نظمیں

غزلیات ★

مضامین ★

سٹی پریس بیرون دروازہ امرتسر سے چھپا کر گیان سنگھ پرنٹر پبلشر و پروپرائٹر نے دفتر نگارش
کٹڑہ باگھ سنگھ امرتسر سے شائع کیا

حرفِ اوّل

"نگارش کا جگر نمبر دیکھ کر میں چونک اُٹھا ہوں۔"

"جگر نمبر ملا اور میں نے اسے چُوم کر سینے سے لگا لیا۔"

"جگر نمبر دیکھ کر مجھے اسمیں شرکت نہ کر سکنے کا افسوس ہوا ہے۔"

"آپ اتنا پیارا اور اس قدر معیاری پرچہ پیش کریں گے مجھے شک تھا۔"

"جگر نمبر دیکھ کر سوچنے لگا ہوں کہ آپ ہندوستان میں ہیں یا پاکستان میں۔"

"جگر کس قدر عظیم شاعر تھا یہ احساس مجھے جگر نمبر دیکھ کر ہوا۔"

"وہ لوگ جو ہندوستان میں اُردو زبان و ادب کے مستقبل سے مایوس ہیں۔ نگارش کا جگر نمبر دیکھ کر یقیناً کِھل اُٹھیں گے۔"

جگر نمبر آپ نے پسند کیا اس کے لئے ہم آپ کے مشکور ہیں۔ دراصل آپکی اس حوصلہ افزائی اور نوازش کے بل بوتے پر اب ہم خاص نمبر پیش کر رہے ہیں۔ خاص نمبر آپ کے خلوص بھرے تعاون اور ہماری انتھک محنت کا حاصل پیشِ خدمت ہے۔ ہم نے اپنے خیالات، ماحول اور اختیارات کے مطابق خاص نمبر کو بہترین رنگ و روپ میں پیش کیا ہے۔ خدا کرے یہ آپ کے ذوقِ سلیم کی تسکین کا ساماں بن سکے۔ خاص نمبر میں جو کچھ بھی پیش کیا جا رہا ہے اس پر ہمیں فخر ہے اسمیں بعض تخلیقات، موضوع، تکنیک، پلاٹ، شدتِ تاثر اور نئی نقطۂ نظر سے بہت ہی بلند پایہ اور منفرد ہیں اور ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ ہم سے اتفاق کریں گے۔

خاص نمبر میں ۱۹۶۰ء کے بہترین افسانے کے عنوان سے ایک انتخاب بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس انتخاب میں کوئی افسانہ بھی آپ بہترین سے کم نہ پائیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کچھ اور افسانے بھی بہترین ہو سکتے ہیں مگر یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ ان بہترین افسانوں میں سے کوئی افسانہ بہترین سے ذرا بھی کم نہیں ہے۔

ترتیب میں پھر کچھ بے ترتیبی ہو گئی ہے۔ کتنی بڑی مجبوری ہے کہ بعض تخلیقات طویل انتظار کے بعد بڑی تاخیر سے موصول ہوئیں۔ ان کو آئندہ کے لئے روک لینا ہمیں گوارا نہیں تھا۔ اب جب آپ ان ادب پاروں کو پڑھیں گے تو یقیناً ترتیب کی بے ترتیبی کو بھول جائیں گے۔

یہ خبر ہمارے لئے بڑے دکھ اور رنج کی ہے کہ پچھلے دنوں ہمارے دوست اور نگار رش نواز جناب انور معنی اجمیری صاحب انتقال فرما گئے۔ انور معنی ایک اچھے منجھے ہوئے ترقی پسند شاعر، ادیب، اور صحافی تھے۔ ان سا ادب نواز اور ادب دوست فنکار ملنا ناممکن ہے بقول جذبی ؎

کیا روئے فلک ان تاروں پر، دم بھر جو چمک کر ٹوٹ گئے

ادارہ

ہم متعدد بار ان کالموں میں آپ سے اپنی پوزیشن بیان کر چکے ہیں کہ مسودہ جات کی واپسی اور جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ ارسال کریں اور نمونہ مفت مانگ کر ہماری مجبوری اور بے بسی کے احساس کو اور تلخ نہ بنائیں۔ مگر نہ جانے آپ بضد کیوں ہیں۔ آپ خود ہی غور کریں کہ اتنا معیاری اور نفیس گٹ اپ کے ساتھ پرچہ اگر مفت ہی دینا پڑے تو پھر یہ سلسلہ کتنے دن چلیگا اور اگر ہمیں آپ کا خلوص بھرا تعاون نہ ملا تو ہم اکیلے کیا کر سکیں گے — ؟؟

منیجر

کشمیری لال ذاکر

رتھ کے گھوڑے

مَیں جب پہلی بار اُس شہر میں گیا تو بس سے اُترتے ہی مَیں نے اُسے دیکھا۔ دس گیارہ برس کی ایک دُبلی پتلی سی لڑکی بس کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں پُرانے کپڑوں اور اِدھر اُدھر کی بےکار چیزوں سے بنائے ہوئے دو گھوڑے تھے۔ جنہیں وہ اپنے سینے سے یُوں چمٹائے ہوئے تھی جیسے ذرا سی ڈھیل دینے پر بھاگ کھڑے ہوں گے اور اس طرح سرپٹ دوڑیں گے کہ کچھ ہی لمحوں میں دھول اُڑاتے ہوئے نظر سے اوجھل ہو جائیں گے اور وہ اُن کی گرد کو بھی نہ پا سکیگی۔ اسی لئے اُس نے خوب کس کے چمٹا رکھا تھا۔ اُن چھوٹے چھوٹے مصنوعی گھوڑوں کو اپنے جسم کے ساتھ۔ بس رُکی تو سب سے پہلے دو ایک جاٹ اُترے، اپنی اپنی چادریں سنبھالتے ہوئے لڑکی نے اُن کی طرف توجہ نہیں دی۔ پھر ایک عورت اُتری، پیلی، پھولدار ساڑھی پہنے۔ گھونگھٹ کاڑھے ہُوئے۔ اپنے بچے کو کندھے کے ساتھ لگائے جو اب تک سو رہا تھا اور اب بس کے رُکنے پر جاگ پڑا تھا۔ لڑکی اُس کی طرف بڑھی۔

”ایک گھوڑا لے لو، اپنے بیٹے کے لئے۔“ اُس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

عورت نے اَن سُنی کرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیئے۔

”دیکھئے اس کا رنگ برنگی ساز کیسا چمک رہا ہے۔“ لڑکی نے عورت کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

عورت کے بعد چونکہ میں بس سے اتر رہا تھا اس لئے لڑکی کے یہ الفاظ میں نے بھی سنے تھے اور اسے اس عورت کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

"کتنے پیسے؟" عورت نے پوچھا۔

"آٹھ آنے!"

"دو آنے لو گی۔"

"تین آنے تو اس کی لاگت ہے اماں جی۔"

"تو کون ہوتی ہے مجھے اماں کہنے والی، چل بھاگ۔"

یہ کہہ کر عورت کسی رکشا والے سے بات کرنے لگی اور وہ لڑکی ایکدم سہم کر پلٹ آئی۔ اس کا چہرہ اداس ہو گیا اور اسکی خوبصورت معصوم آنکھیں دھندلا گئیں۔

وہ بس سے اترتے ہوئے دوسرے مسافروں کو ایک ٹک دیکھتی رہی لیکن کسی سے مخاطب ہونے کی جرأت نہیں کی۔ پھر وہ ہار کر ایک طرف کھڑی ہو گئی اور سب مسافر ایک ایک کر کے بس اسٹینڈ سے باہر نکل گئے۔ دوسری بس آنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ اس لئے بس اسٹینڈ کا میلہ دوبارہ بھرنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ میرا ملازم بس کی چھت سے سامان اتروا کر میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں دیر تک اس معصوم سی، پیاری لڑکی کو دیکھتا رہا۔ اس نے بھی دو ایک بار میری طرف دیکھا لیکن آگے نہیں بڑھی۔ جہاں کھڑی تھی وہیں رکی رہی، اپنے گھوڑوں کو سینے سے چمٹائے کہ کہیں وہ بھاگ نہ کھڑے ہوں۔

کچھ لمحوں کے بعد میں اس کی طرف بڑھا۔

"کیا میں تمہارے یہ گھوڑے خرید سکتا ہوں؟"

میری بات سن کر لڑکی کی دھندلائی ہوئی آنکھیں ایکدم چمک اٹھیں جیسے سورج کی کرنوں میں شبنم سے گیلی کلیاں چمک اٹھتی ہیں۔ اس کا اداس چہرہ پل بھر کے لئے کھل اٹھا۔

"جی، دیکھئے۔" اس نے دونوں گھوڑے میری طرف بڑھا دیئے۔

میں نے گھوڑوں کو لے لیا اور اُنہیں غور سے دیکھنے لگا۔ پُرانے کپڑوں کو رنگ کر اُن میں بُرادہ بھرا ہُوا تھا۔ ٹانگوں کے لئے بانس کی کھپچیاں استعمال کی گئی تھیں۔ دُم اور کان چمکدار کاغذ کے بنے تھے اور سگریٹ کی ڈبیوں میں سے نکلے ہوئے سفید ورق اور کاغذ سے ساز بنایا گیا تھا۔

"کتنے گھوڑے بیچ چُکی ہو؟"

"جی ابھی تو آئی ہی ہُوں گھر سے۔ شام تک بک جائیں گے۔"

"اور اگر یہ ابھی بک جائیں؟"

"تو گھر چلی جاؤں گی اور اپنی دادی کا سر دباؤں گی۔"

"بیمار ہے تمہاری دادی؟"

"جی اُس کے سر میں درد ہوتا رہتا ہے ہر وقت۔ روتی جو رہتی ہے۔"

"کیوں روتی رہتی ہے؟"

میرے یہ پُوچھنے پر وُہ لڑکی رونے لگ گئی۔ ایک عارضی سی خوشی کی پرچھائیں جو اس کے چہرے پر دیکھی تھی فوراً غائب ہو گئی۔

مجھے اُس سے یہ سوال نہیں پُوچھنا چاہیئے تھا۔ میری بات سے اُسے چوٹ پہنچی تھی۔ اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ لڑکی کے بکھرے ہوئے بھُورے بال جو بے حد میلے ہو رہے تھے اُڑ کر اس کے گورے چہرے پر گر گئے اور ساتھ ہی گھوڑوں کے بے جان جسموں پر سجے ہوئے رنگ برنگی کاغذ پھڑپھڑانے لگے۔ مجھے محسوس ہُوا جیسے گھوڑے ابھی بھاگ کھڑے ہوں گے۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر دی۔ لڑکی روئے جا رہی تھی۔

میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ میں خاموش کھڑا اس معصوم لڑکی کو روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"میرے گھوڑے واپس دے دیں!" اُس نے سسکتے ہوئے کہا اور اپنے اُڑتے ہوئے بالوں کو سنبھالنے لگی۔

"بیچو گی نہیں؟"

"نہیں!" اُس نے آنسوؤں سے سُلگتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ میں نے دونوں گھوڑے آہستے واپس کر دیئے اور اُس نے اُنہیں زور سے اپنے ساتھ بھینچ لیا اور پھر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی بس اسٹینڈ کے احاطے سے باہر چلی گئی۔

میں نے دیکھا اُس کے پاؤں ننگے تھے اور اُن پر گرد کی تہیں جمی تھیں۔ اُس کا لباس پھٹا ہوا اور بہت ہی میلا تھا، جیسے وہ محرومی اور احتیاج کا ایک ٹوٹی ہوئی جھونپڑی تھی جس میں اندھیرا تھا اور سیلن تھی اور گرد کے ڈھیر تھے لیکن اُس کی آواز کا شعلہ بڑا اُجلا تھا اور اُس کی چمک بڑی پیاری تھی۔ اُس کے جانے کے بعد بہت دیر تک میں اُس شعلے کی روشنی کو محسوس کرتا رہا۔

اور پھر بس اسٹینڈ کا میلہ بھرنے سے پہلے میں بھی اپنا سامان اُٹھا کر چلا گیا۔ اُس اجنبی شہر میں اپنے لئے کہیں کوئی ٹھکانہ ڈھونڈنے۔

یہ اُس لڑکی سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد میں نے اُسے کئی بار دیکھا ہے۔ وہیں اُسی بس اسٹینڈ پر جہاں دہلی اور آگرہ کے کے لئے بسیں چلتی ہیں اور گوڑگانوہ اور میوات کے علاقے کے لوگ لمبے سفر کے لئے وہاں سے گذرتے ہیں۔ لڑکی ہر روز سینکڑوں مسافروں کو دیکھتی ہے۔ سبھی مسافر ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لئے وہ کسی کو بھی نہیں پہچانتی، مجھے بھی نہیں۔ لیکن گھوڑے بیچنے والی صرف ایک لڑکی ہے۔ اس لئے اُسے ہر کوئی پہچانتا ہے۔ کیونکہ ہر کوئی اُسے دیکھتا ہے۔ لیکن وہ کسی کو نہیں دیکھتی وہ تو صرف گاہک کو دیکھتی ہے جو اُس کے گھوڑے خرید سکے۔ لیکن پھر بھی جانے کیوں مجھے اُس کا سامنا کرتے ہوئے کچھ جھینپ سی محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے اُسے دُور ہی سے دیکھتا ہوں اور فوراً بس اسٹینڈ سے باہر نکل جاتا ہوں۔ اُس کے قریب نہیں جاتا۔ اُس کے گھوڑے نہیں خریدتا۔ اُس سے اُس کے گھر اور اُسکی دادی کی باتیں نہیں کرتا۔ وہ اپنے گھوڑے، اپنے ننگے پاؤں کی دھول، اپنا پھٹا پُرانا لباس اور اپنی آواز کی مٹھاس لئے وہیں کھڑی رہتی ہے اور لُو کے تیز جھلستے ہوئے جھونکوں میں اپنی محنت بیچتی ہے۔ میں جب بھی اُسے دیکھتا مجھے محسوس

ہوتا کہ وہ چمکتے ہوئے گھوڑے جنہیں وہ اپنے سینے سے چمٹائے رکھتی ہے، اُس کے خواب ہیں، اُس کے مستقبل کے خواب جنہیں وہ سجاتی رہتی ہے اور اُن میں رنگ بھرتی رہتی ہے۔ لیکن وہ بے جان ہیں، بے حس ہیں اور زندگی کی حرارت سے محروم ہیں۔

کل دوبارہ مجھے اُسی بس اسٹینڈ پر اترنا پڑا۔

آخری بس سے آیا تھا جو ساڑھے چھ بجے پہنچتی تھی۔ بس سے اُترنے سے پہلے مَیں نے سوچا تھا کہ وہ لڑکی آج وہاں نہیں ملےگی۔ وہ اب تک اپنے گھوڑے بیچ کر جا چکی ہوگی۔ میرے لئے وہ اس ماحول کا ایک ضروری حصّہ بن چکی تھی اور اُسے وہاں ایک طرف کھڑی دیکھنا ایک نارمل سی بات بن گئی تھی۔ اس خیال سے کہ آج مَیں اُسے وہاں نہ دیکھ سکوں گا ایک ذہنی پریشانی محسوس ہوئی لیکن مجھے بڑا اچنبھا ہُوا جب بس سے اُترتے ہی مَیں نے دیکھا کہ وہ سامنے دیوار کے ساتھ کھڑی تھی اور ایسے لگ رہی تھی جیسے ایک پیوند ہو جو اس بوسیدہ دیوار کے پیرہن میں لگا ہو۔ مَیں بس سے اُترا تو میرا خیال تھا کہ وہ لڑکی آگے بڑھ کر مسافروں سے گھوڑے خریدنے کو اصرار کریگی۔ لیکن وہ تو بُت کی طرح دیوار سے لگی تھی اور مسافر دھیرے دھیرے جارہے تھے۔ مَیں نے اُس کی طرف غور سے دیکھا تو مجھے محسوس ہُوا کہ بے چاری دن بھر اپنی محنت بیچتی رہی تھی۔ لیکن کسی نے نہ خریدی تھی۔ دونوں گھوڑے اُس کے ہاتھوں میں تھے، ایک بھی نہ بکا تھا۔ اب اُس میں اتنی بھی قوت نہ تھی کہ اُنہیں اپنے سینے سے زور سے چمٹائے رکھتی۔ وہ اس کی کمزور پکڑ سے چھوٹ کر بھلے ہی بھاگ جائیں اُس کا چہرہ بیحد اُداس تھا۔ اُس کے پاؤں پر جمی ہوئی گرد اُڑ کر چہرے پر بھی جم گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں پت جھڑ کی ویرانی تھی۔ پیاس سے اُس کے ہونٹ سوکھ رہے تھے۔ وہ ایکدم بے جان نظر آ رہی تھی۔ مجھے بڑا بُرا لگ رہا تھا اُس کا یوں بے حس وحرکت کھڑا رہنا۔ کچھ ہی لمحوں میں سارے مسافر چلے جائیں گے۔ وہ آگے بڑھ کر اپنے گھوڑے کیوں نہیں بیچتی؟ لوگ چلے گئے تو کون خریدے گا اُسکی محنت؟ مَیں پہلے کی طرح آج اُس سے چھپ کر بھاگ نہیں رہا تھا۔ وہیں کھڑا تھا مضطرب اور پریشان سا۔ میرے ملازم نے سامان اُتار لیا تھا اور رکشا میں رکھ رہا تھا۔

"چلئے صاحب۔"

"تم جاؤ، میں آجاؤں گا ریسٹ ہاؤس۔"

وہ رکشا میں بیٹھ گیا۔ رکشا والے نے پیڈل گھمایا تو میں نے آواز دی۔

"رک جاؤ تھوڑی دیر۔"

رکشا رک گئی۔

لڑکی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ پل بھر کو اُس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آئی اور پھر وہی پہلا سا گھُپ اندھیرا پھیل گیا اُس کی نگاہوں میں۔ آخری بس آ چکی تھی۔ اب بس اسٹینڈ پر کوئی مسافر نہیں آئے گا۔ اب اُس کے گھوڑے نہیں بکیں گے۔ میں نے قدم اس کی طرف بڑھائے۔

پاس جا کر دیکھا، اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"آج تمہارے گھوڑے نہیں بکے؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے جواب نہیں دیا، صرف ایک بار میری طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"تمہاری دادی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"جی، ویسی ہی ہے!"

اُس کے بازو چاہ رہے تھے کہ وہ اپنا وزن نیچے پھینک دیں۔ دن بھر بوجھ اُٹھا اُٹھا کر اب وہ نڈھال ہو رہے تھے۔

"آپ خرید لیں نا یہ گھوڑے۔"

"ایک بار میں نے خریدنے چاہے تھے تو تم نے انکار کر دیا تھا۔"

لڑکی کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ اُس نے سسکنا شروع کر دیا۔

"تو آپ وہی ہیں؟"

"تو آپ وہی ہیں؟"

"ہاں"

اتنے میں وہ رکشا والا جس کی رکشا میں میرا سامان رکھا تھا ہمارے قریب آ گیا۔

"حسینہ رو کیوں رہی ہو؟" اس نے لڑکی سے پوچھا۔

کل پہلی بار مجھے اس کا نام معلوم ہوا۔ کتنا پیارا نام تھا لیکن کتنا غلط استعمال ہو رہا تھا اس کا۔ جیسے ایک تازہ کھلا ہوا گلاب کا پھول کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا ہو کسی نے۔

"بہت دکھی ہے بے چاری۔" رکشا والا مجھ سے مخاطب ہوا۔

"کیوں؟"

"اس کا باپ عبدالغفار یہاں کا مشہور کوچوان ہے۔ اس جیسا تانگہ چلانے والا اس سارے علاقہ میں کوئی نہیں۔ بٹوارے کے بعد کئی اور مسلمان گھرانوں کی طرح غفار بھی پاکستان نہیں گیا۔ ایک محنت کش کے لئے یہ سیاسی حدیں کیا معنی رکھتی ہیں۔ محنت ایک ایسا مذہب ہے جس میں کہیں کوئی تفرقہ نہیں، تعصب نہیں، پابندی نہیں، وہ دنیا کے ہر ملک میں آزاد ہے اور باعزم ہے۔ اپنی محنت پر بھروسہ بڑی چیز ہے صاحب۔"

میں نے رکشا والے کی بات سن کر اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر ہاتھ بڑھا کر حسینہ کے ہاتھ سے اس کے گھوڑے لے لئے۔ رکشا والے نے اپنی بات جاری رکھی۔

"حسینہ کے باپ کا کام بہت اچھا چل رہا تھا۔ وہ اپنی بوڑھی ماں کی خدمت کرتا تھا۔ اپنی بیوی سے محبت کرتا تھا اور اپنی بچی حسینہ سے اسے بےحد پیار تھا۔ دو برس ہوئے جب غفار کی بیوی مر گئی اور غفار تنہا رہ گیا۔ اس نے تانگہ چلانا چھوڑ دیا۔ گھوڑا تھان پر بندھا رہتا۔ اسے چارہ بھی کوئی نہیں ڈالتا تھا۔ حسینہ اور اس کی دادی ہی اس کا خیال رکھتی تھیں اور ایک دن اچانک غفار کہیں چلا گیا۔"

"کہاں چلا گیا!" میں نے پوچھا۔

"اپنے لئے دوسری بیوی لانے۔" حسینہ جو اب تک خاموش تھی چیخ کر بولی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ رکشا والے نے آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

"جتنے دن وہ غائب رہا حسینہ اور اُس کی دادی دونوں فاقے کاٹتی رہیں اور آخر ایک دن ایک کوچبان نے غفار کا گھوڑا خرید لیا۔ کیونکہ اُن لوگوں کے پاس اسے کھلانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ جس دن اُس کا گھوڑا بکا اُسی شام غفار ایک اور عورت کو لے کر واپس آگیا۔ جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ اُس کی ماں نے گھوڑا بیچ دیا ہے تو اُس کے غصے کی آگ بھڑک اُٹھی۔ وہ شاید پہلا دن تھا جب اس نے اپنی ماں اور اپنی لڑکی کو گندی گندی گالیاں دی تھیں اور انہیں بُری طرح پیٹا تھا۔ اس کے بعد یہ کہانی ہر روز دوہرائی جانے لگی۔ حسینہ اور اُسکی دادی کی روز ہی پٹائی ہوتی اور غفار کی نئی بیوی تماشہ دیکھتی۔"

حسینہ رکشا والے کے ساتھ لگی زور سے روئے جا رہی تھی۔

"لیکن ان گھوڑوں کا کیا تعلق ہے اس بات سے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک دن حسینہ اور اس کی دادی کو الگ کر دیا گیا۔ اپنا گذارہ انہیں خود کرنا تھا۔ دونوں تقدیر کی ماری سوچتی رہیں۔ کوئی راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ کیا کریں۔ کہاں جائیں! بھیک مانگنا انہیں گوارا نہیں تھا۔ غفار کی ماں نے بڑے اچھے دن دیکھے تھے، اپنی پہلی بہو کے جیتے ہوئے۔ اب یہ اچانک آفت اُسکی برداشت سے باہر کی بات تھی۔ ایک روز حسینہ نے دیکھا اُس کی دادی صبح سے ہی کچھ بنانے میں لگی تھی۔ پھر اُس نے پاس کے سگرٹ والے سے سفید ورق منگوائے۔ ایک ٹوٹا سا بانس پڑا تھا۔ اس سے چھوٹے چھوٹے پتلے سے ٹکڑے کاٹے۔ حسینہ بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ اُس سے وہ بھول گئی تھی کہ وہ بھوکی تھی اور بے سہارا تھی اور اس کی ماں نہیں تھی اور اس کے باپ نے اُسے ایکدم نظر انداز کر دیا تھا۔ دوپہر تک دادی اپنے کام میں جُٹی رہی شام کو اُس نے ایک گھوڑا بنا کر حسینہ کے حوالے کر دیا۔ وہ تالیاں بجا کر ناچنے لگی۔ کئی دنوں کے بعد آج اُسے خوشی کا احساس ہوا تھا۔"

یہاں تک بات پہنچی تو روتی ہوئی حسینہ ایکدم چُپ ہو گئی۔ یہ اجنبی آدمی کیوں اُس کی کہانی سُن رہا تھا۔ اُس نے کوئی غلط بات کہہ دی تو وہ برداشت نہیں کر سکیگی۔ وہ رکشا والے سے

سے الگ ہو کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی۔

"اس شام میں اور میری دادی یہاں اِس اڈّے پر آئی تھیں پہلا گھوڑا بیچنے۔ وُہ کوئی زیادہ خوبصورت نہیں تھا۔ کسی کو پسند نہیں آیا۔ ہم دونوں دن ڈھلے تک آخری بس کے آجانے کے بعد بھی یہیں کھڑی رہیں۔ لیکن کسی بھی مسافر نے گھوڑا نہ خریدا اور پھر ہم دونوں مایوس گھر واپس چلی گئیں۔ گھر پہنچیں تو میری نئی ماں نے کہا۔ "روزگار چلا نہیں دادی پوتی کا!"

"دادی تو چُپ رہی لیکن میں نے کہا جب تک روزگار نہیں ملے گا ہم بھوکی رہیں گی لیکن تم سے کچھ نہیں مانگیں گی۔"

"بڑی ہمت والی لڑکی ہو تم حسینہ۔"

"جی!" اُس نے شرماتے ہوئے کہا۔

"کتنے گھوڑے بنا دیتی ہے تمہاری دادی، ایک دن میں؟" میں نے پُوچھا۔

"پہلے تو وُہ اکیلی ہی بناتی تھی اب تو میں بھی اُس کا ہاتھ بٹاتی ہُوں، تین گھوڑے بنتے ہیں۔ بِک جائیں تو روپیہ بارہ آنے بچ جاتے ہیں اور ہمارا گزارہ چل جاتا ہے۔"

"جس روز نہیں بکتے، تو کیا ہوتا ہے؟"

"اُس روز میں گھر جانے سے ڈرتی ہُوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں نے کوئی بہت بڑا پاپ کر ڈالا ہو۔ وُہ پہلا گھوڑا جو بکا نہیں تھا آج تک ہماری جھونپڑی میں رکھا ہے۔ اُس رات پہلا فاقہ تھا مجھے اور دادی دونوں کو۔ کیونکہ ہم نے نئی ماں سے کسی بھی قسم کی امداد لینے کی قسم کھالی تھی۔"

میں اُن دونوں گھوڑوں کو جو میرے ہاتھ میں پکڑے تھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے یہ گھوڑے حسینہ کی زندگی کے رتھ کے آگے جُتے تھے۔ رتھ بڑا بوجھل تھا۔ راستہ بڑا خراب تھا۔ یہ بے جان گھوڑے آخر کب تک اُس رتھ کو کھینچتے رہیں گے۔ اُس کے پہیّوں کے نیچے حسینہ کا بچپن کچلا جا رہا تھا۔ ایک دن اُسکی جوانی بھی کچلی جائیگی اِس بوجھ کے نیچے۔ اُس کے خواب۔ اُس کی اُمیدیں۔ اُس کی آرزوئیں سبھی کچھ۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے اُن گھوڑوں کو پنکھ لگ گئے تھے اور حسینہ

ایک سجے ہوئے رتھ میں بیٹھی آکاش کی طرف اُڑتی جا رہی تھی۔ اُس کے بال ہواؤں میں لہرا رہے تھے۔ اُس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر چاندنی کھیل رہی تھی اور دُور آکاش میں چاند کے قریب اس کی بوڑھی دادی اپنی کمان کی طرح دوہری کمر کو سنبھالے اُس کا انتظار کر رہی تھی۔

"آج تمہارے گھوڑے کیوں نہیں بکے حسینہ؟" مَیں نے پُوچھا۔

"کسی نے نہیں خریدے۔ دادی کی طبیعت آج بہت خراب ہے۔ مجھے تو اس کے لئے پھل لے کر جانا تھا۔ اب مَیں کیا لے کر جاؤں گی۔ آپ خرید لیں یہ گھوڑے، آپ بھلے آدمی نظر آتے ہیں۔ خرید لیں نا!" وُہ میرے قریب آ گئی اور اُسکی آنکھوں سے آگ سی دہکنے لگی۔ اُس کی آواز کا شُعلہ بھرپور انداز سے چمک رہا تھا۔

"وُہ تو خرید بھی لئے ہیں مَیں نے۔"

"سچ؟"

"ہاں!"

"تو مجھے پھل لے دیجئے باہر کی دُکان سے۔ مجھے پھلوں کی پہچان نہیں۔ بہت سے پھل میری دادی کے لئے۔"

مَیں نے وُہ دونوں گھوڑے اپنے ملازم کے ہاتھ میں تھما دیئے اور حسینہ کو ساتھ لے کر قریب کی دکان سے اُس کی پسند کے پھل اُسے خرید دیئے۔

"یہ پھل تمہاری دادی کے لئے ہیں اور یہ قیمت تمہارے گھوڑوں کی ہے۔" مَیں نے اُسے دو روپے دیتے ہوئے کہا۔

"ایک روپیہ بنتا ہے گھوڑوں کا اور اتنے کے تو آپ نے پھل ہی لے دیئے ہوں گے۔ مَیں بھکارن نہیں بابُوجی۔" مجھے محسوس ہُوا جیسے حسینہ نے اپنے کمزور پتلے سے ہاتھ سے ایک زوردار تھپڑ میرے گال پر جما دیا تھا۔

کتنے تیکھے احساس کی لڑکی تھی وُہ!

(بقایا صفحہ ۱۵۱ پر)



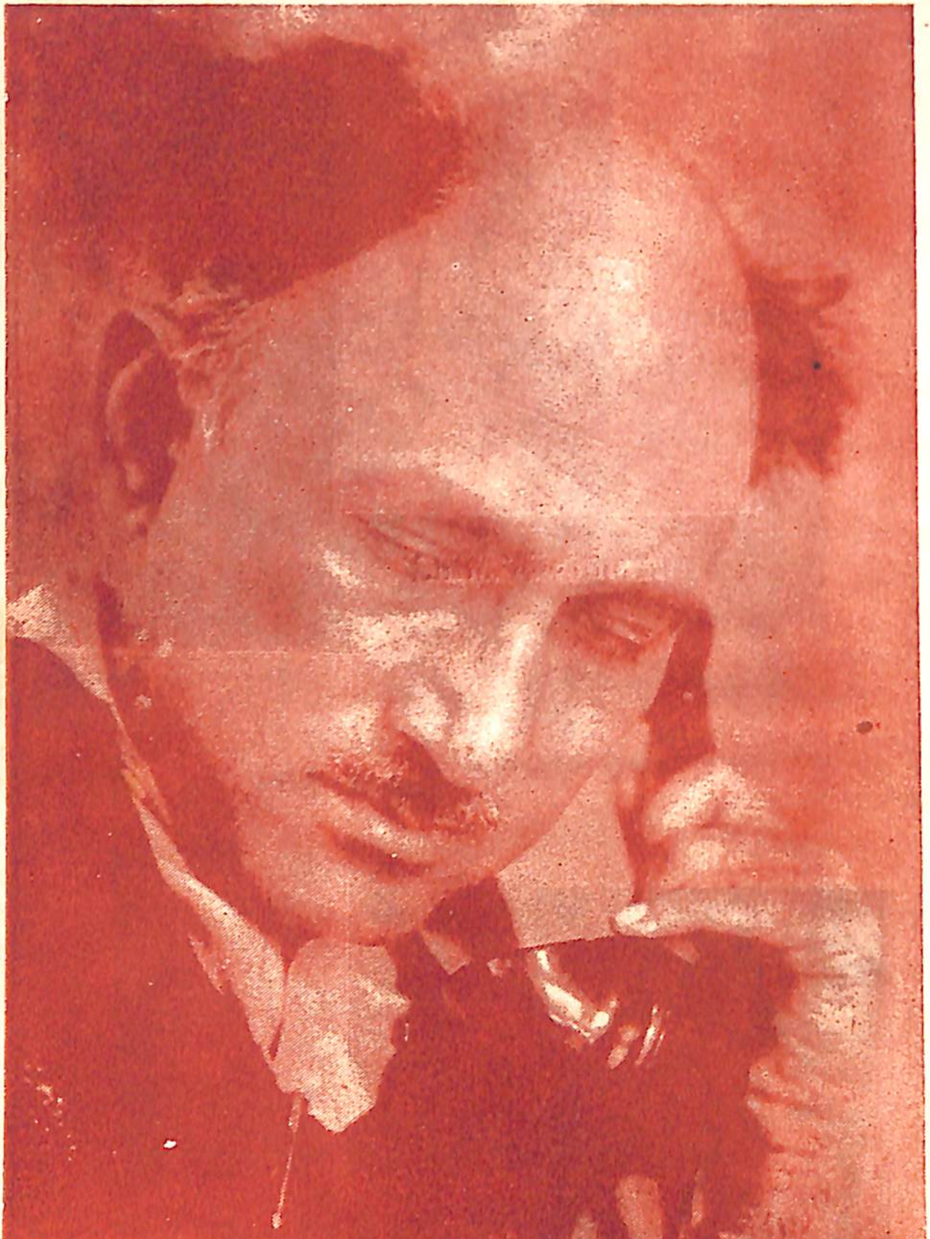
Rajinder Singh Bedi



Kashmiri Lal Zakir



Akhtar Ansari
Akbarabadi



Khawaja Ahmad Abbas.



Zakee Anwar



Taj Saeed



Raja Mehdi Ali Khan



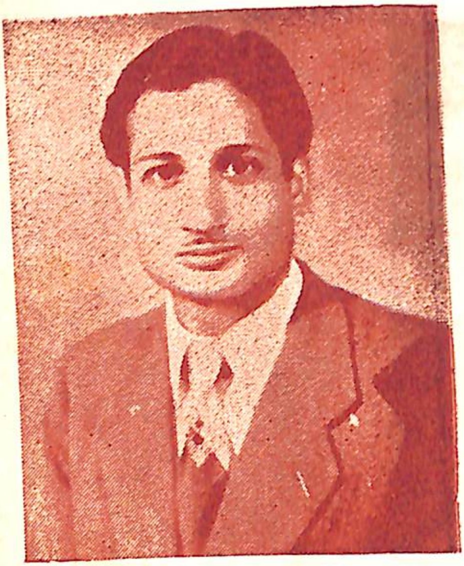
Shifa Gwaliori.



Akhtar Nomani



Narinjan Tasneem



Parkash Nath Parvez.



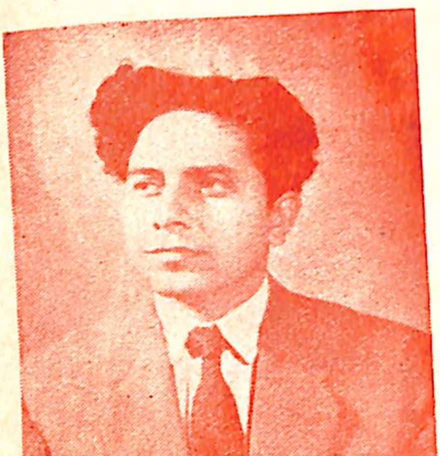
Darshan Kumar Bhola



Itaurrahman Irshad



Ishrat Qadri



Madan Bhardwaj



Prem Kumar Saz



M. A. Asi



Kausar Ludhianvi



Anwer Moiny



Fiza Kausary.



Niaz Badayuni



Zakee Badayuni

سیاہ سورج سفید سائے

ناولٹ

خواجہ احمد عباس

شب کے سناٹے میں یہ کس کا لہو گاتا ہے
سرحدِ درد سے یہ کس کی صدا آتی ہے؟

(سردار جعفری)

دُنیا کے سب سے بڑے شہر کی روشنیاں ایک گہری دُھند کے اندھیرے میں ڈُوبی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جنوری کی اُس شام کو جب ٹمپریچر صفر سے نیچے اُتر چکا تھا۔ دھوئیں کا ایک عالمگیر بادل مستقل طور پر زمین و آسمان پر چھا گیا ہے اور اب کبھی دُنیا میں روشنی نہیں ہوگی، کبھی برف نہیں پگھلے گی، کبھی پھُول نہیں کھلیں گے، کبھی بہار نہیں آئیگی۔

یہ دھُواں پانی برسانے والے بادلوں کی طرح سمندر سے نہیں اُٹھا تھا۔ یہ دھُواں آسمان سے نہیں اُترا تھا۔ یہ دھُواں قدرت نے نہیں، انسان نے تخلیق کیا تھا۔ مگر یہ اُن چولہوں کی آگ کا دھواں نہیں تھا جن پر عورتیں گرم گرم روٹیاں سینک کر اپنے بچّوں کو کھلاتی ہیں۔ یہ دھُواں اُن الاؤں کی آگ سے نہیں اُٹھا تھا جن کے گرد کھیتوں اور جنگلوں میں، پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر اور سمندر کے کنارے، محنت کش انسان۔ کسان اور چرواہے اور لکڑہارے اور ماہی گیر — اکٹھے ہو کر ہاتھ تاپتے ہیں اور ایک دُوسرے کو پُرانی داستانیں اور دردبھرے لوک گیت سُنا کر جاڑے کی لمبی لمبی راتیں گذارتے ہیں۔

یہ دھُواں اُٹھا تھا اُن کارخانوں کی چمنیوں سے جہاں کپڑا بُنا جا رہا تھا۔ مگر یہ کپڑا دُنیا کے اُن کروڑوں انسانوں کے لئے نہیں تھا جو غربت کے مارے اِس سردی کے موسم میں بھی ادھ ننگے گھُومنے پر مجبور ہیں۔ یہ دھُواں اُٹھا تھا موٹروں کے اُن کارخانوں سے جہاں ہزاروں موٹریں

تیار ہو رہی تھیں۔ جن کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ یہ دھواں اٹھا تھا ان کھلیانوں سے جہاں لاکھوں ٹن گیہوں کو جان بوجھ کر آگ لگا دی گئی تھی تاکہ اناج کی منڈیوں کا بھاؤ نہ گرنے پائے چاہے دنیا کی آبادی کا چوتھائی حصہ کال کے مارے مر جائے۔ یہ دھواں اٹھا تھا ان پوشیدہ کارخانوں سے جہاں ایٹم بم ڈھالے جا رہے تھے۔ جہاں زہریلی گیسیں بنائی جا رہی تھیں، جہاں جنگ کے دوسرے منحوس ہتھیار تیار کئے جا رہے تھے، جہاں موت کو جنم دیا جا رہا تھا۔

یہ دھواں اٹھا تھا زمین سے آسمان کی طرف جانے کے لئے۔ مگر سردی سے ٹھٹھرے ہوئے آسمان نے اس زہریلے دھوئیں کو اپنی آغوش میں لینے سے انکار کر دیا تھا اور اب زہر کا یہ بادل زمین اور آسمان کے درمیان معلق تھا۔ ایک طرف اگر اس میں آسمان کے جگمگاتے ہوئے ستارے گم ہو گئے تھے تو دوسری طرف زمین کی تمام روشنیاں بھی اسمیں کھو گئی تھیں۔ نیویارک کی آئڈل وائلڈ ایرپورٹ دھند اور کہر کی اس برفیلی چادر میں لپٹی ہوئی سردی کے مارے کپکپا رہی تھی۔ جب ریڈار کی مدد سے ہوائی جہاز رن وے پر اترا۔ یہ ہوائی جہاز ایک گرم ملک سے آیا تھا اور اس لئے ائیر کنڈیشنڈ پلین کا دروازہ کھولنے سے پہلے ائیر ہوسٹس نے بجلی کے بلب کی طرح اپنی پیٹنٹ مسکراہٹ چمکاتے ہوئے مسافروں کو آگاہ کیا کہ باہر کا ٹمپریچر صفر کے قریب ہے اور یہ سنتے ہی ہر ایک اوورکوٹ اور مفلر اور شالیں اور دستانے سمیٹنے اور لپیٹنے لگا۔ لیکن وہ لمبے قد کا چھوٹی سی کالی داڑھی والا نوجوان جو سفید ٹھنڈا سوٹ پہنے سب سے پیچھے کی سیٹ پر اکیلا اور خاموش بیٹھا تھا دروازہ کھلتے ہی بے پرواہی سے اٹھا اور باہر جاتے ہوئے اس نے کوٹ کا کالر بھی اوپر نہ کیا نیچے اترتے ہی سب مسافر دھند میں کھو گئے اور دھندلے دھندلے دھبوں میں سے ایک دوسرے کو آواز دیکر پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔ لمبے قد کے نوجوانوں نے (جواب بھی ننگے سر اور سوتی کوٹ پتلون میں ملبوس تھا) کہا۔ "اچھا ہوا کہ میں یہاں اس وقت آیا ہوں جب میں نہیں ہوں۔ ورنہ اس زہریلے دھوئیں میں تو میرا دم گھٹ جاتا۔"

"کیا کہا تُم نے ؟" ایک دُوسرے مسافر نے اِس سے پُوچھا۔

اندھیرے میں سے نوجوان کی آواز آئی "مَیں نے کہا اچھا ہُوا مَیں نہیں ہُوں۔"

"تُم کیا نہیں ہو ؟"

"بس مَیں نہیں ہُوں۔ مگر ہوں۔"

اور پھر ان کی آوازیں بھی دُھند میں کھو گئیں اور جب آخرکار ایئرپورٹ کی بلڈنگ میں سب مسافر داخل ہوئے تو وُہ دونوں چُندھیانے والی تیز روشنی میں ایک دوسرے کو نہ پہچان سکے۔

جہاں مسافروں کے پاسپورٹ اور ویزا چیک کئے جا رہے تھے وہاں خُفیہ پولیس کے ایک "سفید پوش" انسپکٹر نے پاسپورٹ آفیسر کے کان میں کہا کہ آج کالی رنگت والے مسافروں سے ذرا ہوشیار رہے کیونکہ پولیس کو خبر ملی تھی کہ اِن دِنوں میں افریقہ کے کئی انقلابی بغیر ویزا کے آنے والے ہیں اور اسی لئے جب ایک نیگرو مسافر نے اپنا پاسپورٹ پیش کیا تو اس سے پُوچھا گیا "لے کالئے۔ تمہارا ویزا کہاں ہے ؟"

نیگرو نے جواب دیا۔ "میرا نام کالیا نہیں ہے مسٹر پیٹر ابراہم جیفرسن ہے۔ دوسرے یہ کہ میرا پاسپورٹ غور سے دیکھئے۔ مَیں امریکن ہُوں اور مجھے اپنے وطن واپس آنے کے لئے ویزا کی ضرورت نہیں۔"

"اوہ تم امریکن نیگرو ہو ؟" پاسپورٹ آفیسر نے چھوٹی سی لال کتاب کو اُلٹتے پلٹتے اور اس پر مُہر لگاتے ہوئے کہا۔ "کالے لوگوں کو پہچاننے میں بھی تو مشکل ہوتی ہے۔ امریکن نگرو اور افریقی نگرو ہمیں ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔"

اور نیگرو مسافر نے اپنا پاسپورٹ سنبھالتے ہوئے جاتے جاتے جواب دیا۔ "تمہاری بدقسمتی سے ہم لوگ نہ صرف ایک جیسے لگتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو ایک ہی سمجھتے بھی ہیں"

"سُنا تُم نے اِن کالوں کی اب یہ ہمت ہو گئی ہے ؟" پاسپورٹ آفیسر نے پیچھے

مُڑ کر خفیہ پولیس والے سے کہا اور اُس پل میں وہ لمبے قد کا کالے رنگ کا نوجوان بھی بغیر پاسپورٹ دکھائے مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

(۲)

ائیرپورٹ کے باہر دھند میں ٹیکسی کے میٹر کی ننھی چمک رہی تھی۔ لمبے قد کا نوجوان ٹیکسی کا دروازہ ٹٹول کر اسمیں بیٹھ گیا۔

"کہاں چلوں؟" دھند کے اندھیرے میں سے ٹیکسی ڈرائیور کی آواز آئی۔ موٹر سٹارٹ ہونیکی آواز کیساتھ

"یو۔ این۔ او۔"

ٹیکسی روانہ ہو گئی آہستہ آہستہ دھند میں راستہ ٹٹولتی ہوئی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے پُوچھا، بروک لن کے آئرش لہجے میں "کیوں بلڈی تمہارے ساتھ کوئی سامان نہیں ہے؟"

"نہیں" نوجوان نے جواب دیا۔ "اب مجھے کسی سامان کی ضرورت نہیں ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ سو اس نے بات جاری رکھنے کیلئے کہا۔

"تو یہاں تمہارے دوست ہوں گے۔ یو۔ این۔ او میں؟"

"ہاں دوست بھی ہیں اور دشمن بھی۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"بہت دُور سے۔ یُوں سمجھو دُوسری دُنیا سے؟"

"تو افریقہ سے آئے ہوں گے۔"

"یوں ہی سمجھو۔"

اب ٹیکسی دھندمیں سے ہو کر ایک لمبی سُرنگ میں سے گذر رہی تھی۔ ڈرائیور بولا۔

"اِس سال بے وقت کی دھند بھی کتنی عجیب ہے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا ساری دُنیا اس سُرنگ کی طرح اندھیری ہو گئی ہے۔ گویا ہم ایک اندھیرے سے دُوسرے اندھیرے میں آگئے ہیں اور اِس اندھیرے سے باہر نکلیں گے ایک اور اندھیرے میں۔"

پیچھے کی سیٹ سے ایک تھکی ہوئی گہری ٹھنڈی سانس سُنائی دی۔ "ہاں بھائی ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہے۔ اندھیرا بھی اور اندھیر بھی۔"

بروک لن کے بھاری آئرش لہجے میں ڈرائیور نے کہا۔ "عجیب بات ہے۔ ہم تم ایک ہی موٹر میں ہیں۔ مگر میں تمہیں نہیں دیکھ سکتا اور تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔" اور پھر چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد۔ "میں پیٹرک مہری اوکونر ہوں۔ آئرش نسل کا امریکن۔ بروک لن میں رہتا ہوں۔ تم کون ہو؟"

"اِنسان ہوں یا تھا۔"

"مطلب یہ ہے بھائی، کہ گورے ہو یا کالے؟ لہجے سے امریکن یا یوروپین تو نہیں معلوم ہوتے۔ ہندوستانی ہو۔ چینی ہو۔ انڈونیشین ہو یا افریقی ہو؟"

"سب کچھ ہوں اور اب کچھ نہیں ہوں۔ مگر میرا وطن افریقہ ہی میں تھا۔"

"سمجھ گیا۔ تم بھی جلاوطن انقلابی معلوم ہوتے ہو۔ ضرور یو۔ این۔ او میں اپنی کوئی فریاد لے کر آئے ہوں گے؟"

"ایسا ہی سمجھو۔"

"تو میں تمہاری طرف ہوں، بھائی تم جو بھی ہو اور تمہاری جو بھی فریاد ہے۔ میرا دادا بھی انقلابی تھا ڈونلڈ جان اوکونر، آئرلینڈ کی آزادی کے لئے برطانوی سامراج کے خلاف کئی بار قید ہوا تھا۔ پھر برطانوی فوجیوں نے اسے گولی مار دی، اور میری دادی اپنے بچوں

کوے کرہیاں آگئیں اور تب سے ہمارا خاندان یہیں امریکہ میں رہتا ہے۔ مگر ہم میں سے ہر ایک کے دل کا ایک ٹکڑا وہیں اپنے وطن آئرلینڈ میں پڑا ہے۔"

اور اب وہ سرنگ سے نکل کر کھلی سڑک پر نکل آئے تھے۔ مگر چاروں طرف چھائے ہوئے اندھیرے میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔

دور دھند کے گدلے اندھیرے سمندر میں دھیمی دھیمی۔ پیلی پیلی روشنی کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ ڈرائیور نے کہا "آج اگر یہ دھند نہ ہوتی تو تم دیکھتے رات کے وقت ہمارا نیویارک کتنا خوبصورت لگتا ہے۔" مگر اس کے مسافر نے جو اپنے ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا، جواب دیا۔ "اِس وقت تو دنیا کی ساری خوبصورتی اِس ٹھنڈے دھوئیں میں ڈوب چکی ہے۔"

کچھ دیر موٹر آہستہ آہستہ سڑک پر رینگتی رہی۔ سینکڑوں دوسری موٹروں کے جلوس میں مسافر اور ڈرائیور دونوں اپنے اپنے خیالات میں کھوئے رہے۔

پھر ڈرائیور نے کہا "بھائی تم نے آج کی خبر پڑھی۔"

مسافر نے کہا "پڑھی تو نہیں مگر میں جانتا ہوں آج کیا ہوا ہے۔"

ڈرائیور نے کہا "کہتے ہیں وہ مارا گیا۔ کیا نام تھا اُس کا؟ اِن غیر ملکی ناموں میں میں ہمیشہ گڑبڑا جاتا ہوں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ لومبا۔ نہیں لومبا۔ اور اس کا پہلا نام تھا پیٹرس۔ جیسا میرا پہلا نام ہے پیٹرک۔" اور پھر تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد۔ "بڑا ظلم ہوا ہے نا؟"

پیچھے کی سیٹ سے آواز آئی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو بھائی۔ بڑا ظلم ہوا ہے۔"

"لکھا ہے وہ جیل سے بھاگ رہا تھا۔ جب اُسے گولی ماری گئی۔ مگر میں نہیں مانتا۔ وہ بھاگنے والوں میں سے نہیں تھا۔ سچا اور پکا انقلابی تھا۔ جیسے میرا دادا تھا۔ میرے دادا کو بھی جب گولی ماری گئی تو سامراجیوں نے یہی بہانہ کیا تھا کہ وہ جیل سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

مسافر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سو تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد ڈرائیور نے کہا۔ "کیوں بھائی خاموش کیوں ہو گئے؟ کیا سوچ رہے ہو؟"

"تمہارے دادا کے بارے میں سوچ رہا ہوں، بھائی۔" مسافر نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "یہ سوچ رہا ہوں کہ دُنیا میں کب تک تمہارے دادا کو گولیاں ماری جائینگی؟"

اور پھر ڈرائیور نے یک لخت بریک لگایا کیونکہ دُھند میں سے سڑک کے بیچوں بیچ دُھندلا دُھندلا ایک ٹریفک کانسٹیبل کھڑا نظر آرہا تھا۔ جیسے آؤٹ آف فوکس تصویر ہو اور اس کانسٹیبل نے دونوں ہاتھ پھیلا کر ٹریفک کو روک رکھا تھا۔

"کیا ہُوا؟" مسافر نے پُوچھا۔

"مَیں ابھی پُوچھ کر آتا ہوں۔" اور ڈرائیور ٹیکسی سے اُتر کر کانسٹیبل کے پاس گیا اور اس سے کچھ پُوچھ کر واپس آگیا۔

"SORRY, BUDDY" اُس نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مگر یو۔این۔او ہیڈکوارٹر تک کوئی کار بغیر سپیشل پاس کے نہیں جا سکتی۔ یہ بندش آج ہی لگی ہے۔ سُنا ہے یُو۔این۔او والوں کو بلوے کا ڈر ہے۔ کہتے ہیں کالے لوگ دھاوا بولنے والے ہیں۔ اوہ بائے۔ ایسا ہُوا تو ہیرڈک ہنری اور کوٹر اُن کے ساتھ ہے۔ مگر بھائی اب تمہیں یہاں اُترنا ہوگا۔ آگے ٹیکسی نہیں جا سکتی۔"

اور اب مسافر نے کہا۔ "ٹھیک ہے مَیں اُتر جاتا ہُوں۔ مگر میرے پاس تمہارا کرایہ دینے کو کچھ نہیں ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور کو اکثر ایسے گاہکوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا جو اس کا کرایہ دیئے بغیر بھاگنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں اُسے یہ مسافر جس کی اُس نے اب تک صُورت بھی نہیں دیکھی تھی اُن بے ایمانوں میں سے نہیں لگتا تھا۔ سو اُس نے کہا "او کے بڈی۔ جاؤ خوش رہو۔ مگر ہیرڈک ہنری اور کوٹر کو یاد رکھنا....."

اور مسافر نے ٹیکسی سے اُترتے ہوئے کہا "تمہیں مَیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ تم بھی شاید مجھے نہ بھولو گے۔ میری یہ نشانی اپنے پاس رکھو۔ میرے پاس اب یہی ایک چیز رہ گئی ہے۔"

اور یہ کہہ کر اُس نے ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی مگر بھاری سی چیز رکھ دی۔
"یہ کیا ہے پڈری؟" ڈرائیور نے رُوک رُک کے بھاری لہجے میں پوچھا۔
"یہ اُس ہی گولی ہے جو پچاس برس ہوئے تمہارے دادا کے سینے میں پیوست کی گئی تھی۔"
ڈرائیور نے ٹیکسی بیٹری کی روشنی میں دیکھا کہ واقعی یہ ایک توجی رائفل میں سے فائر کی ہوئی گولی ہے۔ جو کسی انسانی جسم سے ٹکرا کر ٹوٹ چکی ہے اور جس پر اب تک کسی کا تازہ خون لگا ہوا ہے۔
"ہے پڈری — تم ہو کون؟" ڈرائیور بے تحاشا چلاّیا لیکن مسافر دُھند میں کھویا جا چکا تھا۔

(۳)

دُھند اب اور بھی گہری ہو گئی تھی مگر یُو۔ این۔ او کی بلڈنگ میں اِتنی کھڑکیاں تھیں اور ہر کھڑکی میں اِتنی روشنی تھی کہ ایسا لگتا تھا جیسے دُھند کے کالے نقاب میں سے کسی بھیانک راکھشس کی ہزاروں آنکھیں جھانک رہی ہوں اور وُہ جو افریقہ کے "اندھیرے برِّاعظم" کی سنہری دھُوپ سے نئی دُنیا کی اِس اندھی اور اندھیری راجدھانی میں آیا تھا سوچنے لگا کہ قدیم مصر کے بادشاہوں نے تو بیشمار دولت خرچ کر کے اِتنے اُونچے اہرام بنائے تھے۔ اپنے آپ کو دفنانے کے لئے لیکن یُو۔ این۔ او کے اِس اُونچے مینار تلے کِس کا مقبرہ بنایا جائے گا؟ اور ایک پل کے لئے اُسے یہ گمان گُذرا کہ پتھّر اور سیمنٹ کا یہ پہاڑ شاید خود اُس کا اپنا سنگِ مزار ہے۔ لیکن فوراً ہی اُس نے سوچا نہیں میرے لئے تو اُس گمنام گاؤں کے باہر دو فٹ گہری کچّی قبر ہی کافی ہے۔ جس پر کسی نے ایک لکڑی کی صلیب کھڑی کرنے کی تکلیف نہیں گوارا کی اور وہ جو مرتے دم تک عیسائیت میں اعتقاد رکھتا تھا سوچنے لگا کہ مسیح کو بھی تو کوئی مقبرہ

نصیب نہیں ہوا تھا۔ جس گڑھے میں اس کی لاش کو پھینک دیا گیا تھا اس پر بھی تو کوئی صلیب نہیں لگائی گئی تھی۔ جو مصلوب ہوتے ہیں، سُولی پر چڑھائے جاتے ہیں، اُن کی ہی قبروں پر صلیب کی نشانی نہیں لگائی جاتی۔ شاید ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

ان ہی خیالات میں گم وُہ یو۔ این۔ او بلڈنگ کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ دھند میں ایک پولیس کانسٹیبل کا سفید دستانہ جھلملایا اور ایک کرخت آواز آئی "ٹھہرو۔ کہاں جاتے ہو؟"

"مجھے یُو۔ این۔ او میں جانا ہے" نوجوان مسافر نے بڑی ملائمت سے جواب دیا۔

"پاس ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں پاس تو نہیں ہے۔ لیکن میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔ بہت ضروری ہے ۔۔۔ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"ہٹ جاؤ ورنہ تمہاری زندگی اور موت کے سوال کا یہیں فیصلہ ہو جائے گا" یہ کہہ کر ہٹّے کٹّے کانسٹیبل نے لمبّے پتلے نوجوان کو ایک زور کا دھکّا دیا اور وُہ پتھریلے فٹ پاتھ پر گر پڑا اور اسی وقت ایک لمبی چوڑی موٹر اپنی تیز روشنیوں سے دُھند میں راستہ بناتی تیزی سے گذر گئی۔ یُو۔ این او بلڈنگ کی سمت میں اور نوجوان نے اندھیرے میں بھی پہچان لیا کہ اس موٹر پر جو جھنڈا لگا ہے وُہ اُن قاتلوں اور قصائیوں کا ہے جنہوں نے بلجیم کی بنی ہُوئی تین گولیاں اُس کی پسلیوں میں پیوست کر دی تھیں۔

فٹ پاتھ کے پتھر نکیلے اور سخت تھے۔ نوجوان کا سر اُن پر زور سے ٹکرایا اور اُس کو اپنے بدن میں پتھروں کی نوکیں چبھتی ہوئی محسوس ہُوئیں۔ لیکن کوئی خُون نہیں نکلا۔ جتنا خُون نکلنا تھا وُہ اس کے جسم سے پہلے ہی نکل چکا تھا۔

"اُٹھو" ۔ اندھیرے میں سے ایک نرم سی آواز آئی۔ ایسی ملائم جیسا کا لا مخمل

نوجوان نے اُٹھتے ہوئے سہارا لینے کے لئے ہاتھ سے ٹٹولا تو اس کی اُنگلیوں نے کسی عورت کے ٹخنوں کو چھُوا۔ گھبرا کر اُس نے ہاتھ کھینچ لیا اور "مجھے شما کرنا، بہن" کہتا ہُوا

اُٹھ کھڑا ہوا۔

"بہن ؟" اندھیرے میں سے آواز آئی۔ "تم نے مجھے بہن کہا ہے؟"

کھڑے ہو کر نوجوان نے دیکھا کہ دُھند کے دھوئیں میں لپٹی ہوئی ایک عورت کھڑی ہے جو شائد جوان ہے۔ لمبی سڈول ٹانگیں۔ اُونچا سکرٹ۔ کسا ہوا سینہ اور مُنہ میں ایک سگریٹ۔ جس کا جلتا ہوا نقطہ اندھیرے میں چمک رہا ہے۔

پھر اُس عورت نے وہ سگریٹ پھینک دیا اور بولی۔ ایسی آواز میں جس میں تعجب سے زیادہ دُکھ اور دُکھ سے زیادہ درد کا احساس تھا۔ "تم نے سچ مچ مجھے بہن کہا۔"

"ہاں۔" مُسافر نے جواب دیا کیونکہ اِس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ عورت کو بہن کہنے پر اتنا اچنبھا کیوں ہے۔

اور پھر ایک کھوکھلی سی ہنسی سُنائی دی۔ جیسے اُس عورت کو دفعتاً کوئی پُرانا لطیفہ یاد آگیا ہو۔ "اِس کمبخت دُھند کا اندھیرا ہے نا؟ اِسی لئے تُم دیکھ نہیں سکتے کہ مَیں کالی ہُوں کالی مگر اِس ٹھنڈے دھوئیں نے کالوں گوروں کو یکساں کر دیا ہے۔"

مسافر نے جواب دیا "بہن۔ مَیں بھی کالا ہوں۔"

"تم بھی کالے ہو؟ اِدھر شمال کے ہو یا جنوب کے۔"

"مَیں اِس دیش کا رہنے والا نہیں ہُوں۔ مَیں وہاں سے آیا ہُوں جہاں سے تُم لوگ آئے تھے؟"

"جہاں سے ہم لوگ آئے تھے؟" اُس عورت نے دھیرے سے دہرایا اور اِسے اپنے دِل کے تہہ خانے میں ننھی ننھی چاندی کی گھنٹیاں سی بجتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اُس نے پھر کہا جیسے یہ کوئی منتر ہو۔ "جہاں سے ہم لوگ آئے تھے؟"

اور مسافر کے جواب میں سختی اور تلخی تھی۔ "آئے نہیں تھے چُرا کر لائے گئے تھے۔"

کچھ دیر وہ ہاتھ پر ہاتھ آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ دُھند میں وہ دونوں خواب میں دیکھی ہوئی پرچھائیاں معلوم ہو رہے تھے اور اُن کے قدموں کی آواز بھی ایسی لگتی تھی جیسے دُوسری دُنیا سے

آ رہی ہو۔

وُہ بولی "خیریت ہوئی تُم نے بتادیا کہ تُم کالے ہو۔ نہیں تو ......" اور وُہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

"نہیں تو کیا ہوتا بہن؟"

اس اندھیرے میں مَیں تمہیں سفید چمڑی والا سمجھ کر خراب کرنے کی کوشش کرتی۔ تمہاری جیب خالی کرواتی اور اس کے بدلے میں اپنا روگ تمہیں دیتی۔"

"کیوں؟"

"اِس لئے کہ کئی برس سے میرا یہی پیشہ ہے۔ جو روگ مجھے سفید چمڑی والوں نے دیا ہے۔ وہ میں انہیں واپس دیتی رہتی ہُوں؟"

"کیوں؟"

"اِس لئے کہ مجھے ساری سفید قوم سے نفرت ہے؟"

"کیوں؟"

اور اب وُہ دفعتاً برس پڑی۔ "کیا کیوں کیوں کیوں کر رہے ہو؟" اگر تُم سچ مچ کالے ہو تو کیا تُم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ سفید چمڑی والوں سے نفرت کرنا ہم کالوں کے لئے قدرتی بات ہے؟"

"نہیں مَیں یہ نہیں مانتا بہن۔ اگر مَیں یہ مانتا تو یہاں کبھی نہ آتا اور مجھے یقین ہے تُم بھی نہیں مانتیں۔ صرف کسی تلخ تجربے کی بناء پر غصّے میں ایسا کہہ رہی ہو۔" مجھے بتاؤ تُم پر کیا گذری کہ تمہارا دل جو کبھی محبّت سے بھرا ہُوا تھا اب نفرت سے بھر گیا ہے؟"

وُہ ایک روشنی کے کھمبے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ دُور ریڈیو اِین۔ اد کی روشنیاں دُھند کے اندھیرے سمندر میں ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔

وُہ بولی "مَیں جوان نہیں ہُوں مگر اپنے پیشے کی وجہ سے جوان نظر آنے کی کوشش کرتی ہُوں

پورے اکتیس برس کی ہوں۔ مگر کبھی میں جوان تھی اور جنوب میں جیورجیا ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتی تھی۔ ہم نیگروؤں کی ایک الگ دُنیا تھی۔ ہمارا سکول علیحدہ تھا۔ ہمارا چرچ علیحدہ تھا۔ سفید چمڑی والوں کے ہاں ہم نوکری کرتے تھے لیکن اُنسے اور کوئی واسطہ ہمارا نہیں تھا۔ اُن کو ہم جھک کر ٹوپی اُتار کر سلام کرتے تھے، سر اور میڈم کہتے تھے۔ اکثر اُن کے مذاق اور نقرے بازی کا نشانہ بنتے تھے، کبھی کبھی ان کی گالیاں بھی کھاتے تھے۔ پھر بھی ہماری زندگی بُری نہیں تھی۔ اچھی خاصی تھی۔ مَیں سکول میں ہمیشہ اوّل آتی تھی۔ چرچ کے کوائر میں میری آواز سب سے اچھی سمجھی جاتی تھی۔ میرے ہم عمر نیگرو لڑکے میرے پیچھے دیوانے تھے۔ مگر میں صرف ہنری کو پسند کرتی تھی۔ اور اسی سے مَیں نے شادی کی۔ ہنری جو تمہاری طرح لمبا اور دُبلا تھا اور بجلی کی طرح بیس بال کھیلتا تھا اور جب وہ ہنستا تھا تو اس کے خوبصورت کالے چہرے پر اس کے سفید دانت موتیوں کی طرح چمکتے تھے ......" اور پھر وہ خاموش ہو گئی۔

"اور پھر؟"

"پھر کوریا میں جنگ شروع ہو گئی اور ہمارے سفید چمڑی والے مالکوں نے طے کیا کہ گو نیگرو اس قابل نہیں ہیں کہ ان کے ساتھ گرجاؤں میں عبادت کر سکیں یا ایک ہی سکول میں ان کے بچوں کے ساتھ پڑھ سکیں۔ یا اِن کے ساتھ ٹرین کے ایک ہی ڈبے میں سفر کر سکیں۔ لیکن وُہ اِس قابل ضرور سمجھے گئے کہ گورے سپاہیوں کے ساتھ جنگ کی بھٹی میں جھونک دیئے جائیں اور سو جب میں تیسرے مہینے پیٹ سے تھی ہنری کو ہزاروں میل دُور ایک اجنبی مُلک میں اُن لوگوں سے لڑنے بھیج دیا گیا جن سے اُس کی کوئی دُشمنی نہیں تھی۔ اُس نے ایک خط میں مجھے لکھا بھی کہ بڑے افسروں کے احکام کے مطابق ہم یہاں لڑ رہے ہیں۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ کس سے لڑ رہے ہیں اور کیوں لڑ رہے ہیں۔

پھر میرے دن پُورے ہو گئے اور مَیں ماں بن گئی اور میری گود میں ایک ننھا ہنری کھیلنے لگا۔ ابھی وہ دس دِن کا ہی تھا کہ واشنگٹن سے میرے نام تار آیا۔" ہم افسوس کے ساتھ

تمہیں اطلاع دیتے ہیں کہ تمہارا شوہر، ہنری سیتھر لنکن کوریا کے فرنٹ پر بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا......" اور سو میں اکیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی اور واشنگٹن والے افسوس کا اظہار ہی کرتے رہے۔ ننھا ہنری جونیر پیدا ہوتے ہی یتیم ہو گیا اور اس کے باپ کو کسی دور دراز ملک کی اجنبی "مٹی" میں گاڑ دیا گیا اور واشنگٹن والے ہر روز ایسے ہی تار بھیج بھیج کر امریکن عورتوں کو بیوہ اور امریکن بچوں کو یتیم بناتے رہے...."

مسافر نے کہا۔" اور یہ مائیں اور بچے جو بیوہ اور یتیم ہو گئے اُن میں سفید چمڑی والے بھی تھے اور کالے بھی۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔" لیکن آگے چل کر جو مجھ پر گزری وہ کسی سفید چمڑی والی عورت پر کبھی نہ بیتی ہو گی۔" کیا تمہارے پاس یہ سب سننے کے لئے وقت ہے؟"

مسافر نے جواب دیا۔" میرے پاس بہت وقت ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک وقت ہی وقت ہے۔ دراصل میرے پاس وقت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ دولت نہیں ہے۔ گھر نہیں ہے۔ نام نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جان بھی نہیں ہے۔ سو میں تمہیں وقت ہی دے سکتا ہوں۔"

"تو سنو" ۔ وہ بولی۔" بیوہ ہو کر میں نے اپنی ساری زندگی اپنے ننھے کی دیکھ بھال کے لئے وقف کر دی۔ اس لئے کہ وہ میرا بیٹا ہی نہیں تھا۔ وہ میرے پیارے، میرے شوہر کی پہلی اور آخری نشانی تھا۔ اس کو پالنے کے لئے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ ہوٹلوں میں برتن مانجھے۔ گھروں میں جھاڑو دی، فرشیں دھوئیں، سنڈاس صاف کئے۔ میں نے لانڈری میں کپڑے دھوئے، دس دس گھنٹے استری کی، رات رات بھر مشین چلا کر سلائی کی۔ تب جا کر ہنری جونیر کو سکول میں پڑھا پائی......"

اپنے بچے کے تصور میں وہ تھوڑی دیر کھوئی رہی۔ پھر دھیمی، محبت میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔" کتنا اچھا تھا میرا بیٹا ہنری۔ کتنا خوبصورت۔ دیوتاؤں کے مجسمے جیسا۔ سڈول جسم تھا اس کا۔ یہ بڑی بڑی کالی آنکھیں اور لکھنے پڑھنے میں اتنا تیز کہ نو برس کی عمر ہی میں پانچویں

دسویں میں پہنچ گیا تھا۔ سکول میں کھیل کود ہو، ڈرامہ ہو، تقریر کرنے کا مقابلہ ہو ہر ایک چیز میں وہ اوّل آتا تھا! اور پھر گورنمنٹ نے قانون پاس کر دیا کہ جنوب کی ریاستوں میں بھی نیگرو بچے گورے لوگوں کے سکولوں میں ساتھ پڑھیں۔ ہمارے قصبے میں سے سات بچے" چنے گئے کہ یہ سب سے پہلے گوروں کے سکول میں داخلہ کے لئے اپنے آپ کو پیش کریں گے۔ جس دن ہنری کو اس سکول میں داخلہ کے لئے جانا تھا وہ کتنا خوش تھا۔ صبح سویرے اُٹھا۔ اپنے کپڑوں پر خود استری کی۔ پھر جوتے پر پالش کیا۔ نہایا۔ بالوں میں تیل لگا کر کنگھی کی۔ پھر بستہ لے کر میرے ساتھ چل کھڑا ہوا۔ راستے بھر کہتا گیا" ماما تم بالکل نہ گھبرانا۔ میں بہت جلد گورے بچوں سے دوستی کر لوں گا۔ اور تم دیکھنا میں اس اسکول میں بھی اوّل آؤں گا۔ پھر تم بہت خوش ہو گی نا. ماما۔"

"مگر جب ہم سکول کے پاس پہنچے تو دیکھا سینکڑوں گورے لوگوں نے راستہ روک رکھا ہے اور اُن کے ہاتھوں میں بندوقیں ہیں، ریوالور ہیں، کلہاڑے اور ڈنڈے ہیں اور اُن کی آنکھوں میں ہم کالوں کے لئے نفرت ہے اور اُن کی زبان پر ہمارے لئے دُنیا بھر کی گالیاں ہیں۔۔۔ اور وہ گالیاں اتنی گندی تھیں کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے ہنری کے کان بند کر دئے۔ میں نے تو یہ حالت دیکھتے ہی کہا تھا۔ "چلو بیٹا گھر واپس چلیں، لیکن وہاں بہت سے نوجوان نیگرو آ پہنچے تھے جو اپنی قوم کے قانونی حق کو منوانے پر تلے ہوئے تھے اور نہ جانے کس وقت ہنری مجھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر ان سے جا ملا اور اب وہ لوگ سکول کی طرف بڑھ رہے تھے اور اُن کے آگے آگے میرا ہنری تھا اور اس کے ہاتھ میں اس کی کتابیں تھیں۔ بائبل اور امریکہ کی تاریخ اور لیمب کی لکھی ہوئی شیکسپیئر کی کہانیاں اور ایک کومک میگزین جس میں وہ پچھلی رات کو راکٹ سے چاند کی سیر کے بارے میں پڑھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا " ماما، ماما جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو راکٹ میں بٹھا کر تمہیں چاند کی سیر کو لے جاؤں گا۔۔۔۔"

اُس کی آواز اب آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی اور اس کی زبان سے ایک ایک لفظ

کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر نکل رہا تھا۔ "اب میرا ہنری کبھی چاند کی سیر کو نہیں جائے
وُہ کبھی امریکہ کی تاریخ نہیں پڑھے گا۔ شیکسپیئر کی کہانیوں کی کتاب جو اُسے ابراہیم لنکن کے بارے
میں تقریر کرنے پر ملی تھی ایک گورے غنڈے نے چھین کر پُرزہ پُرزہ کر ڈالی۔ اور اُس کی بائبل جس
میں اُس نے گلاب کا ایک پھول دبا کر نشانی کے لئے رکھا ہُوا تھا اُس کے بیچوں بیچ اب ایک
جلا ہُوا سُوراخ ہے۔ کیونکہ جب گوروں کی رائفلوں سے گولیاں برسیں تو میرے ہنری کے پاس اپنی
حفاظت کے لئے اِس بائبل کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور سو اُس نے اُسی کو اپنے سینے سے چمٹا لیا تھا۔
یہ بائبل جو میرے بچّے کی جان بچانے کے لئے ڈھال نہ بن سکی اب بھی میرے پاس ہے اور اُس
صفحے پر جہاں دس احکامِ خُداوندی درج ہیں ..... "اور تُو کسی کی جان نہیں لے گا"..... وہیں
میرے معصوم ہنری کے خُون کا دھبّہ لگا ہُوا ہے اور یہ خُون کا دھبّہ اُس بائبل ہی پر نہیں ہے
امریکہ کی تاریخ پر بھی ہے اور شیکسپیئر کی کہانیوں پر بھی ہے اور اس خُون کے دھبّے کو کوئی نہیں دھو
سکتا۔ وُہ جو سامنے یُو۔ این۔ او نام کی عالیشان لانڈری کھڑی ہے جہاں دُنیا بھر کے گندے
کپڑے لا کر دھوئے جاتے ہیں وُہ بھی اِس دھبّے کو نہیں دھو سکتی۔ صرف میرے انتقام کی آگ
اِس دھبّے کو دُور کر سکتی ہے اور یہ انتقام میں ہر گورے آدمی سے لیتی ہُوں جو میرے کالے
جسم کا خریدار بنتا ہے۔"

پھر وُہ خاموش ہو گئی اور ایسا محسوس ہُوا کہ ایک لمحے کے لئے دُنیا خاموش ہو گئی ہے
پُل پر سے بجلی کی ریل بغیر آواز کے گُزر گئی۔ سڑک پر جانے والی موٹریں روشنی کے خاموش دھبّوں
کی طرح دھند میں تیرتی رہیں۔

نوجوان مسافر نے ٹٹول کر کالی عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہمدردی کی ایک دھیمی
میٹھی رَو ایک ہاتھ سے دُوسرے میں بہتی رہی اور پھر اُس نے کہا "بہن میں تمہارا درد سمجھتا ہُوں۔
لیکن اِس انتقام کی آگ سے تمہارے بچے کے خُون کا داغ نہیں مٹیگا۔ اِس لئے کہ وُہ داغ تو
اِس بائبل پر نہیں ہے تمہارے دِل پر ہے۔ میرے دِل پر ہے ہر اُس انسان کے دِل پر ہے

جو سچے معنوں میں انسان ہے۔"

"تو اس کا علاج؟" عورت نے پوچھا۔

"مجھے یو۔این۔او کے دروازے تک پہنچا دو۔"

"تم کیا ہو، تمہاری کیا اہمیت ہے جو تم وہاں جاکر دُنیا کی کایا پلٹ کر دو گے۔ بڑی بڑی تقریریں کرنے والے وہاں بہتیرے ہیں۔"

مسافر نے ایک ایک لفظ سمجھا کر ادا کرتے ہوئے کہا جیسے کسی بچے کو سبق پڑھا رہا ہو۔

"میں — نہیں — ہوں — اور — یہی — میری — اہمیت — ہے۔"

عورت بولی۔ "میں تمہاری باتیں نہیں سمجھتی۔ پر تم کوئی بھلے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ نہ جانے تم سے باتیں کرکے مجھے ایک عجیب شانتی سی محسوس ہو رہی ہے۔ جیسے کسی نے میرے من میں بھرا ہوا زہر نکال دیا ہو۔ چلو میں تمہیں وہاں پہنچا دیتی ہوں۔"

اس بار کانسٹیبل نے پھر انہیں روکا اور کہا "یو۔این۔او کی طرف کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ وہاں بلوے کا ڈر ہے۔" مگر عورت نے بازاری لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا "میں تو اُدھر ہی رہتی ہوں، انسپکٹر۔ بلیک بیپی کے رنڈی خانے میں۔ تیرھویں سڑک کے نکڑ پر۔ یو۔این۔او کے بالکل پچھواڑے۔"

"اچھا تو فقط تم جا سکتی ہو۔" کانسٹیبل نے پسیجتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ کون ہے تمہارے ساتھ؟"

"یہ تو میرا گاہک ہے، انسپکٹر اور وہ بھی آج رات کو ایک غریب کالا ہی ملا ہے۔" اور پھر اپنی آواز میں پیشہ دارانہ مٹھاس گھول کر بولی۔ "میرا دھندا مت خراب کرو، انسپکٹر، پلیز!"

اور سو انہیں یو۔این۔او کی طرف جانے کی اجازت مل گئی۔

اندر جانے سے پہلے اُس نوجوان مسافر نے عورت سے کہا۔ "اس زہریلی دُھند میں ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے۔ اگر روشنی میں کبھی ملیں گے تو پہچان بھی نہ پائیں گے۔ لیکن ہمیں ایک دوسرے سے تعارف کی ضرورت نہیں۔ ایک دوسرے کا نام نشان جاننے کی ضرورت نہیں

میں تمہارا شکریہ بھی نہیں ادا کروں گا کیونکہ ہم دونوں ایک ہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں میں ہوں اور تم تم ہو۔"

"میں ایک جاہل سیدھی سادھی عورت ہوں۔" اُس نے کہا۔ "تمہارا یہ سب فلسفہ نہیں سمجھ سکتی۔ مجھے کوئی نشانی دو تاکہ میں تمہیں یاد رکھ سکوں۔"

"تو یہ لو۔" اور اُس نے ٹٹول کر عورت کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا دھات کا ٹکڑا رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ وُہی گولی ہے جو بائبل کے صفحوں کو اور گلاب کی پنکھڑیوں کو چیرتی ہوئی تمہارے بیٹے کو لگی تھی۔ اس گولی سے کل مجھے قتل کیا گیا ہے۔"

اور یہ کہہ کر وُہ دھند میں غائب ہو گیا۔ شائد یو۔این۔او کی بلڈنگ کے اندر چلا گیا۔

کالی عورت دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ اُس گولی کو اپنی اُنگلیوں سے چھُوتی رہی۔ پھر اُس نے بڑے پیار سے گولی کو اپنے گال سے لگایا۔ کیونکہ اسمیں لگے ہوئے خُون میں سے اسے اپنی چھاتیوں سے نکلے ہوئے دُودھ کی مہک آ رہی تھی۔

پھر وُہ وہاں سے مُڑی اور چلی گئی۔ لیکن یہ وُہ راستہ نہیں تھا جو بلیک بیلٹ کے رنڈی خانے کو جاتا ہے۔

(۴)

دروازے پر جہاں پاس چیک کئے جا رہے تھے۔ دربان نے پُوچھا۔ "ڈیلی گیٹ؟"

نوجوان مسافر نے جواب دیا۔ "ہونا تو چاہیئے تھا مگر ہُوں نہیں۔ میری جگہ کوئی اور بیٹھا ہُوا ہے۔"

"تو آپ اس دروازے سے جائیے۔ ادھر سے صرف ڈیلی گیٹ جا سکتے ہیں۔"

دُوسرے دروازے پر اُس سے سوال کیا گیا ۔ "پریس ؟ کیا آپ کورسپونڈنٹ ہیں ؟"
اور وُہ جو کبھی ایک انقلابی اخبار نکالتا تھا بولا "ہاں یہی سمجھئے ۔ مجھے یہاں کی خبر بہت دُور تک بھیجنی ہے ۔"

"تو آپ پہلے پریس رُوم میں جاکر پریس کارڈ حاصل کیجئے ۔ تب ہی اندر جا سکتے ہیں ۔"

پریس رُوم خالی تھا ۔ میزوں پر ٹیبل لیمپ جل رہے تھے ۔ مگر ان کی روشنی میں رپورٹ لکھنے والا کوئی نہیں تھا ۔ ٹائپ رائیٹر کھلے ہوئے بیکار پڑے تھے ۔ ہر ایش ٹرے میں مختلف (براندڈ) کے سگرِیٹوں کی لاشیں پانی میں پڑی گل رہی تھیں ۔ امریکن کیمل اور رُوسی ٹرد کا ایک ہی ایش ٹرے میں پڑے تھے مگر دونوں بجھے ہوئے تھے ۔ ایک لمبی میز پر دُنیا بھر کے اخبار جو اُسی دِن ہوائی ڈاک سے وصول ہوئے تھے ، پھیلے ہوئے تھے ۔

لندن کا ٹائمز
نیُویارک کا ٹائمز
ماسکو کا پراودا
ٹوکیو کا جاپان ٹائمز
پیکنگ کا نیُو چائنا ڈیلی
قاہرہ کا الجمہوریت
بمبئی کا ٹائمز آف انڈیا
برما کا رنگون ٹائمز
سیلون کا سیلون آبزرور

اور اِن میں سے ہر ایک کے پہلے صفحے پر بڑے بڑے کالے ٹائپ میں ایک ہی خبر تھی ، ایک آدمی کی موت کی خبر اور اس خبر کے ساتھ ہر ایک پرچے میں مرنے والے کی تصویر تھی ۔ اور نوجوان مسافر جو میز پر پڑے ہوئے اخباروں کو اُلٹ پلٹ رہا تھا ہر جگہ وہی ایک تصویر

دیکھ کر شرما سا گیا کیونکہ وہ خود اُس کی تصویر تھی۔

اُس نے زیرِ لب بڑبڑا کر اپنے آپ سے کہا۔ "میں نہیں ہوں مگر میں یہاں ہوں میں ہر جگہ ہوں۔"

اور اُسی وقت ایک آواز پریس رُوم کے سنّاٹے میں گُونجی "آج ہمیں شرم سے سر جھکا لینا چاہیئے۔" یہ ہندوستان کے ڈیلی گیبٹ کی آواز تھی۔ جو یُو۔این۔ او کے بڑے ہال سے ریلے ہو کر لاؤڈ سپیکر پر سُنائی دے رہی تھی۔

اور پھر کسی نے میز پر زور سے ہاتھ پٹخ کر کہا۔ "جن سامراجیوں نے یہ قتل کرایا ہے وہ آج آئیں اور جواب دیں" یہ سویت ڈیلی گیبٹ کی آواز تھی۔

"کیا ہمارے برِّاعظم میں ہر ملک کو سامراج سے آزاد ہونے کیلئے خُون کی ندیاں بہانی پڑیں گی۔ کیا ہماری ہر قوم کو ایسے سپوتوں کی قُربانی دینی ہوگی؟" یہ افریقہ کے ایک چھوٹے سے مُلک کے ڈیلی گیٹ کی آواز تھی۔

"ہمیں اِس قتل کی خبر سُنکر واقعی از حد دُکھ اور صدمہ ہوا ہے۔" یہ امریکہ کے ڈیلی گیٹ کی آواز تھی۔

"اور نوجوان مسافر نے سُنکر سوچا" وہ کم عقل سمجھتے تھے کہ تین گولیوں سے میری آواز ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جائے گی"

لاؤڈ سپیکر پر آوازیں آتی رہیں اور پریس رُوم کے سنّاٹے میں گونجتی رہیں مگر اب مسافر کو دفعتاً یہ احساس ہوا کہ اِس کمرے میں وہ اکیلا نہیں ہے۔ دُور کونے میں ایک میز پر سر رکھے کوئی سو رہا ہے۔ وہ اُس کے قریب گیا تو دیکھا ایک سانولے رنگ کا نوجوان ہے جو شاید نشے میں مدہوش ہے کیونکہ میز پر ایک گلاس رکھا ہے جس میں وہسکی کے صرف چند قطرے باقی ہیں اور میز کے نیچے وہسکی کی ایک بوتل رکھی ہے جو تقریباً خالی ہے۔

لاؤڈ سپیکر پر کسی ڈیلی گیٹ کی آواز گونجی "اِن تین گولیوں کی گُونج ساری دُنیا میں سُنائی دیگی۔ اِس دھماکے سے بہروں کے کان کھُل جانے چاہئیں، سوتوں کو جاگ جانا چاہیئے۔۔۔"

سانولے رنگ کا نوجوان شاید یہی آواز سُنکر چونک پڑا۔ نشے سے چُور نظروں سے اُس نے کچھ دیر اُس کالے اجنبی کی طرف گھُورا، پھر لاؤڈ سپیکر کی طرف مُڑ کر دیکھا۔

جواب انگریز ڈپٹی گیبٹ کی شستہ گھلی ہوئی آواز میں اعلان کر رہا تھا "ہمیں اس موت کا از حد دلی افسوس ہوا ہے۔ ہمیں کانگو میں امن قائم کرنے کے لئے پوری کوشش کرنی چاہیئے اور دونوں طرف سے جو تشدد ہو رہا ہے اُسے روکنا چاہیئے۔"

"دونوں طرف سے؟" کالے لمبے نوجوان نے ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ دہرایا۔

"ایک طرف نے گولیاں چلائیں۔ دوسری طرف نے اپنے جسم سے اِن گولیوں کو روکا۔ تشدد دونوں طرف سے ہوا ہے۔ قصور دونوں کا ہے۔"

اور اب ایک اور ڈپٹی گیبٹ کہہ رہا تھا۔

"ہمیں کانگو میں امن قائم کرنے کے لئے فوراً ایک ریزولیوشن پاس کرنا چاہیئے۔"

"بند کر دیہ بکواس" چلّاتا ہوا سانولا نوجوان نشے میں لڑکھڑاتا ہوا لاؤڈ سپیکر تک گیا۔ اُس کا سوچ دبا کر بند کر دیا اور چلّایا۔ ریزولیوشن۔ تقریریں۔ بیانات۔ ہمدری۔ الفاظ دھواں سب بکواس۔ ریاکاری۔ نامردی" پھر وہ دفعتاً چپ ہو گیا۔ اب پریس روم میں مکمل سنّاٹا تھا۔ صرف دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی ٹِک ٹِک تھی اور وہ دونوں تھے۔ صرف وقت تھا اور دو انسان ایک کالا ایک سانولا۔

"تم کون ہو؟" سانولے نوجوان نے قریب جا کر پوچھا۔ نشے سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں۔ "تم کون ہو؟ کیا ہو؟ کیوں ہو؟"

کالے نوجوان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نہیں ہوں۔ کل تک میں تھا۔ آج میں نہیں ہوں۔"

"تم نہیں ہو؟ بڑے مزے میں ہو، بھائی۔ آج کل جو نہیں ہیں وہی خیریت سے ہیں، اگر بدقسمتی سے تم ہوتے تو تمہیں بھی تین گولیاں مار دی جاتیں۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"تم کچھ نہیں جانتے۔ اگر جانتے تو تم یہاں نہ آتے یہ جگہ جو دنیا کی اُمیدوں کا مقبرہ ہے

جہاں ہر روز امن اور آزادی کو بڑے اہتمام کے ساتھ دفن کیا جاتا ہے۔"

"پھر بھی تم یہاں آئے ہو۔ پھر بھی تم یہاں ہو؟" اور یہ کہہ کر کالے نے مسکرا کر سانولے کی طرف دیکھا۔

اور سانولے نے وہسکی کے آخری قطرے زہر کی طرح حلق میں انڈیل کر جواب دیا "میری بات اور ہے۔ میں ہندوستانی ہوں۔ دوسرے لفظوں میں میں بھولا ہوں۔ بیوقوف ہوں۔ اُلّو ہوں۔ اِس کے علاوہ میں نشے میں ہوں اور نشہ مجھ میں ہے۔ سوہنی اُلّو ہوں۔ اُلّو کی دُم فاختہ ہوں۔ وہ فاختہ نہیں جو امن کے نیلے جھنڈوں پر اُڑتی ہے۔ یہ ایک دوسری چڑیا ہے جسے ہم پر کھینچ کر کے پنجرے سے باہر نکال دیتے ہیں اور کہتے ہیں اُڑ ری فاختہ اُڑ۔ مگر اُس کے پر تو کٹے ہوئے اور بے جان ہوتے ہیں۔ سو وہ بیچاری اُڑ نہیں پاتی۔ صرف پھڑپھڑاتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ کوئی بلّی یا کتّا ــــ کوئی بھیانک بُل ڈاگ ــــ یا کوئی عقاب ایک پنجے میں تیر اور دوسرے میں پھول لئے ــ آتا ہے اور ایک جھپٹے میں بی فاختہ کا نوالہ بنا لیتا ہے۔۔۔۔۔

"کیا سمجھے؟ کچھ نہیں سمجھے نا؟ کوئی تعجّب کی بات نہیں۔ میں خود بھی کچھ نہیں سمجھا۔ دراصل اِس میں سمجھنے کی بات ہی کوئی نہیں ہے۔ ویسے بھی ہم ہندوستانی سمجھ بوجھ سے زیادہ جذبات سے کام لیتے ہیں۔ ہمارے بارے ہی میں ہمارے ایک شاعر نے کہا ہے 'سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'۔ خود ہمیں درد گردہ بھی ہو تو ہم علاج کے لئے چورن کی ایک پھنکی کو کافی سمجھتے ہیں لیکن آرکٹک کے کسی اسکیمو کو دانت کا درد ہو جائے تو ہم ساری دُنیا کے اور ساتھ میں اپنے دانت توڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ جذباتیت کے علاوہ ہماری دوسری خصوصیات ۔ خوش فہمی ہے۔ کوئی بھیڑیا بھی بھیڑ کی کھال اوڑھ کر آ جائے تو ہم اُسے پچکارتے پچکارنے نہ صرف گود میں لینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ بلکہ "بھیڑیا زندہ باد" کے نعروں سے اُس کا سواگت کرتے ہیں۔ ہم ہی ہیں جنہیں ہر کالے بادل میں روشنی کی کرن نظر آتی ہے۔ جادو اور روحانی قوتوں میں ہمارا اعتقاد اتنا پکّا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ایک منتر پھونکنے سے توپیں پھول اُگلنے لگیں گی۔

ہر ایٹم بم رس بھرے اناناس میں تبدیل ہو جائے گا اور غرّاتا ہُوا ہر شیر ببر ،مَیں میں کرتی ہوئی بکری بن جائے گی۔ سو ہم ہندوستانیوں کا آورد حانی ہیڈ کوارٹر ہے یُو۔ این۔ امکا یہ جادو گھر۔ اب سمجھے مَیں یہاں کیوں ہُوں اور کیا کر رہا ہُوں۔"

"سمجھ گیا" کالے بھٹے نوجوان نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اور کیونکہ تُم یہاں ہو اِسی لئے مَیں یہاں ہُوں۔ ورنہ مَیں بھی یہاں نہ ہوتا۔ دراصل مَیں اور تُم دو نہیں ایک ہی ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ مَیں نہیں ہُوں اور تُم ہو۔"

"نہیں سمجھا کچھ نہیں سمجھا۔ نشہ اُترتا جا رہا ہے نا؟ اِس لئے چلو ایک وہسکی کی بوتل اور کہیں سے لائیں۔ آج شراب پینا میرے لئے بہت ہی ضروری ہے۔ کیونکہ مجھے بہت کچھ بُھلانا ہے۔ یہ بُھلانا ہے کہ کہیں تین گولیاں چلی ہیں۔ کہیں کسی کا قتل ہو گیا ہے اور جس کا قتل ہو گیا ہے وہ ایک آدمی نہیں تھا ایک قوم تھا، ایک بر اعظم تھا، ایک اصُول تھا، ایک نظریۂ حیات تھا۔ تین گولیاں چلیں اور وہ ختم ہو گیا۔ وہ سب ختم ہو گیا۔ تین گولیاں۔ تین گولیاں! اور اِن تین گولیوں کے دھماکے میرے کانوں میں گُونج رہے ہیں۔ آج سے نہیں بیالیس برس سے۔ سمجھے تُم میرے بھائی۔ بیالیس برس سے۔ حالانکہ میری عُمر صرف اکتالیس برس اور چند مہینے کی ہے۔۔۔۔۔"

(۵)

اور کالے بھٹے نوجوان کی آنکھوں میں اپنے سانولے ساتھی کے لئے اتنی ہمدردی تھی اتنا پیار تھا، اِتنا لگاؤ اور اپنا پن تھا کہ اُس سے باتیں کر کے ہندوستانی کو یہی محسوس ہُوا جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

"تم نے ہمارا مُلک ہندوستان نہیں دیکھا نا۔ سچ پُوچھو تو کوئی خاص بات نہیں ہے جھوٹا

شمال کے جس علاقے کا میں رہنے والا ہوں سینکڑوں میل تک سپاٹ میدان۔ نہ سرسبز پہاڑیاں نہ جھیلیں نہ جنگل۔ بس کھیت ہی کھیت۔ لیکن بہار کے موسم میں اِن کھیتوں میں جب سرسوں کے پھول کھلتے ہیں تو ہمارا سارا علاقہ بسنتی رنگ کا ایک طلسمی قالین بن جاتا ہے جو قدرت نے زمین پر بچھا دیا ہے اور پھر ایک دن آتا ہے جب بہار کے اِس موسم کا سواگت کرنے کے لئے ساری دُنیا ہی بسنتی رنگ میں رنگی جاتی ہے اور ہر من میں سرسوں کے پھول کھل اُٹھتے ہیں۔ بیالیس برس ہوئے اسی تہوار کا دِن تھا جب میرے باپ نے میری ماں سے میلے میں چلنے کو کہا۔ مَیں نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ صرف اُس کے بارے میں سُنا ہے کہ چھ فُٹ کا قد تھا۔ بڑی بڑی مُوچھیں تھیں۔ دھُوپ میں سنولایا ہُوا چہرہ تھا۔ بڑی بھاری آواز تھی اور جب وُہ ہنستا تھا تو معلوم ہوتا تھا زلزلہ آ رہا ہے۔ ہاں تو میرے باپ نے میری ماں سے میلے میں چلنے کو کہا اور یہ سُن کر وُہ خُوش ہوگئی اور جلدی جلدی اُس نے میلے میں جانے کے لئے سرسوں کے پھُولوں کے رنگ کا زرد جُوڑا پہن لیا۔ میری دادی نے منع بھی کیا "کہ بہُو کو ساتواں مہینہ ہے اِسے باہر نہ لے جا۔" لیکن میرے باپ نے ہنس کر ٹال دیا "ماں تمہاری بہُو کو میلہ دِکھانے ہی تو لے جا رہا ہُوں کہیں لام پر گولیوں کی بوچھاڑ میں تو نہیں لے جا رہا۔"

"میرا باپ کسی زمانے میں کھیتی کرتا تھا۔ باپ دادا کے زمانے سے اپنی زمین تھی لیکن دھیرے دھیرے زمین ساہُوکار کے قبضے میں چلی گئی تھی اور پھر میرے بابا انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہو کر جرمنوں کے خلاف لڑنے لام پر چلے گئے تھے اور سُنا ہے کہ وہاں بڑی بہادری اور بے جگری سے لڑے تھے۔ کئی بار زخمی بھی ہوئے تھے اور اِس کے بدلے میں انہیں بہت سے میڈل انعام ملے تھے اور صُوبیدار کا عہدہ بھی ملا تھا۔ مگر واپسی پر اُنہوں نے فوج سے استعفیٰ دے دیا تھا اور چھوٹی سی زمین لے کر اُس پر پھر سے کاشت کرنے لگے تھے۔ لیکن اب بھی وُہ باہر جاتے وقت اپنا فوجی کوٹ ضرور پہن لیتے تھے۔ وُہ کوٹ جس پر اُن کے زخموں کے لہُو کے دھبے لگے ہوئے تھے اور جس کی داہنی جیب پر تین تانبے کے تمغے جگمگاتے تھے۔ ہاں تو لوگوں کا کہنا ہے

کہ میرے بابا اپنی بیوی کو لے کر جب میلے میں پہنچے تو اپنے میڈل لگے ہوئے کوٹ اور طرّے دار خاکی پگڑی میں بہت ہی شاندار لگ رہے تھے۔ میں وہاں موجود نہیں تھا مگر شاید تھا بھی۔ کیونکہ گو میں اِس دُنیا میں ابھی پیدا نہیں ہُوا تھا لیکن اپنی ماں کے پیٹ میں پیدا ہو چکا تھا۔"

میرے بابا اپنی بیوی کو میلہ گھماتے رہے اور اُنہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ اُس باغ کے باہر جہاں وُہ میلہ ہو رہا تھا فوجی لاریاں ہتھیار بند سپاہیوں کو لا لا کر اُتار رہی ہیں۔

میرے بابا اور ماں میلے کی دُکانوں پر ٹھنڈی لسّی پیتے رہے اور چٹ پٹے پکوڑے کھاتے رہے اور اُنہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ایک لال مُنہ کا انگریز افسر فوجیوں کو رائفلوں میں گولیاں بھرنے کا آرڈر دے رہا ہے۔

اور پھر میرے بابا نے اپنے ہونے والے بچّے کے لئے ایک چاندی کا جھنجنا خریدا اور ایک لال سبز رنگ کی گیند خریدی اور اس کے چُوسنے کے لئے چُسنی خریدی اور یہ سب سامان میری ماں کے آنچل میں ڈال دیا اور میری ماں نے خُوشی کے مارے شرما کر نگاہیں جھکا لیں . . . . . اور اسی وقت کئی سو سامراجیوں فوجیوں نے اور ان کے لال مُنہ والے گورے افسروں نے میلے میں آئے ہوئے سارے مجمع کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور باہر نِکلنے کے ہر راستے کو روک کر کھڑے ہو گئے۔

اور پھر میرے بابا اور ماں بچوں کے کپڑوں کی دوکان پر رُک گئے اور ماں نے کہا میں تو اپنی بچّی کے لئے لال ریشم کا فراک لُوں گی اور بابا نے کہا۔ بچّی نہیں ہو گی بچہ ہو گا اور وُہ لال ریشم کا فراک نہیں پہنے گا۔ فوجی مردوں جیسی خاکی قمیض پہنے گا . . . . .

اور میری ماں شرما کر دھیرے سے کہتی رہی بچّی ہو گی . . . . .

اور میرے بابا دھاڑ کر کہتے رہے بچّہ ہو گا جی . . . .

اور اِس لمحے میں گولیوں کی بوچھار شروع ہو گئی۔ مگر میرے بابا سمجھے بادل گرج رہے ہیں اور اُنہوں نے دوکان سے نِکل کر آسمان کی طرف دیکھا . . . اسی دم ایک گولی سنساتی ہوئی

آئی اور اِن کے سینے پر لگے ہوئے میڈل کو چیرتی ہوئی اُن کے پھیپھڑوں میں اُتر گئی ......
اور حالانکہ میں اُس وقت پیدا نہیں ہوا تھا لیکن میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اُس گولی کا تڑاخہ آج تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔

جب میں بڑا ہوا تو میں نے اپنی ماں کی زبانی جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام میں اپنے بابا کی موت کی کہانی سُنی۔ جب میں سکول میں پڑھنے گیا تو میرے دماغ میں وہ گولی سناتی رہی اور میں سوچتا رہا کہ میں اپنے باپ کے خون کا بدلہ کیسے لوں۔

پھر جب میں سکول سے کالج میں گیا تو ایک دن لائبریری میں میں نے آئرلینڈ کے اِنقلاب کے شہیدوں کے بارے میں ایک کتاب پڑھی جس میں ڈونلڈ جان اوکونر کے کردار نے مجھے بہت ہی متاثر کیا۔ وُہ ایک معمولی کسان تھا جس کی اپنی زمین بھی نہیں تھی۔ دِن کو وُہ ایک زمیندار کے آلوؤں کے کھیت میں کام کرتا تھا اور رات کو انقلابی تحریک میں ہرکارے کا کام کرتا تھا۔ اُسے جب گرفتار کیا گیا تو پولیس کو یقین تھا کہ اُس کو مار پیٹ کر اُس سے سارے اِنقلابیوں کے نام اور پتے معلوم ہو جائیں گے۔ مگر اُن کو معلوم نہیں تھا کہ وُہ آئرش کسان کس فولاد کا بنا ہوا ہے۔ اُنہوں نے اِسے کوڑے مارے، اس کو ٹکٹکی پہ باندھ کر اسے ایذا پہنچائی، راتوں کو اسے سونے نہیں دیا۔ کال کوٹھڑی میں اکیلا بند رکھا لیکن اُس کی زبان نہ کُھلی اور پھر ایک دِن پولیس نے اس کی لاش کو اس کے رِشتے داروں کے حوالے کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ وُہ جیل سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ ایک وارڈر کی گولی سے وُہ مارا گیا۔ پر یہ پچاس برس پہلے کا قصّہ ہے۔ لیکن آج اوکونر جیسے لوگ کہاں ہیں؟"

اور کالے لمبے نوجوان نے اپنے ہندوستانی ساتھی کے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا۔
"اوکونر ہر ملک اور ہر قوم میں ہمیشہ پائے جاتے ہیں۔ ایک اوکونر سے تو میں آج ہی مِلا ہوں ڈونلڈ جان اوکونر کے پوتے سے۔ وُہ نیویارک میں ٹیکسی چلاتا ہے اور اپنے دادا کی طرح اب بھی ہر انقلابی تحریک کا ساتھ دینے کو تیار ہے۔ مگر تم اپنی سُناؤ کہ تم ہندوستانی ہو کر

جو سُناہے کرم یوگی ہوتے ہیں، عمل کے پُجاری ہوتے ہیں۔ کیسے اِتنے نراش اور بے ہمّت ہو گئے۔"

"تو سُنو۔ مَیں نے پڑھ لکھ کر فیصلہ کیا تھا کہ مَیں ایک آزاد اخبار نویس کی حیثیت سے ایک ایسی دُنیا کی تشکیل کے لئے جدّوجہد کروُں گا جس میں کسی بچّے کے باپ کو سینے پر گولی نہ کھانی ہو گی جس میں کسی بچّے کی ماں بیوہ نہ بنائی جائیگی۔ لیکن جب میرے دیش میں آزادی آئی تب بھی گولیوں کی منحوس سنسناہٹ میرے کانوں میں گونجتی رہی اور یہ گولیاں سامراج کے ہتیاروں کے کارخانوں میں تیار ہوئی تھیں لیکن اِن کو چلانے والے ہم خود تھے جو ایک دُوسرے پر فائر کر رہے تھے۔ ایک دُوسرے کے گھر لُوٹ رہے تھے اور جلا رہے تھے، ایک دُوسرے کی عورتوں کی بے عزّتی کر رہے تھے اور پھر تین گولیاں چلیں اور ہم نے اپنے ہاتھوں سے اپنے باپ کو مار ڈالا، آزادی کا گلا گھونٹ دیا اور ہمیشہ کے لئے اپنے پر خوُن کا کلنک لگا لیا۔"

اُنیس سو سینتالیس کے واقعات کے بعد مجھ سے اپنے وطن میں نہ رہا گیا۔ دُنیا بھر میں مارا مارا پھرتا رہا۔ کارسپانڈنٹ کی حیثیت سے دُوسرے دیشوں میں گیا۔ وہ دیش جو میرے مُلک کی طرح ابھی آزاد ہوئے تھے یا ہو رہے تھے۔ سویَں کوریا گیا اور وہاں مَیں نے دیکھا کہ ہزاروں امریکن سپاہی۔ گورے اور کالے اپنے دیش سے ہزاروں میل دُور اِس اجنبی مُلک میں جنگ کر رہے تھے تاکہ ایشیا کے نئے آزاد مُلک ڈالر کی سلطنت سے باہر نہ جا سکیں اور وہاں ایک دِن جب مَیں ایک اور ہندوستانی کارسپانڈنٹ وجے شنکر کے ساتھ فرنٹ سے لوٹ رہا تھا ہماری جیپ کے نیچے ایک سُرنگ پھٹی۔ یہ سُرنگ امریکہ میں ڈیٹرائٹ کے قریب ایک فولاد کے کارخانے میں بنائی گئی تھی اور امریکن سپاہیوں نے اِسے جنوب مغربی ایشیا کی اِس خوبصورت اور سرسبز و شاداب سرزمین میں بویا تھا جیسے دھان کا بیج بویا جاتا ہے۔ اور پھر "غلطی" سے یہ سُرنگ ہماری جیپ کے نیچے پھٹ پڑی تھی اور میرا پیارا دوست چوبیس سالہ وجے شنکر جو کیرلا کی ایسی ہی خوبصورت سرزمیں کا رہنے والا تھا۔ جس کی طرف

چھ مہینے ہوئے شادی ہوئی تھی، اور جو اپنی زندگی میں پہلی جنگ کو رپورٹ کرنے آیا تھا جو ہر وقت ہنستا رہتا تھا اور جو اس وقت بھی جب موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی ملیالم کے ماہی گیروں کا ایک گیت گا رہا تھا اور اس کے معنی مجھے بتاتا جا رہا تھا ——

یہ میرا جال ——

یہ میرا سُنہری جال ——

بہت دُور تک میں اِسے پھینکوں گا ——

یہ جال بیشک سمندر کی تہہ تک جائے گا۔

اور لال پیلی ہری مچھلیوں کو سمیٹ کر لے آئے گا۔

مگر کہاں ہے وہ جل پری ——

وہ میری جل پری ——

جو ناریل کے پیڑ کی طرح اُونچی ہے۔

اور جس کا بدن مچھلی کی طرح چکنا اور......

مگر اِس کے آگے یہ گیت کیا کہتا ہے میں آج تک نہ معلوم کر سکا۔ کیونکہ شنکر یہیں تک گا پایا تھا کہ وہ منحوس دھماکہ ہوا اور پھر ہماری جیپ نہیں تھی۔ صرف لوہے کے چند جلتے ہوئے ٹکڑے دھان کے کھیت میں پڑے تھے۔ کوٹائم کا رہنے والا جو شنکر نہیں تھا اور ہمارا کورین ڈرائیور منگ سان نہیں تھا۔ جلے ہوئے گوشت کے چند گمنام لوتھڑے خون میں لت پت زمین پر پڑے تھے۔ مگر تقدیر کے کسی شعبدے سے میں صرف زخمی اور بیہوش ہوا تھا۔ اور جب مجھے ہوش آیا تو میں ہسپتال میں پڑا تھا اور میرے برابر کے بیڈ پر ایک نوجوان امریکن نیگرو بے ہوشی میں بڑبڑا رہا تھا۔ صرف ایک لفظ بار بار دُہرا رہا تھا۔ "نو۔نو۔نو۔ نو نو" کبھی وہ گڑگڑا کر کہتا تھا "نو۔نو۔نو" جیسے اپنی جان کی بھیک مانگ رہا ہو۔ کبھی چلّا کر کہتا تھا "نو۔نو۔نو۔" جیسے کسی بڑی طاقت کو للکار رہا ہو۔ کبھی صرف سیدھے سادھے انداز میں دھیرے سے کہتا تھا "نو۔نو۔نو" جیسے کسی پارٹی میں کیک کا دوسرا ٹکڑا لینے سے اِنکار

کر رہا ہو۔

"میں نے اپنے بیڈ کی دُوسری طرف والے پڑوسی سے پُوچھا اس نیگرو جوان کو کیا ہو گیا ہے جو یہ بیہوشی میں بھی" نو۔نو۔نو" بڑبڑا رہا ہے۔ جس سے میں نے سوال کیا تھا وُہ ایک لال مُنہ کا ہٹا کٹا ادھیڑ عمر کا سارجنٹ تھا جو بقول خُود اُسی کے سفلس "جنگی مرض" کا علاج کرانے داخل ہُوا تھا۔ وہ بولا۔" یہ نیگرو بلیڈی کاورڈ ہے۔ ایک دم بُزدل۔ فرنٹ پر جب اس کی پلاٹون کو حملے کا حُکم دیا گیا تو یہ دُم دبا کر بھاگ رہا تھا، کہتا تھا آخر ہم کیوں کوریا والوں کےخلاف جنگ کر رہے ہیں۔ وُہ تو خیریت ہوئی اس کے سارجنٹ نے وقت پر سنبھال لیا ورنہ ساری پلاٹون باغی ہو جاتی ...."

"اور پھر کیا ہُوا؟" میں نے اس لال مُنہ والے سارجنٹ سے پُوچھا اور وُہ اپنے مُنہ میں سے چیونگ گم تھُوکتے ہوئے بولا۔" ہوتا کیا۔ یُونہی نو نو نو بک رہا تھا جب اس کے سارجنٹ نے فوجی قانون کے مطابق اُسے گولی مار دی۔ ایسے باغیوں کو نہ جانے کیوں یہ ڈاکٹر بچانے کی کوشش کرتے ہیں؟" اور یہ کہہ کر وُہ بڑے انہماک سے پھر اپنا میگزین پڑھنے لگا۔ جس کے اُوپر ایک تین چوتھائی ننگی عورت سر پر انکل سام والا ویسا ہی اُونچا ہیٹ پہنے سمندر کے کنارے کھڑی ریت کے ٹیلے پر ایک چھوٹا سا لال اور نیلا امریکن جھنڈا لگا رہی تھی اور میں نے پھر اس نیگرو کی طرف دیکھا جس کے بیہوش مُنہ سے اب" نو" کی آواز بڑی مشکل سے نکل رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ وُہ کچھ اور کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اس کی طرف کروٹ لے کر سُنا تو وُہ بڑی نرمی سے بڑبڑا رہا تھا۔ ڈارلنگ میں بہت خُوش ہُوں کہ تم ماں بننے والی ہو۔ لڑکا ہو تو اس کا نام ہنری رکھنا، میرے نام پر اور اگر لڑکی ہو ......"

"اور پھر اُس کے ہونٹ کھُلے کے کھُلے رہ گئے۔ خاموش۔ بے جان۔ ایک ڈاکٹر نے چلتے چلتے اس کی نبض ٹٹولی۔ پھر وارڈ بوائے کو اشارہ کیا اور چند منٹ میں وُہ اس کی لاش کو ایک ٹرالی پر ڈال کر لے گئے اور کسی نے اِتنا بھی نہ کیا کہ اس کی بیوی کو اطلاع دے دیتا کہ

اس کے شوہر کی آخری خواہش تھی کہ ان کے لڑکے کا نام ہنری رکھا جائے۔"

"فکر نہ کرو میرے بھائی۔ اس کی بیوی کو اپنے شوہر کی آخری خواہش معلوم تھی۔ اپنے بیٹے کا نام اس نے ہنری ہی رکھا تھا۔"

"تھا؟ تو اب کہاں ہے ہنری جونیئر۔"

"اب وہ نہیں ہے۔ ایک گولی......"

"ایک گولی نہیں سینکڑوں گولیاں، ہزاروں گولیاں، لاکھوں گولیاں ہنری جونیئر جیسے بچوں کے سروں پر منڈلا رہی ہیں۔" گولیاں اور گولے اور راکٹ اور ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اور زہریلی گیس کے بم اور پلیگ اور ٹائی فس کے جراثیم کے بم۔ "میں تو دنیا کا کونا کونا چھان آیا ہوں۔ الجیریا میں میں نے فرانسیسی تہذیب کے علمبرداروں کو عرب قوم پرستوں کے ننگے جسم میں بجلی کے کرنٹ دوڑا کر انہیں ادھ موا کرتے دیکھا ہے۔ میں نے ان معصوم الجیرین لڑکیوں کی لاشوں کو دیکھا ہے جنہوں نے خودکشی کر لی۔ کیونکہ ان کے پیٹ میں ناسور کی طرح فرانسیسی بچے پل رہے تھے۔"

"کیا تم نے فرانس میں ژاں پال سارترے اور آندرے حال رو اور دوسرے فرانسیسی دانشوروں کو اس بربریت کے خلاف احتجاج کرتے نہیں دیکھا؟"

مگر ہندوستانی بولے ہی چلا جا رہا تھا جیسے وہ سب کچھ کہنے پر مجبور ہو۔ جیسے اس کے لئے اور کوئی چارہ ہی نہ ہو۔ "میں نے ہٹلر کی روح کو جنوبی افریقہ میں کارفرما دیکھا ہے۔ میں نے اسی امریکہ کے جنوب کی ریاستوں میں کو کلکس کلان کی کاروائیاں دیکھی ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک نیگرو بچے کو گولی لگی ہے جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ گورے بچوں کے ساتھ ایک ہی سکول میں پڑھنا چاہتا تھا۔ میری آنکھوں نے وہ کچھ دیکھا ہے جو کسی انسان کی آنکھوں کو نہ دکھائی دینا چاہیئے۔"

"میں یہ سب جانتا ہوں، میرے بھائی۔ اس نیگرو بچے کی ماں سے میں آج ہی ملا ہوں۔"

"اور پھر افریقہ کی قومیں آزاد ہونی شروع ہوئیں۔ میں افریقہ کے کتنے ہی ملکوں کے جشنِ آزادی میں شریک ہوا، ان کے بارے میں لمبے لمبے آرٹیکل لکھے اور بار بار اپنے اخبار میں اعلان کیا۔ ایک نیا افریقہ جنم لے رہا ہے۔ ایک نئی دُنیا جنم لے رہی ہے مگر وہ سب جھوٹ تھا۔ اصلیت کچھ اور تھی۔ آزادی کے چمکتے ہوئے ماسک کے پیچھے غلامی کا وہی بھیانک۔ اور کریہہ چہرہ تھا۔ اس نئی دُنیا میں بھی طاقت ہی کا راج تھا۔ ہتھیاروں کی طاقت۔ بندوقوں اور ٹینکوں اور بم مار ہوائی جہازوں کی طاقت اور کل اس طاقت کا آخری اور قطعی مظاہرہ ہوگیا۔ تین گولیاں چلیں اور ..... اور .... "

اور اب نشے میں مدہوش سسکیاں بھر کے رو رہا تھا۔

"اور..... اور کیا ہوا؟" کالے اجنبی نے بڑی ملائمت، بڑے پیار سے پوچھا۔

"تین گولیاں چلیں ـــــ اور جلیانوالہ باغ میں میرا باپ پھر قتل کر دیا گیا ـــــ

تین گولیاں چلیں ـــــ اور ہمارے باپو پھر شہید کر دیئے گئے ـــــ

تین گولیاں چلیں اور الجیریا کی جمیلہ جس کو دُنیا کے انسانوں کی متفقہ آواز نے پھانسی سے بچا لیا تھا وہ آخرکار قتل کر دی گئی اور سیکو اور دیر بٹی پھر الیکٹرک چیئر پر بٹھا دیئے گئے، اور پال روبسن کی کالے مخمل جیسی آواز ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی، اور ساری دُنیا پر یہ منحوس اندھیری زہریلی دھند چھا گئی۔ اب کبھی دُنیا میں روشنی نہیں ہوگی، کبھی برف نہیں پگھلے گی، کبھی پھول نہیں کھلیں گے، کبھی بہار نہیں آئیگی۔ اس لئے کہ انسان جس کے دم سے زندگی تھی اور روشنی تھی اور بہار تھی ـــــ کل خود انسان مر گیا ہے۔"

اور پھر وہ تھک کر خاموش ہو گیا۔ پریس رُوم میں مکمّل سنّاٹا چھا گیا۔ اب صرف دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی ٹک ٹک تھی اور وہ دونوں تھے۔ صرف وقت تھا اور دو انسان تھے۔ ایک کالا ایک سانولا ـــ

ہندوستانی نوجوان نے ایک لمبّی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"میرا انگریز جرنلسٹ دوست پال اپنا پریس کارڈ یہاں پھینک کر گھر چلا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے اب وہ اِس قبرستان کی رپورٹ لینے پھر کبھی نہیں آئے گا۔ اور میں — میں دو بوتلیں وہسکی کی پی چکا ہوں۔ یہ سب کچھ بھلانے کے لئے۔ مگر نہیں بھلا سکتا۔ کل میں بھی ہندوستان واپس چلا جاؤں گا۔ وہاں کسی کروڑپتی سیاستدان کی تقریریں لکھا کروں گا، یا جوتوں کے اشتہار بنایا کروں گا، یا کسی فلم سٹار کے حُسن کی شان میں قصیدے لکھا کروں گا۔ اب یہاں میرا کوئی کام نہیں ہے۔ تماشہ ختم ہو گیا ہے۔"

"تماشہ ختم نہیں ہُوا، میرے دوست تماشہ شروع ہو رہا ہے۔ دُنیا پردہ اُٹھنے کا انتظار کر رہی ہے۔"

"مگر یہ پردہ اُٹھائے گا کون؟"

"تُم!"

"میں؟ کیسے؟"

"مجھے اندر اسمبلی ہال تک پہنچا دو۔"

"تم کو تو میں پال کے پریس کارڈ پر لے جا سکتا ہوں لیکن وہاں تم کرو گے کیا؟ کیا تُم پتھر کو پگھلا سکتے ہو؟ کیا تُم بہروں کے کان کھول سکتے ہو؟ کیا تم اندھوں کو آنکھیں دے سکتے ہو؟"

"ہاں۔"

"ایسی کونسی طلسمی طاقت ہے تمہارے پاس؟"

"میں نہیں ہوں، اور یہی میری سب سے بڑی طاقت ہے۔ چلو اب دیر ہو رہی ہے۔"

"چلو مگر تمہیں مجھے سہارا دینا پڑے گا۔" ہندوستانی نوجوان نے اپنے کالے ساتھی کا بازو پکڑ کر اُٹھتے ہوئے کہا۔ "نشے سے میرے پیر لڑکھڑا رہے ہیں۔"

وُہ پاس دکھا کر اسمبلی ہال میں داخل ہو ہی رہے تھے کہ کالے لمبے اجنبی نے اپنے ہندوستانی دوست کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی بھاری سی چیز رکھ دی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ وہی گولی ہے جو جلیانوالہ باغ میں تمہارے باباکو لگی تھی۔ بیالیس برس سے تم اس کی تلاش کر رہے تھے نا؟"

(۴)

اور اب کالے لمبے نوجوان نے دیکھا کہ ایک لمبے ہال کی چار دیواروں میں ساری دنیا قید ہے۔

یورپ
ایشیا
افریقہ
امریکہ
آسٹریلیا
کالے
گورے
سانولے
اشتراکی
سرمایہ دار
غیر جانب دار

دوست

دُشمن

مغربی یورپ کا ایک ڈیلی گیٹ کہہ رہا تھا۔ "جذباتیات سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اِس مسئلے پر ٹھنڈے دِل سے غور کرنا چاہیئے۔ ہمیں کانگو سے مُفصّل رپورٹ آنے کا انتظار کرنا چاہیئے۔ ہوائی الزامات پر یقین نہ کرنا چاہیئے۔ یہ قتل کیسے ہُوا اور کِس نے کیا یہ تو صرف ایک ہی آدمی کی گواہی سے ثابت ہو سکتا تھا —— وہ جِس کا قتل ہُوا ہے!"

عین اس وقت دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک کالا لمبا سا نوجوان خاموشی سے پریس گیلری میں کھڑا ہو گیا۔

اور اس کا وہاں نمودار ہونا تھا کہ ...... یُو۔این۔او کے سیکرٹری جنرل کے ہاتھ سے پانی کا گلاس گر پڑا اور اس کی تقریر کا ڈرافٹ جو سامنے پڑا تھا اس پر پانی پھِر گیا۔

برٹش ڈیلی گیٹ کی بائیں آنکھ سے مونوکل کا شیشہ میز پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

فرانسیسی ڈیلی گیٹ کے منہ سے سونے کا لمبا سگریٹ ہولڈر گر گیا اور اس کے بڑھیا سوٹ پر راکھ بکھر گئی۔

بلجیم کے ڈیلی گیٹ کی گھگھی بندھ گئی اور اس کے نقلی دانت گھبراہٹ کے مارے جبڑے سے باہر نکل پڑے۔

امریکن ڈیلی گیٹ کچھ کہنے والا تھا مگر اس کا منہ کھُلا کا کھُلا ہی رہ گیا۔

سوویت ڈیلی گیٹ کی لال پنسل کی تیز نوک سامنے رکھے ہوئے کاغذ کے پیڈ میں پیوست ہو گئی۔

ہندوستانی ڈیلی گیٹ جو اب تک آکسفورڈ کے انداز گفتگو میں اور برطانوی قانونی جملوں میں تقریر کر رہا تھا ایکدم اپنی ہندوستانی بھاشا میں چِلّا پڑا۔

"وہ دیکھو۔"

افریقہ کے ملکوں کے جتنے ڈیلی گیٹ خاموش اور مایوس بیٹھے تھے دفعتاً ان کی آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہو گئی۔ جیسے ان کے سامنے کوئی آسمانی معجزہ ہوا ہو۔

مگر ایک کالے رنگ کا ڈیلی گیٹ (جس کے سامنے میز پر "کانگو" کے نام کی تختی رکھی ہوئی تھی) ایسا بھی تھا جو ڈر کے مارے کانپتا ہوا بلجیم کے ڈیلی گیٹ کی کرسی کے پیچھے چھپ گیا۔

اور اس وقت سننے والوں نے سنا کہ پریس گیلری میں کھڑا ہوا کالا نوجوان کہہ رہا ہے "دوستو اور...... اگر میں کل یہاں آتا تو کہتا دوستو اور دشمنو۔ لیکن کل میں تھا اور آج موجود نہیں ہوں اور جو نہیں ہے اس کا کوئی دشمن نہیں ہوتا۔ سنا ہے آپ کو میرے قتل کا ثبوت چاہیئے۔ ثبوت میرے پاس تین تھے۔ تین گولیاں جو بلجیم کی بنی ہوئی تھیں۔ مگر ان گولیوں کو چلانے والے ہاتھ گورے بھی تھے اور کالے بھی۔ یہی تین گولیاں میں آپ کے سامنے پیش کرنے یہاں آیا تھا لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ جن تین گولیوں سے مجھے قتل کیا گیا ہے میں نے انہیں دنیا میں تقسیم کر دیا ہے۔"

اور پھر وہ کالا لمبا ہیولا غائب ہو گیا اور سب نے سوچا کہ یہ ہمارا واہمہ تھا۔ بھلا یو۔این۔او کی بلڈنگ میں جہاں تین تین پہرے لگے رہتے ہیں کوئی بھوت کیسے داخل ہو سکتا ہے۔ صرف ایک ہندوستانی نوجوان تھا جو قسمیں کھاتا تھا کہ اس نے کالے لمبے نوجوان کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ اس سے باتیں بھی کی ہیں۔ اسے اپنے ساتھ اندر بھی لایا ہے۔ لیکن ایک شراب میں مدہوش کارسپانڈنٹ کا کون اعتبار کرتا ہے۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگلی صبح کو جس وقت آئڈل وائلڈ ایئر پورٹ سے ایک ہوائی جہاز افریقہ کے لئے روانہ ہو رہا تھا کہ لوگوں نے دیکھا کہ تین دن سے جما ہوا ٹھنڈا دھواں آہستہ آہستہ ایئر پورٹ پر سے اٹھتا جا رہا ہے اور جب وہ ہوائی جہاز رن وے سے اڑ کر نیویارک کے شہر پر سے گزرا تو مسافروں نے دیکھا کہ یو۔این۔او کے مینار کی چوٹی دھند کی نقاب میں سے دھیرے دھیرے سر نکال رہی ہے اور ریڈیو پر موسم کی رپورٹ سنانے والے اناؤنسر نے کہا

کہ نیویارک پر سے دھند دور ہونے کے پورے امکانات ہیں کیونکہ گرم ہوا کا ایک زبردست جھونکا جو افریقہ کے تپتے ہوئے صحرا سے چلا تھا وہ ہندوستان اور جنوب مغربی ایشیا پر سے ہوتا ہوا انڈونیشیا اور جاپان پر سے گذرتا ہوا امریکہ تک آن پہنچا ہے۔ اور گرم ہوا کے اس جھونکے سے دھند کا ٹھنڈا دھواں پگھلتا اور بکھرتا جا رہا ہے۔ اب اندھیرے کی قید سے سورج نکلنے ہی والا ہے۔

غیاث احمد گدی

منظر و پس منظر

سینے ویو میں لوگ باگ آنے جانے لگے ہیں۔

ایک ایک کر کے گانی لوگ پہنچ گئے ہیں، خالی میزیں بھر رہی ہیں۔ کئی خوبصورت نسوانی چہرے بھی دکھائی دینے لگے ہیں۔ رنگین اور قیمتی کپڑوں سے ایوننگ اِن پیرس کی خوشگوار لپٹیں آ رہی ہیں، خوبصورت مسکراہٹیں بکھر بکھر جاتی ہیں، کوئی خوبصورت جوڑا ایک دوسرے کے بازو کا سہارا لئے داخل ہوتا ہے تو مشتاق نگاہیں بڑی محبت سے خوش آمدید کہتی ہیں، اور پژمردہ چہروں پر جھومتی ہوئی بہار کی سی دلنواز کیفیت چھا جاتی ہے۔ کاؤنٹر میں اونگھتے ہوئے مینیجر کی آنکھوں میں تاجرانہ چمک آجاتی ہے اور وہ سفید وردیوں میں ملبوس ممیوں کی طرح دکھنے والے بیروں کو بڑی کڑی نظر سے دیکھنے لگتا ہے جو اب تک پچھلی دیوار کا سہارا لئے اونگھ رہے ہیں۔ جواب میں یہ بیرے کوک بھری ہوئی گڑیوں کی طرح اِدھر اُدھر گردن جھکائے دوڑنے لگے ہیں۔ تھکے ہوئے چہروں پر زبردستی کی بشاشت پیدا کئے ہوئے ——— سینے ویو میں ایک زندگی سی پھیل رہی ہے۔ لوگ باگ باتوں میں مصروف ہیں، محبت کی باتیں، فراق کے درد میں ڈوبی ہوئی جان گسل باتیں کہ آنکھوں میں سیلاب سا امنڈا چلا آ رہا ہو۔ کوئلے اور ابرک کی کانوں اور نئی ملوں کا ذکر ——— کلکتہ کے ریس کورس میں جیتی ہوئی ران بےشمار رقموں کے تذکرے جو رات کی رات کسی بنگالی فلم اسٹار کی آغوش اور فرانس

کی پرانی شراب میں غرق کر دی گئی ہوں —— پھر قہقہے، چھیڑ چھاڑ، چمچوں اور پلیٹوں کی آوازیں، ایک پیارا سا شور، ایک دلکش ہنگامہ، اور ہال کے درمیان سفید وردیوں میں لپٹے ہوئے سیاہ فام بیروں کی عقیدت سے جھکی ہوئی گردنیں اور رعبِ حسن اور رعبِ دولت سے کانپتے ہوئے لب آہستہ سے، بڑے سہمے ہوئے انداز میں، گویا شہنشاہِ وقت کو بیدار کرنے والی کنیزوں کے غریب سے ہوئے ہونٹ ہل رہے ہوں —— یس سر.... بہت بہتر صاحب.... آل رائٹ سر،.....

رس گلّے سے بھری ہوئی پلیٹ کو دھکیلتے ہوئے مارواڑی نوجوان نے اپنے بالمقابل بیٹھی ہوئی اینگلو انڈین محبوبہ کو کہا۔

"ارے کھاؤ کھاؤ ڈارلنگ، شرمانا کیسا —— ؟"

یہ حسینہ جس کی آنکھوں میں تقدس ہے۔ بڑی چور نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہے۔ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کی نگاہوں میں کچھ تلاش کرتی ہے اور پھر ایک بار مسکرا کر اپنے محبوب کو دیکھتی ہے۔ رس گلّے کو تکتی ہے اور پھر آہستہ سے کانپتی ہوئی انگلیوں میں تھامے ہوئے کانٹے میں رس گلّے کو پھنسا کر منہ میں رکھ لیتی ہے اور آہستہ آہستہ منہ چلاتی ہے۔ اس کا چہرہ شرم سے کشمیری سیب کی طرح سُرخ ہو گیا۔ طلوعِ دم سُورج کی طرح پاکیزہ ——

"نہ شرما حسینہ صبح بہاراں نہ شرما.... زہر میں ڈوبے ہوئے یہ انیونی رس گلّے جب رفتہ رفتہ تمہارے ضمیر کو ایکدم سے گہری نیند سلا چکے ہوں گے۔ اس وقت یہ کشمیری سیب سڑ گل کر زرد ہو چکے ہوں گے، آنکھوں کا تقدس مر چکا ہو گا۔ اس وقت رس گلّہ تو کیا سگریٹ کے ایک ٹکڑے کے لئے تم سرمایۂ حیات لٹاتی پھرو گی اور لوگ اس کے لے بھی تیار نہ ہوں گے۔ کشمیر کے سیب آج ہی سے پک رہے ہیں۔ اس لئے اے حسینہ.....

بیرے نے چائے کی ٹرے سامنے لا کر رکھ دی ہے۔

"بیرہ، تمہاری عمر کیا ہے ؟"

"چالیس برس جناب!"

"کتنے برس سے بیرے کا کام کر رہے ہو؟"

"کوئی چھبیس برس سے جناب!"

"پورے چھبیس برس ہوئے؟"

"یس سر"

"ان چھبیس برسوں میں تم نے "یس سر" کے علاوہ بھی کچھ سیکھا ہے؟"

"نہیں جناب۔ مگر میرا بیٹا شاید وہ سب کچھ سیکھ رہا ہے جو میں نے نہیں سیکھا۔ وہ حرامزادہ ہوٹل کی نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ وہ شیشے کے برتن سر پر لئے گلی گلی میں مارا مارا پھرتا ہے۔ اُلو کا پٹھا۔ لونڈا بالکل سڑی نکلا۔ حضور بالکل سڑی۔" پھر اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "کبھی کبھار میں ہوٹل کی کوئی اچھی سی چیز چرا کرلے جاتا ہوں تو اسے نہیں کھاتا ہے۔ کہتا ہے اس کے کھانے سے میری آنکھوں سے کم دکھائی دینے لگے گا۔ ہی ہی ہہ ہہ...... حرامزادہ۔ جناب ایسا کھانا تو اس نے عمر بھر میں چکھا تک نہ ہوگا۔ ویل سر؟"

"یس سر۔"

بیرا چلا گیا۔

اس نے اپنے نا خلف لڑکے کی شکایت کر کے میری خوشنودی حاصل کرلی ہے۔ اس نالائق اولاد کی شکایتیں جس نے باپ کا سبق بھول کر زندہ رہنے کے لئے ایک الگ راستہ اختیار کیا ہے نادان چھوکرے۔ اب تمہیں باپ کی جائیداد میں سے ایک سکہ بھی نہیں ملے گا۔

نگاہیں اٹھیں تو دروازے پر کھڑے ہوئے غضنفر نواب دکھائی دیئے۔ ان کے ساتھ خلافِ دستور ایک کی جگہ دو لڑکیاں ہیں، قیمتی امریکن سوٹ زیب تن ہے، وہ اُکتایا ہوا چہرہ لئے ہوئے ایک خالی میز کے قریب بیٹھ جاتے ہیں ——— "کیا حال ہے حضور نواب صاحب؟"

"میں بہت پریشان ہوں۔ بہت پریشان ہوں۔"

اپنے باپ کے انتقال کے بعد جب غضنفر نواب نے ایک روز اپنے سرمائے کا اندازہ لگایا تو ان کی آنکھیں چُندھیا گئیں اور دہ کالج کی تعلیم، ورڈس ورتھ کی شاعری، شیلے کے نغموں اور شیکسپئر کے ادب کو بھاڑ میں جھونک اپنے بچپن کے شوق کو پورا کرنے بمبئی چلے گئے اور وہاں انہوں نے اپنے دیرینہ شوق کو پورا کیا۔ یعنی ایک فلم بنائی — فلم ناکام رہی۔

"کوئی بات نہیں نواب صاحب کوئی بات نہیں، یہ تو ہوتا ہی ہے۔ چار ہی لاکھ کی تو بات ہے ایک کوشش اور سہی۔ مرد باید کہ ہراساں نہ شود۔۔۔۔"

نواب صاحب نے حواریوں کے مشورے سے ایک اور فلم بنانا شروع کی۔ "نواب صاحب دیکھی ہے آپ نے۔ کیا غضب کی چھوکری ہے۔ کیا جوانی ہے۔ کیا سینے کا اُبھار ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے نا کہ "وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے" کی من وعن تفسیر ہے حضور صرف ایک بار شرفِ باریابی دیکر دیکھ لیا جائے۔۔۔۔"

"حضور فلم کی ہیروئن نے آج رات آپ ہی کے یہاں ریہرسل کو کہا ہے۔۔۔۔ حضور یہ۔۔۔۔ حضور وہ۔۔۔۔" اور یوں نواب صاحب کے گیارہ لاکھ روپے ختم ہو گئے اور فلم کی کاغذی تیاری بھی مکمل نہ ہو پائی تو اچانک ایک روز جب نئی اکسٹرا نے پانچ ہیرے والے جڑاؤ ہار کی فرمائش کی تو اُن کی نظر بینک بیلنس کی طرف گئی اور ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ عین اسی وقت حواریوں نئی اکسٹرا گرل اور فلم کی ہیروئن نے یک وقت سبھوں کو اپنی اپنی مصروفیات یاد پڑ گئیں اور نواب صاحب نے دیکھا کہ کمپنی کے بیشمار نوکران کے آگے پیچھے گھومنے لگے ہیں، تو انہوں نے چپکے سے ایک رات یہ کہہ کر کہ نئی فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے کولہاپور کی جگہ معائنہ کرنے جا رہا ہوں اپنا بستر تک چھوڑ کر بمبئی سے چلے آئے اور اب "میں بہت پریشان ہوں، بہت پریشان۔"

"آپ بہت پریشان ہیں اس اعلیٰ سوٹ میں، ان دو لڑکیوں کے درمیان ؟ سینے ریو کے رومان افریں ماحول میں آپ کو سکون نہیں — ؟ ؟ ؟ اور وہ حرامزادہ بیرہ کا ناخلف چھوکرا کہتا ہے۔ گلی گلی گھومنے اور سوکھی روٹی میں بڑا مزہ ہے۔ بڑھا بیرہ سچ کہتا ہے کہ لڑکا سٹری ہو

گیا ہے۔ سولہ آنہ سٹری معلوم ہوتا ہے۔ نواب صاحب ایک خالی میز پر چپ چاپ بیٹھ گئے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے گویا واقعی وُہ بہت پریشان ہیں۔

نواب صاحب کی پہلو والی میز پر ایک ادھیڑ عُمر کی عورت ایک سترہ اٹھارہ برس کے نوجوان کی ٹانگوں میں ٹانگیں پھنسائے بیئر کی ہلکی ہلکی چُسکی لے رہی ہے۔ اس کی ساڑی کا رنگ چاکلیٹ کا سا ہے اور بلاؤز سفید۔ جس پر جا بجا شیشے کے ٹکڑے لگے ہوئے ہیں۔ اس کا جسم پیلا ہو گیا ہے مگر چہرہ پوڈر کی دبیز تہہ کے باعث قدرے خوبصورت لگ رہا ہے۔ وُہ بُوڑھی ہو کر بھی جوان ہے۔ اس نے اپنی خزاں رسیدہ عمر کو مصنوعی بہار سے چھپا لیا ہے۔ عُمر کی یہ منزل اسے پسند نہیں۔ کیونکہ اس کا یہ خیال ہے کہ عُمر کی یہ منزل عشق کے لئے موزوں نہیں اور عشق وُہ رُوحانی غذا ہے، جس کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ نامکمل اور اس رات کی طرح جس رات پُونم کی چاندنی نہ ہو۔ اس نے شادی نہیں کی ہے۔ والدین کے لاکھوں روپے بینک میں اس کے نام محفوظ ہیں۔ جس کی بدولت وُہ آج بھی جوان ہے اور آج بھی وُہ بیکار کریچیوں کے گرم اور صحت مند جسم خرید سکتی ہے۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور اس پیدائشی حق کی محافظت کے طریقوں سے وُہ اچھی طرح واقف ہے۔ لوگ نادان ہیں، جو اسے شادی کی تلقین کرتے ہیں، یُوں پابندی میں پڑ کر انسان ایک فطری حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ پھر بکھیڑے الگ، نا بابا۔ نا بابا... نا...

مجھے یہ زندگی پسند نہیں۔ مجھے تو ہر روز ایک چیز چاہیئے۔ جہاں کوئی نئی شکل دکھائی دی دل ناداں مچلتا ہے کہ بس ہم تو یہی لیں گے۔

نواب صاحب کو اپنے قریب پا کر اس کی آنکھیں چمک اٹھی ہیں، اہا کتنا خوبصورت جوان ہے، کیسا توانا جسم ہے۔ اس کی نگاہیں نواب صاحب کے پریشان مگر خوبصورت چہرے پر لگی ہوئی ہیں اور چہرے سے یُوں معلوم پڑ رہا ہے جیسے مسکراہٹ پھوٹی پڑ رہی ہے۔ اس نے اپنے ساتھ والے نوجوان کو ایکدم بھلا دیا ہے اور اب اس کی ٹانگیں بھی الگ ہو چکی ہیں —— اہا اہا کتنا خوبصورت جوان ہے، کتنا....

نواب صاحب پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس دور میں عورت کے جسم ہی کی نہیں۔ مرد کے جسم کی بھی قیمت لگ سکتی ہے ..... اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں نواب صاحب !! اب وہ ادھوری فلم ضرور مکمل ہو جائیگی — کیونکہ اب دلِ ناداں مچل رہا ہے کہ بس ہم تو یہی ہیں گے۔

اب سینے ویو میں زندگی کی لہریں بڑھ رہی ہیں۔ گاہکوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا ہے۔ کچھ دیر پہلے جو ایک اونگھتی ہوئی بجھی بجھی سی کیفیت طاری تھی وہ دھیرے دھیرے گاہکوں کے شور میں بدل رہی ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ اب تک جو زندگی نیند کی آغوش میں پڑی ہوئی تھی اب ہولے ہولے جاگ رہی ہے۔ مگر اس کی آنکھوں کا خمار اور نیند کی مستی باقی ہے۔ کچھ لمحوں کے بعد یہ خمار اور مستی گہرے ہنگامے میں یوں کھو جائیں گے کہ ڈھونڈنے سے بھی سارے بار میں نہیں ملیں گے اور اس وقت شرمائی لجائی زندگی بے حیائی سے ناچ اٹھیگی اور خوبصورت عورتیں جنہیں دیکھتے ہی ایک طرح کی شگفتگی اور بھرپور زندگی کا احساس جاگ اٹھتا ہے، شراب کے نشے میں دھت لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنے عاشقوں کے ساتھ آرکسٹرا کی دھنوں سے ہم آہنگ ہو کر رقص میں محو ہو جائیں گی۔ یہ مست جسم ایک دوسرے سے مس ہوں گے اور آنکھوں میں سوئی ہوئی ہوس انگڑائی لے کر بیدار ہو اٹھیگی۔

ایک حسین شور پھیلنے لگا ہے۔ توس وقزح سی رنگینی امڈی پڑتی ہے، خوبصورت چہرے رنگین، سینٹ میں بسے ہوئے، سرسراتے ہوئے قیمتی کپڑے۔ بکھرے بکھرے خوشبودار تیلوں کی ہلکی سی رمق لئے ہوئے بال، جو سینے ویو کے ایلکٹرک فین کی ہوا سے ریشم کی تاروں کی طرح اڑنے لگے ہیں۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس مردانہ جسم، شوخ طرح دار ٹائیاں، قیمتی زیور۔ خوشبو، کریم اور پوڈر کی موٹی تہیں، بات بات پر بلاوجہ پھوٹ پڑنے والے قہقہے — یہ ہنسی، یہ تبسم یہ زندگی، یہ پوڈر کی موٹی تہیں، — یہ نرم و نازک ہاتھ اپنے محبوب کی طرف اس طرح کیوں بڑھتے ہیں۔ کسی اعلیٰ و ارفع جذبے سے سرشار ہو کر کیوں نہیں بڑھتے، اس محبت آمیز فقروں پر تصنع کیوں ہے۔ یہ سب ایک بنی قوت کے محتاج کیوں ہیں؟ ان مسکراہٹوں سے ستاروں کی تنک تابی اور چاندنی میں جھومتے ہوئے سمندر کی موجوں کا جمال کون چھین لے گیا ؟ ؟ ؟ ؟ اس ہستی میں

شکست خوردہ زندگی کی اُجڑی ہوئی تمناؤں کا سوگ کیوں ہے ؟؟؟؟؟؟

بہ ظاہر اس خوبصورت ماحول میں کسی شے کی کمی ہے۔ کوئی چیز کھٹک رہی ہے۔ خوشنما، رنگین، ریشم، ایوننگ اِن پیرس اور ملائم پاؤڈر کی تہوں میں کوئی چیز دب گئی ہے۔ اسے تلاش کروں، جی چاہتا ہے کہ پاؤڈر کی تہوں کو کھرچ دوں۔

ہال میں سگریٹ کا دھواں پھیل رہا ہے، باتوں، قہقہوں، چمچوں اور پلیٹوں کا شور اب سامع خراشی کرنے لگا ہے۔ خوبصورت رنگین کپڑے۔ قیمتی زیوروں اور بناوٹ کی بجلیاں آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی ہیں۔

میں نے ایک ہلکے سے دھکے سے شیشے کی کھڑکی کھول دی ہے اور باہر دیکھنے لگا ہوں۔ کئی گھنٹوں تک برس چکنے کے بعد بارش اب تھم گئی ہے۔ آس پاس دور دور تک ساری چیزیں دُھل کر صاف ہو گئی ہیں۔ مکانوں اور دکانوں کے پیچھے کالی ناگن کی طرح کولتار کی سیاہ فام سڑک زرد رنگ کی رفیع الشان سینما بلڈنگ۔ سڑک پر ٹھہری ہوئی رنگ برنگ کی کاریں، سب دُھل کر دُلہن کی طرح نکھر گئی ہیں۔

راہگیروں کی آمد و رفت پھر سے شروع ہو گئی ہے۔ ان سب پر ڈوبتے ہوئے آفتاب کی بھیگی بھیگی کرنیں۔ من بھاونی کومل کرنیں، گویا اپنی آنچل سکھا رہی ہیں، دھوپ کی اے پیاری کرنو! تم ہر صبح کہاں سے آتی ہو اور پھر کہاں کو شام ہوتے ہی چل دیتی ہو۔؟

کرنیں جواب نہیں دیتیں، صرف مسکراتی ہیں۔ ہولے ہولے .... جیسے دُلہن ہوں۔ شاید سہاگ رات منانے جا رہی ہوں۔

فٹ پاتھ پر بوڑھا نیوز ہچی، جو دیر سے اپنا سامان لئے دکان کے چھجے تلے رکا ہوا تھا بانس کے ٹیڑھے میڑھے اسٹینڈ پر نئے سال کا کلنڈر سجانے لگا۔ وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کے لئے زور زور سے ہاتھ ہلا ہلا کر چلانے لگا ہے —— نئے سال کا کیلنڈر —— ساڑھے چھ آنے میں، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، ساڑھے چھ آنے میں، مہاتما بدھ، ساڑھے چھ آنے

ہیں، نرگس، ثریا، مدھوبالا، تاج محل، شاہ جہاں ساڑھے چھ آنے ہیں، لے جایئے نئے سال کا کیلنڈر۔۔۔۔۔"

احمق رنبو جی، ابھی کوئی پولیس کا سنتری آئے گا اور تجھے دھکے دیکر حوالات لے جائیگا۔ مساوات کی دُم آتمؔ نے ہر چیز ایک ہی بھاؤ بیچنی شروع کردی ہے۔

کئی گھنٹوں تک بارش ہوتی رہی، جس کے باعث رنبو جی کے کلنڈر اتنی تعداد میں نہیں بک سکے ہیں کہ اس کے کمیشن سے وہ آج چاول ہی لے جا سکے۔ کل جب اس کے ہرے بھرے کھیتوں میں زندگی لہریں مار رہی تھی، کوئی اسے چاول کھانے کو کہتا تو وہ اسے اپنی خواہش کی توہین سمجھتا۔ اسے گالی سمجھتا۔ مگر آج ان ہی چاولوں کے صرف چند دانوں کے لئے وہ دن دن بھر اور رات گئے تک گلا پھاڑتا ہے۔ اس کے دو چھوٹے چھوٹے پوتے جو کل تک صرف دودھ پیا کرتے تھے، ایک ضعیف بیوی اور اپنا ایک جہنم چاول کے ان ہی دانوں کے لئے منتظر تھے۔ آج بھی شاید نصف پیٹ کھانے پر ہی اکتفا کی جائیگی، کیونکہ آج بھی کمیشن میں اتنے پیسے نہ مل سکیں گے۔ کہ جو جنہوں کے لئے پورے ایندھن ہی اکٹھا کر سکیں، مگر چمن کا بوڑھا دل مایوس نہیں۔ وہ آج بھی خوش ہے۔ اس کی نگاہیں مستقبل کی طرف لگی ہوئی ہیں، وہ حالات سے مایوس نہیں۔

جب وہ فسادات سے تباہ ہو کر ایک قافلہ کے ساتھ چل پڑا اس کے ساتھ اس کا جوان لڑکا تھا، دو پوتے اور ایک بوڑھی بیوی اور ہزاروں تباہ حال انسان تھے، بوڑھے۔ بچے جوان، عورتیں، مرد، تنومند لٹی ہوئی خوبصورت لڑکیاں!۔۔۔۔ زخم۔۔۔۔ آنسو۔۔۔۔ خون۔۔۔۔ پیپ۔۔۔ مگر ان ساری چیزوں سے بڑھ کر ایک اور شے تھی۔ اس کے دل کے نہاں خانے میں ایک کلی مہک رہی تھی، جیسے گھنے اندھیرے میں نور کی ایک لکیر تھرتھرا رہی ہو۔ راستے میں بڑی بڑی مصیبتیں آئیں۔ مگر یہ کلی بدستور مہکتی رہی۔ گرمی۔ دھوپ۔ بارش اور مسلسل تھکان اور اذیت ناک بھوک نے اس کے قدموں کی طاقت بھی چھین لی تھی۔ مگر وہ کلی مہکتی رہی۔ ایکدن اچانک قافلے پر حملہ ہوا۔ اس نے جوان ہمتی سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے

اپنے جگر کے ٹکڑے جوان بیٹے کی گردن کو تن سے الگ ہوتے دیکھا، پھر بھی وہ کلی بدستور ہنستی رہی پھر وہ ایک تاریک پہاڑی نالے میں تین رات اور دو دن اپنی بیوی اور دو گلاب جیسے پوتوں کو لئے چھپا رہا۔ لیکن دل کے نہاں خانے میں یہ امید کی کلی برابر مہکتی رہی۔ اس نے سوچا تھا، ہندوستان پہنچتے ہی اس کے ہم مذہب اس کے قدم لینے کے لئے دوڑ پڑیں گے۔ اس کو گلے سے لگا لیں گے۔ اس کے تلووں پر پڑے ہوئے چھالے جو اب پھوٹ کر زخم میں بدل رہے تھے اس پر مرہم کے پھاہے رکھے جائیں گے۔ اس نے سوچا تھا کہ وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں، فرش پر نرم نرم مخمل بچھے ہوتے ہیں جن پر پاؤں رکھتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔

لیکن سرحد پار کرنے کے بعد یہ سب کچھ خواب ثابت ہوا۔ اس نے ظلم اور بے دردیوں کو بدستور دیکھا ــــ اس وقت اس کلی پر ایک ہلکا سا حزن، ایک دھول سی چھا گئی۔ لیکن چند لمحوں کے لئے پھر اس نے دھول کو جھاڑ دیا اور کیمپ کی ضمیر کو مردہ کرنے والی روٹیوں پر تھوک کر اس شہر میں آگیا۔ اور اب نئے سال کا کیلنڈر لے جائیے ــــ ساڑھے چھ آنے میں .... ساڑھے چھ آنے میں .....

آج اتوار کا دن ہے۔ آج وہ کچھ زیادہ کی توقع لے کر آیا ہے۔ وہ کئی ہفتوں سے ہر اتوار پر آسرا لگائے رہتا ہے تاکہ اپنی بوڑھی بیوی، جس نے رفاقت کے تیس (۳۰) برس اس کے ہمراہ بڑی تندہی سے گزارے ہیں۔ اس کے لئے چار گز لٹھا خرید سکے۔ لٹھا نہ سہی مارکین سہی، وہ سات دنوں میں سینکڑوں بار بڑھیا کو یقین دلاتا ہے کہ اتوار کو ضرور کپڑا لے آؤں گا تیرے لئے۔ مگر وہ اتوار نہیں آتا جس کا اسے انتظار ہے۔ وہ اتوار جو اس کی مٹھی میں اتنے پیسے دے، جس سے وہ چار گز لٹھا نہیں تو مارکین ہی خرید سکے اور مجبوراً ایک ہی شلوار میں وہ دونوں گزر کر رہے ہیں۔ صبح جب وہ غمِ روزگار کا بھاری بوجھ لئے اپنے جھونپڑے سے باہر نکلتا ہے تو باہر سے دروازہ کے اندر ہاتھ ڈال کر کہتا ہے ــــ "دے جلدی۔ بہت دیر ہو گئی ہے تیکھے کی ماں جلدی کر"

جواب میں تیکھے کی ماں اندر کو اپنی شلوار پکڑا دیتی ہے۔ بڈھا کھڑا کھڑا شلوار پہن کر

گچھا اندر پھینک دیتا ہے اور کچھ کہے بغیر چل پڑتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں خون کا ایک قطرہ کانپ اُٹھتا ہے۔ اندرونی کرب سے چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اس کے دل میں ایک بھٹی اچانک سلگ اُٹھی ہے مگر وہ کسی سے شکایت نہیں کرتا۔ اور چپ چاپ اتوار کے انتظار میں بازار کی سمت بڑھ جاتا ہے، جہاں وہ اپنے غموں کا بوجھ پٹک دیتا ہے اور شام کو جب واپس آتا ہے تو باہر سے آواز دیتا ہے ــــ "تیکھے کی ماں بہت دیر ہو گئی جلدی کر"

تیکھے کی ماں جو کئی ہفتوں سے دن بھر یا تو اپنے پوتوں کو لے کر پڑی رہتی ہے یا پھر دروازہ کی آڑ لے کر راہ گیروں کو تکا کرتی ہے۔ آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر گچھا باہر پھینک دیتی ہے۔ جسکو پہن کر بوڑھا پھر شلوار واپس کر دیتا ہے۔

"تیکھے کی ماں اب کے اتوار کو ضرور اچھا کیش ملیگا۔"

تیکھے کی ماں کچھ نہیں کہتی اور چپ چاپ نل پر پانی پینے چل دیتی ہے اس طرح ایک ہی شلوار سے دونوں کی گذر ہو رہی ہے۔

بوڑھا رفیوجی قول ہی میں نہیں عمل کے میدان میں بھی مساوات کا قائل ہے۔

ساڑھے چھ آنے پنڈت نہرو۔ نئے کلنڈر۔ تاج محل ساڑھے چھ آنے، لے جائیے نئے سال کا کیلنڈر...... مہاتما بدھ......

مہاتما بدھ جن کے لبوں پر ایک نورانی مسکراہٹ چمک رہی ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ مگر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایک ایک شے ایک ایک نقطے کو تک رہے ہیں، سُرخ چہرے پر ایک تقدس ایک پاکیزگی دکھائی دیتی ہے۔ قریب پہنچ کر میں نے آہستہ سے کہا ــــ "شہزادے کیا تمہیں سکون مل گیا؟"

شہزادہ کچھ نہیں کہتا۔ اس کے لب خاموش ہیں مگر اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا ہے ــــ میں نے بڑی آہستگی سے اس کے شانے کو تھپتھپایا۔

سدھارتھ، آنکھیں کھولو..... کیا تمہیں وہ رات یاد ہے، جب یشودھرا گہری نیند میں

سوئی ہوئی تھی اور اُس کے چہرے پر نُور کا ایک ہلکا سایہ منڈلا رہا تھا۔ اور اُس کے لبوں پر ایک ایسی مُسکراہٹ تھی، جِسے آج لوگ زندگی کہتے ہیں .... مغرور شہزادے! کیا تمہیں وُہ مسکراہٹ وُہ زندگی یاد ہے ؟ وُہ یشودھرا یاد ہے ؟؟ وہ پیاری سچائی یاد ہے ؟؟؟ یا سب بھول گئے ؟؟؟؟

لبوں کو ہلکی سی جُنبش ہوئی —— "مگر نگر پھرنے والے کہانی کار تُم یہاں سے چلے جاؤ۔ میرے سکون کو مت چھیڑو ......"

"مگر شہزادے، زندگی موت کے سکون سے نہیں زندگی کے شور سے عبارت ہے۔"

"بس بس :۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ ...... یہاں سے چلے جاؤ ......"

"جاتا ہُوں سدھارتھ۔ مگر تُم اب گھر لوٹ جاؤ۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔ کوئی وقت کی راہ پر نظریں گاڑے صدیوں سے منتظر بیٹھا ہے ....."

"کون —— کون ہے وُہ ؟"

"سکون کی تلاش میں بھاگے ہوئے شہزادے تم کتنے نادان بنتے ہو۔ وُہ یشودھرا ہے۔ لوٹ جاؤ سدھارتھ! یشودھرا زندگی کے رُوپ میں آج بھی تیرا انتظار کر رہی ہے۔

نئے سال کا کیلنڈر ساڑھے چھ آنے —— نئے سال کا کیلنڈر لے جائیں۔ مہاتما بُدھ ...

تاج محل ..... شاہجہان۔ ایک محل کا وسیع کمرہ ہے۔ جو قیمتی ایرانی قالینوں، اطلسی پردوں اور مختلف قسم کے سامان سے آراستہ ہے۔ ایک طلائی پائیوں والی پلنگ پر شہنشاہ شاہجہان نیم دراز ہیں، قریب ہی آبنوس کی قیمتی کُرسی پر مخملیں لبادہ زیب تن کئے شاہی طبیب شہنشاہ کی نبض ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ آس پاس چند مصاحب دست بستہ و سرنگوں کھڑے ہیں، پلنگ کے پیچھے طاؤس کے لمبے لمبے پنکھے لئے کنیزیں کھڑی ہیں۔ کنیزوں کے پیچھے سفید ریش والے چار مُلّا تلاوت قران میں مصروف ہیں، کمرے میں ایک لمبے لوبان دان سے عود عنبر کا پیچ کھاتا ہُوا دُھواں اُٹھ رہا ہے، شاہجہان کے چہرے پر اُداسی چھائی ہوئی ہے۔ رنگ زرد اور لبوں پر پپڑی پڑی ہوئی ہے۔ چاروں طرف گہرا سکوت ہے۔ صرف شہنشاہ کی لمبی سانس ٹھہر ٹھہر

(باقی صفحہ ۵۴۳ پر)

عادل رشید

گورنر صاحب کی پتلون

نواب صاحب سے میرے بڑے دیرینہ مراسم تھے اور وہ بیچارے مجھ سے محبت بھی بہت فرماتے تھے۔ ادب کے دلدادہ تھے اور ادیبوں اور شاعروں کے بڑے مدّاح تھے۔ مجھ سے ایک بار بمبئی ریس کورس میں فرمانے لگے۔

"یہ بتاؤ کہ تم ہمارے یہاں ایک زمانے سے کیوں نہیں آئے۔"

"ضرور حاضر ہوں گا نواب صاحب۔"

"نہیں بھئی ضرور آؤ۔" وہ بڑی شفقت سے بولے ——"اس دفعہ جب تم آؤ گے تو ہم تمہیں شیر کے شکار پر لے چلیں گے۔"

اور شکار کی بات سُن کر میرا شوق یکبارگی اُبھر آیا اور مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا جبکہ میں اپنے وقت کا بیشتر حصہ محض شکار کھیلنے اور جنگلوں کی خاک چھاننے میں گذارتا تھا۔

اور ابھی میں نے کوئی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ فرمانے لگے۔

"آنا کیا معنی جی۔ تم اس بار ہمارے ساتھ ہی چل رہے ہو۔"

"اچھا حضور۔" میں مسکرایا۔"تو سمجھ لیجئے کہ میں اس بار آپ کے ساتھ ہوں۔"

اور پھر ہمارا پروگرام طے ہو گیا اور میں نے دوسرے ہی دن ان کے ساتھ اُن کی ریاست

میں جاکر شکار کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا میں بھی بمبئی کی اس کاروباری زندگی سے اُکتا گیا ہوں۔ ایک ہفتہ کے لئے نواب صاحب کی ریاست ہی کی سیر کی جائے۔ دل بہل جائے گا کہ وہ کچھ سوچ کر بولے۔

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ اس ریس پر تم کیا کھیل رہے ہو۔؟"

"جو آپ فرمائیں گے کھیل دونگا۔" میں نے یونہی کہہ دیا۔ حالانکہ اس ریس میں سوا ہرمجسٹی کے کوئی دوسرا گھوڑا کھیلا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اپنے وقت کی چیمپین گھوڑی تھی اور یہ ریس یوں سمجھئے کہ اس کے باپ کی تھی۔

وہ مسکرائے۔

"تو بتا دوں ایک ایسا گھوڑا جو ریس جیت کر پورے ریس کورس کو حیرت میں ڈال دے۔"

"بتائیے۔"

وہ چپکے سے اپنا منہ میرے کان کے قریب لیجا کر بولے۔ "اس ریس میں تم چھوٹا صاحب کھیلو۔"

اور نواب صاحب کے منہ سے چھوٹا صاحب کا نام سنکر میں حیرت و استعجاب کے سمندر میں ڈوب گیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ ضرور نواب صاحب کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس ریس میں وہ مجھے چھوٹا صاحب کھیلنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ حالانکہ چھوٹا صاحب کا باپ بھی بڑا صاحب اور سلاننگ واٹر کی بیٹی ہرمجسٹی کو نہیں مار سکتا۔ وہ چیمپین گھوڑی تھی اس سال کی اور اس نے اپنی ہر دوڑ میں ریس جیتی تھی۔ بمبئی کے ٹرف کلب میں وہ اپنی ایک نئی تاریخ مرتب کر رہی تھی۔

دل میں خیال آیا کہ نواب صاحب مجھ سے مذاق فرما رہے ہیں۔ مگر انہوں نے کبھی اس قسم کا مذاق مجھ سے نہیں کیا تھا، اور وہ انجان یا بیوقوف اس لئے نہیں تھے کہ اس کا انہیں بہت بڑا تجربہ تھا۔ خود مہاراجہ گوالیار، کشمیر، بڑودا اور بڑے بڑے اونرس، ٹرینرس

اور جاکیز کو مَیں نے اُن سے ٹپ لیتے دیکھا تھا اور مُشکل ہی سے اُن کا بتایا ہُوا کوئی گھوڑا آج تک ایسا ہُوا تھا کہ ریس نہ جیت سکا ہو۔ مَیں سوچ میں پڑ گیا۔ ٹن ٹو ون آن۔ یعنی دس کے گیارہ کا بھاؤ دینے والی یہ ہر مجسٹی چھوٹا صاحب سے ہار کیسے سکتی ہے اور پھر چھوٹا صاحب جسکا کوئی خاص ریکارڈ بھی نہیں تھا۔ اور ہر مجسٹی کو بڑے بڑے مارواڑی بیس، بیس اور پچیس پچیس ہزار کھیلتے تھے دس فیصدی سود کی آدھے گھنٹے میں واپسی سے بڑی لگتی تھی۔

وُہ میری طرف دیکھ کر مُسکرائے۔

"تمہیں یقیناً میری بات پر تعجّب ہو رہا ہوگا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ آج ہر مجسٹی ہار رہی ہے اور وُہ بھی اسی گھوڑے چھوٹا صاحب سے۔"

اور پھر وُہ بولے۔

"اب بھی وقت ہے جا کر سو پچاس کھیل دو۔"

اور مَیں محض نواب صاحب کی بات رکھنے کے لئے سو پچاس تو نہیں البتہ بیس روپیہ جا کر چھوٹا صاحب کھیل آیا۔ اور پھر جب ریس شروع ہو کر ختم ہو گئی تو سارا ریس کورس انگشت بدنداں ہو گیا۔ ہر مجسٹی اپنے وقت کی عظیم گھوڑی چھوٹا صاحب سے ریس ہار چکی تھی اور ہزاروں کی سٹیک کرنے والوں کا دیوالہ ہو چکا تھا۔

چھوٹا صاحب نے ظاہر ہے دس بیچلے کے سوا سو چھ بیس روپے دینے تھے۔ مَیں نواب صاحب کو حیرت سے تکنے لگا اور وُہ بولے۔

"کیوں کہیں، مَیں نہ کہتا تھا۔"

"مگر نواب صاحب —!" مَیں نے واقعی حیران ہوتے ہوئے پُوچھا۔ "مگر یہ ہُوا کیسے — ؟"

"بس ہو گیا۔" وُہ مُسکرائے۔ "یہ چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تم میرے ساتھ چل رہے ہو نا۔"

"یقیناً نواب صاحب۔"

اور پھر دوسرے ہی دن میں نواب صاحب کے ساتھ ہی ان کی ریاست کے لئے روانہ ہو گیا۔

صبح سے لیکر شام ہو گئی۔ مگر اتفاق کی بات ہے کہ ہمیں نواب صاحب کی اس ریاست کے جنگل میں شیر کیا شیر کا بچہ بھی نہ ملا اور ہم بہت زیادہ مایوس ہوئے۔ نواب صاحب نے فرمایا۔

"کوئی بات نہیں یار۔ ذرا مغرب کی نماز پڑھ لوں۔ پرسوں میں ہانکا کراؤں گا۔ اور پھر تم مچان پر بیٹھ کر شیر کا شکار کرنا۔"

"بہت بہتر نواب صاحب۔"

اور پھر نواب صاحب جیپ کی سائیڈ میں جائے نماز بچھا کر مغرب کی نماز پڑھنے لگے اور میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اتفاق کی بات کہ مجھے بہت زور سے پیشاب معلوم ہوا اور میں نے رائفل اسی جگہ گھاس پر رکھ دی اور مشرق کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ میرے سامنے لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔

اور ابھی میں نے پیشاب شروع ہی کیا تھا کہ اتفاقیہ طور پر میری نظر اپنے سامنے گئی۔ اور آپ یقین کیجئے کہ میرا پیشاب یکبارگی رُک گیا۔

میرے بالکل سامنے کوئی چار گز کے فاصلہ پر گھاس کے اوپر ایک شیر بیٹھا ہوا تھا۔ اور مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں چپکے سے بالکل آہستہ آہستہ، دم سادھ کر اس جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کی اور شیر میری یہ حرکت دیکھ کر اپنی جگہ سے چپکے سے اُٹھا اور میں جو کہ

تھوڑا سا اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اُس عالم میں ادھ کھڑا ہی رہ گیا۔ ہم دونوں ایک دُوسرے کو ٹک ٹک دیکھ رہے تھے۔

شیر کی یہ خاصیت ہے کہ وُہ ایک ذرا سی نگاہ چُوکنے پر فوراً حملہ کر دیتا ہے۔ لہٰذا میں اُسکی فطرت جانتے ہوئے اُسے ٹک ٹک۔ بغیر پلک جھپکائے دیکھ رہا تھا اور یہی کیفیت اُسکی بھی تھی۔ وُہ بھی مجھے ٹک ٹک دیکھ رہا تھا۔ پلک نہ اُسکی جھپک رہی تھی اور نہ میری۔

میرا پیشاب ہنوز رُکا ہُوا تھا اور سانس رُکی ہُوئی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ رائفل مجھ سے دُور پیچھے پڑی ہوئی ہے اُسے اُٹھاؤں تو کس طرح۔ ذرا میں نے جُنبش کی اور میں شیر کا لُقمہ بنا۔ میں اُسی طرح کھڑا ہُوا تھا۔ پینٹ کے بٹن لگانیکی بھی میں حماقت نہیں کر رہا تھا۔ اس لئے وُہ ظالم اور خطرناک شیر مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اور میری ایک معمولی سی جُنبش بھی اُسے مشتعل کر سکتی تھی اسی عالم میں کھڑے کھڑے میرے گھٹنے بجنے لگے اور میں دل ہی دل میں کلمہ پڑھنے لگا۔ اپنی موت مجھے لازمی نظر آ رہی تھی اور نواب صاحب میرے پیچھے کوئی بیس گز کے فاصلہ پر یادِ الٰہی میں مشغول تھے۔

میں نے ہولے ہولے نواب صاحب کو آواز دینی شروع کی۔

"نواب صاحب — نواب صاحب —"

مگر میری یہ آواز اُن کے کانوں تک کہاں پہنچنے والی تھی۔ وُہ بدستور مغرب کی نماز ادا کرتے رہے اور اس عالم میں کھڑے کھڑے میرے گھٹنے جواب دینے لگے بھلا نائیم کی مشق بھلا مجھے کہاں تھی کہ میں اپنے اس پوز کو سہار جاتا۔

اور اب میری آنکھوں میں میرے بچّوں کی تصویریں پھرنے لگیں اور مجھے اپنا انجام اور اپنی دردناک موت یقینی معلوم ہونے لگی۔ میں نے سوچا، اچھا آئے تھے شیر کا شکار کھیلنے۔

میرا پیشاب شیر کو دیکھ کر اب تک رُکا ہُوا تھا۔ حالانکہ اُسے خطا ہو جانا چاہیئے تھا اس لئے کہ ڈر سے پیشاب خطا ہو جاتا ہے۔ رُکتا نہیں ہے۔ مگر وُہ رُکا ہُوا تھا۔

میں نے ایکبار نواب صاحب کو چپکے چپکے پھر آواز دی - اور میرے لبوں کی جنبش کو تاڑ کر شیر نے مجھے اس انداز میں دیکھا جیسے کہ وہ میری اس گستاخی کو نہ برداشت کر کے اب مجھے سزا دینے ہی والا ہے -

اور میں دل ہی دل میں جلدی جلدی کلمہ پڑھنے لگا ـــــ اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ شیر اٹھ کر ذرا سا پیچھے کی طرف اسی طرح الٹے پاؤں کھسکا اور پھر بڑی آہستہ آہستہ خرامی کیساتھ مجھ سے ذرا سا ہٹ کر جھاڑی سے باہر آگیا اور میں نے بھی اب گھبرا کر اپنا رخ پشت کیطرف موڑا - شیر بڑی شانِ بے نیازی کیساتھ نواب صاحب کے بغل سے ہوتا ہوا ان کے آگے سے نکل گیا اور اسوقت جبکہ وہ ان کے آگے سے جا رہا تھا وہ بس سلام پھیرنے ہی والے تھے اور جب انہوں نے سلام پھیر کر دیکھا تو شیر اپنی ایک جھلک انہیں دکھا کر ایک جست لے کر سامنے والے گھنے جنگل میں غائب ہو چکا تھا -

اور اب جو میں نے اپنی حالت پر غور کیا تو میری پتلون کے بٹن ہنوز کھلے ہوئے تھے اور میری ٹانگیں بری طرح لرز رہی تھیں - خدا معلوم خوف کیوجہ سے یا اتنی دیر تک ادھ مڑی رہنے کیوجہ سے

نواب صاحب نے سلام پھیر کر بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں مڑ کر میری طرف دیکھا اور میں جلدی جلدی پتلون کے بٹن بند کرنے لگا - میرا پیشاب نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا -

میں نے جھک کر رائفل جو کہ زمین پر رکھی ہوئی تھی اٹھالی ـــــ

"کیا ہوا تھا ـــ؟"

نواب صاحب مصلے سے اٹھ کر میرے قریب آئے اور میں نے ان گذرے ہوئے لمحات کی پوری داستان انہیں سنا ڈالی ـــ وہ بولے ـــ "خیریت گذر گئی صاحب -"

اور پھر وہ شیر کی عظمت اور اسکی شرافت اور اسکی بڑائی کے قصے سنانے لگے ـــ اور پھر ہم لوگ جیپ میں بیٹھ کر پرسوں شیر کے شکار کا پروگرام بناتے ہوئے نواب صاحب کے پیلس واپس آگئے -

نواب صاحب کے ایک انگریز دوست جو کہ ایک صوبے کے گورنر تھے اتفاق سے غیر متوقع طور پر اُن کے مہمان بن کر آ گئے اور پھر شیر کے شکار کا پروگرام اور پختہ ہو گیا۔

گورنر بہادر کو شیر کے شکار کا بڑا شوق تھا۔ وُہ اِس شکار کے بارے میں بڑی بڑی لمبی چوڑی باتیں کرتے رہے۔

”مَیں نے یوگنڈا میں چھ فٹ لمبا ایک شیر اِس طرح مار دیا تھا جس طرح کوئی بلّی مار دیتا ہے۔“

”بھوپال کے نواب حمید اللہ خاں بھی میرے ایک دفعہ قائل ہو گئے۔ جبکہ مَیں نے ایک شیر کو پہلے زخمی کر کے اُس کے تڑپنے کا تماشہ بہُت دیر تک دیکھا اور پھر اُسے مار دیا۔“

”مَیں نے یورپ میں بھی شیر کا شکار کھیلا ہے اور ایک دفعہ تو مَیں نے افریقہ کے گھنے جنگلوں میں ایک خونخوار شیر کو اِس طرح مار کر پھینک دیا تھا جیسے کوئی چوہے کو مار دیتا ہے۔“

اور وُہ بہُت دیر تک اِس قسم کی باتیں کرتے رہے اور ظاہر ہے کہ مجھے اُن کی اِن باتوں پر نہ یقین کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔

اور پھر دُوسرے ہی دِن شیر کے شکار کا بندوبست محض گورنر صاحب بہادر کی وجہ سے نواب صاحب کو کرنا پڑا اور وقت مقرر پر ہم لوگ شکار پر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

”تم اپنی کہانیوں اور اپنے ناولوں میں زخمی شیر کی مثال تو دیتے ہو گے۔“

”جی —“ مَیں نے جواب دیا — ”دیتا ہُوں —“

”آج مَیں تمہیں زخمی شیر دِکھاؤں گا۔“ نواب صاحب بولے — ”یہ مثال جو تم محض لکھ دیتے ہو آج اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور پھر تم اِسے ذرا اور تفصیل سے لکھ سکو گے — دیکھنا کہ زخمی شیر کی تڑپ اور اُس کا غصّہ کیا ہوتا ہے۔“

”آپ جو دکھائیں گے مَیں دیکھ لُوں گا نواب صاحب۔“

”وِل نواب صاحب۔“ گورنر صاحب مسکرائے ”اور آج میں آپکو اپنا کمال بھی دِکھاؤں گا۔“

”ضرور ضرور“ نواب صاحب مسکرائے ”آج ہم نواب صاحب بہادر کا کمال بھی دیکھیں گے۔“

اور پھر ہم شکارگاہ میں پہنچ گئے۔

"آپ مچان پر بیٹھئے۔"

نواب صاحب نے فرمایا۔ اور ہم چار آدمی مچان پر بیٹھ گئے۔ مَیں۔ وُہ گورنر بہادر اور اُن کے دو آدمی اور۔

"اور آپ ۔۔؟" مَیں نے نواب صاحب سے دریافت کیا اور وُہ بولے۔

"مَیں مچان کے نیچے کھڑا ہو کر گورنر بہادر کا کمال دیکھوں گا۔"

"مگر ۔۔۔"

"تم فکر نہ کرو۔"

نواب صاحب نے میری بات کاٹی اور ہانکا شروع ہُوا۔ کم از کم پچاس ساٹھ آدمی ۔کنستر، ڈھول اور اِسی قسم کی دُوسری چیزوں سے ہانکا کر رہے تھے۔

اور پھر شیر گھنے جنگل سے نکل کر ہمارے بالکل سامنے مچان سے کوئی چالیس گز کے فاصلہ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ وُہ مارے غصّہ کے آگ بگولا ہو رہا تھا۔ شور سے اُس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

"گورنر صاحب ۔۔!" نیچے سے نواب صاحب کی آواز سُنائی دی ۔۔۔ "آپ کا شکار آپ کے سامنے ہے ۔۔"

مَیں نے دیکھا کہ گورنر صاحب بہادر نے رائفل سنبھالی ہی تھی کہ شیر نے بڑی غضبناک نظروں سے اپنی بڑی بڑی اور غصّے میں سُرخ آنکھیں اُوپر مچان کی طرف اُٹھائیں۔

اور یکبارگی اُسکی نظروں کی مقناطیسیت سے گورنر بہادر کی رائفل اُن کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی اور شیر نے رائفل دیکھ کر ایک پُرزور جست مچان کی طرف لگائی اور قبل اس کے کہ وُہ مچان تک پہنچے نواب صاحب نے جو کہ نیچے مچان کے قریب رائفل لئے کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے اپنی رائفل سنبھالی اور پلک جھپکتے ہی ایک زور کا دھماکہ ہُوا اور شیر زخمی ہو کر کوئی مچان سے پچیس گز کے فاصلہ پر گرا اور شور مچانے لگا۔

نواب صاحب نے اُسے مارا نہیں تھا بلکہ اُنہوں نے ہمیں زخمی شیر دکھانے کے لئے اُسے

صرف زخمی کیا تھا اور اب وُہ زخمی شیر تڑپ رہا تھا۔ گرج رہا تھا اور شور مچا رہا تھا۔

اور اُس کے شور اور اُس کے ہنگامے سے پُورا جنگل تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وُہ مارے غُصّے کے پتھروں کو مُنہ میں لیتا تھا اور اُنہیں سُرمہ بنا کر باہر نکالتا تھا۔

اُس کے شور اور اُس کے ہنگامے سے ہم سب کا کلیجہ مُنہ کو آنے لگا۔ پُورا ماحول ایک ہیبت ناک قِسم کے اثر میں ڈُوب گیا تھا۔

درختوں پر پرند شور مچانے لگے تھے اور بندر ٹپکے کے پھل کی طرح درختوں پر سے نیچے گر رہے تھے اور جگہ جگہ سانبروں اور چیتوں کی کُوک سُنائی دینے لگی تھی۔

اور پھر مَیں نے گھبرا کر کہا۔

"نواب صاحب خُدا کے لئے اب اِس کا قِصّہ تمام کیجئے۔ مَیں نے زخمی شیر کی مِثال اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہے۔ خُدا کے لئے نواب صاحب۔"

اور پھر اُس شیر کی نظر نواب صاحب پر پڑی اور وُہ آندھی اور طُوفان کی طرح اُن کے اُوپر جھپٹا اور مَیں نے واقعہ یہ ہے کہ خوف کی وجہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

مَیں زیادہ اِس لئے ڈر گیا تھا کہ نواب صاحب مچان پر نہیں تھے بلکہ نیچے زمین پر کھڑے ہوئے تھے۔ اُدھر سے زخمی شیر نے اپنی پُوری ہیبتناکی کے ساتھ ایک اُونچی جست لگائی اور اِدھر سے نواب صاحب کی رائفل سے گولی نکلی اور دونوں نے بیچ راستہ پر ایک دُوسرے کا اِستقبال کیا۔

شیر نے ایک غضبناک چیخ نکالی۔ وُہ کوئی دو منٹ کے قریب فضاء میں اور اُچھلا اور پھر دھڑام کر کے اُسی جگہ زمین پر گرا اور گرتے ہی سرد ہو گیا۔

نواب صاحب کی رائفل کی گولی نے اُس کا بھیجا پاش پاش کر دیا تھا۔

پیلس پر پہنچ کر نواب صاحب نے بڑی سنجیدگی سے گورنر بہادر سے کہا۔

"آپ باتھ رُوم میں جاکر اپنی پتلون بدل ڈالیئے۔"
اور گورنر صاحب بڑی سعادت مندی کیساتھ باتھ رُوم میں گھس گئے۔

زکی انور

آسمان کے آنسو

چڑیاں اپنے بھیگے پر سمیٹے کارنس پر بیٹھی ہیں۔ بارش اب تک تھم نہیں سکی ہے ابر اور بھی دبیز ہو کر چاروں طرف پھیلتا جا رہا ہے۔ جیسے وہ ساری کائنات کو چھپالے گا۔ اور خدا اپنے بندوں کے گناہ اور ثواب نہیں دیکھ سکیگا! لیکن وہ ثواب دیکھ پاتا ہی ہے کب؟ کبھی نہیں، کسی حال میں نہیں، ہمیشہ گناہ اور صرف گناہ!

بارش نہیں تھمے گی اور میں چھجے پر اپنی چیئر ڈالے یوں ہی پڑی رہوں گی اور چڑیاں اپنے بھیگے پر سمیٹے کارنس پر بیٹھی رہیں گی اور نیچے ڈرائنگ روم میں فلش ہوتا رہے گا اور وہ لوگ اوباش لڑکیوں کے بارے میں باتیں کرتے رہیں گے اور مس شکتی ٹھنڈے اسٹوف پر چڑھی کیتلی سے چائے کے کپ میں سوڈا ملی رم نکال نکال کر انہیں پلاتی رہیگی۔

لیکن وہ سیدھے سیدھے شراب کیوں نہیں پیتے؟

کیا وہ سمجھتے ہیں کہ اب یہ بارش نہیں تھمے گی؟ اور چالیس دن اور چالیس راتیں مسلسل بارش ہوتی رہیگی اور پھر ایک بوڑھا ملاح آئے گا۔ اس کے پاس ایک آرک ہوگا اور وہ ساری ذی روح کا ایک ایک جوڑا اپنے آرک میں رکھ لے گا..... اور پھر ایک بھاری طوفان آئیگا...

وہ طوفانوں سے نہیں ڈرتے، وہ مہذب شہری ہیں اور قانون کی عزت کرتے ہیں شراب

پینا ممنوع ہے ۔ غالباً عورتوں کے بارے میں ابھی اُنہوں نے کوئی قانون نہیں بنایا ہے ۔ نہیں تو اِس وقت مِس شکتی بھی ٹھنڈے اسٹوف پر ایک بڑی سی کیتلی میں چپسی چڑھی ہوتی ۔

اُف کیسی مُوسلا دھار بارش ہونے لگی ہے !

عینک کی ایک کمانی کی جگہ بیا کا دھاگا باندھ کر کان میں پیپٹے رہنے والے ماسٹر جی کلاس میں آگئے اور ہم اُن سے شبیر کے شکار کا کوئی واقعہ سُننے کی اُمید کر رہے ہیں لیکن آج اُن کا موُڈ اچھا نہیں نظر آ رہا ہے اور وُہ کلاس کے کونے میں اپنی بھیگی ہوئی سفید چھتری کھڑی کر کے پُوچھتے ہیں "اِٹ اِز رییننگ کیٹس اینڈ ڈاگس کے معنی ؟" کلاس کے سارے ہاتھ گرے ہوئے ہیں ۔ سارے ہاتھ گرے رہتے ہیں ..... لیکن یکایک ایک ہاتھ اُٹھتا ہے ــــ "شاباش پرتھوی ــــ شاباش" ۔ پرتھوی کھڑا ہوتا ہے ــــ "ماسٹر جی ! یہ بلّیاں اور کُتّے برس رہے ہیں !" ــــ کچھ زوردار بچگانہ قہقہے ــــ ایک زوردار طمانچہ !

"بلّیاں اور کُتّے ؟ ــــ نامعقول ! کچھ روز قبل جو فریز میں نے لکھائے ہیں نکالو ، اور سب کے سب بنچ پر کھڑے ہو جاؤ ..... سب کے سب ۔"

اپنے بھیگے کپڑے سمیٹے ہم بنچ پر کھڑے ہیں ، کلاس کی سب سے شوخ اور چنچل اور پیاری پیاری سی بچّی کہتی ہے ــــ "ماسٹر جی ! ہمارے کپڑے بھیگ گئے ہیں ۔ ہمیں اُمید تھی کہ رول کال کے بعد رینی ڈے ہو جائے گا ، ماسٹر جی ہمیں نمونیہ ہو جائے گا ۔" فلموں کے دیووں کی سی بھیانک آواز میں ماسٹر جی کہتے ہیں ــــ "مر جاؤ ! ــــ بارش ہو گی ہر روز تو کیا ہر روز رینی ڈے ہو گا ؟"

"لیکن یہ میں نہیں کہتا ،" ماسٹر جی کی آواز ایسی ہو گئی ہے جیسے اُن کا گلا بیٹھا جا رہا ہو ۔ "مجھے تو نمونیہ سے بہت ڈر لگتا ہے ..... بیٹھ جاؤ اور فریز یاد کرو ..... سب کے سب بیٹھ جاؤ ..... میرا رام ایسی بارش میں بھیگ گیا تھا ..... اور اُسے نمونیہ ہو گیا تھا اور وُہ ..... اور وُہ ..... "

ہم سب کے سب کم سِن بچّے ہیں لیکن غالباً ہم میں سے ہر ایک ماسٹر جی کا درد اپنے دِل میں

محسوس کر رہا ہے اور سارے کلاس میں پن ڈراپ سائلنس ہسلّط ہو گیا ہے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس سب کے سب جاؤ..... میں نے تمہاری طرف سے بہت سفارش کی، جھگڑا ابھی کیا..... آپ لوگوں کو پڑھانے کی نیت نہیں ہوتی تو بچوں کی وکالت کرتے ہیں۔"

ہے ہے ہے کتنی پیاری آواز ہے چھٹی کی گھنٹی کی!

"ماں سے کہنا، سرسوں کا تیل سارے بدن پر مالش کر دے...... لیکن اگلے بدھ کو سارے فریز یاد ہوں ہاں...... بدمعاش کہیں کے..... بلیاں اور کتے"!

ماتاجی مجھے نیکر پہنا کر سارے جسم پر سرسوں کا تیل مالش کر رہی ہیں۔ لیکن اب کون مالش کرائے گا؟ باپو آ گئے،

باپو آ گئے..... باپو آ گئے۔

گنیش دوڑ کر باپو سے لپٹ گیا ہے اور میں جل رہی ہوں۔

چھوڑو بھی ماتاجی ــ تیل لگا جسم! میں اُن کے ہاتھ سے پھسل بھاگتی ہوں اور باپو کے کندھے پر چڑھ جاتی ہوں۔

"میں تجھ سے بات نہیں کروں گا۔" باپو کی بات میرا کلیجہ چھید دیتی ہے۔

"کیوں باپو؟ ــ آج کی رات میں سارے فریز یاد کر لوں گی۔"

"فریز جائیں چولھے میں ــ تو نے مجھے کلاس میں آج پھر ماسٹر جی کہا تھا نا؟ بدمعاش کہیں کی ــ کیا اس لئے کہ میں تیرا باپ نہیں؟"

"نہیں باپو..... بس یوں ہی باپو..... سچ کہتی ہوں باپو..... تم میرے باپو نہیں تو پھر کون ہیں میرے باپو......"

"رونا بُری بات ہے۔"

باپو مجھے اور گنیش کو مونگ پھلی جیب سے نکال کر دیتے ہیں لیکن میرے آنسو کیوں نہیں

تھمتے؟ جانے کتنی صدیاں بیت گئی ہیں۔ جانے کتنی بار باپو نے کہا ہے رونا بُری بات ہے۔ جانے کتنی ساری مُونگ پھلی انھوں نے مجھے دے ڈالی ہے۔ لیکن میرے آنسو کیوں نہیں تھمتے؟“ شائد یہ آنسو اس لئے نہیں تھمتے کہ عینک کی ایک کمانی کی جگہ سیاہ دھاگا باندھ کر کان میں پہننے والے ماسٹر جی میرے باپو نہیں۔ شائد یہ آنسو اس لئے نہیں تھمتے کہ گنیش میرا بھائی نہیں۔ لیکن ان تلخ حقیقتوں کا احساس ہی مجھے کب ہوا؟ مجھے پہلے سرسوں کے تیل کی مالش کی گئی ہے گنیش کو بعد میں۔ مجھے زیادہ مُونگ پھلی ملی ہے۔ اس لئے کہ میں بڑی ہوں اور گنیش کو کم، باپو کے ایک کندھے پر گنیش سوار ہے تو دوسرے پر میں۔ گنیش کے لئے ہولی میں نئی قمیض آتی ہے تو میرے لئے نئی فراک ۔۔۔۔۔

چندا کی نیّا میں ہو کے سوار، آجا ری نندیا تو نینوں کے دوار۔۔۔

ماتاجی چھ سال کے گنیش کو سُلا رہی ہیں اور میں مچل جاتی ہوں کہ ساری رات جاگتی رہوں گی پر بغیر لوری کے نہیں سوؤں گی — اتّی بڑی میں دس سال کی!

”تیرے لئے لوری نہیں بیاہ کے گیت گاؤں گی۔“

”تُلسی کے بن مت جا رے سنوریا۔۔۔۔۔ تُلسی کے بن مت جا۔۔۔۔ تُلسی کے بن ایک بیٹھی جوگنیا۔۔۔۔ رکھے گی جادو چلائے۔۔۔۔۔“

میرے اندر شرم کا احساس جاگ پڑا ہے اور میں ماتاجی کو نوچنے لگتی ہوں۔

دروازے پر کھڑے باپو ہنس رہے ہیں اور میں زور سے آنکھیں میچ کر پڑ رہتی ہوں اور پھر مجھے نیند آجاتی ہے۔

مجھے گہری نیند آجاتی ہے۔

جانے کب تک میں سوتی رہتی ہوں۔ کہ ایک دن اچانک پرتھوی مجھے جھنجھوڑ کر کہتا ہے ”رما ابھی ابھی کالج میں مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہارے باپو موومنٹ میں پارٹ لینے کے جرم میں اسکول سے الگ کر دیئے ہیں — کیا بات ہے؟“

"سچ ؟ — " مَیں نے کالج سے آکر ابھی کپڑے تک نہیں بدلے ہیں، دوڑ کر ماتاجی کے پاس پہنچتی ہُوں۔ ماتاجی کو یہ خبر پہلے ہی مِل چکی ہے وُہ باورچی خانے میں گم صُم بیٹھی ہیں اور اُن کی آنکھوں سے آنسُو کے قطرے نِکل نِکل کر اُن کے گالوں پر پھسل رہے ہیں۔ میرے کچھ پُوچھنے سے بیشتر ہی وُہ مجھے سینے سے لگا کر پھُوٹ پڑتی ہیں۔

لیکن باپُو شام کے وقت بدستُور مُسکراتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔

"چولھے میں جائے نوکری — جانتی ہو بیٹی رما! — اسے تُم کیا جانوگی، کہتا ہُوں فالتو وقتوں میں کشیدہ کاری کے بدلے اُردو پڑھو — اُردو علم کا خزانہ ہے۔ تُم اِقبال کو کیا جانوگی"

"نہیں باپُو! مَیں نے مسانی کی اور اِنڈیا میں اِقبال کے بارے میں پڑھا ہے وہی نا؟ — سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔۔۔۔" باپُو کا ہنستا چہرہ دیکھ کر گھر بھر کے کمھلائے چہرے دوپہر کے کنول کی طرح کھِل اُٹھتے ہیں اور باپُو چارپائی پر پاؤں چڑھا کر بیٹھ گئے ہیں۔

"سُنو — اِقبال نے — اُسی سارے جہاں سے اچھا ہندوستان والے اِقبال نے کہا ہے۔

ے اے طائرِ لاہُوتی۔ اُس رِزق سے موت اچھی
جس رِزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مطلب یہ ہُوا۔۔۔۔" باپُو ٹھیک اپنے ماسٹرانہ انداز میں شعر کا مطلب سمجھانے لگتے ہیں اور جب وُہ مطلب سمجھا چُکتے ہیں تو ماتاجی کسی قدر خوفزدہ سی ہو کر پُوچھتی ہیں۔

"تو کیا نہیں سچ مچ سکول سے الگ کر دیا گیا جی؟"

"اجی — چُولھے میں جائے نوکری۔" باپُو کا چہرہ اور بھی بشاش ہو گیا۔ "ہاں بیٹی رما! بتاؤ تو باپُو پرائیویٹ کوچنگ اسکول اچھا نام رہے گا یا آدرش وِدیالے۔ یا پھر آدرش پرائیویٹ کوچنگ اسکول؟"

"باپُو پرائیویٹ کوچنگ اسکول!" مَیں اور گنیش تقریباً ایک ساتھ چیخ اُٹھتے ہیں —

"باپُو پرائیویٹ کوچنگ اسکول؟"

"بہت لڑکے آئیں گے، پچاسوں لڑکے اسکول چھوڑ دیں گے، صرف ایک روپیہ ماہوار فیس لوں گا اور سو لڑکے رکھوں گا ـــ گنیش کی ماں ابھی تو مجھے صرف پچاس ملتے تھے اور یہی کوئی بیس ایک ٹیوشن سے ـــ اب سو لڑکے آئیں گے سو لڑکے ...."

ایک طرف سے پندرہ برس کی میں آئی اے کی اسٹوڈنٹ، دوسری طرف سے گیارہ برس کا گنیش باپو کو دبوچ لیتے ہیں۔ باپو کا چہرہ اور بھی بشاش ہو گیا ہے۔

اور میں باپو کو کالج کی روداد سنا رہی ہوں کہ آج پڑھائی وڑھائی کچھ نہیں ہوئی۔ صرف بڑے ہال میں تقریریں ہوئیں اور یہ کہ کل لڑکیوں کا جلوس نکلے گا۔

"کل ہم بھی جلوس نکالیں گے۔ سارے اسکول کے ماسٹر لوگ، دیکھیں کتنے ماسٹروں کو ہیڈ ماسٹر لوگ نکالتے ہیں ـــ کل ہمارا بھی جلوس نکلے گا...." باپو بچوں کی طرح خوش ہیں اور پھر اپنے "باپو پرائیویٹ کوچنگ اسکول" اور ایک سو لڑکوں کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں۔

میں سوچتی ہوں ـــ اب ہمارے چہرے نہیں کمھلائیں گے۔

لیکن دوسرے دن ایک سو کیا ہزاروں لڑکے ہمارے گھر کے سامنے جمع ہیں۔ ایک ہزار لڑکے ہی کیوں؟ ہزاروں جوان، ہزاروں بوڑھے اور باپو ان کے بیچ چارپائی پر پڑے مسکرا رہے ہیں ـــ چارپائی پر پھولوں کا انبار ہے۔ جس کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا ایک بہت ہی مقدس پھول کھلا ہوا ہے ـــ وہ ہے باپو کا بشاش چہرہ..... اور اب باپو کا جلوس نکلنے والا ہے۔

میں ماتاجی کے سینے سے لگی سوچ رہی ہوں۔ "کل ہمارا بھی جلوس نکلے گا!"

اور یہ کہ باپو پرائیویٹ کوچنگ اسکول زیادہ اچھا نام ہے یا آدرش ودیالے یا آدرش پرائیویٹ کوچنگ اسکول۔"

میرے آنسو تھم نہیں پاتے،
یہ آنسو کبھی نہیں تھمیں گے۔

وہ آنسو ہی کیا جو تھم جائیں ؟ !

میں رو رہی ہوں اور پرنسپل مس ماتھر کہہ رہی ہیں ۔

"تم روتی ہو رما ؟ تمہیں فخر کرنا چاہیئے کہ تم ایک بہادر باپ کی بیٹی ہو"

ہاں میں باپو کی بیٹی ہوں، سگی بیٹی، گنیش کی سگی بہن ۔ جس کی پڑھائی جاری رکھنے کے لئے میں نے ایک پرائیویٹ فرم میں سیلس گرل کے لئے درخواست دی ہے اور پرنسپل سے کالج لیونگ سرٹیفکیٹ اور کیریکٹر سرٹیفکیٹ لینے آئی ہوں اور پرنسپل صاحبہ کہہ رہی ہیں ۔

"تمہیں اس بات کا بھی فخر ہونا چاہیئے کہ تم ایک فرض کی ادائیگی کے لئے اپنی تمنّاؤں کا بلیدان دے رہی ہو ۔"

میرا سینہ فخر سے تن جاتا ہے ۔

لیکن میرے آنسو کیوں نہیں تھمتے ؟

اور یہ بارش کیوں تھمنے کا نام نہیں لیتی، لیکن اب یہ چڑیاں اُڑ چکی ہیں اور تاش ختم ہو گیا ہے اور ٹھنڈے اسٹوو پر چڑھی کیتلی خالی ہو گئی ہے اور کئی کاریں لان سے ہو کر نکل چکی ہیں اور مس شکلی کی آواز نہیں آ رہی ۔

میں کون ہوں ؟

جانے کب سے میں یہ دنیا کے ایک ایک آدمی سے پوچھ رہی ہوں لیکن کوئی نہیں بتاتا کہ میں کون ہوں ؟ زیادہ سے زیادہ میرا دل مجھے یہ بتاتا ہے کہ میں مس رما شاستری ہوں، جس کی عمر ۲۷ سال ہے اور جو زندگی کا ایک آخری امتحان دیکر اب تک اس امتحان گاہ میں بیٹھی ہے !

رائے اینڈ رائے کا مالک میرے آتے ہی مسکرانے لگا ہے ۔ جانے کیوں اس کی مسکراہٹ آج مجھے بڑی بھیانک سی لگ رہی ہے ۔

میں جانتی ہوں آج اسکی مسکراہٹ ایسی بھیانک کیوں ہے ۔ میں جانتی ہوں آج وہ گذشتہ دنوں کے سیلز کے بارے میں نہیں پوچھے گا ۔ میں جانتی ہوں آج وہ یہ نہیں سمجھائے گا کہ

سیلس گرل کو چاہئیے کہ ہر ایک کسٹمر کا مسکرا کر استقبال کرے اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ آج وہ یہ نہیں کہے گا کہ چیزوں کی قیمت وصول کرتے وقت ہمیشہ تھینکس کہنا چاہیئے۔

"مس رما شاستری! منشی جی نے آپ سے کچھ کہا تھا؟"

"جی ہاں۔" میں سہم جاتی ہوں۔

"اور غالباً آپ نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ سیلس گرل کی بہ نسبت سیلس بوائے کم قیمت پر ملتے ہیں اور کام بھی زیادہ کرتے ہیں۔"

"جی ہاں۔" میرا سر چکر انے لگا ہے۔

"جب تو آپ بھی کافی عقلمند لڑکی ہیں۔" وہ اور بھی بھیانک مسکراہٹ کے ساتھ میرے پاس آتا ہے اور باپو چارپائی پر بیٹھے بالکل ماسٹرانہ انداز میں اقبال کے اس شعر کا مطلب سمجھا رہے ہیں اور میں دل ہی دل میں سو روپے ماہوار کی در سے اٹھارہ روز کی تنخواہ کا حساب کر رہی ہوں اور جب رائے اینڈ رائے کا مالک میرے کھلے ہوئے بالوں کی ایک پتلی سی لٹ کے قریب اپنی موٹی بھدی انگلیاں لے جاتا ہے تو میرے منہ سے جیسے غیر ارادی طور پر نکل جاتا ہے۔

"سر! آج ۹ تاریخ ہے، ۸ تک کے ساٹھ روپے بنے!"

اس کی آنکھیں شعلے اگلنے لگتی ہیں اور میں دکان سے باہر آجاتی ہوں۔

باہر کی دنیا تاریک ہے۔

ماتاجی کو میں کچھ بتانا نہیں چاہتی، ماتاجی جو شعلہ ہدائت ہیں۔

باہر کی دنیا تاریک ہے۔

گنیش — ایک نو عمر لڑکا ہے، لیکن تاریکی میں وہ ایک کرن ہے۔

اور میں اُسے نہائت ہی رازدارانہ طور پر سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں۔ وہ کہتا ہے۔

"دیدی میں نوکری کروں گا۔"

مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ باپُو کے مرنے کے تیسرے روز بھی اُس نے یہی کہا تھا، جب مَیں رائے اینڈ رائے میں درخواست دے رہی تھی تب بھی اُس نے یہی کہا تھا، جب مَیں کالج سے سرٹیفکیٹ لینے لگی تب بھی اُس نے یہی کہا تھا۔

وُہ یہی کہتا ہے۔ اُسے یہی کہنا چاہیئے۔

لیکن کون کہتا ہے گنیش میرا سگا بھائی نہیں۔ مَیں اُسے نوکری کرنے نہیں دُوں گی۔ مَیں اُسے کبھی یہ سوچنے کا موقع نہیں دُوں گی کہ باپُو مر گئے۔ باپُو جو میرے سگے باپ تھے۔ باپُو جو میرے پتاجی کے دوست تھے۔

لیکن میرے آنسُو کیوں نہیں تھمتے؟

وُہ آنسُو ہی کیا جو تھم جائیں، مجھے بھروسہ ہے میرے آنسُو نہیں تھمیں گے۔ کبھی وُہ بہتے بہتے تھک گئے تو رائے اینڈ رائے کے مالک نے سنبھالا دیا، کبھی بلونت راج جی نے جن کے بچّوں کو میں پڑھانے لگی تھی، کبھی ایک سرکاری افسر نے جس کے دفتر میں مجھے ٹائپسٹ کی جگہ مِل گئی تھی — اور پھر پرتھوی نے جس کا احسان مَیں کبھی نہیں بھول سکتی!

"رما! مجھے معاف کر دو مَیں گھر والوں سے مجبور ہو گیا — سچ کہتا ہُوں سادھنا سے مجھے ہرگز پیار نہیں۔"

اور مَیں کھڑی چپ چاپ سوچ رہی ہُوں — کیا مجھے زندہ رہنا چاہیئے؟

میری بے پناہ خاموشی سے اُکتا کر (غالباً) پرتھوی واپس چلا گیا ہے اور مَیں اب تک سوچ رہی ہُوں — کیا مجھے زندہ رہنا چاہیئے؟

"ہیلو دیدی ڈارلنگ — یک لخت تین خوش خبریاں سُنو۔" گنیش چیختا ہُوا گھر میں داخل ہُوا ہے — "اکٹھی تین خوش خبریاں — مَیں نے تنہا اکسٹھ ۶۱ رن بنائے نمبر ایک — نمبر ۲ دو میں سٹ اپ ہو گیا اب بی اے فائنل کی فیس کی تیاریاں کرو — نمبر تین میری کہانی نے پہلا انعام پایا — دس روپے ...... ماتا جی تین کوئی اچھا شگون نہیں چوتھی خوشخبری

تم سناؤ نا..... کیا میری دیدی ..... سُن ری سکھی موا بجنا بُلائے ......"

گنیش ہنس رہا ہے اور ماتا مُسکرا رہی ہے۔ لیکن مَیں سوچ رہی ہُوں "کیا مجھے زِندہ رہنا چاہیئے ہے۔"

"تمہیں زِندہ رہنا چاہیئے رما بیٹی!"

یہ کِس کی آواز ہے؟ کیا یہ میرے اُس باپُو کی آواز ہے جو ۴۲ء میں شہید ہوئے یا اُس باپُو کی آواز ہے جنہیں مَیں دیکھ بھی نہ پائی؟

"یہ مَیں ہُوں! —" میرے باپُو، جنہیں مَیں دیکھ بھی نہ پائی ہُوں، میرے سامنے کھڑے ہیں — "تمہیں زِندہ رہنا چاہیئے رما بیٹی۔"

مَیں زِندہ رہُوں گی، کم سے کم دو سال مَیں ضرور زِندہ رہوں گی۔

اور مَیں ایک بار پھر زِندہ ہو گئی ہُوں۔

"کوڑے پر کوڑا — بڈھا باپ سے بھی گرا — بولو کیا؟"

میرے ننھے مُنے اسکول کی ننھی مُنّی بچّیاں چیخ اُٹھتی ہیں — "ناریل"

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بُلبلیں ہیں اِس کی ....."

"دیدی پانی کیوں برستا ہے؟ — دادی کہتی ہے آسمان روتا ہے تو پانی برستا ہے۔"

دیدی سوچتی ہیں کیا سچ مُچ آسمان روتا ہے تو پانی برستا ہے؟ کیا سچ مُچ آسمان روتا ہے — کیا سچ مُچ خُدا روتا ہے؟؟؟

لیکن پھر دیدی بتا رہی ہیں پانی کیوں برستا ہے اور کیسے برستا ہے!

یہ اِتنے سارے بچّے! دیدی سوچتی ہیں کیا میرے اپنے اِتنے سارے بچّے ہیں؟ دیدی کو بچّوں سے پیار ہے — بے پناہ پیار۔ وُہ سوچتی ہیں، اگر وُہ سوویت دیش میں ہوتیں تو بارہ بچّوں کی ماں بنتیں اور مدر ہیروئن کا خطاب پاتیں!

اور یہ سوچتے سوچتے میرے آنسوؤں کو جیسے پھر بڑھاوا مِل جاتا ہے

ایک بچی پوچھتی ہے ۔ "دیدی! آپ کبھی کبھی روتی کیوں ہیں؟"
دیدی جھوٹ بولتی ہے ۔ "میری آنکھیں خراب ہیں نا، پانی گرتا ہے۔"
اور میں سوچ رہی ہوں ۔ میرا یہ ننھا منا اسکول کب تک میرا ساتھ دے گا؟"
"دیدی! میں سوچتا ہوں اِس سال ڈراپ کر جاؤں اور کہیں سروس کر لوں۔ آئندہ سال پرائیویٹ سے ایم اے کر لوں گا۔"
"نہیں!" میں جیسے چیخ اُٹھتی ہوں۔
اور میرا ننھا منا اسکول میری طرف حسرت سے دیکھتا ہے۔
تمہارا شکریہ نہ ادا کرنا میری انتہائی احسان فراموشی ہوگی ۔ تم نے مجھے روٹی دی ۔ بلکہ تم نے ہمیں روٹی دی ۔" میں اپنے ننھے منے اسکول کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔
"لیکن گنیش کی فیس؟" میرا ننھا منا اسکول بدستور میری طرف حسرت سے دیکھ رہا ہے۔
رات کو وقت میں ماتاجی سے پوچھتی ہوں۔
"آپ نے ٹھاکر صاحب کو کیا جواب دیا؟"
"بیٹی وہ ایک پرلے درجے کا اوباش آدمی ہے۔" ماتاجی حیرت سے میری طرف دیکھتی ہیں۔
"لیکن میری عمر اب ۲۵ سال سے آگے ہے۔" میں کہتی ہوں۔
یہ کون سی منحوس رات ہے کہ میں ماتاجی سے بحث کر رہی ہوں، اِس ماں سے جو میری ماں نہیں لیکن میں نے ہمیشہ جس کی پوجا کی ہے۔
"تمہیں اچھے سے اچھا بر ملے گا۔"
"تمہیں نہیں معلوم کہ لائے اینڈ ٹرائے کے مالک نے اور اُن تمام لوگوں نے مجھے بدنام کر دیا ہے میں جن کی گرفت سے بچتی رہی۔"
"اِس ہنگامے کی ضرورت نہیں ۔ میں اِس سال ڈراپ کر جاؤں گا۔"
میں گنیش کو ڈانٹ دیتی ہوں اور وہ چلا جاتا ہے۔

اور رات بیت جاتی ہے، لیکن بحث ختم نہیں ہو پاتی۔
اور اب صُبح ہو گئی ہے، اور ماتا جی رو رہی ہیں۔
اور اب شام ہو گئی اور ماتا جی رو رہی ہیں۔
اور پھر وہ شام آگئی ہے جب میں بھی رو رہی ہوں اور گنیش بھی لیکن ماتا جی آنگن میں بمار پائی پر پڑی مسکرا رہی ہیں!

"گنیش! ماتا جی کو میں نے مارا ہے — میں خونی ہوں۔" ماتا جی مجھ سے پہلے ہی چار کہاروں کے سہارے چلی جا رہی ہیں اور گنیش میرے سینے سے لگا بچوں کی طرح رو رہا ہے — "گنیش میں تمہاری ماں ہوں۔" یہ میرے دل نے کہا ہے اور گنیش کے دل نے سنا ہے بس — اور کچھ نہیں۔ اور گنیش دوڑ کر ماتا جی کی ارتھی کو کندھا دے دیتا ہے۔

اور میں سوچ رہی ہوں — کیا مجھے زندہ رہنا چاہیئے؟
ٹھاکر صاحب تسلیاں دینے آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ "تمہیں زندہ رہنا چاہیئے ملا! کون نہیں جانتا کہ تم گنیش کے لئے ماں سے بھی زیادہ اہم ہو!"
"جی ہاں — میں زندہ رہوں گی۔"
"کیا میں تمہیں سہارا دوں؟"
"نہیں — نہیں — نہیں۔" میں چیخ اٹھتی ہوں "میرے اسی خیال نے میری ماں کو قتل کیا اب میں ان کی آتما کو قتل نہیں کر سکتی۔"
ٹھاکر صاحب چلے جاتے ہیں۔
اور میں سوچ رہی ہوں گنیش کی فیس بھرنے کو صرف بارہ دن باقی ہیں۔
اور فیس بھرنے کا آخری دن کتنا بے رحم ہے!
گیارہ دن — دس دن — نو دن — آٹھ — سات — چھ
"کیا تم ایک جگہ رُک نہیں سکتے؟" میں فیس بھرنے کے آخری دن سے پوچھتی ہوں۔

"نہیں — مَیں وقت ہُوں اور وقت بے رحم ہے!"

پانچ دن —

اور پھر مَیں ٹھاکر صاحب کے سامنے کھڑی اُن سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہُوں۔

"ٹھاکر صاحب! —" کیا مَیں اِس سے آگے اور کچھ بولنا نہیں جانتی؟

"ٹھاکر صاحب —"

"ٹھاکر صاحب —"

ٹھاکر صاحب بالکل خاموش ہیں اور آج پھر میرے سامنے ایک بھیانک مُسکراہٹ ناچ رہی ہے۔ لیکن آج مَیں اِس بھیانک مُسکراہٹ سے ڈر نہیں رہی سہم نہیں رہی۔ بوکھلا نہیں رہی حالانکہ یہ مُسکراہٹ رلائے اینڈ ٹرائے کے مالک کی مُسکراہٹ سے کچھ زیادہ ہی خطرناک نظر آ رہی ہے۔

اور میرے لب جیسے کچھ کہنے کے لئے کانپ رہے ہیں اور مَیں کچھ کہنا ہی چاہتی ہُوں کہ میرے ہاتھ میں نوٹوں کی ایک گڈّی آ جاتی ہے۔

یکایک جیسے مجھے گویائی مِل جاتی ہے۔

"لیکن ٹھاکر صاحب، مَیں چاہتی ہُوں ساری زندگی آپ کے سہارے جیتی رہُوں ... ساری زندگی۔"

بھیانک مُسکراہٹ شعلہ فشاں پہاڑ کا سا قہقہہ بن جاتی ہے۔

اور شعلے کہتے ہیں — آج کے بعد مِس رما شاستری کی قیمت ہی کیا رہے گی!"

اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ مِس رما شاستری ایک بھیانک آتش فشاں پہاڑ کے نیچے دب کر مر گئی!

مِس رما شاستری مر گئی!

مَیں مر گئی!

لیکن مِس شکتی کی سی ایک اوباش لڑکی ایک عالیشان مکان کے چھجے پر ایزی چیئر ڈالے

لیتی ہے۔

ایک ماں بارش میں گھری سوچ رہی ہے کہ کب بارش تھمے اور وہ گھر جا سکے، جہاں
اُس کا بچہ اُس کا انتظار کر رہا ہے۔
لیکن بارش نہیں تھمے گی۔
"ڈیڈی! میری دادی کہتی ہے جب آسمان روتا ہے تو پانی برستا ہے۔"
یہ آسمان کے آنسو ہیں
اور وہ آنسو ہی کیا جو تھم جائیں!"

الطاف حسین

وصیّت نامہ

بُوڑھا اِس قصبہ میں کنجُوس کے نام سے مُتعارف تھا۔ ایک زمانہ ہُوا جب اِس کا خاندان قصبہ میں بڑی عزّت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ وُہ اِس خاندان کا آخری فرد تھا۔ اِس کا باپ شام کو جب اپنی نئی بگیّ میں جو اس زمانہ میں امارت کی معراج تھی، قصبہ کی تنگ و تاریک گلیوں میں گھُومنے نِکلتا تو بستی کے لوگ تعظیماً کھڑے ہو جاتے تھے —

بُوڑھا اِس خاندان کی آخری نِشانی تھا۔ وُہ ہمیشہ ایک ہی بیٹھک میں اپنے مکان کی بالائی منزل کی اِس کھڑکی میں بیٹھا رہتا تھا۔ جو سڑک پر کھُلتی تھی — نِیچے کے حِصّہ میں اس کی آبائی دوکان تھی جہاں کِسی زمانہ میں موم بتیاں اور سگریٹ فروخت کئے جاتے تھے۔ لیکن بُوڑھا موم تی اور سگریٹ کے خالی ڈبّوں کو اسی قرینہ سے الماریوں میں قطار اندر قطار اِس طرح جماتا تھا کہ اِس کو پرانے خریدار کبھی کبھار آ ہی جاتے تھے اور سڑے ہوئے سگریٹ اور پھپوندیائی ہوئی موم بتیّاں بربنائے ارادتِ قدیم اور جذبۂ احترام خرید لیتے تھے — دولت اور شہرت کے پر باندھ کر اُڑ جانے کے بعد بُوڑھے نے دوکان کا سارا کاروبار ایک نوکر نیکسٹی نامی کے نام تفویض کر دیا تھا — یہ نوکر کسی زمانہ میں ملٹری میں رہ چکا تھا اور گنٹھیا کا دائمی مریض ہونے کے سبب علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ اُس نے قصبہ میں مشہور کر رکھا تھا کہ بُڈھے کے پاس کثیر سرمایہ ہے

لیکن وہ کنجوس ہے اور خرچ کرنا اس کے مذہب میں حرام ہے اور نوکر کی ان نامعقول خبروں کو بوڑھے کے خاندانی روایاتی اقتدار سے استحکام مل جاتا تھا ــــ بوڑھے کی ایک لڑکی جو لیا تھی، جو پچیس سال پیشتر ایک خوش فکرے کیساتھ بھاگ گئی تھی اور لا پتہ تھی۔

صبح کی نمود کے ساتھ نیکسی، بوڑھے کے سامنے بالکل ملٹری انداز میں کھڑا ہو جاتا۔

" آقا ــــ کیا حکم ہے۔" اور جواباً بوڑھا ایک چونی اس کے ہاتھ میں رکھ دیتا اور چونی دیکھ کر نیکسی سیخ پا ہو جاتا۔

" صرف چار آنہ! ــــ کیا کیا لاؤں گا؟ ــــ چائے کی پتی بھی ختم ہو گئی ہے۔ کیا آج پڈنگ نہیں کھاؤ گے؟"

" میرے پاس صرف یہ ہے ــــ تم اس میں کھانے کا سامان بھی لے آؤ اور چائے کی پتی بھی ــــ "

" میں خوب جانتا ہوں کہ تمہارے پاس صرف یہی ہے! ــــ ان کالے بکسوں کو کب تک لوبان کی دھونی دیتے رہو گے؟" ــــ نیکسی بڑبڑاتا، بھنبھناتا اور منہ سے آگ برساتا ہوا چلا جاتا۔

نیکسی نے یہ خبر قصبہ میں عام کر رکھی تھی کہ بوڑھے کے پاس دو بکس ہیں۔ جنہیں اس نے اپنے سونے کے پلنگ کیساتھ کیلوں سے جوڑ رکھا تھا ــــ وہ ان بکسوں سے کبھی علیحدہ نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی کسی کو انہیں چھونے کی اجازت تھی۔ ظاہر ہے کہ قصبہ کے لوگوں کا گمان صحیح تھا کہ بوڑھے کے پاس کثیر دولت ہونا ہی چاہیئے اور اسی امید کے سہارے کہ صرف نیکسی ہی بوڑھے کا تنہا وارث تھا، قصبہ کے اکثر دوکاندار نیکسی کو قرض دے دیا کرتے تھے ــــ لیکن بوڑھا جوں جوں زندگی کو کھینچتا رہا، قرض خواہوں کا پیمانۂ صبر چھلکتا گیا اور آخرکار ایک دن سب دوکانداروں نے نیکسی کو قرض سودا سلف نہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک دن قصبہ کے چرچ کا پادری دوکان پر آیا۔

"نیکسی! ۔ کیا حال ہے تمہارا اور تمہارے کنجوس آقا کا ۔۔۔ مجھے احساس ہے کہ بوڑھا تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا ۔ لیکن تم پھر بھی اس کی دیکھ بھال اپنے باپ کی طرح کرتے رہتے ہو ۔۔۔ تم بے فکر رہو ۔ تمہیں اس کا بدلہ ضرور ملے گا ۔۔۔ " پادری کہہ رہا تھا ۔۔۔ "اور ہاں نیکسی! ۔۔۔ اُن دونوں بکسوں کا کیا حال ہے؟ ۔۔۔ سب ٹھیک ہے نا ۔۔۔"

"مجھے کیا معلوم ۔۔۔ مقدس باپ!" ۔۔۔ نیکسی نے مایوسی سے کہا ۔ "بوڑھا کمبخت تو ان بکسوں کو کبھی اکیلا بھی نہیں چھوڑتا ۔۔۔"

"خیر تم فکر نہ کرو! ۔۔۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا ۔۔۔" پادری بڑی معنی خیز نظروں سے نیکسی کو دیکھتا ہوا بوڑھے کے پاس چلا گیا ۔

بوڑھا یک و تنہا پلنگ پر پڑا ہوا تھا ۔ اُس کے ہاتھ پاؤں سوجنے لگے تھے اور چہرے پر بیضوی رنگ چھلکنے لگا تھا ۔ بوڑھے نے مقدس پادری کو دیکھ کر تعظیماً اُٹھنا چاہا ۔ لیکن پادری نے اشارہ سے منع کر دیا ۔

"اب تو طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی ہے ۔ اگر ارادہ ہو تو اسپتال داخل کرا دوں؟" مقدس پادری نے دُنیا بھر کی ہمدردی کے تاثرات صرف بوڑھے کے لئے چہرے سے مترشح کرنے کی کوشش کی ۔

"لیکن مقدس باپ ۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بولتا ۔۔۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے اور اسپتال میں داخل ہونے کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے ۔" ۔۔۔ بوڑھے نے بیٹھے ہوئے کہا ۔۔۔ دُنیا بھر کی مایوسیاں اِس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں اور حزن و ملال اِس کے ایک ایک لفظ سے ٹپک رہا تھا ۔۔۔

"لیکن تم کو اس کی فکر کی کیا ضرورت ہے ۔۔۔ وہ سب تو میں ٹھیک کر لوں گا ۔۔۔ ہاں اگر تم اسپتال نہ جانا چاہو تو میں تمہاری دیکھ بھال کے لئے دو نرسیں اسپتال سے بھجوا دوں ۔۔۔

وہ کمبخت نیکسی تمہارا پڑا نا نوکر ہونے کے باوجود تمہاری ذرا پرواہ نہیں کرتا ــــ "

" لیکن مقدس باپ ــــ میں جھوٹ نہیں بولتا میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ نرسوں کا صرفہ میں کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا ــــ " بوڑھے نے کہا ــــ " اِس کمبخت نیکسی نے مجھے تباہ کر ڈالا ــــ دکان کا مال بیچ ڈالتا ہے اور مجھے خبر بھی نہیں ہونے دیتا . . . . "

" پھر وہی ــــ " پادری نے بوڑھے کی بات کاٹتے ہوئے کہا " تم اُس کی فکر نہ کرو۔"
اور پادری کے اِس خلوص کارانہ اظہارِ ہمدردی پر بوڑھا رو پڑا اور پادری چلا گیا ــــ
اور دُوسرے لمحہ پادری نیکسی سے محوِ گفتگو تھا ــــــــــ

نیکسی ــــ اب تمہارے دِن پھرنے والے ہیں ــــ میں کل دو نرسیں بھیج رہا ہوں ــــ وُہ بوڑھے کی دیکھ بھال کریں گی اور اپنا کام بھی بن جائے گا ــــ "

دُوسرے دِن پادری نے دو نرسیں بھیج دیں ــــ اِن میں ایک نوجوان تھی اور ایک متوسط عمر کی ــــ اُنہوں نے گھر میں قدم رکھتے ہی پہلا کام صفائی کا کیا۔ ایک ہاتھ میں جھاڑو اور دُوسرے ہاتھ میں صابن کا پانی اور فینائل دے کر چھوٹی نرس نے نیکسی سے سارا فرش صاف کروالیا اور وہی نیکسی جو ملٹری میں سے صرف سستی اور کاہلی کی بناء پر نکال دیا گیا تھا، نرس کے ہر حکم پر لبیک کہہ رہا تھا ــــ وُہ اِسے اپنا میجر سرجنٹ سمجھنے لگا تھا ــــ وُہ صبح اُٹھ کر سب سے پہلے فرش دھوتا۔ پھر چائے تیار کرتا اور اِس کے بعد کھانا بناتا، غرض سارا دِن کام میں مشغول رہتا۔ اور سونے وقت کھٹمل اور پسوؤں کے مارنے کی دوا گھر کے ہر کونہ میں چھڑکتا۔

دونوں نرسوں نے بُوڑھے کی خدمت۔گذاری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ وُہ صبح بُوڑھے کو نہلاتیں، اُس کے بالوں میں کنگھی کرتیں۔ اُسے چائے پلاتیں اور پھر دن بھر اسے بائبل میں سے کچھ نہ کچھ سناتی رہتیں۔ لیکن بُڈھا سارا دِن صرف "ہاں" اور "نہیں" کے علاوہ کچھ نہ کہتا ــــ ضرورت سے زیادہ آؤ بھگت کا سبب سمجھنے سے وُہ قاصر تھا، بلکہ دِل ہی دِل میں مُقدس باپ کے لئے دعائیں کرتا۔ جس کی خُدا ترسی کے سبب سے اُسے بڑھاپے میں اِس قدر

آرام مل رہا تھا۔

بُوڑھا اب بہت کمزور ہوگیا تھا۔ یعنی عُمر کا ٹٹّو چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں بے حد سُوج گئے تھے۔ آنکھیں بَیٹھ گئی تھیں، چہرے کی جھُریاں سُوکھنے لگی تھیں..... یعنی وہ وقت نزدیک آرہا تھا جب بُوڑھے کو اپنی جائیداد کا وصیّت نامہ تیار کرالینا چاہیئے تھا اور کِسی کو اپنا وارث مقرّر کر دینا چاہیئے تھا —— قصبہ کے دوکانداروں نے بُوڑھے کی طبیعت کا یہ حال سُنکر فِیکسی کو پھِر سے سودا سلف قرض دینا شروع کر دیا تھا اور اب تو کیمسٹ بھی دوائیں اور انجیکشن اُدھار دے دیا کرتے تھے ——

ایک دِن مقدّس پادری بُوڑھے کی مزاج پُرسی کو آیا۔

"بڑے میاں کیسی طبیعت ہے ؟"

"بس جی رہا ہُوں —— یہ صِرف آپ کا کرم ہے کہ زندگی کے آخری ایام اچھّی طرح گذر رہے ہیں — ورنہ وُہ کمینہ فیکسی تو مجھے کبھی کا مار ڈالتا — خُدا بھلا کرے اِن نرسوں کا جن کی بدولت مجھے دُوسری زندگی مِلی۔ مقدس باپ! —— مَیں تُمہارا احسان مرتے دم تک نہ بھُولوں گا —— اور تمہارے حق میں دعائیں کروں گا ——"

"ارے اِس میں احسان کی کون سی بات ہے —— یہ دِن تو سب کو دیکھنا پڑتا ہے ۔"

اور اِس کے بعد دو چار باتیں اِدھر اُدھر کی مِلا کر پادری اپنے کھوئے ہوئے مقام پر آگیا۔

"بڑے میاں ——" پادری نے ہاتھ کمر پر رکھ لیئے اور کُرسی سے اُٹھ کر کھِڑکی کے پاس کھڑا ہوگیا —"تُم نے وصیّت نامہ تو لکھوا لیا ہوگا! ——"

بُوڑھا چونک پڑا! — وُہ بالکل نہیں سمجھ سکا کہ مقدّس باپ کا "وصیّت نامہ" سے کیا مطلب تھا۔ بہر حال اُس نے اپنی اندر کو دھنسی ہُوئی آنکھوں کے پپوٹوں کو بڑی جانفشانی سے اُوپر اُٹھایا اور کہا ——

"مقدّس باپ مَیں آپ کا مطلب نہیں سمجھا ——"

"یعنی یہی کہ تُم نے اپنی ملکیت کا وارث کیسے مقرّر کیا؟ — یعنی وصیّت نامہ.... یعنی وِل WILL......وِل...."

مقدّس باپ میرے آیسے کنگال کے پاس ہے ہی کیا کہ وصیّت نامہ کی ضرورت پڑے. مَیں آپ سے جھُوٹ نہیں بولتا۔ مقدّس باپ! — "

لیکن پادری کو یقین کیسے آسکتا تھا۔ اس کے دماغ میں تو قصبہ کی پرانی روایت یعنی بُوڑھے کے دو بکس چکّر لگا رہے تھے۔ اس نے دِل میں سوچا کہ بُوڑھا کمبخت زندگی بھر مجھے حیران و پریشان کرتا رہا اور اب آخری وقت مجھے بھی سبز باغ دِکھانے کی کوشش کر رہا ہے.

"لیکن تمہیں وصیّت نامہ تو ہر حالت میں لکھوا دینا چاہیئے"۔ بُوڑھے کی طرف پادری نے دیکھا اور نظریں بجائے اُس کے چہرے پر مرتسم کرنے کے اُس کے پلنگ کے نیچے رکھے ہوئے دونوں بکسوں پر بچھا دیں! ——— اور بُوڑھا خرانٹ سب کچھ سمجھ گیا۔ اُس کو یقین ہو گیا کہ اِس قدر آؤ بھگت. خدمت گذاری. مزاج پُرسی. اظہارِ ہمدردی کا سبب ان بکسوں کا بھاری پن تھا. بُوڑھے کے سُوکھے ہوئے ہونٹ پھڑ پھڑائے اور وقفِ تبسّم ہو گئے۔ اُس نے انتہائی سنجیدگی اور متانت سے کہا ——

"کیا اِس کے لکھوانے میں وکیل کی ضرورت نہیں رہتی؟"

"لیکن مَیں حاضر ہُوں — مَیں نے اب تک کئی وصیّت نامے لکھے ہیں. میرے پاس اسٹامپ بھی تیار ہے."

اور اسی کیساتھ پادری نے اپنے بیگ سے کاغذ نکالا اور چشمہ لگا لیا اور قلم کی نوک کاغذ پر پیوست کرنے کے بعد بُوڑھے کی طرف دیکھا —— "آپ اِس وقت صرف حصّہ وار تقسیم کا مسوّدہ لکھا دیں. بعد میں اِسے مَیں مکمّل کر کے رجسٹر کرا لُوں گا.... ہاں فرمایئے کہاں سے شروع کروں میرا خیال ہے کہ اِن کو اپنی عاقبت پہلے سُدھارنا چاہیئے.... سب سے پہلے آپ چرچ کے مقدّس سالانہ جلسہ کے لئے لکھائیں..... فرمایئے کس قدر رقم لکھوں؟"

پادری بڑی بیتاب اور سیماب بداماں نظروں سے بُوڑھے کے ہونٹوں کی جُنبش کا منتظر تھا۔ زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا جب وُہ کسی کے سامنے اِس قدر پُرتاثیر الفاظ میں چرچ کے سالانہ جلسہ کی سفارش میں بہت کچھ کہہ گیا تھا۔۔۔ بُوڑھے کی خاموشی اور چہرے کا مکمل سکُون پادری کی سفارش اور درخواست کی منظوری کی ترجمانی کر رہا تھا۔۔۔ یہی وُہ پہلا آئیٹم تھا جس میں پادری کا مُفاد سب سے زیادہ مُضمر تھا۔۔۔ بُوڑھے کی خاموشی نے پادری کے اضطراب میں اضافہ کر دیا۔ لہٰذا وُہ خود ہی بول اُٹھا۔

"اِس مدّ میں آپکو سوچ وِچار کئے بغیر لکھا دینا چاہیئے۔ کہیئے بیس ہزار۔۔۔ پچیس ہزار۔۔۔؟"
پادری کا جُملہ سُن کر بُوڑھا پھڑک گیا۔۔۔ اِس کے ہونٹوں پر ہنسی رقص کرنے لگی اور اُس نے آنکھیں بھینچ لیں۔۔۔۔

"آپ کا خیال دُرست ہے!۔۔۔" اُس نے فرمانبردار بیٹے کی طرح باپ کے ارشاد میں گردن جُھکا دی۔

"بہت خُوب۔۔۔" پادری مسّرت بے پایاں سے جھوم اُٹھا۔ "مجھے ایسے لوگ بیحد پسند ہیں جو اپنی زندگی میں ہی اپنی عاقبت سنبھال لیتے ہیں۔ یہی ایک سودا ایسا ہوتا ہے جس کا نفع اِنسان کو دُوسری دُنیا میں ابدالآباد تک مِلتا رہتا ہے۔۔۔۔ لیکن پھر بھی اگر آپ تھوڑا سوچ لیں تو اچھا ہے۔۔۔ یہی وُہ مدّ ہے جس کا عطیہ آپ کے کام آسکیگا۔۔۔" پادری کا حرص و طمع بڑھتا جا رہا ہے اور بُوڑھا آنکھیں بند کئے بُوڑھے پادری کی ہر بات کا جواب اثبات میں دے رہا تھا۔۔۔

"آپ کی یہی مرضی ہے تو اِس مدّ کی رقم ڈبل کر دیجیئے!"
اور بُوڑھے کا یہ جُملہ سُنکر پادری فرطِ مسّرت سے ناچنے لگا۔۔۔

"اچھا۔۔۔" پادری نے چشمہ ناک سے آنکھوں کی طرف چڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔ "اِن دونوں نرسوں کے لئے کیا ارشاد ہے؟"

"کیا فرمایا ــــ مقدّس باپ ؟"

"یعنی یہی دونوں نرسیں جو آپ کی خدمت پر ایک ہفتہ سے مامور ہیں۔۔۔۔ آپ پر ان کا بھی حق ہے ــــ"

"تو پھر ان کے لئے بھی اُوپر کی رقم لکھ لیجئے۔"

لیکن بجائے اِس کے کہ پادری کا قلم خود بخود چلنے لگتا، رُک گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بوڑھا جو رقم خرچ کے سالانہ جلسہ کی الگ جبا کر چکا ہے وُہی رقم اِن نرسوں کے لئے کیوں ــــ حالانکہ اِس تقسیم میں بھی ایک تہائی حِصّہ اس کا تھا۔ لیکن پھر بھی بوڑھے کی اس غیر متوقع پیشکش نے اُسے شک وشُبہ میں ڈال دیا۔ بوڑھا پادری کے چہرہ کا اُتار اور چڑھاؤ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ ــــ مقدّس باپ ؟" ــــ اُس نے پُوچھا

"کچھ نہیں ــــ کچھ نہیں۔" اور پادری نے وُہی رقم نرسوں کے لئے محفوظ کرالی۔

"اچھا اب خیرات کے باب میں کیا خیال ہے ؟" ــــ اور اِس کے بعد پادری نے خیرات اور زکواۃ کے باب میں ان کے فوائد، فضیلت اور حسنات پر ایک مختصر سا لیکچر بھی دے ڈالا۔ اُس نے کہنا شروع کیا۔

"یہ راہبوں کی دُعاؤں کا اثر ہوگا کہ بڑے میاں آپکو وہاں تکلیف نہیں ہوگی۔ یہ تمہارے لئے ہر وقت دُعا کریں گے ــــ ان کی دُعاؤں میں بڑا اثر ہے۔۔۔۔۔"

"خیر۔۔۔۔ اِس مد میں پچاس ہزار کافی ہیں۔۔۔۔ ؟" بوڑھے نے پادری کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے ــــ"

"اچھا اب گھر پر آئیے اور آپ کے پرانے نوکر نیکی کے لئے کچھ لکھوائیے ــــ فرمائیے کیا حکم ہے ؟ ــــ"

اور نیکسی کا نام سُنکر بُوڑھا ایک فُٹ اُونچا اُچھل گیا۔ غُصّہ سے اُسکی آنکھیں لال ہوگئیں۔

"مقدس باپ نیکسی کا نام نہ لیجئے۔ اُس نے مجھے برباد کر ڈالا ہے....."

"لیکن پھر بھی وُہ آپ کا پرانا نوکر ہے۔ میرا خیال ہے اُس کے نام پر پچاس کی رقم تو لکھوا ہی دیجئے ـــــ"

نیکسی کنواڑ کے روزنوں سے کان لگائے کھڑا تھا ـــــ کس مدّ میں کتنی رقم لکھائی جا چکی تھی وُہ سُن چکا تھا۔ جب اُس نے اپنے لئے صرف پچاس کا عدد سُنا تو وہ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گیا ـــــ

"میری زندگی بھر کی خدمت کا صلہ صرف پچاس....."

"لیکن نیکسی تم خاموش رہو! ـــــ" پادری نے کہا ـــــ "مَیں تمہارے حق میں بے انصافی نہیں ہونے دُوں گا......"

"مقدّس باپ۔ مَیں سب کچھ سُن چکا ہُوں۔ یہ آپ ہی کی سفارش ہے کہ مجھے برباد ہونا پڑے گا....." نیکسی نے طنزاً کہا۔

"لیکن مَیں تمہیں ایک کوڑی بھی نہ دُوں گا ـــــ" بُوڑھے نے غُصّہ سے کہا ـــــ "مقدّس باپ! یہ روزانہ سگریٹ اور موم بتیّاں فروخت کرتا ہے۔ مَیں اِس کھڑکی میں بیٹھا سب کچھ سنتا رہتا ہُوں اور دیکھتا رہتا ہُوں۔ لیکن یہ کمبخت مجھے ایک دمڑی بھی نہیں دیتا ـــــ"

اور مقدّس پادری کی سفارش پر نیکسی کے لئے ڈھائی سو کی رقم جبا کر دی گئی۔ حالانکہ نیکسی اِس پر بھی اکڑ پھُوں بناتا رہا۔ جُلبلاتا رہا اور مُنہ سے آگ برساتا رہا۔

بُوڑھے کا وصیّت نامہ تیار ہو چکا تھا۔ قصبہ کی ہر گلی میں وصیّت نامہ پر تبصرے اور چرچے ہو رہے تھے۔ نیکسی پادری کو بدنام کرتا پھر رہا تھا۔ جسکی حارص و طلع طبیعت نے اُسے اِتنی بڑی جائیداد سے محرُوم الارث کر ڈالا تھا اور قصبہ کے لوگوں کا بھی یہی خیال تھا کہ مقدّس پادری نے اپنی جھولی بھر لی اور نیکسی کو اُس کا حق بھی نہیں دلوایا۔ لیکن چُونکہ پادری کا پیشہ ہی یہ تھا،

کسی کو زیادہ سوچنے کی ضرورت نہ رہی۔

دوسرے روز سے بڈھے کی دیکھ بھال بڑے ہی اعلیٰ پیمانہ پر ہو رہی تھی۔ نوجوان نرس اُسے ستار پر نغمے سناتی اور دوسری نرس انجیل میں سے قصّے کہانیاں سُناتی۔ بُڈھے کو قیمتی دوائیں اور مرغن تغذیہ مل رہا تھا — علی الصبح مُرغی کے چوزوں کا آبجوش، دوپہر کو انڈوں کا پڈنگ، سہ پہر کو سینڈوچ اور کافی اور شام کو بُھنی ہوئی مصالحہ دار بطخ — لیکن زندگی کی کس قدر آؤبھگت کیوں نہ کیجائے، کسی قدر مرغن غذائیں کھلا کر اسکی چاپلوسی کیجائے، آخر ایک دن دھوکہ دے ہی جاتی ہے — اور ایسا ہی ہُوا — یعنی وصیّت نامہ کے بعد وارثین جس دن کا بڑی بے صبری اور بے قراری سے انتظار کر رہے تھے — تاکہ حق بہ حقدار رسد — وُہ دن آگیا اور بُوڑھا ایک دن علی الصبح اپنے پیش روؤں سے جا ملا اور قبرستان میں ایک قبر کا اضافہ ہوگیا۔

بُڈھے کی تجہیز و تکفین کے بعد، تین دن گزرے کہ مقدّس پادری گھروٹے نیکسی، ایک بڑھئی کے ہاں سے بسولہ، ہتھوڑا اور چھینیاں لے آیا — اُس کا خیال تھا کہ وُہ پادری کے آنے سے پہلے ہی بکسوں کو کاٹ کر دو چار سونے کی سلاخیں نکال لے گا۔ لیکن بکسے اِس قدر مضبوطی سے بند کئے گئے تھے کہ نیکسی کی سب کوششیں بیکار گئیں۔

پادری نے سب سے پہلے مکان کے دروازے بند کر دیئے۔ پھر اُس نے بکسوں کو پلنگ کی سرہانے اور پائینتی والی پٹیوں سے بسولہ اور ہتھوڑے کی مدد سے الگ کیا۔ بکسے بےحد وزنی تھے اور اِس احساس سے پادری کے دل و دماغ میں خُوشی کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ اُس نے ابھی تک وصیّت نامہ کو رجسٹر بھی نہیں کرایا تھا اور وُہ اِسی تگ و دو میں تھا کہ بکسے کھلتے ہی سارا کا سارا مال پار کر دیا جائے!

مکان کے دروازے بند ہونے کے سبب سے ہوا کا رُخ بند ہوگیا تھا اور پادری اور نیکسی پسینے میں غرق ہو رہے تھے۔ پادری نیکسی کو اور نیکسی پادری کو قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا

تھا — اِس حمام میں دونوں ہی ننگے تھے — دونوں بکسے کھلنے سے پیشتر وہ دونوں یہ سوچ رہے تھے کہ ایک کو کسی طرح ختم کر دیا جائے - لیکن اِن میں ایک بُوڑھا تھا پادری اور دُوسرا گنٹھیا کا مریض (فیکسی) — ایک کے ہاتھوں میں رعشہ تھا تو دُوسرے کے ہاتھ ہتھوڑی کا وزن بھی نہیں اُٹھا سکتے تھے — بہر حال وہ دونوں ایک دُوسرے کا مطلب نظروں ہی نظروں میں اخذ کر گئے اور باہمی مفاہمت کے بعد یہ طے ہُوا کہ پہلے بکسے کھولے جائیں اور وصیت نامہ جو کہ ابھی تک مسوّدہ ہے اور رجسٹر بھی نہیں ہو سکا ہے ضائع کر دیا جائے۔

ہتھوڑے اور پسولہ کی ایک ہزار ضربوں کے بعد بکسے کھلے ! — لیکن ....

بکسوں میں سونے کی سلاخیں نہیں تھیں — گنیاں بھی نہیں تھیں ! اور چاندی بھی نہیں تھی — دونوں بکسے پرانے بولٹ، لوہے کے ٹکڑوں، پرانی گھڑیوں کے پیتل کے چکر لوہے کے واشرز — اور بُوڑھے کے والد ماجد کی ٹوٹی ہوئی بگّی کے لوہے کے سامان سے بھرے ہوئے تھے !!!

بکسوں کے اِرد گرد فیکسی، مقدس پادری اور دونوں نرسیں حلقہ بگوش بیٹھے ہوئے تھے اور قصبہ کے قرضخواہ دوکاندار نیچے کھڑے چلا رہے تھے — جولیا بُوڑھے کی دُختر نیک اختر بھی والد ماجد کی وفات کی خبر سُن کر اپنا حصّہ لینے آ گئی تھی۔

(خیال اور پلاٹ انگریزی کہانی سے ماخوذ ہیں)

پال لاگرکوسٹ
مصنف

حیدر جعفری سید
مترجم

لفٹ

دولت مند تاجر مسٹر اسمتھ نے ہوٹل کی شاندار لفٹ کا دروازہ کھولا اور فر میں لپٹی پاوڈر کی خوشبو میں بسی ہوئی عورت کو پیار بھرے انداز سے اندر کھینچ لیا۔ ملائم، اور لچکدار سیلنڈر پر وہ دونوں ہم آغوش ہو گئے۔ لفٹ نیچے چل دی۔ عورت نے اپنے شراب آلود، نیم وا لب آگے کر دیئے اور دونوں نے ایک دوسرے کا بوسہ لیا۔ تاروں بھرے آسمان کے نیچے، ہوٹل کی چھت پر وہ دونوں ابھی عشائیے سے فارغ ہوئے تھے اور اب سیر و تفریح کے لئے کہیں اور جا رہے تھے۔

"سنو! اوپر ماحول کتنا خوشگوار معلوم ہوتا ہے جیسے جنت میں بیٹھے ہوں" دوشیزہ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "نہ جانے کیوں تمہاری قربت حاصل کرنے کے بعد ماحول اسقدر رومانٹک اور شاعرانہ ہو جاتا ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے ہم دونوں اس دھرتی کے باسی نہیں بلکہ آسمان کے تارے ہوں۔ محبت کیا ہے اس کا احساس ایسے ہی لمحات میں ہوتا ہے تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟ کیوں کرتے ہو نا؟"

مسٹر اسمتھ نے اس کا جواب پہلے سے بھی زیادہ گرم اور طویل بوسے سے دیا۔ لفٹ نیچے جا رہی تھی۔

"ڈارلنگ! تم آگئیں۔ یہ بہت اچھا ہُوا۔" مسٹر اسمتھ بولے۔ "ورنہ تم جانتی ہو کہ میرا مُوڈ کتنا خراب ہو جاتا؟"

"ہاں! یہ بات تو ہے لیکن ذرا یہ بھی تو سوچو کہ وُہ آدمی کتنا ضدی اور ڈھیٹ ہے۔ میں نے جیسے ہی چلنے کی تیاری شروع کی حضرت پُوچھنے لگے کہ کہاں چل دیں۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ جہاں جی چاہے گا وہیں جاؤں گی۔ کسی کی غلام ہُوں کیا۔ میری اس بات پر جب تک میں کپڑے بدلتی اور نیا اُونی شال پہنتی رہی وُہ خاموشی سے بیٹھا مجھے بڑی بے شرمی سے گھورتا رہا۔ اچھا تو تم بتاؤ یہ لے رنگ۔ اُونی شال تمہیں کیسی لگتی ہے۔ تمہیں کس رنگ کے کپڑے پسند ہیں؟ گلابی رنگ کے پسند ہوں گے نا؟"

"تمہارے اُوپر تو سب ہی جان پڑ جاتی ہے" مرد نے کہا۔ "لیکن آج تو تم دِل پر بجلیاں گرا رہی ہو بجلیاں!"

اعتماد سے بھرپور مُسکراہٹ کیساتھ اُس نے اپنا فر والا کوٹ کھول دیا۔ پھر وُہ دونوں دیر تک مصرُوفِ بوس و کنار رہے۔

لفٹ نیچے اُترتی رہی۔

"پھر جیسے ہی میں نکلنے کے لئے تیار ہوئی اُس نے کہے سُنے بغیر میرا ہاتھ پکڑ کر اتنی زور سے اُمیٹھ دیا کہ ابھی تک درد ہو رہا ہے۔ تم تو سوچ بھی نہیں سکتے کہ وُہ کتنا اُجڈ اور گنوار آدمی ہے۔ میں نے کہا کہ اچھا بھئی اب چلتی ہُوں تو اُس کافر کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ وُہ اِتنا ضدی اور بے حیا آدمی ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔ اب تو یہ سب کچھ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"اُف" مسٹر اسمتھ نے ہمدردی کا اظہار کیا۔

"جیسے ذرا سا باہر نکل کر دِل بہلانا بھی میری قسمت میں نہیں ہے اور ہاں وُہ ساتھ ہی ساتھ اِتنا گھٹا اور خاموش آدمی ہے کہ تم تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ کسی بات پر سنجیدگی اور اطمینان کیساتھ غور و فکر کرنا تو اُس نے سیکھا ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر وقت زندگی اور موت کا سوال اُس کے

سامنے رہتا ہو۔"

"ہائے تمہیں کتنے مصائب برداشت کرنے پڑتے ہوں گے۔"

"اُف! مَیں نے بیحد اذیّت ناک مصائب برداشت کئے ہیں۔ ہاں بیحد اذیّت ناک۔ مَیں نے جس ضبط وتحمّل کا مظاہرہ کیا ہے کیا کسی اور نے بھی کیا ہوگا؟ محبّت کسے کہتے ہیں یہ تو مَیں تم سے متعارف ہونیسے قبل جانتی بھی نہ تھی۔"

"جانِ من!" اُسے اپنی باہنوں میں سمیٹتے ہوئے مسٹر اسمتھ بولے۔

لفٹ نیچے اُترتی رہی۔

"مجھے محسوس ہونے والی اُس مسرّت کا تصوّر کرو۔" ہم آغوشی کے بعد جیسے ہی تنفس اعتدال پر آیا وُہ بولی۔ "تمہارے ساتھ بیٹھ کر یُوں ستاروں کو دیکھنا اور خوابوں کے جزیروں میں گم ہو جانا .... ہائے! مَیں اِس لمحے کو کبھی نہ بھولوں گی۔ دیکھو بات یہ ہے کہ اب آرنلڈ کیساتھ رہنا ناممکن ہے۔ ہمیشہ اِتنی منحوس اور بزرگ صُورت بنائے رکھتا ہے کہ بس شاعرانہ حِس تو اُسمیں ہے ہی نہیں۔ ویسے بھی شاعری واعری سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اِن باتوں کو برداشت کر لینا واقعی ناممکن ہے ڈارلنگ۔"

"ہاں یہ سب ناقابلِ برداشت ہے — لیکن ...." مُسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھا کر وُہ عورت بولی۔

"یہاں بیٹھ کر ہم اِن تمام فضُول باتوں پر دِماغ سوزی کیوں کریں۔ ہم لوگ تو سیر و تفریح کرنے نِکلے ہیں۔ تُم سچ مُچ مُجھ سے محبت کرتے ہو نا؟"

"ہاں ہاں اِسمیں بھی کوئی شک ہے کیا؟" مرد بولا۔ پھر اُس نے اُس کی کمر پکڑ کر اُسے پیچھے جھکا دیا۔ عورت کا مُنہ کھل گیا۔

لفٹ نیچے اُترتی رہی۔

مرد نے جُھک کر اُس پر بوسوں کی بوچھار کر دی۔ مارے ترنم کے اُس کی رنگت اور

زیادہ سُرخ ہو گئی۔

"آؤ آج کی رات ہم دونوں اِس طرح مُحبّت کریں کہ کسی نے نہ کی ہو" مرد نے سرگوشی کی۔
عورت نے اُسے اپنے جسم سے لپٹا کر آنکھیں مُوند لیں۔

لِفٹ نیچے اُترتی رہی۔

لِفٹ نیچے اور نیچے اُترتی جا رہی تھی۔

آخر مسٹر اسمتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔

"لیکن اِس لِفٹ کو کیا ہو گیا ہے؟" وُہ گھبرا کر بولے "یہ تو رُکتی ہی نہیں۔ نہ جانے ہم لوگ کب سے اِسمیں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں؟ کیوں ہے نا یہ ہی بات؟"

"ہاں جانِ من! میرا بھی یہ ہی خیال ہے کہ ہم لوگ اِس میں کافی دیر سے بیٹھے ہیں۔ وقت بھی تو ہوا کی طرح اُڑتا ہے۔"

یا خُدا! ہمیں اِسمیں بیٹھے بیٹھے زمانہ گُذر گیا۔ آخر اِس کا مطلب کیا ہے۔" اُس نے سلاخوں سے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ باہر سوائے تاریکی کے اور کچھ نہ تھا اور لِفٹ تھی کہ یکساں رفتار سے نیچے گہرائی میں اُترتی جا رہی تھی۔

"اے میرے خُدا! یہ کیا ہُوا؟ جیسے ہم لوگ کسی غار میں اُتر رہے ہوں۔ خُدا جانے کتنی دیر ہو گئی اِس غار میں اُترتے اُترتے۔ اب کیا ہو گا؟"

اُنہوں نے نیچے کھڈ میں جھانکنے کی کوشش کی وہاں بھی سوائے تاریکی کے اور کچھ نہ تھا اور وُہ لوگ اس میں ڈُوبتے جا رہے تھے۔

"معلُوم ہوتا ہے اب تو یہ دوزخ ہی میں پہنچ کر دم لیگی۔" مسٹر اسمتھ بولے۔ "ہائے اللہ" اُس کا ایک بازو پکڑ کر عورت مُنہ بنانے لگی۔ "میری تو جان نکلی جا رہی ہے۔ اِسے روکنے کے لئے ایمرجنسی بریک کھینچو نا؟"

مسٹر اسمتھ نے اپنی پُوری طاقت کیساتھ بریک کھینچا لیکن بے سُود۔ لِفٹ پہلے کی طرح

نیچے اُترتی رہی۔

"اُف! یہ کیا ہوا؟" وہ بڑبڑائی "اب ہم کیا کریں؟"

"ہاں ایسے میں آخر کوئی کرے بھی کیا؟" اسمتھ بولے۔"آفت ہے۔"

دوشیزہ بہت بیتابی سے اُٹھی اور پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

"بس کرو ڈارلنگ بس! اب رو مت! ہم لوگوں کو ذہانت سے کام لینا چاہیئے۔ آؤ ہم دونوں پاس پاس بیٹھ کر دیکھیں کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ لفٹ کبھی نہ کبھی تو رُکے ہی گی اور نہ رُکے گی تو جائے جہنم میں!"

وُہ لوگ بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

"کبھی کسی نے بھی سوچا نہ تھا کہ ایسا ہو گا؟" عورت بولی۔ "ہم لوگ تو جنت کے مزے لُوٹنے نکلے تھے۔"

"ہاں اسی بدبختی کے لئے تو ہم لوگ نکلے تھے۔" اسمتھ نے جواب دیا۔

"تم مجھ سے بیحد محبت کرتے ہو۔ کرتے ہو نا؟"

"ڈارلنگ!" اسمتھ نے اُسے اپنی باہوں میں سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔

لفٹ نیچے اُترتی رہی۔

آخر کار لفٹ اچانک رُک گئی۔ چاروں طرف اتنی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی کہ آنکھیں مارے درد کے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وُہ لوگ اب جہنم میں آ گئے تھے۔

شیطان نے ادب کیساتھ لفٹ کا چھوٹا والا گیٹ ایک طرف سرکا دیا۔

"آداب عرض!" شیطان نے انتہائی عقیدت سے کہا۔ اُس نے اپنی مونچھوں کو بڑے فیشن ایبل طریقے سے سجا رکھا تھا۔ ایک زنگ آلود کیل کے سہارے پونچھ کے بالوں والا حصہ ریڑھ کے اُوپر گردن کے پاس جھول رہا تھا۔

مسٹر اسمتھ اور وُہ عورت دونوں لڑکھڑاتے ہوئے لفٹ سے نکل آئے۔ اُن عجیب و غریب

سایوں سے خوفزدہ ہو کر وہ شعوری طور پر بول اُٹھی ۔ "اے خدا! ہم لوگ کہاں آ گئے!"

خدا نے اُنہیں مطلع کیا ۔ "جہنم کا لفظ جتنا ناگوار معلوم ہوتا ہے اُتنی ناگوار جگہ یہ نہیں ہے۔ مجھے اُمید ہے آپ لوگوں کا وقت مزے سے گذرے گا ۔ غالباً آپ یہاں ایک رات قیام کریں گے ۔"

"جی ہاں! " اسمتھ نے ہاں میں ہاں ملائی ۔ "ہم صرف ایک ہی رات ٹھہریں گے۔ اس سے زیادہ تو ہم لوگ ٹھہر بھی نہیں سکتے ۔"

خوف سے کانپتی ہوئی عورت نے اُسکی کلائی پکڑ رکھی تھی ۔ روشنی کچھ اِس طرح کی سُرخ سبز اور پیلی تھی کہ پہلے تو اُنہیں کچھ دکھائی نہ دیا ۔ اُنہیں ایسا محسوس ہُوا جیسے ہر طرف گرم گرم بو پھیلی ہوئی ہے ۔ جب اُن کی آنکھیں اس روشنی کی عادی ہو گئیں تو اُنہوں نے دیکھا کہ جس جگہ وہ لوگ کھڑے ہیں چوک نما ہے ۔ اُس کے چاروں طرف روشن دروازوں والے مکان، تاریکی میں پھیلے ہوئے تھے ۔ دروازوں پر پردے پڑے تھے ۔ لیکن اُن لوگوں نے دروازوں کی درازوں سے جھانک کر دیکھا کہ اندر لوبان کی قسم کی کوئی چیز سُلگ رہی ہے ۔"

"ایک دُوسرے سے شدید محبّت کرنے والے آپ ہی لوگ ہیں نا؟"

اپنی مخمور آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے عورت نے جواب دیا ۔ "ہم لوگ ایک دُوسرے سے شدید محبّت کرتے ہیں ۔"

"تو آپ اِس طرف تشریف لے چلئے ۔" وہ بولا ۔ "براہِ کرم میرے پیچھے پیچھے چلے آئیے۔"

وہ لوگ جھینپے جھینپے سے بغل والی تاریک گلی میں چل دیئے ۔ ایک پرانی لالٹین گندے دروازے پر لٹک رہی تھی ۔

"اِسی جگہ!" شیطان نے دروازہ کھولا اور ادب کیساتھ لوٹ گیا ۔

وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے ۔ ایک ننگی، موٹی اور خوشامدی قسم کی چڑیل نے اُن کا استقبال کیا ۔ اُسکی چھاتیاں نمایاں طور پر بڑی تھیں اور اُسکی مونچھوں پر پاؤڈر چھلک رہا

تھا۔ وہ انتہائی بھلے انداز سے مسکرا رہی تھی۔ اُسکی مٹر ایسی آنکھوں میں خلوص اور دوستی کے جذبات نمایاں تھے۔ اپنے ماتھے کے سینگوں پر اُس نے چاروں طرف سے چوٹیاں بیٹ رکھی تھیں اور انہیں نیلے ریشمی ربنوں سے باندھ رکھا تھا۔

"اچھا تو آپ ہی مسٹر اسمتھ ہیں اور وہ عورت آپکی محبوبہ ہے نا؟" وہ بولی "اب آپ آٹھ نمبر کمرے میں تشریف لے جائیے۔" اُس نے انہیں بڑی سی چابی تھمادی۔

وہ تنگ و تاریک سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ سیڑھیوں پر پھسلن تھی۔ اوپر دو بلب جل رہے تھے۔ اسمتھ نے آٹھ نمبر کا کمرہ تلاش کیا۔

کمرہ کافی کشادہ اور بُو میں بسا ہوا تھا۔ بیچ میں ایک میز رکھی تھی جس پر گندہ میز پوش پڑا ہوا تھا۔ دیوار کے پاس ایک مسہری بچھی ہوئی تھی۔ اسکی چادر کی سلوٹیں کافی احتیاط سے نکالی گئی تھیں۔

اُنہوں نے سوچا کہ یہ جگہ تو بہت ہی اچھی ہے۔ پھر اُنہوں نے اپنے کوٹ اُتار دیئے اور دیر تک مصروفِ بوس و کنار رہے۔

اُسی وقت ایک آدمی بہت خاموشی کے ساتھ دُوسرے دروازے سے کمرے میں داخل ہُوا۔ لباس تو اُس نے ویٹروں کا پہن رکھا تھا لیکن اسکی ڈِنر جیکٹ بہت خوبصورت سلی ہوئی تھی۔ اسکی قمیض کا اگلا حصہ اِتنا صاف تھا کہ اُس اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ اسکی چال بہت سنجیدہ اور دھیمی تھی۔ چلتے وقت کوئی آواز نہ ہوتی تھی۔ اسکی ہر حرکت مشینی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے دِین دُنیا سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ چہرے کے نقوش میں کوئی لطافت نہ تھی۔ اُسکی آنکھیں جھپکتی نہ تھیں بلکہ سامنے ہی دیکھتی تھیں۔ چہرے پر موت کی سفیدی چھائی ہوئی تھی اور اُسکی کنپٹی پر گولی کا زخم تھا۔ اُس نے کمرے کو درُست کرکے سنگار میز کو صاف کیا اور پھر جھاڑو اور اُگالدان لاکر اندر رکھ دیئے۔

اِن لوگوں نے اُس پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ لیکن جیسے ہی وہ جانے لگا مسٹر اسمتھ

بولے ۔ "غالباً ہم لوگوں کو شراب کی ضرورت محسوس ہوگی۔ ذرا ایک ادھا لے جانا!"

ویٹر عقیدت سے جھکا اور باہر غائب ہوگیا۔

اسمتھ نے اپنے کپڑے اُتارنے شروع کر دیئے لیکن عورت شرما رہی تھی۔

"وہ ابھی واپس آئے گا نا؟" عورت بولی۔

"اُف ایسی جگہوں پر ان باتوں کی پرواہ نہیں کیجاتی۔ بس اب تیار ہوکر آجاؤ۔"

عورت شرمائی لیکن پھر وہ لباس کی قید سے آزاد ہوکر بڑی ادا سے مرد کی آغوش میں آبیٹھی

وہ دونوں کافی لذّت محسوس کر رہے تھے۔

"ذرا تصوّر تو کرو" عورت نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "صرف ہم اور تم، یہ تنہائی، یہ سکون، یہ رومانٹک ماحول.... پھر ہم دونوں کا یُوں بیٹھنا سچ مچ یہ اِس قدر شاعرانہ اور مخمور کُن ہے کہ میں کبھی بھول نہ پاؤں گی۔"

"جانِ من!" مرد نے جواب دیا۔

اور دیر تک بوس و کنار کا سلسلہ جاری رہا۔

کچھ کہے سُنے بغیر وہ آدمی پھر کمرے میں داخل ہُوا۔

بہت اطمینان اور شستہ انداز سے اُس نے گلاس رکھے اور اُن میں شراب انڈیلی۔ لیمپ کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اُسمیں کوئی قابلِ ذکر بات نہ تھی۔ ہاں اُس کے چہرے پر موت کی سفیدی تھی اور ایک کنپٹی پر گولی کا نشان تھا۔

اچانک عورت چیخ مار کر اُچھل پڑی۔

"ہائے اللہ! آرورڈ! تُم ہو؟ یہ تُم ہی ہو نا؟ ہائے اللہ یہ تو مر گیا! اس نے گولی مار کر خودکشی کر لی۔"

وہ شخص ایک بُت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا سامنے گھُورتا رہا۔ اُس کے چہرے پر کسی بھی قسم کے جذبات نہ تھے۔ وہ پہلے کی طرح کرخت اور سنجیدہ تھا۔

"لیکن آر درڈ! تم نے یہ کیا کر ڈالا؟ ہائے اللہ یہ کیا حرکت کر بیٹھے تم؟ پیارے آدورڈ! مجھے اِس بات کا ذرا سا بھی اندیشہ ہوتا تو مَیں گھر ہی پر رہ جاتی! لیکن تم تو مجھے کچھ بتاتے ہی نہیں تم نے اِس سلسلے میں مجھ سے ایک بات بھی تو نہ کہی۔ جب تم ہی نے کچھ نہیں بتایا تو مَیں سمجھتی بھی کیسے؟" اُس کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔

اُس شخص نے عورت کو اِس طرح دیکھا کہ گویا پہچانتا ہی نہ ہو۔ اُسکی نگاہیں گہری، سرد اور اُداس تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُسکی نگاہیں ہر چیز کے آرپار گذر جاتی ہوں۔ اُس کا زرد چہرہ اندھیرے میں بھی نظر آرہا تھا۔ کنپٹی کے زخم سے خون کی ایک بوند بھی نہیں برس رہی تھی۔ صرف ایک گڑھا سا تھا۔

"اُف۔ بھیانک! بھیانک!! وہ رونے لگی۔ "مَیں یہاں نہیں رُکوں گی۔ چلو ہم لوگ ذرا چل دیں۔ میری قوتِ برداشت جواب دیتی جا رہی ہے۔" اُس نے لپک کر فر کا کوٹ، ہیٹ اور کپڑے اپنے ہاتھوں میں دبوچے اور باہر لپکی۔ پیچھے پیچھے اسمتھ تھا۔

نیچے وہی مونچھوں والی چڑیل کھڑی ہوئی اُسی خلوص اور دوستی کیساتھ مسکراتی ہوئی اپنے سینگوں کو اُوپر نیچے ہلا رہی تھی۔

باہر سڑک پر آکر اُنہیں کچھ اطمینان ہُوا۔ اب عورت نے کپڑے پہنے، کمر سیدھی کی اور ناک پر پاؤڈر ملا۔ پھر وہ لوگ چوک میں آگئے۔

شیطانِ اعظم وہیں چہل قدمی کر رہا تھا۔ وہ لوگ دوڑ کر اُس کے پاس پہنچے۔

"آپ لوگوں نے بڑی عجلت سے کام لیا۔" وہ بولا۔ "اُمید ہے وقت اچھا گذرا ہوگا۔"

"اُف! بڑی بھیانک جگہ تھی۔" عورت بولی۔

"نہیں نہیں۔ یہ نہ کہیئے۔ لیکن آپ اِس طرح نہیں مانیں گے۔ اگر آپ پُرانے زمانے میں آئے ہوتے تو بات کچھ اور ہوتی۔ اب تو دوزخ میں ایسی کوئی بھی چیز نہیں ہے جسکی شکایت کی جاسکے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اِس جگہ کو زیادہ سے زیادہ فرحت بخش

بنانے کے لئے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے۔ پہلے تو یہاں بالکل دُوسرا ہی معاملہ تھا۔"

"جی ہاں!" مسٹر اسمتھ بولے۔" آپ کا بیان حقیقت پر مبنی ہے جو کچھ بھی ہے اس میں پہلے سے زیادہ اِنسانیت ہے۔"

"جی ہاں!" شیطان بولا۔" ہم لوگوں نے تو اب تمام چیزوں میں جدّت پیدا کر دی ہے جو چیزیں جیسی ہونی چاہئیں اُنہیں ویسا بنانے کے لئے ہم نے ہر ممکن کوشش کی ہے۔"

"بے شک! بے شک! آدمی کو وقت کا ساتھ دینا ہی پڑتا ہے۔"

"جی ہاں! آجکل جو تھوڑی بہت زحمت ہوتی ہے وُہ صرف رُوح ہی کو ہوتی ہے۔"

"اِسے بھی خُدا کا فضل و کرم سمجھا جائے۔" عورت بولی۔

شیطان اُنہیں مؤدّبانہ انداز سے لفٹ تک لے آیا۔

"آداب عرض!" اُس نے بہت نیچے جُھک کر کہا۔" پھر کبھی تشریف لائیے گا!" اس کے بعد اُس نے سلاخوں والا گیٹ کھینچ دیا۔ لفٹ اُوپر چل دی۔

خُدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے اِس بلا سے پیچھا چھُوٹا۔" دونوں نے سیٹ پر ایک دُوسرے سے چپٹتے ہوئے سکھ کی سانس لی۔

"اگر تم نہ ہوتے مَیں یہاں سے بچ کر نہ نکل پاتی۔" عورت نے سرگوشی کی۔

مرد نے اُسے اپنے سے اور قریب کر لیا۔ دیر تک بوس و کنار کا سِلسلہ جاری رہا۔ جب تنفس اعتدال پر آیا تو عورت بولی۔" ذرا سوچو تو اُس کمبخت نے یہ کیا کر ڈالا ؟ لیکن اس کے دماغ میں ہمیشہ اِسی قسم کی واہیات باتیں بھری رہتی تھیں۔ وُہ کسی بات کو اطمینان اور سنجیدگی سے تو سوچتا ہی نہ تھا۔ جیسے اُس کے سامنے ہر وقت زندگی و موت کا سوال قائم رہتا ہو۔"

"سب بکواس ہے۔" مسٹر اسمتھ بولے۔

"کم از کم مجھے تو بتا ہی دیتا۔ مَیں رُک جاتی۔ آج کے بجائے ہم لوگ کسی اور رات کو چلے چلتے۔"

"ہاں ہاں اور کیا؟" مسٹر اسمتھ نے جواب دیا۔ "ہم لوگ کسی اور بھی دن چل سکتے تھے۔"

"خیر چھوڑو بھی! اب ان بیکار باتوں پر سر کھپانے سے کیا فائدہ۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا!"

"ہاں ڈارلنگ۔ اب تو سب کچھ ہو ہی چکا ہے۔" مرد نے اُسے اپنی باہنوں میں سمیٹ لیا۔ لفٹ اُوپر چڑھتی رہی۔

صمد حمیدی

کشمکش

ویمن کالج ہوسٹل میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ بانکی پور اور مراد پور کی سڑکیں تھکی تھکی سی نظر آتی تھیں۔ مسافروں کا اژدہام اور ریلا پیلا بہت کم ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی موٹروں، بسوں اور رکشاؤں کے گزرنے کی آواز آجاتی تھی۔ اکّا دکّا راہگیر بھی نظر آجاتے تھے۔ آوارہ کُتے بھونکتے، اور ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہے تھے۔

"ٹُن ٹُن" سائیکل رکشا رُک گیا اور شاہدہ گل خیر خمار آلود نگاہیں ڈالتے اتر گئی ——

سلام جناور(؟) نے الوداعی بوسہ دیا۔

"شب بخیر! اے گلوں کی نکہت۔ بادِ بہاری شب بخیر۔"

"شب —— باخیر، اے میرے گل چیں، شب باخیر" اُس نے چبا چبا کر ایک ایک لفظ کو ادا کیا۔

پھاٹک کے پاس پہنچ کر اُس نے آواز دی۔

"کرما سنگھ دروازہ کھولو، کوئی خاص بات؟"

"آیئے اندر آیئے مِس صاحبہ، بڑا بھجال ہو گیا، سپرنٹنڈنٹ صاحبہ آپکو پوچھ رہی تھیں"

"اوہو پھر تو غضب ہو گیا۔" اُس نے اپنی کھوپڑی بجانے کی کوشش کی۔ پورے ہوسٹل میں

خاموشی چھائی ہوئی تھی، اُس نے پنجوں کے بل چل کر سیڑھیاں طے کیں اور اپنے کمرے میں آ کر بستر پر گر پڑی۔

سپرنٹنڈنٹ۔ مس کلپنا سنہا نے ٹارچ کی روشنی ماری۔

"تو آپ آگئیں مس شاہدہ۔ میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

شاہدہ گل خیر بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ دوسری کمرے والیاں بھی جگ چکیں۔

"مس شاہدہ۔ آج آپکو آخری بار وارننگ دیتی ہوں۔ آئندہ پھر کبھی ہوسٹل کے قانون کو توڑنے کی کوشش کی تو آپکو یہاں سے نکال دیا جائے گا۔ یہ تعلیم گاہ ہے۔ تفریح گاہ نہیں، سمجھیں۔"

مسز سنہا غصّے میں بڑبڑاتی چلی گئیں۔

شاہدہ گل خیر کا چہرہ فق ہوگیا۔ اتنی ساری سہیلیوں کے درمیان اسکی سُبکی برداشت سے باہر تھی۔

"ہاہاہا" قہقہہ بلند ہوا۔

"اری مکرمہ سنتی ہو بھئی"۔ جوگن بن جاؤں گی سیّاں تیرے کارن جوگن بن جاؤں گی۔

"ہو ہو ہو" مکرمہ نے لقمہ دیا۔ "نہیں شبلا تم نے سُنا نہیں وہ جو چچا غالب فرما گئے ہیں

؎ عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

"تو کیا یہ سب وحشت اور شہرت کے انداز ہیں؟"

"اور کیا۔؟"

ہاں بھئی جوانی دیوانی کا دوسرا نام ہے۔

؎ ایک ہم ہیں کہ کوئی لیتا نہیں ہماری خبر
ایک وہ ہیں کہ پلکوں پر بٹھائے جاتے ہیں

"تو آپ شاعری کب سے کرنے لگیں ؟"
"جب سے یہ عشق کے آزار ہوئے ۔"
"اُوئی اللہ مجھے چھیڑو مت ، مجھے عشق کا آزار ہی سہی ۔"
"شاہدہ باجی سچ سچ کہئیے گا وہ کیسے ہیں ؟"
"مَیں کیا جانوں ؟ تم دیکھ لینا ، کل وہ آنے والے ہیں ۔"
رضیہ فردوس گرامفون ریکارڈ کی طرح بجنے لگی ۔

ع اے بادِ صبا کچھ تُو نے بھی سُنا ، وہ کون ہے مہمان جو آنے والے ہیں ۔

"چلو سو جاؤ مجھے زیادہ مت ستاؤ ۔ مجھے نیند آنے لگی ہے ۔"

شاہدہ گل خیر کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے ۔ ابا اماں کی سرد مہریاں یاد آنے لگیں پتہ نہیں نزہت نے کون سا افسون پھونک دیا ہے کہ ابا اماں اُسی کی طرفداری کرتے نظر آتے ہیں ۔ جب دیکھو نزہت ، نزہت ۔ میرے تو سنتے سنتے کان پک گئے ۔ اُس نے سوچا ۔

"اسمیں شک نہیں نزہت اُن کے اشاروں پر چلتی ہے ۔ دن کہیں تو دن اور رات کہیں تو رات مانتی ہے ۔ یہی تو مجھ میں اور اسمیں فرق ہے ۔ مَیں خود سر ہوں اور وہ فرمانبردار ۔ میری پڑھائی کے لئے بھی کم رگڑے جھگڑے نہیں ہوئے ۔ لیکن مَیں جاہل مطلق بھی تو نہیں رہ سکتی تھی ۔ آخر انٹرمیڈیٹ کیا تھا تو گریجویشن اور ایم اے کرنا بھی ضروری تھا ۔ اب تو صرف سال بھر کی بات ہے پھر مَیں ہوں گی ــ ایم اے کی ڈگری ہوگی اور پیارا سلام ہوگا ــــ"

"سلام ؟" اُس نے سوچا ۔

"سلام جعفری بھی اپنے وقت کے کم ذہین اسٹوڈنٹوں میں نہیں ۔ یونیورسٹی میں اوّل آنے والا کیا اُس کا مستقبل کم شاندار نہیں ہوگا ۔ لیکن میاں جی کو اب ریسرچ کی سوجھی ہے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کرنا چاہتے ہیں ۔۔۔۔

ہائے اللہ جدھر دیکھو پڑھائی ۔ لیکن پڑھائی کی بھی ایک عمر ہوتی ہے ۔ کیا بڈھے کھوٹے

کو لالا لگام اچھا لگے گا۔ عمر کا بیش قیمت حصہ اگر پڑھائی اور مستقبل سنوارنے میں برباد کر دیا جائے تو لاحاصل بات ہے۔ یقینہ صحت و سلامتی کے حصول میں گذر جائے گا ہی۔ زندگی کی مسرتیں اور خوشی نہ پہلے حاصل ہوئی تھی نہ آخر ہو گی۔ لیکن آج کل کے نوجوانوں کو کون سمجھائے۔ خالی خولی مستقبل کے پیچھے مارے پھرتے ہیں۔ اس امیدِ موہوم پر کہ مستقبل کے سنورتے ہی ایک اچھی بیوی خدمت گذاری کے لئے مل جائے گی۔ لیکن قسمت والے ہی کو ایسی بیوی ملتی ہے —— زیادہ تر مثالیں تو دیکھنے میں آتی ہیں کہ خوبصورت شوہر کے پلّے چاندی سونے کی اینٹوں سے لدی بدصورت بیوی باندھ دی جاتی ہے۔ اسی طرح بدصورت مردوں کے حصّے میں بعض وقت خوبصورت عورتیں آ جاتی ہیں۔ تو کیا ایسی شادی کامیاب ازدواجی زندگی قرار دی جا سکتی ہے؟ ہائے میں کیسے یقین کر لوں لیکن سلام جعادری کو ان سب چیزوں کا خیال نہیں —— بس سر پر پی ایچ ڈی کا بھوت سوار ہے —— سلام جعادری —— گورا چٹا رنگ، نازک اندام —— ہم لڑکیوں سے کم نفاست پسند اور نازک مزاج نہیں —— بات بات پر روٹھنا اور منانا کوئی اس سے سیکھے۔ تو ظاہر بات ہے اس سے نباہ کتنی مشکل چیز ہو گی —— لیکن میں اللہ ماری۔ سب چیزوں کو جانتے ہوئے کیوں اسی کا ہر وقت دم بھرتی رہتی ہوں۔ کون سا جادو اس نے کر دیا ہے کہ میں اس کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکتی؟ —— ہائے ہائے میں لٹ گئی۔ برباد ہو گئی۔ میرے ندیم آج میں نے کتنا اصرار کیا کہ چلو ذرا صنعتی اگزبیشن ہی دیکھ آئیں لیکن اڑیل ٹٹو نہ مانے —— کہنے لگے۔ "نہیں پکچر ہی چلیں گے۔"

نہ پکچر دیکھتے نہ اتنی دیر ہوتی اور نہ مسز سنہا کی یہ پھٹکار سننے میں آتی —— یہ سب انہی کے کارن ہوا۔ وہ مجھے بے عزت کروا چھوڑیں گے شاید —— اگر ان کے یہی طور طریقے رہے تو میں کہیں منہ دکھلانے کے لائق نہ رہوں گی —— رقیبہ فردوس —— مکرمہ —— شہلا اور شیلا کیسے چہک چہک... اور چمک چمک کر مجھے الّو بنا رہی تھیں —— جیسے میں نادان بچی ہوں۔ کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ کل وہ آئیں تو میاں جی کی وہ خبر لوں گی کہ وہ بھی کیا یاد کریں گے —— !!

جماہی لے کر وہ سو رہی ـــ سو کر اُٹھی تو بڑی بڑی آنکھوں میں سرور ناچنے لگا ـــ رضیہ فردوس نے کنول کے ہونٹوں پر اپنا مکھڑا رکھ دیا۔

"چھوڑو بھی، مجھے یہ مذاق پسند نہیں ہے"

وہ جھنجھلا کر برس پڑی ـ شیلا و نایاب ـ مکرمہ ـ مس پردھان کھلکھلا کر ہنس پڑیں

"ہاں ابھی کیوں پسند آئے گا، اب تو اُن ہی کا مذاق پسند آئے گا ہے"

پیر پٹخنتی وہ غسل خانے میں گھس گئی۔ نکلی تو پھوار پڑ رہی تھی۔ اور فضا میں مستی چھائی تھی ـــ خادمہ نے ایک ملاقاتی کارڈ لا کر دیا۔

"سلام جعفری ایم اے۔"

"ملاقات کے کمرے میں وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں ہے"

"اچھا چلو میں ابھی آئی۔"

سکھیاں اور ساتھ میں پڑھنے والیاں سب اُسے گھورنے لگیں۔ ٹھوکے مار کر اشارہ کرنے لگیں۔

"ارے دیکھو تو وہ کون آیا ہے بھلا ہے"

ملاقاتی کمرے کے آمنے سامنے لڑکیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ گذرنے لگے۔

سلام سب کو گھورتا اور نظریں نیچی کر لیتا۔

"بڑے بھولے ہیں بیچارے جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔"

"دیکھتی ہو کیسی بھیگی بلّی بنے ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں ستّر چوہے کھا کے ....."

شاہدہ گل خیر بجلیاں گراتے آئی اور ایک طرف کو بیٹھ گئی۔

"آپ بڑے بے صبرے ہیں، سویرے ہی سویرے چلے آئے ـ ہے"

"کیوں نہیں آتا۔ اب تو سب چین و قرار آپ نے چھین لیا ہے، میرے پاس لٹنے کے لئے بچا ہی کیا ہے ہے"

"کیا میں ڈاکو ہوں جو اِس طرح کا اِلزام مجھ پر رکھنے لگے!"
"اِس سے بھی زیادہ — کیونکہ آپ کا مارا پانی بھی مشکل سے پیئے گا؟"
کھلکھلاکر سب ہنس پڑیں۔ ایک شور مچ گیا۔
"ڈاکو —— ڈاکو —— ڈاکو"
شاہدہ گل خیر غصّے سے جلتی بھُنتی مُلاقاتی کمرے سے نکلی اور سیڑھیاں طے کرنے لگی —
سلام چغادری مُنہ لٹکائے ہوسٹل کے پھاٹک سے باہر جاتا نظر آیا —
"شریر کہیں کی — چین سے دو گھڑی بات بھی کرنے نہیں دیتیں۔ آفت کی پر کالائیں بلکہ شیطان کی خالائیں ہیں سب۔"
خیالات میں کھویا وُہ آگے بڑھتا گیا، رکشا والے نے آواز دی۔
"بابُو صاحب ذرا دیکھ کر چلیئے۔ مراد پور کی سڑکیں کم گنجان نہیں؟"
شاہدہ نے گن گن کر سبھوں سے بدلہ لینا شروع کر دیا۔
"پھر کبھی ایسا کرو گی۔ بولو۔ جواب دو نہیں تو ٹینٹوا دبا دبا کر آدھ موا کر دُوں گی۔"
"نہیں باجی۔ نہیں۔ چھوڑو بھی اللہ قسم۔ ہم سے غلطی ہوئی۔"
"سلام صاحب کیا تاثرات لے کر گئے ہوں گے۔ سوچو تو سہی؟ خواہ مخواہ سبکو بدنام کروایا۔ آئندہ سے کوئی شریف آدمی کس طرح یہاں پھٹک سکیگا۔"
"نہ پھٹکیں گے نہ سہی۔ یہاں کوئی مانجھے میں اُن کے لئے بیٹھا نہیں ہے۔"
"پھر وہی شہ زوری، تُم ایسے نہ مانو گی مسرّت۔؟"
"میری اچھی باجی جانے دو۔ یہ تو کہو کیا کیا باتیں ہوئیں؟"
"پھر وہی بک بک —؟"
کلاس میں اُس کا دل نہ لگا۔ ہر پہر کے تصوّرات کے گھوڑے پر سوار سلام نظر آیا۔
صوفیہ نے ٹوکا۔ "کیوں باجی کس دُنیا کی سیر کر رہی ہو؟"

"کچھ نہیں بھئی۔ اب کہاں بھٹکوں گی —— وہ زمانہ تو لدگیا جب خلیل خاں فاختہ اُڑاتے تھے۔ اسکول اور کالج لائف بھی کیسی بے فکری اور بے خبری کا زمانہ ہوتا ہے۔ تت نئی شرارتیں اور شگوفے دلوں میں کھلتے اور پھوٹتے رہتے ہیں۔

—— ہائے ہائی ڈے روڈ۔ گوتم بدھا مارگ —— میں تجھے اب کہاں ڈھونڈوں —— کیسی شاندار اور سدا بہار جگہیں تھیں یہ بھی —— واللہ —— شام ہوئی اور میں گلشن آسا کے یہاں پہنچ گئی۔ ان کے بھیا جیسے منتظر ہوتے —— آنکھیں بچھاتے اور سرآہیں کھینچ کر شعر پڑھتے۔ ع تڑپ اے دل۔ تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے۔ خاک تسکین ہوتی ہے۔ شاعر بھی بعض وقت کم غیر منطقی باتیں نہیں کرتے۔ یہاں تو زخم کو کُریدنے سے ٹیسیں ہی اٹھتی ہیں —— کیا اسی کو تسکین کا نام دیا جا سکتا ہے۔ فرخ تم کہاں ہو۔ محبت کی اولین شمع میرے دل میں روشن کرنے والے۔ میرے محبوب۔ میرے دیوتا ——"

اُس نے سینے کو تھام لیا۔ زور زور —— ماتیوں میں زیروبم ہونے لگا۔

"بیوفا تُم نے محبت کی قدر نہ کی۔ کلی کو مسلنا اور روندنا ہی تم نے سیکھا —— دامِ تزویر میں لاکر خوش چینی ہی کو تم نے معراج قرار دیا —— حالانکہ یہ محبت نہیں —— نفسانیت اور جذباتیت تھی۔ میں بھی کیسی احمق تھی جو اُسکی چکنی چپڑی باتوں میں آکر ماں باپ گھر، جائیداد سبکو چھوڑ چھاڑ کر بمبئی کی سڑکوں کی خاک چھاننے جا پہنچی —— بمبئی —— عروس البلاد —— فلمی ستاروں کی خوبصورت نگریا —— جس کو دیکھ کر نرگس۔ مینا۔ مدھوبالا۔ اور ثریا بننے کا خواب دیکھتی۔ حالانکہ ثریا۔ مینا اور مدھوبالا بننے کے لئے جن پگڈنڈیوں سے ہوکر گذرنا پڑتا ہے کیا کوئی شریف عورت اور لڑکی اسکی متحمل ہو سکتی ہے۔ فلمی دنیا ظاہرا جتنی دلکش اور قوس و قزح کی مانند دکھائی پڑتی ہے اندر سے اتنا ہی کھوکھلا اور بے مُرا ہے یہاں ہر شخص کی زندگی پر سونے کا ملمع کیا ہوا ہے جو قرض اور انکم ٹیکس کے بوجھ سے لدا ہوتا ہے آج کا لکھ پتی کل کا بھکاری ہے —— فرخ۔ تمہارا خدا بھلا کرے۔ تم نے میری آنکھیں کھول

ڈالیں۔ ورنہ میری خوش فہمیاں آج بھی غلط فہمیوں کا باعث بنتیں اور میری ادھوری تعلیم کبھی بھی تکمیل کے مراحل طے نہیں کرتی — یہ سچ ہے میرے چلے جانے کے بعد اماں ابا کی کم تھڑی تھڑی نہیں ہوئی۔ شہر میں اس کا کم چرچا نہیں ہوا۔ لیکن خدا اماں کی عمر دراز کرے۔ سب بدنامیوں کو گھول کر پی گئیں۔

"بیٹی! جو ہو چکا اس سے توبہ کرو اور آئندہ سے قسم کھاؤ پھر کبھی ایسی بھول چوک نہیں ہوگی۔"

"شاہی! میں اس لائق تو نہیں کہ تمہیں سمجھاؤں۔ خیر بیٹی اتنا ضرور کہوں گا کہ اب اپنے آپ کو اس لائق بناؤ کہ لوگ تمہارے ماضی کو بھول کر صرف مستقبل کی بات کریں۔" ابا کی آنکھوں میں آنسو تیر آئے۔ شاہی ابا کے سینے سے لگی رونے لگی۔

"چلو بیٹی اندر چلو۔ اب میں دنیا سے مقابلہ کی تاب رکھتا ہوں، پہلے کے جیسا رہو سہو۔ کھاؤ پیو۔ لکھو پڑھو۔

کتابیں پھینک کر نزہت نے آپا کو دیکھتے ہی پکارا۔

"آپی — مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں —"

"کہیں نہیں نزو — کہیں نہیں — یہیں تو تھی۔"

دونوں بہنیں گلے لگ کر خوب روئیں۔

اس نے انٹرمیڈیٹ کے بعد گریجویشن کیا اور ایم اے کے لئے یونیورسٹی چلی آئی —

"اماں نے کم مخالفت نہیں کی — کیا پڑھتے پڑھتے بڈھی ہو جاؤ گی لڑکیو!

"میرے بھی ارمان ہیں ان کو بھی نکالنے کا موقع دو —"

"امی — تھوڑی مدت اور سہی صرف تھوڑی مدت۔"

ابا شاباشی دینے لگے "میری اچھی لاڈلی — میری ہونہار سپوت! — خوش رہو۔ سدا خوش۔"

اچھلتی کودتی وہ ٹینس ٹیبل پر جھک گئی اور بال کو ہٹ کرنے لگی۔ نزہت نے جوابی

پھٹ گیا۔

اماں ابا کھڑے دیکھتے رہے۔

"ہیرے۔ ہیرے" — دونوں نے تالیاں پیٹیں

"بہت خوب۔" ڈاکٹر گل خیر فرطِ انبساط سے دوہرے ہو گئے۔ شاہدہ کا چہرہ فخر سے تن گیا۔ نزہت بھی تابڑ توڑ جواب دیتی گئی۔

"بس باجی بس — اب مجھ میں دم نہیں رہا۔"

رفیعہ شاہین نے جھنجھوڑا "چلو باجی اٹھو۔ کب کا کلاس ختم ہو گیا —

"دور چھت پر نظریں گاڑے کیا پڑھ رہی ہو —"

شاہدہ کو جیسے ہوش آگیا۔ سرمگیں آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا کلاس ختم ہو گیا؟"

"ہاں باجی سن نہیں رہی ہو — بہری تو نہیں ہو گئیں۔"

ہوسٹل آکر اسکی طبیعت اور پریشان ہو گئی۔ شام کو لائبریری روم تک بھی اس سے جایا نہ گیا — دربان کی معرفت سلام نے پرچی بھجوائی۔

"کیا شاہدہ صاحبہ مجھ سے ناراض ہیں جو شمعِ رخ کی زیارت کو میں شام سے ترستا ہوں ۴ بجے ہمارے ہوسٹل میں نہ آئیں حالانکہ وعدہ تھا۔ کہیئے تو میں حاضرِ خدمت ہو جاؤں۔ لیکن آنٹی کی پرکالاؤں سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہو سکے تو آج رات ۹ بجے کسی طور الفسٹن پہنچئے۔ وہیں سے پروگرام طے کریں گے۔ دیکھئے خبردار کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ نہیں تو آپ ہوسٹل سے نکلیں گی سو الگ۔ میں بھی کم بدنام نہیں ہوں گا — ویسے آج آپ کو فرصت بھی ہے سپرنٹنڈنٹ صاحبہ سے کوئی بہانہ کر کے آ ہی سکتی ہیں —"

آپ کا اپنا منتظر
سلام

خادمہ اور دربان کو ملا کر وہ ہوسٹل سے باہر نکلی۔ تھوڑی دیر پیدل چل کے اُس نے رکشاء کر لیا اور الفنسٹن جا پہنچی۔ سلام جغادری فلمی پوسٹروں پر نظریں جمائے راہ تک رہا تھا۔

"ہلو شاہدہ تم آگئیں۔"

"ہلو"

ٹیکسی کر کے دونوں نے اگز بیشن روڈ کے ہوٹل ڈی لکس کا رُخ کیا۔ دروازہ کھلا۔ چرّر چرّر کی آواز پیدا ہوئی اور دونوں بالائی کمرے میں آکر دم لینے لگے۔

"شاہدہ کچھ تو کہو۔ یہ زبان پر تالے کیوں ہیں؟"

"سلام پیارے۔ میں سوچتی ہوں کہیں تم مجھے دھوکا تو نہیں دے رہے؟"

"ارے آج تم کیسی باتیں کرنے لگی۔ نعوذ باللہ۔ تمہیں اِس طرح کا گندہ خیال سوجھا کیسے۔ کیا یہ ممکن ہے بھلا — میں اپنی شاہو کو دھوکا دوں — یہ کبھی نہیں ہو سکتا — ؟"

"دیکھو باتیں بنانا چھوڑو۔ سچ سچ بتاؤ یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے؟"

"اِس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا؟" سلام نے شاہدہ کو گود میں بھر لیا۔ لب لعلیں کے بوسے لینے شروع کر دیئے۔ کپکپاتی آواز سے شاہدہ نے پکارا۔

"ٹھہریئے، آگے بڑھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں تو آپ کی ہوں ہی۔ شادی کے بعد جی بھر کر پیار کر لیجئے گا۔"

دونوں کے لب ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔

ہڑبڑا کر اس نے گھڑی دیکھی۔ چار بج چکے تھے۔ جلدی جلدی تیار ہو کر اُس نے شاہدہ کو جگایا۔

"شاہدہ اُٹھو بھئی؟"

شاہدہ نے زوردار انگڑائی لی۔ "کیا صبح ہونے کو آگئی؟"

"جی جناب؟"

دونوں الگ الگ رکشاؤں میں سوار ہوسٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ لان کے پاس پہنچ کر طبیعت میں سرخوشی پھوٹنے لگی۔ نسیمِ سحر نے خفتہ جذبات کو برانگیختہ کرنا شروع کر دیا۔

شاہدہ "آؤن۔ آؤن" کرنے لگی۔

"کیوں بھئی کیا ہوا؟ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو عرض کروں، یہ کفر توڑ انگڑائی پتہ نہیں کس کس کی جان لے۔۔؟"

"چپ رہیئے۔ آپکو تو موقع ملنا چاہیئے بنانے کا۔ نہ آدمی دیکھتے ہیں نہ آدم زاد۔"

رکشاء والا مسکرانے لگا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"ٹن ٹن" سے رکشاء لان کے گرد چکر لگانے لگا۔ روپک، ایجنٹ۔ الفسٹن اور گول گھر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے وہ مراد پور اور بانکی پور کی سڑکوں پر مڑ گئے۔ اس کے کانوں سے ناقوس اور اذان کی آوازیں ٹکرانے لگیں۔ ادب سے دونوں نے سر جھکا لیا اور خوش آئند تصورات میں کھو گئے۔

شاہدہ گل خیر اپنے ہوسٹل کے پاس اتر گئی، سلام بھی اپنے کمرے میں پہنچ کر کھویا کھویا سا نظر آنے لگا۔

شکیل الرحمان نے ٹوکا۔

"کہو دوست آج کل تو بالائیوں پر ہاتھ صاف کئے جا رہے ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب صاف ہے، آپ انجان بننے کی کوشش مت کیجئے۔ مجھے سب خبر ہے؟"

"آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے، جا کر کانکے میں اس کا علاج کرائیے۔"

"جی بہت بہتر جناب، آپ کے مشورے کا بہت بہت شکریہ؟"

نادم۔ منظر۔ انور۔ حسن۔ نفیم وغیرہ سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

سلام جیسا دری خجالت محسوس کرنے لگا، اس نے دوسری طرف منہ کر لیا

دِن بیتتے گئے ــــ راتیں ــــ دنوں میں ڈھلتی رہیں۔ اِمتحان دیکر شاہدہ اپنے گھر لوٹ گئی۔ اُس نے خط لکھا۔

"پیارے سلام!

آئیے جلد چلے آئیے ــــ اماں ابا آپ کو جلد دیکھنا چاہتے ہیں ــــ مَیں آپ کی بُری طرح کمی محسوس کرتی ہُوں ــــ آنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سب کچھ وہاں ہی رہ گیا ہے ــــ میری قسم، میری جان و محبّت کی قسم دیر مت کیجئے گا۔ فوراً ٹرین پر سوار ہو جائیے گا۔"

صرف آپ کی

"شاہی"

سلام نے جلدی جلدی سامان دُرست کیا اور گاڑی میں سوار ہو کر گیا کے لئے روانہ ہو گیا۔ اسٹیشن پر شاہدہ ــ گل خیر ــ نزہت ــــ اور اُن کے ابّا پیشوائی کے لئے موجود تھے۔

"تسلیمات عرض ہے قبلہ؟" اُس نے مؤدبانہ سلام کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے گلے لگا لیا۔

"خُوش رہو ــ میرے قرۃ العین ــ خوش رہو ــــ مجھے شاہی نے سب کچھ تبلا دیا ہے مَیں انسپکٹر جعفری کو اچھی طرح جانتا ہُوں۔ اُن سے میرے پرانے مراسم ہیں ــــ؟"

"جی آپ کا کرم ہے ورنہ میں کہاں آپ کی عنائتوں کا سزادار ہوں ــــ؟"

گھر پہنچ کر اماں نے وارا۔

"جُگ جُگ جیؤ میرے بیٹے ۔ جگ جگ جیؤ "

خوشی کی لہریں پُورے گھر میں دوڑ گئیں۔ جسکو دیکھو ہشاش بشاش نظر آنے لگا۔ خُوب دھوم دھڑکے سے قاضی صاحب کو بُلایا گیا اور سلام و شاہدہ کے سہرے کے پھُول کھِل اُٹھے۔ ــــ دونوں مسرور ایک دُوسرے کو دیکھنے لگے۔

"چالاک لومڑی ــ تم نے مجھے خُوب شکنجے میں جکڑ لیا ــــ زیرِ دام لانا خوب جانتی ہو

اب میری پی۔ ایچ۔ ڈی کا کیا ہوگا ــــ ؟"

"اب آپ کی پڑھائی ختم ــــ اب تو میری ناز برداری شروع ہوگی۔"

"ادھو یہ تیور ہیں ــــ تو ابا میاں سے کہو ــــ کوئی کارخانہ کھلوادیں پھر ہم دونوں ٹھاٹھ سے زندگی گذاریں گے۔"

"وہ بھی ہوجائے گا، آپ دیکھتے تو جائیے آگے آگے ہوتا ہے کیا!"

دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ سلام نے شاہدہ کے پھول سے رخسار کو چوم لیا۔

دونوں ہنی مون منانے رانچی جا پہنچے۔ جہیز میں ملی کار کو سرپٹ دوڑاتے پھرتے ــــ ہنڈرو فال کانکے ــــ جہاز کوٹھی ــــ

جب دونوں سیر کو نکلتے تو سلام کو ایسا محسوس ہوتا جیسے کرائے کے ٹٹو پر بیٹھا ٹخ ٹخ کر رہا ہو ضمیر بھی بعض وقت کم لعنت ملامت نہیں کرتا۔ سوچتا۔

"یہ سودا بازی اچھی نہیں رہی۔ ایک انسان کو اتنا ڈیمورلائز (DEMORLISE) نہیں ہونا چاہیئے۔ کیا مجھے ایسا کرنا لازم تھا۔ ہائے میرے تصورات ــــ میرے خواب و خیالات سب کہاں جاکر مدفون ہوگئے۔ ہائے میں اب کیا کروں، کہاں جاؤں اب تو راہ فرار بھی نظر نہیں آتا۔ بیڑیاں راستہ روکے کھڑی ملتی ہیں ــــ ؟؟"

طمانیت قلب کے لئے اس نے ایک کالج میں لیکچر شپ قبول کر لی لیکن سکونِ دل پھر بھی میسر نہ آسکا۔ شاہدہ کی جدائی بھی اکثر شاق گذرتی۔

"شاہدہ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں رہ سکتا۔ چلو میرے ساتھ چلو۔"

"جی آپکو کس نے یہاں سے جانے کو کہا۔ آپ شوق سے یہاں رہیئے سہیئے۔ منہ کیھئے۔ کہیئے تو میں خیکٹری آپ کے نام کروادوں ؟"

"نہیں شاہدہ نہیں۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، میں یہاں رہنا نہیں چاہتا ــــ ؟"

"جی آپ کیا فرماتے ہیں ؟"

"۔ میں ٹھیک عرض کرتا ہوں ۔۔۔ ؟"

دونوں بھک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، نزہت نے آکر طلسم توڑا۔

"دولہا بھائی چلئے پکچر چلیں۔ بڑی اچھی تصویر لگی ہے۔ پیاسا"

"پیاسا" سلام جعفادری نے دہرایا اور غٹا غٹ پانی کا پورا گلاس پی گیا۔

سامنے والے مکان سے جھگڑے کی آواز آ رہی تھی۔

"بے شرم، کمینے، باپ کا گھر سمجھ لیا ہے، جا، نکل جا، اپنی بیوی بچوں کو لے کر نکل جا ۔۔۔ کتا ۔۔۔ کہیں کا ۔۔۔ ؟"

علی بن ایاز
مترجم

....
مصنف

کفارہ

کمرہ میں خاموشی اور بلا کی گرمی تھی۔ سگریٹ کا دھواں مرغولوں کی صورت میں بند کھڑکیوں اور دروازوں سے ٹکراتا ہوا میز سے لگے بیٹھے شخص کے سر پر چکر لگا رہا تھا۔

اسے نہ گرمی کا احساس تھا اور نہ اس دھند کا جو دھوئیں سے پیدا ہو رہا تھا۔ وہ ہر شے سے بے خبر تھا، سوا ان کاغذوں کے جو اس کے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی وہ پنسل اٹھاتا اور پیڈ پر کچھ لکھتا جاتا۔ اکثر اس کا ہاتھ سگریٹ کی طرف بڑھتا، جیسے وہ جلتی ہوئی سگریٹ سے جلا لیتا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ کب کھڑکی کھلی اور کب ایک بچی کمرہ میں داخل ہوئی اور اسے گھورتی کھڑی ہو گئی۔ مکان پر مرغابیوں کے شور اور سمندر کی سرسراہٹ نے اسے خبردار کیا۔ کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

آواز ہلکی تھی۔ سمندر کی موجیں ہلکے ہلکے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس نے اس وحشی جانور کی طرح جو خطرہ کی بو سونگھ لیتا ہے سر کو جھٹکا دیا۔ آہستہ آہستہ اس کے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو گیا اور وہ کرسی پر ایسے سیدھے بیٹھ گیا جیسے شیر حملہ کے لئے چھلانگ لگانے کو ہوتا ہے۔

جب اس نے بچی اور اس کے عقب میں کھلی کھڑکی کو دیکھا تو اعصاب کے تناؤ میں تبدیلی آ گئی اور تناؤ ڈھیل آ گیا۔ لیکن آنکھوں میں غصہ اور درشتی اب بھی باقی تھی۔

"تم یہاں کیسے؟" اس نے درشتی سے کہا، "چلو، اپنا راستہ لو — باہر۔"

لیکن بچّی کھڑی رہی، گھورتی ہوئی، اُنگلیاں چُوستی۔ اسکی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اِس پر جمی ہوئی تھیں...... جیسے کوئی پرستار اپنے دیوتا کو گھُورتا ہے۔

وُہ جانتا تھا کہ یہ ایک پناہ گزین بچی ہے۔ اِن پناہ گزینوں کا پڑاؤ پتھر کی کان کے پاس لگا تھا۔ اِن کی جھونپڑیاں کھڑکی سے دِکھائی دیتی تھیں۔ یہ جھونپڑیاں اِس بڑی چٹان پر لگی تھیں جس کے نیچے وادی میں گاؤں آباد تھا۔

گاؤں والے اِن پناہ گزینوں سے خُوش نہ تھے۔ مقامی روزناموں میں چھپنے والے خطوں سے ظاہر تھا کہ جھونپڑیوں اور الگنیوں کی وجہ سے اِس پہاڑی گاؤں کا حُسن کافی متاثر ہُوا ہے۔

لیکن مقامی لوگوں کی ناراضگی پر وُہ کِسی نہ کِسی طرح قابُو پالیا کرتا تھا۔ کسی کو بھی اِن پتھر کی کانوں میں کوئی عجیب بات یا قدرت نظر نہ آتی تھی۔

یارک شائر اور ویلز میں بھی لوگ اِسی طرح احتجاج کرتے رہے تھے۔ بہرحال آئندہ نو مہینوں میں اِس کان کا کام ختم ہو جائے گا اور گاؤں والے چین کی بنسی بجائیں گے۔

اِس نے بچّی کی جانب نظر کی۔ اِس کا لباس پہلے سے زیادہ خراب تھا۔ اِس کی دیکھ بھال کرنے والا تھا ہی کون؟

گون جو وُہ پہنے تھی ایسے کپڑے کا تھا جو اِس کی کم عُمری کے لحاظ سے بالکل نامناسب تھا۔ یہ گون تھیلے کی طرح اِس کے جسم پر جھُولتا تھا۔ گون کے دامن کی سلائی کی طرف ایسے معلوم ہوتا تھا کِسی نے دھیان دیا ہی نہیں۔ پاؤں برہنہ اور میلے۔ سیاہ بال، کنگھی اور تیل سے محرُوم جٹے بن رہے تھے

بچّی نے یکایک اپنے مُنہ سے اُنگلیاں نکال لیں
"تم کنگ آرتھر ہو نا؟" [1]

---

[1] کنگ آرتھر، انگریزی ادب کا ایک افسانوی کردار ہے۔ کہتے ہیں کہ وُہ انگلستان کا بادشاہ تھا۔ اِس نے جماعت بنائی تھی جو مظلوم عورتوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ اِسکے اراکین کو "نائٹ" یا "سر" کا خطاب دیا جاتا تھا۔

وُہ چونک گیا۔ بچی کی بات پر نہیں، بلکہ اس پر کہ وُہ صاف انگریزی بول رہی تھی۔ اسٹیفان کے سوا سارے پناہ گزین اپنی اپنی بولی میں بات کرتے تھے۔ وہ اپنی رسم و رواج سے بُری طرح چپٹے ہوئے تھے۔ اپنی زبان کی سختی کیساتھ حفاظت کرتے تھے۔ انمول آبائی ترکہ کی طرح بعض وقت اسے غصّہ آجاتا کہ وُہ وقت اور زمانہ کیخلاف چل رہے تھے۔ جب کبھی وُہ انہیں کوئی حکم دیتا تو وُہ بھیڑوں کی طرح اس کا مُنہ تکتے رہ جاتے تھے۔

اس نے اِن لوگوں کو ایک فہرست بھی بنا کر دی تھی۔ خاص خاص جُملوں اور الفاظ کی لیکن یہ جُملے اور یہ الفاظ اِن کی زبان پر نہ چڑھتے تھے۔ وُہ بولنے کی کوشش کرتے اور ناکام رہ کر ایک دوسرے کی صُورت مٹ مٹ دیکھتے رہ جاتے۔ مگر عورتیں ــــ وُہ کھِل کھلا اُٹھتیں۔

بعض اوقات مُوڈ ٹھیک ہوتا تو وُہ سوچتا۔ بیچارے ــ لے دے کے اِن کے پاس زبان ہی تو رہ گئی ہے۔ وہ اِس سے چپٹے نہ رہیں تو کیا کریں گے۔

اب اس نے بچّی سے پُوچھا۔

"تُم نے انگریزی کہاں سیکھی؟"

"میری ماں نے سکھایا۔ وُہ بھی تُم جیسے پیلے بالوں اور گلابی رنگ والی تھی۔ اس نے ہی مجھے کنگ آرتھر اور اس کے نائٹس کے بارہ میں بتایا کہ وُہ خُوبصورت عورتوں کو مصیبت سے بچاتے تھے۔ کیا تُم نے کبھی کسی عورت کو بچایا ہے؟"

بچّی کے اِن الفاظ نے اس کے چہرہ کا سارا خُون سوت لیا۔ وہ اس کی طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے کوئی بھُوت کو دیکھ رہا تھا۔ یکا یک وُہ کانپنے لگا۔ جیسے جیسے وُہ خُود پر قابُو پانے کی کوشش کرتا ویسے ویسے اس کا لرزہ بڑھتا گیا۔

یکایک دروازہ کھُلا۔ اس کی بیوی اندر آگئی۔ ایک ہی نظر میں اس نے صُورتِ حال کو بھانپ لیا۔ وُہ جلدی سے بچی کی طرف بڑھی۔

"یہاں سے چلی جاؤ۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "اسے یہاں سے لے جاؤ۔"

"آؤ ننھی میرے ساتھ آؤ۔" عورت نے ملائمت کیساتھ کہا۔ "چلو باورچی خانہ میں چائے پئیں گے۔" بچی نہائت فرمانبرداری کے ساتھ اس کے ہمراہ ہولی۔ لیکن جاتے ہوئے پھر اس کی طرف ایک نظر ڈالی۔ وہ اب کرسی پر میز کا سہارا لئے بیٹھا تھا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میز پر اضمحلال کی حالت میں رکھے تھے۔

ایک گھنٹے کے بعد جب بیوی اس کی طرف آئی تو اسے اسی حالت میں بیٹھا پایا۔

"جانِ من" اس نے نرمی کیساتھ کہا، اپنی باہیں اس کے گلے میں حمائل کر کے اس کا سر اپنے سینہ سے لگاتے ہوئے کہا "کیا بات تھی۔ بچی نے کیا کہا؟"

اس نے ایک طویل مرتعش سانس کھینچا، اور آہستہ سے اسے اپنے سے جدا کرتے ہوئے لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"وہ مجھے کنگ آرتھر سمجھتی ہے۔ مجھ سے پوچھتی تھی کہ حال میں میں نے کسی خاتون کی مدد کی اور اس کی جان بچائی ہے۔" اس نے جھرجھری لے کر کہا۔ "اچھی دل لگی ہے، ہے نہ؟"

وہ ہنس پڑا۔ لیکن کتنی خوفناک تھی اس کی ہنسی۔ تلخ اور حرمان سے بھرپور۔ پھر اس نے اپنی بیوی کے چہرہ پر نظر ڈالی اور یکایک ساکت ہو گیا۔

لارا مورس گڑھیا سی عورت تھی۔ سر پر بھورے بال بادل کی طرح سایہ فگن رہتے تھے۔ آنکھیں کشادہ، جن میں رحم و شفقت بھرپور تھی۔ اس کو دیکھنے والا فوراً اسکی خاطرداری اور حفاظت پر کمربستہ ہو جاتا تھا۔ شائد اس کا شوہر ہی جانتا تھا کہ اس منحنی اور نازک جسم میں کیا کڑا کی کیسی فولادی سختی ہے۔ اس صلابت کی جسمانی نزاکت پردہ دار تھی۔ اس کی ہی مضبوطی تھی کہ وہ اس سخت چوٹ کو سہہ گئی۔ جس نے شوہر کی کمر توڑ دی تھی۔

لارا کی آنکھوں سے تشویش جھانکنے لگی۔ پریشانی میں اس کی انگلیاں کمر کی پیٹی سے کھیلنے لگیں "لارا۔" شوہر نے کہا۔ "اتنی پریشان نہ ہو۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ مجھے یہ بات پریشان

کر رہی ہے کہ وُہ ایسی اچھی انگریزی کیسے بول لیتی ہے۔ وُہ کون ہے؟"

"اس کا نام روزی ہے۔" اسکی آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کر وُہ مُسکرا دی اور کہنے لگی "ہاں وُہ گلاب سے زیادہ چنبیلی دِکھائی دیتی ہے۔ اس کی ماں انگریز تھی یہی وجہ ہے کہ وُہ انگریزی اتنی صاف بول لیتی ہے۔ ماں شاید اپنی بچپن کی کتابیں بھی اپنے ساتھ لیتی گئی تھی۔ کیونکہ روزی کو اینڈرس، اُلائس ان ونڈر لینڈ، کنگ آرتھر اور اس کے درباریوں کی کہانیاں یاد ہیں۔ وُہ کہتی ہے کہ اس کے ماں باپ بلوہ میں مارے گئے۔"

"لیکن وُہ یہاں کیسے آگئی؟"

لارا نے اپنے کندھوں کو جُنبش دی۔ "مَیں اسے کیمپ میں لے گئی اور اسٹیفان سے دریافت کیا وُہ پہلو بچا رہا ہے۔ مَیں سمجھتا ہُوں کہ وُہ سرحد پر آوارہ اکیلی پھر رہی تھی۔ میریا اور اس کے شوہر نے اسے اُٹھا لیا اور اپنی بچی کہہ کر ساتھ لیتے آئے۔

"لیکن میریا کے خود اپنے دو بچے ہیں۔ چنانچہ وہی اس بچی کی دیکھ بھال کر لیتی ہے یعنی جب بھی اس کا خیال آتا ہے مجھے معلوم ہُوا ہے کہ وُہ بچوّں میں مقبول نہیں ہے کیونکہ وُہ انگریزی بولتی اور اس مُلک کو اپنا مُلک کہتی ہے۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے غُصّہ سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اس کی پرواخت ہی نہیں کرتا ہے۔ اور۔۔۔"

وُہ رُک گیا اور کندھوں کو جنبش دے کر رہ گیا۔ یہ حرکت بھی اس کے لئے ایک بھاری کوشش معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بے چینی کے ساتھ کہا۔ "شاید وُہ اپنے آدمیوں میں ہی ٹھیک ہے اگر کوئی اس کے ساتھ کچھ سلوک کرنا چاہے تو شائد سب مِل کر یہ اصرار کریں کہ یہ بچیّ میریا کی ہے اور شائد میریا بھی سرکاری عہدہ داروں کے سامنے حلف اُٹھانے کے لئے تیار ہو جائے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" لارا نے اوپری دِل سے کہا۔ کہ پناہ گزین ایک کام سے دُوسرے کام پہ بدلی ہوتے رہتے ہیں۔ سب کی بدلی ایک ساتھ ہی ہوتی تھی۔ وہ عہدہ داروں سے بہُت

گھبراتے تھے - انہیں یہ خوف لگا رہتا تھا کہ ان کی جماعت منتشر اور خاندان بکھر جائیں گے۔

لارا نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ روزی کے ساتھ حتی المقدور سلوک کرے گی - ایلن جب کام پر چلا جائے گا تو بچی کو گھر لے آئیگی - بہر حال وہ روزی کو ایلن کی نظروں سے دور رکھنے کی کوشش کرے گی -

"ایلن چلو ٹہلنے چلیں۔" اس نے یکایک کہا۔

ایلن نے سر کو نفی میں جنبش دی - ابھی بہت سارا کام پڑا ہے۔ کل برسنے لگنے ہیں جس کے لئے انتظام کرنا ہے - مجھے یہ کام ختم کرنا چاہیئے۔

"تم بھول رہے ہو۔ سات بجے ٹام آنے والا ہے۔"

ٹام کمپنی کے شعبۂ انجینیرنگ کا منیجر تھا - یہ مقررہ اوقات میں گاؤں کے انتظامات اور حالات کا معائنہ کیا کرتا تھا - وہ ان کا پرانا دوست اور ان کی شادی میں دولہا کا رفیق بھی رہا تھا۔

"اوہ جب تک میں کام ختم بھی کر لوں گا۔" اس نے اضطراب کے ساتھ کہا۔ "اگر ختم نہ ہو بھی تو ٹام میری مشکل کو سمجھ جائے گا۔"

وہ میز کے پاس بیٹھ گیا - ہاتھ بڑھا کر سگریٹ اٹھایا اور ایک کش زور سے لیا - لارا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری "تم اس قدر محنت کیوں کرتے ہو؟" اس نے آہستہ سے پوچھا مگر وہ اب کام میں منہمک ہو چکا تھا - وہ اپنے سوال کا جواب خود جانتی تھی۔

کام سے فارغ ہوا تو اس وقت ۸ بج رہے تھے اور جب وہ وہاں سے اٹھا تو ڈرائنگ روم میں لارا کی ہنسی ٹام کی گھمبیر آواز میں مدغم سنائی دی۔

اسے تعجب ہوا کہ لارا ہنس بھی سکتی تھی - ایک لمحہ کے لئے یہ بات بہت تلخ معلوم ہوئی وہ حیران تھا کہ آخر وہ کیسے ہنس سکتی تھی - جبکہ ان کی زندگی سے مسرت ہمیشہ کے لئے چلی گئی تھی۔ اس کے لئے تو اب ہنسی نہ رہی تھی - وہ جانتا تھا کہ وہ اب کبھی نہ ہنسے گا۔

اس نے بیٹھک کا دروازہ پہلے سے کھولا - ٹام لارا کا سگریٹ سلگھا رہا تھا - ایک ہاتھ

لارا کی کرسی کے گرد تھا اور لارا کا ہاتھ شعلہ کو سنبھالنے کے لئے ٹام کے ہاتھ کو سہارا دے رہا تھا۔

اس نے جلدی ہلکے سے دروازہ بند کر دیا۔ باورچی خانہ سے ہوتا ہوا پچھلے دروازہ کو کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اندھیرے میں گھورتا سمندر کی سرسراہٹ سنتا رہا۔ اسے سمندر سے کوئی خوف محسوس نہ ہوتا تھا۔ اس نے سمندر کیساتھ مل کر جینا سیکھ لیا تھا۔ مجبوری جو تھی! اس کا پیشہ ہی ایسا تھا کہ اسے ساحلی علاقوں میں بسر کرنا ضروری تھا۔

چنانچہ سمندر کی آواز غیر متوقع طور پر اور یکایک سنائی دی تو اسے وہ خوفناک رات پھر یاد آئی اسے وہ بے رحم موجیں قریب تر آتی دکھائی دیں . . . .

اس نے زور سے سانس لی اور ان کربناک خیالوں کو جو اسے حافظہ کی گہرائی میں لئے جا رہے تھے پھر کوشش کیساتھ دور کر دیا۔

لیکن ایک دوسری چیز اور بھی اس نے سیکھ لی تھی۔ اپنے دماغ یا تصور پر قابو پانا . . . کہ بچی ریت پر کھیلتی دکھائی نہ دے۔ ایک ننھی بچی، ایا، ایا کہتی سنائی نہ دے۔ آنکھ اور کان کے اس کھیل سے اس کا دماغ پھر خود بخود اگست کی ایک دوپہر کے واقعہ کی طرف چھلانگ لگایا کرتا تھا۔

ٹام اور لارا کی تصویر اس کے تصور میں آئی۔ وہ سوچنے لگا حادثہ سے پہلے بھی کیا اسے رقابت کا یہ جذبہ محسوس ہوتا تھا۔ اے کاش! وہ یہ جلن محسوس کر سکتا۔ بجائے اس بے حسی اور خالی پن کے جس نے اسکی زندگی کو دوبھر بنا رکھا تھا۔

آج لارا کے جسم میں اس کا محبوب جوڑا تھا۔ سبز رنگ کا جوڑا جو اسے بیحد مرغوب تھا۔ وہ آنکھ بند کر کے دیکھ سکتا تھا کہ اس کی صراحی دار گردن کس طرح گول سفید کندھوں میں بطخ کی طرح جمی ہوئی ہے جب بھی لارا کو وہ اس لباس میں دیکھتا تو بیقرار ہو کر اپنے ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیا کرتا۔ جلد کی نرمی اس کی انگلیوں کو محسوس ہوتی۔ اور وہ ان کندھوں کو چوم لیتا۔ وہ اسے اپنی طرف کھینچ لیتا۔ پھر دونوں جسم اس طرح تنگ ہو کر ملتے کہ وصل کا تصور بھی نہ رہنے پاتا اور دونوں کے گرم ہونٹ

آپس میں سختی کیساتھ مل جاتے۔

اِسے ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ اِس نے ارادتاً اِس خواہش کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جو صرف اس کے لمس سے اِس کے دِل میں جاگ اُٹھتی تھی۔ کتنی بار اس نے اپنے دِل میں یہ یادیں بیدار کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیسی کیسی دُعائیں مانگی تھیں کہ وُہ پہلے کی طرح آدمی بن جائے اب اس کی حالت اس سہمے ہوئے بچّے کی سی تھی جسے تسلّی دلاسہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

آہ وُہ کتنی رحم دِل تھی۔ کتنی ہمدرد۔ کتنی صابر۔ عورت اتنی رحم دِل، اتنی ہمدرد، اتنی صابر ہو سکتی ہے، اس کا اِسے یقین نہ تھا۔

لیکن خوُد اِسے ہمدردی اور رحم دِلی سے کیا سروکار؟ وُہ چاہتا تھا کہ پہلے کی طرح کاروبارِ محبت کا آغاز کرے اور اس کے دِل پر فتح پائے۔ پھر سے وُہی احساسِ فتح و نیازمندی محسوس کرے جو سکوُنِ جذبات سے حاصل ہوتا ہے۔

کیا اِسے یہ بات پھر حاصل ہو گی؟ شدّتِ کرب سے اس کے اعماقِ قلب سے ایک آہ لبوں تک آگئی۔ اِسے خوُد اپنے پر رحم آنے لگا اور اسی وجہ سے خوُد اِسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ کام اور بس کام۔ نجات کی بس یہی ایک راہ ہے! ڈاکٹر نے کیا کہا تھا۔ صرف ایک۔ وقت کے لئے زِندہ جینا۔ ہاں یہی تو وُہ کر رہا تھا۔ تو اب شام سے مُلاقات . . . .

دو ہفتے بعد ایک روز جب وُہ کان سے غیر متوقع طور پر گھر آیا تو روزی باورچی خانہ میں میز کے پاس دِکھائی دی۔ اِس کے بال صاف اور چمکدار تھے جنہیں ایک پٹی سے باندھ دیا گیا تھا۔ جسم میں خُوشنما فراک تھا۔ جس سے اِس کا رنگ کِھل آیا تھا۔ فراک کا رنگ اِسکی آنکھوں کی سیاہی کو بھی نمایاں کر رہا تھا۔

پچھلی دوپہر کے بعد اِس نے روزی کو صرف ایک بار ہی دیکھا تھا اور وُہ بھی دُور ہی سے۔ جبکہ اسٹیفان اِسے کان کے ساحلی دروازے سے بھگا رہا تھا۔ بعد میں اِس سے اسٹیفان نے بیان کیا کہ روزی

دُوسرے بچّوں سے دُور دُور رہتی ہے کیونکہ وُہ اِسے ستاتے ہیں۔"

"لیکن قصُور ہے بھی تو اسی کا۔" اس نے بچّوں کی وکالت کی۔ "وُہ اپنی ماں کے انگریز ہونے پر فخر کرتی اور ان کو چڑاتی ہے کہ وُہ انگریزی نہیں بول سکتے۔"

اِس کے دِل میں وقتی طور پر جذبۂ رحم نے جوش مارا۔ اِس نے محسوس کیا کہ یہ فخر و ناز ایک پردہ ہے اپنی تنہائی کو چھُپانے کا۔

روزی نے اِس سے انگریزی میں گفتگو شروع کر دی۔

"آپ کی بیگم کیک لانے گئی ہیں۔" اس نے کہا۔ "مَیں نے یہ کیک کبھی نہیں کھائے۔ اب کھاؤں گی اور ہر وُہ کام کروں گی جو انگریز کرتے ہیں۔ امّاں کہتی تھیں کہ انگلستان بہترین مُلک ہے۔

ایلن مُسکرا دیا۔ "ہے تو۔ مگر سب یہ بات کیوں مانیں۔ لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ تمہاری ماں وطن پرست تھیں۔" پھر بچّی کی آنکھوں میں تعجّب دیکھ کر اس نے فوراً بات بدل دی۔ "اچھا روزی یہ تو بتاؤ تمہاری عُمر کیا ہے؟"

"چھ اور پون سال۔" اس نے جواب دیا۔

"اور تم مدرسہ جاتی ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "خود ہمارے اُستاد جو ہیں — میکا لا اور روبرٹ — کسر یہ ہے کہ وُہ انگریزی نہیں جانتے۔" اس نے قدرے افسوس کیساتھ کہا۔ "روبرٹ کو میری کہانیوں کی کتابیں تک پڑھنی نہیں آتیں۔ . . . رہ گیا اسٹیفان، اِسے فُرصت ہی نہیں۔ وُہ دیکھئے آگئیں آپکی بیگم۔"

اِس نے جوشِ مُسرّت سے کہا۔ "یہی مُجھے پڑھاتی ہیں۔ حساب سِکھاتی ہیں۔ میں روز دوپہر میں آتی ہُوں۔ سبق لیتی ہُوں اور پھر ہم چائے پیتے ہیں۔"

ایلن سیدھے بیٹھ گیا۔ غصّہ میں بھرا ہُوا۔ اس نے اپنے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کی۔

لیکن لارا دروازہ میں آچکی تھی۔ ان دونوں کو بار بار پریشانی سے دیکھتی تھی۔

"مجھے معلوم نہ تھا تم اِتنی جلدی آجاؤ گے۔" وُہ کہنے لگی۔

اس نے طمانیت بخش انداز میں کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ روزی اور میں ایک دوسرے سے متعارف ہو رہے تھے۔" اس نے جوتوں، پاتابوں اور بچی کے صاف ستھرے ہاتھوں کو خصوصیت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے اس کو یہ فراک سی دیا ہے۔" لارا نے جلدی سے کہا۔

اس کو ایک دھچکہ سا لگا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ لارا یہ کہنا چاہتی ہے کہ یہ وہ کپڑا نہیں جو.....

لیکن اب بھی وہ نام لینے سے گریز کرتا تھا، خیال تک سے بھی۔

"خیر بھئی چلو لنچ شروع ہو جائے۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرہ سے نکل گیا۔

شام کو لارا اسکی بیٹھک میں نہیں آئی۔

"روزی کی بات کہتی ہے۔" وہ کہنے لگی۔ "اس بچی کا مجھے ہر وقت خیال لگا رہتا ہے، اس لئے میں نے اسٹیفان سے بچی کو دوپہر یہاں بھیج دینے کے لئے کہا ہے۔ اس کا کسی کو کچھ خیال نہیں نہ تعلیم کا، نہ کپڑوں کا.....۔"

"بچی تمہارے پاس آتی جاتی رہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اس روز جب آئی تو کچھ سمندر کا اور کچھ اس کی باتوں کا اثر تھا۔ لیکن اس کو کیا معلوم تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے.....۔"

"مجھے اس بچی سے پیار سا ہو گیا ہے۔" لارا نے نرمی سے کہا اور اسکی طرف یکایک نظریں اٹھائیں خوفزدہ سی، "کتنی پیاری اور کتنی خوبصورت ہے۔ میں اسکی دیکھ بھال کرنا چاہتی ہوں ایلن۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت ہم کو پھر ایک موقع دے رہی ہے۔" وہ رک گئی۔ اس کے چہرہ پر غصہ کے آثار اور اسکی آنکھوں میں خوفناک چمک دیکھ کر۔

"اگر تمہارا مطلب وہی ہے جو میں سمجھتا ہوں تو تم شاید پاگل ہو گئی ہو۔" اس نے سختی کیساتھ کہا "وہ کلموہی اجنبی بچی اور اس گھر میں! اگر تم چاہو تو اس بچی کے لئے ان لوگوں کو کچھ رقم

دیدو۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ وہ اِس بچّی کے کچھ کام بھی آئیگی۔"

اس کا غصّہ اِسی تیزی سے اُتر گیا جس تیزی سے چڑھا تھا۔

وہ اصرار کرنے لگی "میں تنہائی محسوس کرتی ہوں ایلن۔ شدّت کیساتھ بالکل اکیلی اکیلی۔"

"میں جانتا ہوں۔" اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں نے اِسی روز یہ بات محسوس کر لی تھی تم کو ٹام کیساتھ دیکھ کر۔ تم کو ہنستے دیکھ کر۔ تمہاری باتیں سُن کر۔ میں نے محسوس کر لیا کہ تمہاری زندگی کتنی بھیانک بن گئی ہے۔ کوئی عورت بات چیت کرے نہیں۔ ہنسے بولے نہیں اور رہا شوہر تو بس برائے نام مجھے تعجب تو یہ ہے کہ تم ایسی صورت میں یہاں رہ بھی سکی ہو۔۔۔۔"

"میں یہاں نہ رہوں تو تمہیں تکلیف نہ ہوگی؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تو پھر میں چلی جاؤں؟"

وہ ہراس کیساتھ اسکی صورت دیکھنے لگا۔ تب اس نے محسوس کیا، وہ چاہتا تھا کہ لارا اس کے پاس رحم وکرم اور ہمدردی کا تحفہ لے کر آئے۔ اس کو اس بات کی خود سے توقع نہ تھی۔ اِسے اِس بات کا صدمہ تو ہوا، مگر زیادہ نہیں۔

اس کا ذہن، اس کا دماغ لارا کے بغیر زندگی کے تصوّر سے بھی دبا کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ احساس نہ کر سکتا تھا۔ کوئی چوٹ ایسی نہ تھی جو اسے اُٹھا کر لارا کے پہلو میں پہنچا دیتی اور اِس سے ٹھہرنے کی التجائیں کراتی۔

"برداشت کی بھی حد ہوتی ہے ایلن"۔ وہ ہچکیاں لے کر کہنے لگی۔ "میں سمجھتی تھی کہ نہیں ہوتی، مگر ہوتی ہے۔ ایک سال ہو چکا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے۔ خدا کی قسم تم جانتے ہو کہ کتنی سخت کوشش کی ہے۔ لیکن تم نے مجھے دُور دُور ہی رکھا ہے۔" "میں نے بھی کوشش کی ہے تم نہیں جان سکو گی کہ میں نے کتنی محنت اور کوشش کی ہے لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے کہ گویا مجھ میں زندگی رہ نہیں گئی ہے۔ میں اب کچھ بھی محسوس نہیں کر سکتا۔ اب کوئی چیز مجھ پر اثر نہیں کریگی۔ کوئی مجھ سے کچھ کہے۔ مجھے وہ بات دہم نہیں معلوم ہوتی۔ ہر بات بس یونہی سی معلوم ہوتی ہے اس کے بعد۔ بہرحال میں تم سے کیسے

آنکھیں چار کر سکتا ہوں۔ کیسے اُمید کر سکتا ہوں کہ تم مجھے معاف کر دو گی؟"

"مَیں معاف کر سکتی ہوں۔ مگر یہ کیا کہ تم اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتے؟" اس نے پوچھا۔

"تم سے جو ہو سکتا تھا، وہ تم نے کیا۔ ..."

"مَیں نے کیا کیا؟ اگر مَیں سو گیا نہ ہوتا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

لارا یہ چاہتی تھی کہ دوڑ کر اس کی آغوش میں چلی جائے۔

اب اس نے کہا، "تم نے مجھے کبھی نہ بتایا کہ واقعہ کیا ہوا۔ ڈاکٹروں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم وہ بات مجھے کبھی بتا دو گے۔ مگر وہ وقت اب تک نہیں آنے پایا ہے۔ بتا دو شاید یہ کرب، یہ بےچینی جو تم محسوس کرتے ہو وہ اس طرح کم ہو جائے!"

"نہیں!!"

لفظ تیس کمرہ میں گونج اُٹھا۔ کارتوس سے نکلی ہوئی گولی کی طرح جو دیوار سے ٹکراتی ہے۔

"لیکن مجھے جاننے کا حق ہے۔" اس نے اصرار کیا، آواز میں مضبوطی پیدا کر کے — "الزبتھ میری بھی بیٹی تھی۔"

اس نے سر اُٹھایا۔ اسکی آنکھیں قلبی کرب کی آئینہ دار تھیں۔ لارا یہ دیکھ کر اپنی اس قلبی تحریک کو بہ مشکل روک سکی کہ دوڑ کر اس سے لپٹ جائے اور کہہ دے "ہاں جانِ من جانے دو۔ اگر اس سے تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔ مَیں انتظار کروں گی۔"

لیکن کیا اس نے اِتنا عرصہ انتظار نہ کیا تھا جبکہ وہ دواخانہ میں پڑا۔ وہ مٹ مٹ اس کیطرف دیکھتا گیا اور کچھ بھی نہ کہا۔ ... کچھ بھی نہیں۔ وہ گھنٹوں اس کے بازو بستر میں پڑی رات آنکھوں میں کاٹتی رہی تھی۔ اس کے جسم سے جسم ملائے جبکہ وہ قلبی تاثرات کے تحت بحرانی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس شدید بحرانی کیفیت میں جس کا سمجھنا مشکل تھا۔

وہ اِنتظار کرتی رہی، راتیں آنکھوں میں کاٹ کاٹ کر۔ بحرانی حالت میں اس کے مُنہ سے نکلے

جملوں کو جوڑ جوڑ کر ان کا مطلب نکالتی رہی ۔۔۔۔ اس کی پیشانی سے پسینہ پونچھتی ہوئی۔
اب اور انتظار ناممکن تھا ۔ اس لئے اس نے لبوں پر آئے ہوئے پیار بھرے الفاظ کو لبوں میں ہی دبا دیا ۔ اس کی نظروں سے نظریں ملائے رہی ۔ یہاں تک کہ خود اس کی نظریں جھک گئیں ۔ آخر میں اس نے خود پر قابو پا لیا ۔ اس کا چہرہ اب ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا ۔
"اچھا تو سنو ۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور جب بولنے لگا تو اسکی آواز سپاٹ لیکن تھکی تھکی تھی ۔
"تم بازار گئیں اور میں الزبتھ کو ساتھ لئے ساحل کی طرف روانہ ہوا ۔ دوپہر کا وقت تھا ۔ ہوا گرم تھی ۔ اس نے ننھے کیکڑے پکڑنے کے لئے اپنا ڈول ساتھ لے لیا تھا ۔ مجھے ٹھیک ٹھیک یاد ہے اس کے جسم میں جو لباس تھا ۔۔۔۔ وہ سفید فراک جو تم نے سیا تھا ۔ جس پر نیلے نیلے جہاز تھے ۔ تم نے اس کے بال فیتے سے باندھ دیئے تھے کہ آنکھوں پر نہ پڑنے پائیں ۔
میں نے بس اسی وقت اسے آخری بار دیکھا ۔۔۔ جب وہ گنڈ کی طرف دوڑ کر گئی تو اس کے ریشمی بال بالو کی دم کی طرح اسکی پیٹھ پر جھول رہے تھے ۔"
وہ رک گیا اور سگریٹ تلاش کرنے لگا ۔ لارا کرب کے عالم میں کھڑی رہی ۔ وہ دیا سلائی سے سگریٹ جلا کر آہستہ آہستہ دھواں چھوڑنے لگا ۔
"اوہ ، کہتے چلو ۔ اس نے دل ہی دل میں کہا ۔ اس ڈر سے کہ یہ رکاوٹ کہیں اس کے شکستہ ضبط کا باعث نہ بن جائے ۔ لیکن جب وہ بولنے لگا تو اس کی آواز بالکل اس کے قابو میں تھی ۔"
میں اخبار دیکھنے لگا ۔ مگر میں نے ایکا یک محسوس کیا کہ یہ بھی میرے لئے بار ہے اور میں اونگھ گیا ۔ میں محنت سے کام کر رہا تھا ۔ میں اپنے دل کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ دن کی گرمی میں ریتی پر سو جانا بالکل قدرتی بات تھی ۔۔۔۔
"جب میں جاگا تو پانی میرے قریب آچکا تھا ۔ میں نے رزی کو اس پاس تلاش کیا ۔ مگر وہ

دکھائی نہ دی۔ میں پریشان نہیں ہُوا۔ میں نے اسے آواز دی۔ اِدھر اُدھر لپکارتا پھرا ۔۔۔۔"

وُہ لارا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔

"پھر بھی میں پریشان نہیں ہُوا۔ میں سمجھا شائد وُہ تمہارے پاس آگئی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کبھی کبھی وُہ تمہارے پاس سینڈ وچز کے لئے آجاتی تھی اور پھر ہم سب ریت پر بیٹھے چائے پیتے تھے ۔۔۔۔"

لارا نے صرف سر ہلا دیا۔ کچھ بولتے اسے ڈر لگ رہا تھا۔

" اب پانی چٹانوں سے باہر آرہا تھا اور یکایک میں نے اسکی آواز سُنی وُہ ایک غار میں گھُس گئی تھی۔ خدایا! آواز بھی کتنی قریب وہ ہوتی ہے! میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا، قیمتی منٹ ضائع کرتے ہوئے، آواز کا پتہ لگانے۔

"آخر وُہ غار مل گیا لیکن اس کا دہانہ کتنا چھوٹا تھا! میری سٹی گم ہوگئی۔ مُنہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ میں جانتا تھا میں غار میں نہ جاسکتا تھا۔ میں نے حواس درست کئے۔ غار کے دہانہ میں اپنا سر ڈال کر اسے آواز دی۔ اس نے جواب دیا "ابا! کیسا اچھا تماشہ ہے۔ دھنک کے رنگ اور ننھے ننھے کیکڑے آپ آکر دیکھئے۔"

"اب پانی میرے گھٹنوں تک آچکا تھا۔ میں نے آواز پر قابو پانے کی کوشش کی۔"

" اب تم باہر آجاؤ۔ پانی بڑھ رہا ہے۔ جلد آؤ۔ تمہاری امّی انتظار کر رہی ہیں۔"

اس کی آواز بھرّا گئی اور وُہ چُپ ہوگیا۔

لارا کے جسم کا ریشہ ریشہ چاہتا تھا کہ دوڑ کر اس سے لپٹ جائے اور کہے "بس اب اور کچھ کہنے کی حاجت نہیں۔"

لیکن وُہ جانتی تھی کہ اُسے اس اعتراف کی بازی پر اپنی ساری پونجی، صبر و ضبط کا خزانہ لگا دینا چاہیئے۔ اس کی بھڑاس نکل کر سارا کرب دُور ہو جائے گا۔ اپنا بوجھ ہٹا کر وُہ زندہ رہنے کے قابل ہو سکیگا۔ دل ہی دل میں وُہ دُعا کرنے لگی۔

"خدایا! اسے ہمت دے۔ طاقت دے!"

"میں وہ پکار کبھی نہ بھولوں گا۔" وہ کہنے لگا۔ اسکی آواز بھرا گئی تھی۔

"اس نے کہا، ابا! میرا پاؤں اٹک گیا ہے میں نکال نہیں سکتی۔ آپ آکر نکال دیجئے۔"

"میں کیسے اندر جا سکتا تھا؟ غار کے اس تنگ دہانے سے کیسے گھس سکتا تھا اور پانی تھا کہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔"

"ابا میری مدد کیجئے!" وہ پکاری۔

اور میں نہیں جا سکتا تھا۔ نہیں جا سکتا تھا۔ لارا کیا تم میری اس حالت کا اندازہ نہیں لگا سکتیں؟ آہ! کتنی کرب ناک حالت تھی۔ کتنی نزدیک اور کتنی دور!

"میں نے اسے آواز دی۔ اس طرح اسے مدد دینے کی کوشش کی۔ یاد نہیں کیا کہا۔ لیکن یہ ضرور کہا کہ پاؤں کو جھنجوڑے۔ کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو کسی طرح نکال لے۔ میں نے اسے کتنے ہی لالچ دیئے۔ ایک نئی سائیکل۔ ایک پاؤڈر لانے کے ....."

اب اسے اپنی آواز پر قابو نہ رہا تھا۔ "اب بھی اسکی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں اس کی سسکیاں اب بھی سن رہا ہوں۔ جن میں ہچکیاں بھی شامل تھیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ پاؤں نہیں نکال سکتی تھی——

اب پانی کمر کمر ہو گیا تھا۔ میں نے پانی کو آہستہ آہستہ غار میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس جہنمی غار میں۔ اس وقت مجھے یاد آیا وہ چھوٹا سا لڑکا جو مچھلی کی طرح تیرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ غار میں جا کر لڑکی کی مدد کر سکتا تھا۔

"خدایا! میں اس وقت کیسے دوڑا۔ گاؤں والے مجھے حیرت سے دیکھتے تھے۔ مجھے ان کا تکنا اب تک یاد ہے....."

ہاں لارا جانتی تھی۔ واقعہ کا یہ حصہ اسے معلوم تھا کیونکہ گاؤں والوں نے بیان کیا تھا کہ ایلن دیوانوں کی طرح چیختا سڑک پر دوڑ رہا تھا اور اب بھی قدم بہ قدم دوڑ رہا تھا۔

"لیکن ساری کوششیں بعد از وقت تھیں۔ پانی غار میں بھر چکا تھا اور ننھی اپنے سفید جوڑے اور نیلے فیتے کیساتھ اس کی تہہ میں محبوس ہو چکی تھی۔"

"لیکن ہم بہت دیر سے پہنچے۔" ایلین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بہت دیر سے . . . ."

لارا اسکی سمت چلی، باہیں پھیلائے، رخسار پر آنسو بہتے ہوئے۔

"جانِ من۔ تم نے اپنی سی کرلی۔" وہ کہنے لگی۔ "تم سے جو ہو سکتا تھا وہ تم نے کیا۔"

وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے وہ کوئی اجنبی تھی۔

"لیکن میں نے پوری کوشش کہاں کی؟ کیا یہ بس تھا؟" اس نے سپاٹ آواز میں پوچھا۔

"اب زندگی بھر اسکی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہیگی۔" ابا! میری مدد کیجئے"

وہ اسے ہٹاتا ہوا نکل گیا، ایک کل دار پتلے کی طرح۔

لارا نے محسوس کیا کہ وہ بازی ہار گئی۔ اس کا داؤ خالی گیا۔ اب اس کا شوہر اس سے پہلے سے زیادہ دور ہو گیا تھا۔ اسکی ساری محبت اور کشش اسے واپس نہ لا سکیگی۔

دوسرے روز وہ خاموش اور دور دور رہا۔ اس کے تیور بتاتے تھے کہ لارا نے اس کا راز جان کر برا کیا۔ حالانکہ لارا نے یہ سمجھا تھا کہ شرکتِ غم ان میں قربت پیدا کریگی۔ مگر

ع شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری

"آج دس بجے ہم پرے لگا رہے ہیں۔" اس نے جاتے ہوئے کہا۔

لارا نے یہ دھماکے سنے۔ وہ لرزہ افگن صدائیں جنہوں نے گھر کا فرش اور دیواریں ہلا ڈالیں۔ اس نے گھڑیال کی سمت نظر کی۔ پونے دس بج رہے تھے۔ اس وقت اسے چیخیں سنائی دیں، خوفناک رونگٹے کھڑا کر دینے والی چیخیں اور وہ بے تحاشا پچھلے دروازہ سے نکل کر بھاگنے لگی۔ کان کی طرف۔

وُہ جانتی تھی کہ اُس نے دس بجے کا وقت تبلایا تھا تو اِس کا مطلب تھا دس بجے ہی کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ کوئی از حد خطرناک قسم کی غلطی۔

کان کے دہانے پر پناہ گزین جمع وُہ اپنی بولی میں کچھ کہہ رہے تھے۔ ہر اِس سے اُن کے ہاتھ متحرک تھے۔ دو ایک عورتیں گھٹنوں کے بَل کھڑی تھیں۔ ایک بُوڑھا چُپکا چُپکا رو رہا تھا۔ آنسو اس کے جھُریوں بھرے چہرے پر سے بہہ کر اس کے لرزتے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

لارا گھستی پِٹتی ایلن اور اسٹیفان تک پہنچ گئی۔

"کیا ہُوا؟"

"فیتل وقت سے پہلے سلگ گئی۔" ایلن نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے اندر صرف دو آدمی رہ گئے تھے۔ جنہیں ہم نے جھُولے سے باہر نکال لیا۔"

اس نے ہاتھ سے آہنی ڈول کی طرف اشارہ کیا۔ جو موٹی رسیوں میں جھُول رہا تھا۔ "بھاری سیست ہوئی، دو ہزار ٹن پتھر ٹوٹ کر بیٹھ گیا ہے۔"

یکایک چند خوفزدہ آوازیں سُنائی دیں اور میریا دو چھوٹے لڑکوں کو ڈھکیلتی ہوئی لائی۔ اسٹیفان نے پہلے میریا اور پھر لڑکوں سے کچھ پُوچھا اور ایلن کی طرف پلٹا۔

"وُہ کہتی ہے روزی تو اندر ہے ساحل سے کان میں جو راستہ جاتا ہے اِس طرف ـــــ وہ اِن بچوں سے چھپی تھی۔ ..."

ایلن ہونٹوں میں کچھ بڑبڑاتا ساحل کے دہانہ کی طرف دوڑا، اس کے پیچھے لارا اور باقیماندہ لوگ لارا کے پیچھے چل پڑے۔

دہانہ بند ہو چکا تھا۔ لیکن اِس نے دیکھا کہ غار میں جو سُوراخ کیا گیا تھا وُہ ابھی صاف ہے اور اِس میں سے ڈول کے ذریعہ سُرنگ میں داخل ہونا ممکن ہے۔ اس نے ایک ٹارچ اُٹھالی اور جھُولے میں بیٹھ گیا اور اسٹیفان سے بولا۔ "مجھے نیچے اُتار دو اور جب میں دو بار رسّی ہلاؤں

تو اوپر کھینچ لینا۔"

ایک مختصر سے لمحے کے لئے اس نے لارا کی طرف نظر کی، جس کا رُونگٹا رُونگٹا چیخنا چاہتا تھا۔

"مت جاؤ۔ مت جاؤ۔" اس نے نیچے پتھر کے گرنے کی آواز بھی سُنی۔ زینہ کو جس پر وہ کھڑی تھی لرزتے ہوئے بھی محسوس کیا۔ لیکن وہ کسی نہ کسی طرح مسکرا دی اور زبان خاموشی سے کہا۔

"جاؤ پیارے خدا حافظ۔"

اندھیرا، گہرا اندھیرا۔ اس قدر گہرا کہ ٹارچ کی روشنی موم بتی کی روشنی معلوم دیتی تھی۔ زمین کی رطوبت بڑھ رہی تھی۔ گرد و غبار کی تلخی حلق کو چھیلتی تھی۔ پانی کی ریزش صاف سُنائی دے رہی تھی وہ ڈول سے اُتر گیا۔ اس کے پاؤں کیچڑ میں پھسڑ پھسڑ کرنے لگے۔ اس پاس دیواروں سے پانی بے رحمی کیساتھ ریزش کر رہا تھا جسکی وجہ سے اِسے رُکنا پڑا۔ اسکی گردن اس کے ہاتھوں اور اس کے سارے جسم سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ "تم پانی سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔" اس نے خود سے کہا "واپس چلے جاؤ۔ وہ بڑھتا جائے گا۔ چڑھتا جائے گا۔ تمہیں موقعہ نہ دے گا لڑکی کو موقعہ نہیں ملا۔ روزی کو بھی نہیں ملیگا۔ روزی بھی مرے گی جیسے لڑکی مری، مجبور ہو کر۔۔۔"

"کون ہے؟"

یہ آواز اس کے دائیں جانب سُرنگ سے آئی اور وہ کچھ سوچے بغیر آگے بڑھ گیا۔

"روزی تم کہاں ہو؟" اس نے پکارا۔

"یہاں ہوں۔" وہ جواب دی۔ وہ ایک بار پھر آواز کی فریبندگی پر جھلا اُٹھا۔ اسے ایک موڑ پر رُکنا پڑا۔ معلوم نہ تھا کدھر جائے۔

"روزی پھر آواز دو۔" اس نے کہا۔ "میں آرہا ہوں ڈرو نہیں۔"

ہوا کتنی متعفن ہے۔ وہ اپنی کھانسی کو روکتے ہوئے جواب کے انتظار میں۔

"میں ڈرتی نہیں۔" وہ جواب دی "لیکن اس صدا میں بلبلاہٹ تھی۔ صرف اندھیرا ہی

بُرا لگتا ہے ۔"

وُہ جان گیا، بچّی کہاں ہے اور ہیبت زدہ سا کھڑا رہ گیا، اِس مٹی اور پتھر کی دیوار کے سامنے جو اس کا راستہ روکے تھی۔ اس میں ذرا سا سُوراخ تھا۔ اِسکی مُٹھی کے برابر۔ پھر وُہ جوشِ وحشت میں اِسے جھنجوڑنے لگا۔

"تم یہاں ہو؟" اس نے چیخ کر پُوچھا۔

فوراً ہی ایک ہاتھ سُوراخ سے باہر نکلا اور پھر جلد ہی اندر ہو گیا اور ایک آنکھ اور گال کا کچھ حصّہ دِکھائی دیا۔

"اوہو، یہ تو کنگ آرتھر ہے"، بچّی نے جوشِ مسرّت میں کہا۔

"ہاں" اس نے جھٹکے سے کہا۔ "میں اپنی ننھی بیگم کو بچانے آیا ہوں۔ لیکن روزی تم ذرا پرے ہٹ جاؤ۔ میں یہاں سے مٹی ہٹاتا ہُوں تم ذرا پیچھے ہٹ سکتی ہو؟ جگہ ہے؟"

"بہت ساری جگہ"۔ وہ بولی۔ "لیکن گرمی غضب کی ہے۔ مجھے سانس لینی مُشکل ہو رہی ہے۔"

"اچھا تو ذرا ہٹ جاؤ۔ جتنا دُور ہو سکے اور ڈرو نہیں"۔ اس نے کہا۔ "میں تمہیں یہاں نہیں چھوڑوں گا روزی...."

"مجھے اِسے جلد نکال لینا چاہیئے۔" وُہ وحشت زدگی کیساتھ سوچنے لگا۔ "اندر ہوا نہیں ہے" وُہ وحشیوں کی طرح مٹّی کو جھنجوڑنے لگا اور جلد ہی سُوراخ اِتنا بنا لیا کہ اس کا سر جا سکتا تھا۔

اِسی غار کے دہانے کے برابر جیسمین لزی نے جان دی تھی.....

ایک لمحہ کے لئے ـــــ اِس کے لئے قیامت ہو گئی۔ اِس کے جسم کی قُوّت سلب ہو گئی۔ کمزوری نے اِس پر غلبہ پایا۔ وُہ دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا اور رُوزی کی آواز میں اسے لزی کی آواز سُنائی دی۔ "ابا! میری مدد کیجئے۔"

وہ کچھ نہ کر سکتا تھا اِسے سانس لینی مُشکل ہو رہی تھی۔ اس کا دم گھُٹ جائے گا۔

وُہ اب اِس سے زیادہ کچھ نہ کر سکیگا، جس قدر کہ پہلے کر سکا تھا - لیکن شاید یہ حقیقت نہ تھی۔ اس نے دیوانگی کیساتھ سوچا، شاید یہ بھی ایک خوفناک خواب ایک حقیقت ہو۔ ۔ ۔

لیکن اسے اپنے پیچھے ایک ہیبتناک گڑگڑاہٹ سُنائی دی۔ اس نے سر کو موڑ کر اپنے راستے پر پتھر گرتے دیکھے۔ جس سے دم گھُٹنے والا غبار اُٹھ رہا تھا، اور بدبُو ناک میں گھُسنے لگی۔

"نِکل چلو، نِکل چلو۔ ابھی وقت ہے" اس کے دماغ پر ہتھوڑوں کے سے ضرب پڑنے لگے۔ آخر روزی تمہاری کیا لگتی ہے۔ ایک پناہ گزین بچّی۔۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔۔ یہ لزی نہیں۔"

"جلدی کرو کِنگ آرتھر" اب اِس آواز میں ننھی سی بلبلاہٹ تھی۔ یکایک اسمیں دیوانوں جیسا جوش پیدا ہو گیا۔ وہ دوبارہ یہاں ہاریگا۔ وہ مٹی پر، پانی پر، چٹانوں پر غالب آئے گا۔۔۔ پُوری لعنتی دُنیا پر، تبھی اس کے کہا ر مان لے۔ پُورے جوش و خروش کیساتھ وُہ دیوار پر پل پڑا اپنے ہاتھ مٹی میں گھُسیڑ کر پتھر اُٹھا کر پھینکتے ہوئے، وحشیانہ طاقت کے ساتھ دُور پھینکتے ہوئے۔

"مَیں آرہا ہُوں۔" اس نے آہستہ کہا۔

جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ سسکیاں لیتے۔ آہیں بھرتے۔ اور جوش میں مٹی کو ٹھوکریں لگاتے ہوئے۔۔ یہاں تک کہ سُوراخ اتنا بڑا کر لیا کہ اسمیں اس کا سر اور کندھے داخل ہو سکتے تھے۔ اس نے اپنی ٹارچ اُٹھائی۔ کمزور روشنی میں اس نے دیکھا کہ بچی بیہوش پڑی ہوئی ہے۔ اس کے ہاتھ بچی تک پہنچ سکتے تھے۔ اس کا ننھا ہاتھ پکڑ کر اس نے آہستہ آہستہ اسے اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔

یکایک آس پاس کی مٹی میں لرزش پیدا ہوئی اور اس نے اپنی پیٹھ پر کوئی ایک ہزار ٹن کا بوجھ محسوس کیا۔

ایک لمحہ تک تو وُہ ہانپتا پڑا رہا۔ اس کے شش غیر معمولی دباؤ سے پھٹتے محسوس ہوتے تھے انتہائی سخت کوشش کے بعد وُہ ایک انچ اُٹھ سکا اور روزی کو گود میں لے لیا اور اپنے جسم کو ڈبل بنا

کر اسے شگاف سے باہر کھینچ لیا۔

وُہ سمجھ گیا کہ جیسے ہی وُہ دہانہ سے اپنا جسم کھینچے گا مٹی بیٹھ جائیگی۔ اس نے بچّی کو آگے کر کے مٹی کا سارا بوجھ اپنی پیٹھ پر لے لیا۔ بچّی مٹی کی زد سے باہر ہو گئی تو ایک فیصلہ کُن جھٹکے کیساتھ اپنے کو اور بھی شگاف کی دُوسری طرف کر لیا۔

مٹی یکایک بیٹھ گئی اور وُہ بچی کو چھاتی سے لگا کر دہانہ کی طرف دوڑنے لگا۔ پتھر اور کنکڑ گر رہے تھے۔ اس کے کندھے، اس کے گال اور اس کے سر ان کی رگڑ کھا رہے تھے۔ وُہ ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے سنبھلا لیکن بچی کو اپنے سے چمٹائے رکھا۔ اتنی زور سے کہ بچّی کے دِل کی دھک دھک اپنے دِل پر محسوس کر رہا تھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہو گیا لزی۔ ابا تمہیں بچا لے آئے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور ڈول میں بیٹھ گیا۔ رسّی کو بے تحاشا ہلاتا ہُوا اور یہ سوچتا ہُوا کہ کمبخت ایڈخان رسّی کھینچے گا بھی کہ نہیں۔

اب وُہ دہانہ کی طرف چڑھ رہے تھے۔ اندھیرے میں ایک دھاریدار شعاع شگاف کر رہی تھی اس نے بیہوش بچی کی طرف دیکھا جو آغوش میں تھی۔

یہ لزی نہ تھی! روزی تھی!! لیکن اس کے گال کا بالہ بھی وہی تھا۔ وہی بچپن کی معصومیت اور بیکسی۔ بال بھورے ریشمی نہ تھے۔ تو کیا آخر ننھی سی جان تو تھی۔ . . . محبت کی حاجت مند، گھر کی، ماں کی، باپ کی۔

"ابا میری مدد کیجئے" یہ ایک پکار تھی، جس کے جواب سے وُہ اِنکار نہ کر سکتا تھا۔ اگر ابا کی بجائے یہ پکار کنگ آرتھر کر ہوتی تو کیا؟ ضرورت تو ایک ہی تھی۔

وُہ سطح پر پہنچ گئے۔ اسے پناہ گزینوں کے جوش سے تمتماتے ہوئے چہروں کا احساس ہُوا۔ ان کی سیاہ آنکھیں اس پر جمی تھیں۔ اور ایک جھنجھناہٹ کا احساس جو اب بڑھ کر غل میں تبدیل ہو رہا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ لارا کی موجودگی کا احساس۔

وُہ باہیں پھیلائے کھڑی تھی۔ آنسو گالوں پر مچل رہے تھے۔ اِس کے دل میں محبّت نے پھر جوش مارا۔ خون رگوں میں اُچھلنے لگا۔ نبض تھرکنے لگی۔ دِل میں ایک شعلہ بھڑک اُٹھا، وُہ شعلہ جسے وُہ سمجھتا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا تھا۔

اس نے محسوس کیا کہ کندھے ٹُوٹ رہے ہیں۔ بچّی اسکی گرفت سے ڈھلنے لگی تھی۔ وُہ بڑھتا گیا، ایک فاتحانہ شان کیساتھ لارا کی طرف بڑھتا گیا روزی کو گود میں لئے ہوئے۔

”میں اس کے پاس پہنچ گیا لارا۔“ اس نے کہا۔ ”اِس بار میں وقت پر پہنچ گیا۔“

وہ اِسکی جانب ایسی نظروں سے دیکھنے لگا، جن سے وُہ سمجھتی تھی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محرُوم ہو گئی تھی۔

زندہ کی حیثیت سے، فاتح کی حیثیت، ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جس نے کفارہ ادا کر کے اپنے کو پاک صاف کر لیا تھا۔ لیکن اِس فاتحانہ شان میں ایک انکسار تھا۔ ایک تواضع آمیز ادا کے ساتھ اس نے روزی کو لارا کی گود میں دے دیا۔

”لو یہ رہی تمہاری بیٹی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ جسے صرف لارا ہی سُن سکی۔

محبوب اللہ مجیب

شاداں

شفق نے آخری قہقہہ بلند کیا اور شام ہوگئی —— ایک گہری شام — تاریک اور تاریک تر۔

"نہیں اب مجھے جانے دو۔" شاداں نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ "وہاں میری ماں انتظار کرتی ہوگی۔" اس کے لہجے میں بڑی بے بسی تھی۔

"نہیں، بالکل نہیں —— مدّت کے بعد تو یہ شام ملی ہے، اتنا کہہ کر راجو نے اسے اپنے بازوؤں میں اور سمیٹ لیا۔

کھیت کی بوڑھی مینڈھ پر اب وہ اس اطمینان سے بیٹھی تھی جیسے ماں کے انتظار کرنے کی بات بالکل ختم ہوگئی ہو یا ماں کی شفقت، محبوب کی محبّت سے مات کھا گئی ہو۔

"جانا ہو تو چلی جاؤ —" راجو کی شرارتاً پوچھا۔

"نہیں اب تو میں نہیں جانے کی —" شاداں معصوم بن کر کہنے لگی۔

"کیوں؟" راجو کو تشویش ہوئی۔

"اسلئے کہ — مدت کے بعد یہ شام ملی ہے۔" شاداں نے اسی کا جملہ دوہرا دیا۔

"دیکھو!" اس نے دفعتاً راجو کے بازوؤں کو ہلاتے ہوئے کہا۔ "میرے کھیت کتنے

خوبصورت ہیں ؟"

"ہاں بالکل تمہاری طرح ـــــ ؟" شاداں جھینپ گئی۔

"اور ان پر لٹکی ہوئی سنہری بالیاں ؟" شاداں بڑی معصومیت سے پوچھنے لگی۔

"جیسے تم ماتھے پر جھومر سجا کر کھڑی ہو جاؤ۔" اتنا کہہ کر راجو اس کی نگاہوں میں اپنی کھوئی ہوئی کائنات ڈھونڈنے لگا۔

"مجھے اتنا گھور کر نہ دیکھو۔"

"کیوں ؟"

"ڈر لگتا ہے۔"

پھر شاداں نے خود ہی بات بدل دی ـــــ

"نوراں نے تو ہمارے کھیت ہی ہڑپ کر ڈالے تھے۔"

"کیوں ؟"

"بس اس کے دل میں بے ایمانی ہی تو آ گئی ـــــ بھلا کرے محمد بھائی کا کہ باپ کے مرنے کے بعد ہمارے سارے کھیت واپس کر دیئے ـــــ کتنے اچھے ہیں ہائے محمد بھائی ـــــ کیوں اچھے ہیں نا ؟"

"جب تم کہتی ہو تو ضرور اچھے ہوں گے۔" راجو پھر شرارت کر بیٹھا۔

"اور ہم نہ کہیں تو ـــــ ؟" شاداں پوچھ بیٹھی۔

"خراب ـــــ بالکل خراب۔" راجو مسکرانے لگا۔

"ہٹ شریر کہیں کے ـــــ" شاداں اس کے گالوں کو تھپتھپانے لگی۔

ـــــ اور اتنی دیر میں رات بالکل جوان ہو چکی تھی۔ شمال سے چل کر جنوب کی طرف جانے والی ساری ہوائیں پہلے سے بھی زیادہ خنک ہو گئی تھیں۔ دور جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں کبھی کبھی مچھلیوں کے اچھلنے کا ایک خفیف سا شور بلند ہوتا اور ختم ہو جاتا۔

"اُف بہت اندھیرا ہو گیا۔" شاداں نے گھبرا کر کہا۔

"مگر اندھیرا کیسا؟ چاند تو قریب ہے۔" راجو پھر شرارت کر بیٹھا۔

"چلو اب چلیں۔" شاداں کہنے لگی۔

"کہاں؟" راجو نے سوال کیا۔

"گھر" شاداں نے جواب دیا۔

"تو پھر تم چلی جاؤ گی؟" راجو کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں۔ کہیں ماں ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں نہ آ جائے"

"تو کیا ہوگا؟"

"بہت بُرا ہوگا ——" اور یہ کہہ کر وُہ اُٹھی کھڑی ہوئی اور شمال جانب والے اندھیرے کی طرف چلنے لگی۔

"—— تو کل پھر یہیں چراغ جلے ——" راجو نے چلّا کر کہا اور خاموش وادی دہل گئی۔

"وعدہ ——" دُور سے شاداں کی آواز آئی۔

وُہ بڑی دیر تک شاداں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور اس کے ہلکے عکس کا تعاقب کرتا رہا

—— مگر کتنی دیر تک ——؟

اب وُہ خود بھی لوٹ رہا تھا ——

آج بھی سامنے وُہی لہلہاتے ہوئے کھیت تھے اور وُہی کل والی خاموش جھیل ——

دونوں نے مل کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی —— دھرتی کا دل بھی انہیں کے دل کی طرح گنگنا رہا تھا۔

"یہ جھیل کتنی خوبصورت ہے؟" شاداں بولی۔

اور کچھ جواب دینے کے بجائے راجو اس کی نگاہوں میں کل کی طرح پھر کچھ تلاش

کرنے لگا۔

"تمہیں معلوم ہے راجو۔؟"

"کیا؟"

"ـــــ ماں کہہ رہی تھی"۔ وہ بولی "جب فصل کٹے گی تو ہم ایک دعوت کریں گے"۔

"بس خوشی میں؟" راجو نے پوچھا۔ "فصل تو ہر سال کٹتی ہے۔"

"ہاں فصل تو ہر سال کٹتی ہے، مگر کھیت ہر سال تھوڑی واپس ہوتے ہیں۔" شاداں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ بات ہے۔" راجو کی سمجھ میں بات آگئی۔"

"اور اُس دعوت میں کیا ہوگا؟"

"میری سہیلیاں آئیں گی۔"

"وہ کیا کریں گی؟"

"کھانا کھائیں گی؟"

"اور کچھ نہیں؟"

"نہیں!"

"جھوٹ"۔ راجو بولا "گانا نہیں گائیں گی؟"

"گائیں گی۔" شاداں بولی۔ "مگر تمہیں کیسے معلوم؟"

"مَیں نے سُنا تھا۔" راجو ہنس رہا تھا۔

"سُنا تھا تو ثبوت دو۔" شاداں اصرار کرنے لگی۔

"ـــــ تمہاری سہیلیوں نے یہی گیت گایا تھا نا ـــ" راجو سُنانے لگا۔

یودسہ دیبر مرتہ تراُدتھ سیود مہ کن کرتھے نظر	نراون زن ھی بوچھولہ باپا وتش زھود مارہ ہا
کامہ دیو کرسیر ڈل بزم شیس گژھہ تل یل	دد شمس آبس اندر پمپوش لا گنھ برارھا

سوز بوزنہ پانہ سید ھے بونہ ھے بیانی دداکھ   شوقہ سان دلہ ربابس تارہ لوچہ چارہ ھا

(کتنا اچھا ہوتا اگر میرا محبوب میری طرف نظر بھر کر دیکھتا اور میں تو اس خوشی میں ساون کی چمیلی بن جاتی اور میرا جوبن کھل اُٹھتا۔ مَیں نے یہ بھی سُنا ہے کہ میرا پریتم جھیل ڈل کی سیر کے لئے جا رہا ہے اور وُہ وہاں تیل بل میں شب گذارے گا۔ کاش! مَیں کنول بن جاتی اور اس کا وہیں انتظار کرتی۔)

"اب سمجھی!" شاداں متعجب سی ہو گئی۔

"اگر سمجھ ہی جاؤ، تو بڑی بات ہو گی؟" راجو نے اتنا کہہ کر ایک لمبی آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔

"ہوں۔ یکبارگی خاموش کیوں ہو گئے ــــ؟" شاداں نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ــــ!" راجو اُداس ہوتا ہُوا بولا۔

"آخر کچھ تو ــــ؟" شاداں کریدنے لگی۔

"بس یہی کہ ــــ" راجو کہنے لگا۔ "میرے خیالوں میں بھی ایک دُلہن ہے، جو ہُو بہُو تمہاری طرح ہے ــــ یہی ناک نقشہ اور یہی رنگ و رُوپ ــــ"

"جھوٹ ــــ بالکل جھوٹ۔" شاداں شوخی سے اکڑ گئی۔

راجو پھر کل کی طرح خاموش ہو گیا۔

"راجو!" اس نے پھر اس کے بازو ہلائے۔ "اس سال ہماری فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ میں جتنی بار دیکھتی ہے، اُتنی ہی بار خوش ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہی ہے۔" وُہ بولا۔ "مَیں بھی اِسی طرح جتنی بار تمہیں دیکھتا ہُوں اُتنا ہی زیادہ خوش ہوتا ہُوں،" اِتنا کہہ کر وُہ خود بھی جھینپ گیا۔

کل والی بات تو بھلائے نہیں بھولتی تھی۔ شاداں نے کئی بار کوشش کی کہ غفور اُ خالہ والی بات راجو سے بتلا دے لیکن ہمّت نہ ہو سکی۔ راجو کیا سوچے گا؟ اِس کے بارے میں کہاں تک رائے دے

پائے گا؟ وہ خود بھی کچھ فیصلہ نہ کر پائی۔

غفورا خالہ نے تو ماں پر اپنا سکہ ہی جما لیا تھا۔ جس طرح دوسری جگہ نسبت طے کراتی پھرتی ہیں، اسی طرح اس کو بھی نسبت کا فیصلہ سنا دیا اور ماں نے بھی بغیر کسی پس و پیش کے قبول کر لیا، جیسے پہلے ہی سے ٹھانے ہوئے بیٹھی تھیں —— "میری شاداں کے لئے محمود تو بالکل ہی ٹھیک پڑیگا"۔ ماں نے غفورا خالہ کے جاتے جاتے یہ بھی فیصلہ دے دیا تھا۔

شاداں کو کچھ زیادہ اداس دیکھ کر راجو نے ہی پہل کی "اٹھ دل شاداں"۔ راجو نے اس کے بازوؤں کو ہلایا۔ "تم بہت تھک گئی ہو۔ چلو اب گھر چلیں"

وہ کچھ بولے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی اور راجو کے ساتھ چلنے لگی۔

وادیاں کل کی طرح پھر خاموش تھیں اور دور پھیلے ہوئے اس چھوٹے سے گاؤں میں زندگی کی رفتار پھر سست پڑ گئی تھی۔ دور گاؤں کا چوکیدار اپنی موٹی اور بھدی آواز میں چیخ رہا تھا۔

راجو دبے پاؤں گھر میں داخل ہوا اور اپنے چھپر یلے مکان کی ٹوٹی ہوئی پلنگ پر نیم دراز ہو کر نہ جانے کن کن واہموں کا شکار ہو گیا۔

جب ہوا کی تیزی سے اس کے کواڑ بجنے لگے تو اس نے اٹھ کر آہستہ سے اسے بند کر دیا اور سو گیا۔

"راجو! راجو!" کسی نے اس کا شانہ ہلایا۔ "میری شادی محمود سے ہو گی۔" یہ سنتے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

"اف کتنا بھیانک خواب ہے؟" اس نے اپنے دل میں سوچا مگر کہیں خواب حقیقت نہ بن جائے —— ؟" وہ سر پر ہاتھ رکھے بڑی دیر تک سوچتا رہا۔

فصل کٹنے کا موسم بھی آ گیا۔ شاداں کی ماں نے کام میں ہاتھ بٹانے کی خاطر سے اپنے سارے دور اور نزدیک کے رشتے داروں کو جمع کر لیا۔

"ماں!" شاداں نے کہا۔ "ہمارے کھیت کتنے اچھے ہیں؟"

ماں خاموش رہی۔

"خوش ہونے کی بات پر تم اُداس کیوں ہو ماں؟" شاداں نے حیرت سے پوچھا۔

"تیرے باپ کی یاد آگئی۔" ماں روندھی ہو گئی تھی۔ "میں نہیں کہہ سکتی کہ انہیں ان کھیتوں سے کتنا پیار تھا؟"

"اور تم سے نہیں ماں؟" شاداں بیچ ہی میں بول پڑی۔

"تو بھی کتنی بھولی لڑکی ہے!" ماں مسکرا دی "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ تیری اتنی عمر ہونے کو آئی، اب شادی ہوگی، چار دن بعد ماں بنے گی ——— اور پھر ——— پھر بھی بھولی رہیگی۔" اس کی ماں کے لہجے میں پیار تھا۔

"ماں! میں ابھی آئی۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر آگئی۔ "راجو وہاں انتظار کرتا ہوگا!" اس نے اپنے دل میں سوچا۔

"شاداں!" اُسے دیکھتے ہی راجو خوشی سے اچھل پڑا۔ پھر از خود غمگین ہو گیا۔

"راجو!" شاداں نے اُداس لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔

"کیا؟" وہ حیرت سے اُس کا منہ تک رہا تھا۔

"ماں کہہ رہی تھی ———" اتنا کہہ کر وہ رک گئی۔ باقی جملہ پورا کرنے کی سکت جاتی رہی

"——— یہی نا ———" راجو بولا۔ "تمہاری شادی ہوگی ——— ؟؟"

"ہاں!" اور یہ کہہ کر وہ اس کے سینے سے لپٹ گئی۔ "راجو! مجھے بچاؤ!!" اس نے ایک چیخ ماری اور اسکی گود میں بے دم ہو کر گر پڑی۔

"کیوں؟ اب بولو گے بھی نہیں ——— ؟" وہ ہوش آنے کے بعد کہہ رہی تھی۔

"——— اب بول کر ہی کیا کریں گے؟" راجو کہہ رہا تھا۔

"بول سے چاہت جوان رہتی ہے۔" شاداں اُسے یقین دلا رہی تھی۔

"چاہت کیسی ؟" راجو بولا۔ "ناطے تو تم نے توڑ لئے۔"

"یہ تو ہم نے نہیں کیا۔؟" شاداں کہہ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے"۔۔۔ راجو کہہ رہا تھا۔ "درمیان میں جب ایک تیسرا آگیا تو بندھن ڈھیلا تو ضرور ہو گیا۔"

"مگر تم نے یہ کس طرح فرض کر لیا؟" شاداں کریدی رہی تھی۔

"۔۔۔ تمہاری ماں کے فیصلے کے بعد ۔۔۔" راجو کہہ رہا تھا۔ "شادی کے بعد احسان کا بدلہ تو اُتر ہی جائے گا۔"

اتنا کہہ کر راجو تیزی سے اُٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دُور نکل گیا۔

"راجو! راجو!" شاداں آواز دیتی رہی "تمہیں میری قسم ہے۔ رُک جاؤ۔ تمہیں میری قسم ہے رُک جاؤ۔" وہ متواتر چیختی رہی۔

راجو کچھ جواب دیئے بغیر شمال جانب والے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

شاداں آہستہ آہستہ قدموں سے گھر واپس ہو رہی تھی۔ لیکن راجو کا جملہ۔۔۔ "شادی کے بعد احسان کا بدلہ تو اُتر ہی جائے گا" سوچ سوچ کر اس کے آنکھوں سے متواتر آنسو بہہ رہے تھے۔

"تو کہاں رہ گئی تھی شاداں!" گھر میں گھستے ہی ماں نے سوال کر دیا۔

"کہیں نہیں ۔۔۔؟" وہ مشکل جواب دے پائی۔

"ارے ۔۔۔ ! یہ تیرے آنکھوں میں آنسو کیسے ؟" ماں شاداں کو بڑی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"کچھ بھی تو نہیں ۔۔۔" اس نے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کی۔

"آخر کچھ تو ۔۔۔؟" ماں اصرار کر رہی تھی، "کیا تجھے دولہا پسند نہیں ؟"

شاداں اِس بات پر بالکل خاموش رہی۔

"—— مگر آنسو کیوں نکلے آ رہے ہیں —— ؟" ماں کا اصرار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔
"ایک کانٹا چبھ گیا ——" شاداں کہہ رہی تھی۔
"وہی تو پوچھ ہی رہی ہوں ——" ماں نے کہا۔ "لاؤ میں نکال دوں۔"
"اِس وقت تو تم ہاتھ بھی نہ لگاؤ ماں ——" شاداں گرج کر بولی —— "اور تکلیف بڑھ جائیگی ——"
—— ماں دیر تک حیرت سے اُس کا مُنہ تکتی رہی ——

آثم میرزا

انگارے اور پھول

پہلی ہی نظر میں ہری رام کو میں نے پہچان لیا تھا - اور وہ بھی یوں میرے سامنے آ کر کھڑا ہوا تھا جیسے باز کے پنجوں میں پھنسا ہوا زخمی کبوتر اچانک فضا میں چکر کھاتا میرے قدموں میں آ گرا ہو --- وہ سنہری حاشیہ والی شال پہنے بوڑھی نائکہ کی مانند رجنی کے دائیں طرف بیٹھا تھا اور سازندے ہماری آمد پر تعظیماً سروں کو جنبش دے رہے تھے - ہریش نے مسکراتی آنکھوں سے رجنی بائی کی طرف اشارہ کیا - جیسے وہ اپنے انتخاب کی داد چاہ رہا ہو..... شام کو اس نے کچھ اس انداز سے رجنی بائی کی تعریف کی تھی کہ میں اسے دیکھے بغیر واپس پاکستان جانا نہ چاہتا تھا - دہلی میں میری یہ آخری رات تھی اور میں ہریش کی دعوت کو ٹھکرا نہ سکا تھا۔ کنور اودے سنگھ کی کوٹھی پر ہریش سے ملاقات نہ ہوتی تو شاید زندگی بھر یہ کسک دل میں پھیلنے نہ پاتی - جو ہری رام کو دیکھ کر پیدا ہوئی تھی اور چند ہی لمحوں میں جس نے زندگی کے ہر گوشہ میں اذیت ناک تلخی اور کرب ناک ندامت رچا لی تھی ——— ہریش ہنس مکھ اور ملنسار نوجوان تھا - اس کے نظریات میں تعصب کی گھٹن نہ تھی اور اپنی آزاد خیالی کی بدولت وہ کنور اودے سنگھ سے کافی بے تعلق تھا - چونکہ اپنے سسرال کی وجہ سے کنور اودے سنگھ سے میرے تعلقات برادرانہ قسم کے تھے اس لئے ہریش مجھ سے بھی جھجھک نہ محسوس کرنے لگا - جب میں نے اس سے شرارتاً پوچھا -

"کیوں بھئی دہلی کی مشہور چیزیں کون کون سی ہیں؟" تو اس نے کنور اودے سنگھ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر جواب دیا۔

"رجنی بائی اور رجنی بائی۔" "یعنی! تم شائد میرا مطلب نہیں سمجھے۔" میری جلد بازی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کنور اودے سنگھ نے کہا۔

"خواجہ صاحب۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ چھوکرا کسی بائی کے دامِ محبت میں گرفتار ہو کر ہر چیز میں اسی کا عکس دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک دہلی کی مشہور چیز سوائے اِس بائی کے اور کوئی نہیں"

میں نے اپنے خیال میں اس پر چوٹ کی۔ "جوانی کی طغیانی بڑی بے رحم ہوتی ہے۔ برخوردار اگر تمہارا عشق صادق ہے تو ایک دن ضرور چلمیں بھرو گے۔" ہربنس نے بھرپور یقین کے ساتھ کہا "اس کی نوبت کبھی نہ آئیگی جناب۔ ہم کوئی بگڑے رئیس نہیں جو ناز نخرے اٹھاتے فقیر ہو جائیں۔ بڑی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے۔ اور اگر زندہ رہے تو آپکو ضرور شادی کا دعوت نامہ بھیجیں گے۔"

مجھے اس کے ارادہ پر تعجب ہوا۔

"مگر صاحبزادے اب دیر کس بات کی ہے؟" "رجنی کا باپ عجیب قسم کا آدمی ہے کسی پر بھی اعتبار نہیں کرتا۔ انسانیت کی اس کی نظر میں کوئی وقعت ہی نہیں۔ جب شادی کا ذکر کرو تو وہ پہلے تو خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔ پھر اچانک قہقہہ لگا کر مذاق اڑانے لگتا ہے۔"

"۔۔۔ اور رجنی بائی کا رویّہ کیسا ہے؟" "وہ تو میرا ساتھ دینے پر رضامند ہو گئی ہے اسے تو ضرور اپنے پیشہ سے نفرت ہے۔ مگر باپ کی خاطر وہ اپنے ماحول سے بغاوت کرنے سے گھبراتی ہے۔"

"عجیب عورت ہے؟" کنور اودے سنگھ نے کہا "خواجہ صاحب ہاس مارکیٹ کی سبھی عورتیں اسی قماش کی ہیں۔ اگر وہ ایسے بہانے نہ بنائیں تو چاہنے والے کیسے پروانوں کی مانند چکر لگاتے رہیں۔"

ہربنس جذباتی لہجہ میں بولا۔ "کنور صاحب۔ وہ ان سب سے بالکل مختلف ہے

اسکی کسی ادا میں تصنّع نہیں۔ اس کے رویہ میں کھوٹ کا شائبہ تک نہیں۔ آپ اسے ایک نظر دیکھ کر خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

"نہیں بھئی۔ مجھ سے یہ نہ ہو سکیگا۔" پھر کچھ سوچ کر زیر لب مسکرا کر کہا۔ "البتہ خواجہ صاحب کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ جاتی دفعہ یہ دہلی کی خاص الخاص چیز بھی دیکھ لیں تو اچھا ہے۔" میں تو اشارے کا منتظر تھا۔ کسی پس و پیش کے بغیر ہی میں نے ہریش کیساتھ پروگرام بنا لیا —— اب میں رجنی بائی کو پرکھنے والی نظروں سے دیکھنے کی بجائے ہری رام کو تحیّر زا نظروں سے دیکھ رہا تھا —— اس نے پہلے ہریش کی طرف دیکھا۔ ذرا کسمسایا۔ شال میں سے ہاتھ باہر نکال کر گھٹنوں پر رکھے۔ پھر نظروں کا زاویہ بدلا اور رجنی کے بیحد دلکش چہرے پر بڑی حسین مسکراہٹ کو مچلتے دیکھ کر اس نے پلکیں تیزی سے جھپکائیں اور پھر اس کے چہرے پر ایسے آثار پیدا ہو گئے جیسے کسی قیمتی شے کے کھو جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا ہو۔ ہریش نے مخصوص نشست کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میرا ہاتھ زور سے دبایا اور میں پہلی بار بھرپور نظروں سے رجنی کا جائزہ لینے لگا —— میں نے کوئی اٹھارہ سال پہلے کلکتہ میں اپنے دوست بتواری پرشاد لال سے کامروپ کھچیا کے جادو کی ایسی متاثر تعریف سنی تھی کہ بہت عرصہ تک میں اس جادو کو ایک نسوانی پیکر میں دیکھنے کا متلاشی رہا تھا۔ اور اب رجنی کو ایک شدید لگاؤ کے زیر اثر تبسم پاشی میں مصروف دیکھ کر یکدم لاشعور کے بند کواڑ ایک کھڑکھڑاہٹ کیساتھ کھل گئے اور اٹھارہ سال سمٹ کر رجنی کی مسکراہٹ میں رچ گئے۔ یہ رچاؤ ایسا انبساط انگیز اور مسحور کن تھا کہ میں ہریش اور ہری رام کی موجودگی کو بالکل فراموش کر بیٹھا۔ کامروپ کھچیا اپنی ساری پُراسرار روایات کیساتھ میرے سامنے جلوہ افروز تھا اور میں نغمے اور خوشبو کے حسین ملاپ کو اپنا روشن مقدر سمجھ کر خود وارفتگی کی منزل پر آ گیا تھا۔ ہریش نے میرا ہاتھ کھینچ کر کہا۔ "بیٹھئے بھی جناب۔ آپ تو یوں کھوئے ہو جیسے کوہ قاف کی نگری میں آ گئے ہوں۔"

پھر وہ رجنی سے مخاطب ہوا۔ "یہ اپنے خواجہ صاحب ہیں۔ پاکستان سے ملنے کو

آئے تھے۔ اور میں زبردستی انہیں اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔ اسکی ہنسی میں ایسا خلوص اور اعتماد تھا کہ مجھے اپنی خود وارفتگی کی کیفیت پر ندامت محسوس ہونے لگی۔ اس کے قریب بیٹھ کر میں نے ندامت چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہریش کے انتخاب پر اسے مبارکباد دینا چاہتا تھا۔ اس لیئے یہاں تک چلا آیا۔"

ہری رام کی طرف اشارہ کر کے ہریش بولا۔ "یہ رجنی کے پتاجی ہیں۔ بڑے اچھے اور ملنسار آدمی ہیں۔ مجھ سے تو خاص طور پر عزت سے پیش آتے ہیں۔"

ہری رام نے نظریں اُٹھائیں۔ میں اس کے بالکل سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بجلی کا کوندا لپک گیا اور پھر پھیلی ہوئی آنکھوں میں عجیب سی تشنگی اور استعجاب کے ڈورے اُبھر آئے۔ اس کے یوں دیکھنے سے میرے سینے میں ایک پھانس سی چبھنے لگی اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں جوالا مُکھی کے دہانے پر لڑکھڑا رہا ہوں ——

"آپ — خواجہ — صاحب ہیں!" — یہ الفاظ اس نے بڑی مشکل سے رقت انگیز لہجہ میں ادا کئے اور اسکی ٹھوڈی گھٹنوں سے ٹکرا گئی ——

ہریش نے متفکر لہجہ میں پوچھا۔ "آپکی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ کوئی تکلیف تو نہیں؟"

ہری رام خاموش رہا۔ مگر اس کے گہرے سانسوں کی چلن اس بات کی غماز تھی کہ مجھے پہچان کر اس کی زندگی کا ہر گوشہ تڑپ اُٹھا ہے۔ میں خود کو یوں محسوس کرنے لگا جیسے تھوہر کے کانٹوں میں اُلجھ کر رہ گیا ہوں —— رجنی کو دیکھ کر روح نے جوانی کو بے تابانہ آواز دی تھی۔ اسکی گونج المناک چیخ میں ڈھل کر شعور میں تھرتھرا رہی تھی۔ رجنی کا پتا اور بملا کا پتی ہری رام ایک نئے روپ میں ایک جانگسل انداز میں نظریں مجھ پر جمائے ہوئے تھا۔ جیسے جوانی کی ساری خوشیاں، سارے رنگ اور ساری خوشبوئیں لٹا کر ہوڑہ برج پر کھڑا چھلانگ لگانے کو تیار ہو —— اس سے میری پہلی ملاقات بھی ہوڑہ برج پر ہی ہوئی تھی۔ میں بنواری کے رکشا پر بیٹھا للوا کے غلیظ بازارِ حسن کی طرف جا رہا تھا اور منشیات کے خفیہ اڈہ تک

رسائی حاصل ہونے کی خوشی میں ہوائی قلعے بنا رہا تھا۔ کہ شعور کی تیز آوازیں سُن کر میرے تصوّرات کو جھٹکا لگا۔ موسم خوشگوار ہونے کیوجہ سے ہوڑہ برج پر خُوب چہل پہل تھی۔ مَیں نے گردن باہر کی۔ ہری رام ہوڑہ اسٹیشن کی طرف اُنگلی اُٹھائے چلّا رہا تھا ۔۔۔

"وہ بھاگا جا رہا ہے۔ اِس نے میرا بٹوا اُڑایا ہے۔ پرماتما کے لئے اِسے پکڑو ۔۔"

نواری نے گردن گھُما کر کہا۔ "یہ بابُو ہمارے پڑوس میں رہتا ہے۔" !

مَیں نے برتری کے نشہ میں کہا۔ "تو پھر اسکی مدد کرنی چاہیئے۔ تیز بھاگ کر اِس سالے کو دبوچ لو۔۔"

ہم نے ٹراموے اسٹیشن تک اِس کا تعاقب کیا۔ مگر وہ اِس سے آگے لوگوں کے جمِ غفیر میں یُوں گُم ہُوا کہ پھر نہ اُبھر سکا۔

نواری نے مایُوسانہ لہجہ میں کہا۔ "یہ بابُو بھی آپ کے پنجاب کا رہنے والا ہے۔ بڑا شریف اور کم گو ہے اور شاید بُزدل بھی۔ معلُوم ہوتا ہے پنجاب میں رہتے ہوئے بھی وُہ پانی اُڑیسہ سے منگوا کر پیتا ہوگا۔"

نواری کی طنز پر میرا ذہن بھنا اُٹھا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ واپس چلو۔ بیچارہ گھر تک کیسے پہنچیگا۔"

اس کے قریب نواری نے رکشا روک لیا۔ مَیں نیچے اُترا۔ اور اُس کے اُترے ہوئے یاس بھرے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بابُوجی اِس پاکٹ مار کا تعاقب تو بہت کیا مگر اِسٹیشن کے سامنے اِتنا ہجُوم تھا کہ وُہ بچ کر نِکل گیا۔" بِلّا ریل کے آہنی جنگلے کو پکڑے روہانسی کھڑی تھی۔ ہری رام نے اُس کی طرف دیکھ کر رندھے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "بِلّا۔ اب پیدل ہی چلنا ہوگا۔" بلّا نے نظریں جھکا لیں۔ مَیں نے بلّا کی طرف دلچسپی سے دیکھا اور میری آنکھوں میں گندم کے سنہری خوشے جھُومنے لگے۔ مَیں نے ہمدردی جتائی۔

"لالہ جی آپ ہمارے ہمسائے ہیں۔ ہم آپکو تکلیف میں دیکھ کر کیسے دامن بچا سکتے ہیں۔"

آپ کہیں تو نواری آپکو رکشا پر چھوڑ آئے۔"

نواری جلدی سے بول اُٹھا۔ "یہ ٹرام میں چلے جائیں گے۔ ہمیں دیر ہوگئی تو معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔" —— میں نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر ہری رام کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے تشکّر آمیز نظروں سے دیکھا۔ پھر ہملا سے نظریں مِلائیں۔ مَیں نے اجنبیت کی دیوار سرکاتے ہوئے کہا۔ "مَیں بھی پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ اِس طرح ہم غیر نہیں رہے اور پھر پردیس میں ہم ہمسائے بھی ہیں۔ یہ لے لیجئے۔ اُمید ہے شام کو ضرور مُلاقات ہوگی۔" ہری رام کی انگلیوں میں نوٹ کانپنے لگا —— ہم اپنے اڈہ پر عین وقت پر پہنچ گئے۔ گُل باز خاں ہمارا منتظر تھا —— معاملہ بڑی خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔ مَیں نے معقول کمیشن پر منشیات کے کاروبار میں اس کا معاون بننے کی پیشکش قبول کر لی تھی —— گُل باز خاں سے تعارف نواری نے دو دن پہلے کرایا تھا۔ نواری سے مُلاقات نہ ہوتی تو اِس وقت میری ڈگر شائد اِس سے مختلف ہوتی —— مَیں فوج میں ملازم ہو کر کلکتہ آیا تھا۔ ہماری کمپنی سیلدا کے پاس کیمپ لگائے ہوئے تھی۔ اور ہم چوری چُھپے شہر کی رونقوں پر شبخون مارنے نکل آیا کرتے تھے۔ کلکتہ کی دِلکشی کو اگرچہ بلیک آؤٹ اور پناہ گاہ کی مانند دکانوں کے آگے بنائی ہوئی اینٹوں کی دیواروں نے شدید دھچکا لگایا تھا۔ پھر بھی عورت اور بوتل کی فراوانی نے اِس نگری کو ہمارے لئے بہجت جبین بنا دیا تھا۔ وہاں کے بازاروں میں گھومتے شرارتیں کرتے ہوئے میرا جی چاہتا تھا کہ وہاں کا سارا حسن، ساری مٹھاس ایک ہی بار سمیٹ کر سینے میں چُھپا لُوں۔ کلکتہ کی زندگی جو عورت۔ بوتل اور گھوڑے کے گرد گھوم رہی تھی مجھے اپنے گرد چکّر لگاتے ہوئے محسوس ہونے لگی اور جب ہماری کمپنی کو منی پور روڈ کی طرف کوچ کرنے کا حکم مِلا —— تو مَیں کلکتہ ہی میں رہ گیا۔ شلوار قمیض کے اُوپر فوجی وردی پہن کر مَیں اسپیشل ٹرین سے بھاگ آیا۔ فوجی وردی اُتار کر پھینک دی اور زکریا اسٹریٹ کی بڑی مسجد کے مہمان خانے میں پناہ لے لی۔ کوئی بھی میرے حسب نسب سے واقف نہ تھا اور مَیں خود بھی اپنے ماضی کے متعلق کچھ زیادہ نہ جانتا تھا۔ اپنے عزیز واقارب کا کچھ پتہ نہ تھا۔ غلیظ ہوٹلوں اور سنیماؤں میں محنت مزدوری کرتے ہوئے بچپن نے

جوانی کی حدوں کو چھوا تھا۔ اُٹھنے بیٹھنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ نہ کوئی انتظار کرتا تھا۔ نہ کامرانی کی دُعائیں مانگتا تھا۔ خود ہی پھیلے ہوئے ہاتھ بن جاتا تھا اور خود ہی دُعا

دُوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو میں نے اپنے ماحول کو چھوڑ کر فوجی ماحول سے ایک نئی اُمنگ اور ترنگ کیساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ وہاں سب ایک جیسی وردی پہننے کے بعد ذات پات کی اُلجھنوں میں پھنستے نہ تھے۔ کوئی بھی خود کو کسی سے کمتر نہ سمجھتا تھا۔ احساسِ کمتری جس نے مجھے بہت کچلا تھا۔ ستایا تھا۔ اب یُوں مجھ سے گھبرانے لگا تھا جیسے بنگال کے دیہات کی عورتیں فوجی وردی سے خوف کھاتی تھیں۔ کلکتہ کی زندگی کے سطحی مطالعہ کے بعد مجھے یقین پیدا ہو گیا تھا کہ وہاں میرے پنپنے کے روشن امکانات ہیں۔

ایک شام میں بنواری کے رکشا میں بیٹھا سوناگاچی سے گذر رہا تھا کہ وہاں کے ایک مشہور بدمعاش پرشاد سے ٹکراؤ ہو گیا۔ وُہ رکشا کے سامنے کھڑا ہو کر جھومنے لگا۔ میں نے غصیلے انداز میں اسے پرے ہٹنے کو کہا۔ وُہ تحکمانہ لہجہ میں بولا۔ "ہم کو بالی گنج جانا ہے۔ تم نیچے اُتر جاؤ —" خود کو وہاں کے ماحول سے متعارف کرانے کا بڑا مناسب موقع حاصل ہوا تھا۔ نیچے اُتر کر میں نے اس کی توقع کیخلاف بجلی کی سی تیزی سے اسے گریبان سے پکڑا اور ناک پر ٹکّر مار دی۔ اس اچانک حملے نے اسے چکرا دیا۔ میرا مُکّہ اس کے جبڑے پر پڑا اور وُہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ میں نے مٹھی میں پیتل کا مُکّہ چھپا رکھا تھا۔ پنجاب میں وہاں تک اس نے خاموشی سے میرا ساتھ دیا تھا۔ اب میں نے اسے اپنے جوہر دکھانے کی خاطر اُنگلیوں میں پھنسا لیا۔ پرشاد ناک سے بہتے ہوئے خون کو آستین سے پونچھتے ہوئے اُٹھا۔ خونی نظروں سے گھور کر مجھ پر جھپٹا اور پیتل کے مُکّہ کی ایک ہی ضرب سے کراہ کر ڈھیر ہو گیا —— مخالفانہ آوازوں کے ہجوم میں میرے لئے اب بھاگ جانا ہی بہتر تھا۔ میں رکشا میں بیٹھا تو بنواری سرپٹ دوڑنے لگا اور لوگ ششدر سے کھڑے دیکھتے ہی رہ گئے ——

بنواری میری اس کارگذاری سے بیحد متاثر ہوا تھا۔ اب وُہ میرے بالکل قریب ہونے کیخاطر میرا نام اور جائے رہائش معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اچانک مجھے خیال گذرا کہ خود کو بنواری کا ہم مذہب ظاہر

کرنے پر شاید مجھے کوئی بہتر ٹھکانہ مل جائے اور پھر اپنے مفرور ہونے کے احساس کی بدولت بھی
مَیں نیا بہروپ اختیار کرنا چاہتا تھا۔

مَیں نے اپنا نام پنّا لال ظاہر کر کے کہا۔ "حال ہی میں پنجاب سے آیا ہوں۔ کام کی تلاش
ہے۔ ابھی سر چھپانے کو کوئی جگہ نہیں ملی۔"

نواری نے عقیدت مندانہ لہجہ میں مجھے اپنے ہاں رہائش اختیار کرنے کی پیشکش کی۔ مَیں
دکھاوے کے طور پر پس و پیش سے کام لینے لگا۔ وہ کچھ اِس حد تک مجھ سے مرعوب ہو چکا تھا
کہ ملتجانہ لہجہ میں بولا ــــ "استاد میرا بھی آگے پیچھے کوئی نہیں۔ آپ کو میرے پاس رہ کر کوئی
کام کرنے کی بھی ضرورت نہ رہیگی۔ آپ ساتھ ہوں گے تو کوئی سالا ٹھوکر نہ لگا سکیگا۔ وہاں خضر پور میں
باسو بدمعاش بہت تنگ کرتا ہے۔ مَیں اسے بھی مزہ چکھانا چاہتا ہوں۔"

اپنی ساکھ جمتے دیکھ کر مَیں رضامند ہو گیا۔ خضر پور میں سپاری مارکیٹ کی پچھلی طرف دڑبہ نما
کوٹھڑیاں بنی تھیں۔ درمیان میں تنگ غلیظ گلی تھی۔ اس کے پیچھے قدم اٹھاتے ہوئے مَیں گلی
میں کئی بار ڈگمگایا۔ بدبو کے تیز بھبھکوں سے سانس رُکنے لگی تھی۔

رہنے کے لئے جگہ مل گئی تھی۔ باسو بدمعاش سے مڈبھیڑ ہونے کے بعد آس پاس کے
اٹھائی گیرے۔ جیب کترے اور گندے نالہ کے کنارے واقع بازارِ حسن کے دلال بھی مجھ سے دبنے لگے
تھے۔ داداگیری سے وقت مزے میں گذرنے لگا تھا اور مَیں نے اپنے خیال میں کلکتہ کو اپنے سامنے
جھکا لیا تھا۔ نواری کی شناسائی گل باز خاں سے بھی تھی اور ریزو کا کے فلیٹ پر اس نے میرا تعارف
بھی گل باز خاں سے کروا دیا تھا۔۔۔ اور اب مجھے اس سے منشیات کی ایجنسی لا دی تھی۔

نواری بائیں ہاتھ کی پہلی دو انگلیوں کیساتھ بندھے ہوئے گُھنگھرو کو رکتا کے بجائے پر مارتے ہوئے
بھاگ رہا تھا۔ اب اور کوئی پروگرام نہ تھا۔ نواری نے بھی چار پانچ روپے کما لئے ہوئے تھے
مَیں نے نواری سے پوچھا۔ "کیوں بھیا اب کہاں چلوگے؟" نواری نے اسی رفتار سے دوڑتے ہوئے کہا
"اگر وہ جا پُو جس کا بٹوا کھو گیا تھا۔ اِس وقت مل جائے تو کیا رہے!"

"اوہ - مَیں تو اپنی کامیابی کے نشہ میں اِسے بھول ہی گیا تھا - حالانکہ اِس کی تنّی کو ایک بار دیکھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا -" "اُستاد بڑے معرکہ کی چیز ہے -"

"ہاں بھیّا! پھر وہ ہمارے بھی ہیں تیر نشانے پر بیٹھ گیا تو دوسری رینو کا جنم لے لے گی -"

"ہاں اُستاد میں بھی یہی سوچ رہا ہوں - اب ان سے مراسم بڑھانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے"

مجھے مُظفر پور کے پل پر اُتار کر وہ رکشا چھوڑنے چلا گیا - جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا لفافہ تھا - وُہ ہری رام کے گھر خالی ہاتھ نہ جانا چاہتا تھا - سُورج غرُوب ہو رہا تھا اور مغربی اُفق پر دخانی جہازوں کا دھُواں پھیل رہا تھا - ہری رام کے نیم وا دروازہ میں جھانک کر نواری کے پُوچھا —

"بابو جی آپ اندر ہی ہیں؟"

دو ایک منٹ تک کھسر پھسر ہوئی - پھر ہری رام دروازہ پر آگیا - ہماری طرف غور سے دیکھا اور مُسکرانے لگا -

"نمسکار بابو جی -" نواری نے اسکی مُسکراہٹ کا جواب دیا - اس نے اندر کی طرف نظریں گھمائیں اور گھبراہٹ اور مسرت کے مِلے جُلے لہجہ میں کہا -

"میں ذرا لالٹین روشن کر لوں -"

لالٹین کی روشنی میں اندر داخل ہو کر مَیں نے سب سے پہلے ہِلا کو تلاش کیا - وہ سمٹی ہُوئی ایک طرف کھڑی تھی - مَیں نے اِس کے قریب رُک کر ہاتھ باندھ دیئے -

"نمستے بھابی - پردیس میں جب کوئی دیس والا مِل جائے تو خوشی کی انتہا نہیں رہتی -"

وہ جھینپتے ہوئے بولی "بھگوان نے بڑی کرپا کی جو آپکو بھیج دیا - ورنہ یہاں تو کوئی ایک سے دیئے کو روادار نہیں ہوتا -"

"بیٹھو بھائی، اب تم کوئی غیر تھوڑے ہو پہلی ہی مُلاقات کے بعد مجھے تو یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے ہم برسوں ایک ساتھ رہ رہے ہوں" ہری رام نے کہا -

تواری لفافہ ہری رام کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "ہم بھی آپ ہی کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ یہ پنّالال بھی آپ سے دوبارہ ملنے کے لئے بیچین ہو رہے تھے۔"

ہری رام نے لفافہ پر نظریں جما کر کہا۔ "میں اِس میلاپ پر جتنی بھی خوشی مناؤں کم ہے۔"

میں نے چند منٹ بعد اس سے کلکتہ میں آنے کا سبب پوچھا تو وہ سنجیدہ لہجہ میں بولا۔

"اپنے شہر میں بیکاری کے ہاتھوں تنگ آ چکا تھا۔ پتاجی نے زبردستی شادی کردی تھی۔ وہ پرچون کی دُکان کرتے تھے۔ مگر میں میٹرک پاس کر کے نوکری کرنے کا حامی تھا۔ پتاجی کی اچانک موت کے بعد میرا دل وہاں سے اُچاٹ ہو گیا۔ میرے محلّہ کا ایک آدمی گردیال کلکتہ میں پاٹنگ شو فیکٹری میں ملازم تھا۔ وہ چھٹی پر آیا تو مجھے بھی ترغیب دلا کر یہاں لے آیا۔ ملازمت مل گئی تو میں بملا کے بغیر زندگی میں ایک تکلیف دہ خلاء محسوس کرنے لگا۔ دو مہینے ہوئے میں ایک مہینے کی چھٹی اور ایڈوانس لے کر گھر گیا تھا اور بملا کو ساتھ لے آیا تھا۔ گردیال جب تک یہاں رہا زندگی بڑے مزے میں گزرتی رہی مگر نہ جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ فوج میں ملازم ہو گیا۔ مجھے بھی وہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر میں رضامند نہ ہوا۔ اگر فوج کی ملازمت کرنے ہوتی تو گھر سے یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں امن پسند آدمی ہوں۔ لڑائی جھگڑے سے بہت گھبراتا ہوں۔ اب پرماتما نے گردیال کا نعم البدل بھیج دیا ہے اور زندگی پہلے سے زیادہ خوشگوار بن جائیگی۔"

میں نے بملا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہاں لالہ جی۔ پرماتما نے چاہا تو اب تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی اور بھابی کا وقت بھی اچھا گذرے گا۔"

تواری نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "چلو بھیا ہوٹل تک ہو آئیں۔ بھوک کی وجہ سے جم کر بیٹھا نہیں جا رہا ہے۔"

بملا نے دھیمے لہجہ میں پوچھا۔ "آپ ہوٹل سے کھانا کھاتے ہیں؟"

میں نے لہجہ کو افسردہ بناتے ہوئے کہا۔ "گھر میں کوئی پکانے والی نہ ہو تو پھر ہوٹل کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔" ہری رام نے بملا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ سمجھایا۔ کچھ سمجھا اور پھر کچھ

سے مخاطب ہوا۔ "بھائی پنّالال۔ اب یہ شرم کی بات ہے کہ اپنی بھابی کے ہوتے ہوئے آپ ہوٹل سے کھانا کھائیں۔"

نواری آنکھیں پھیلا کر بولا۔ "کیا واقعی ہم ایسے خوش قسمت ہیں؟"

بملا نے مسکرا کر کہا۔ "خوش قسمتی تو ہماری ہوگی۔"

میں خاموش نہ رہ سکا۔ "ایک شرط پر ہم بھابی کی شرط پوری کر سکتے ہیں!" —— "وہ کیا؟" وہ دونوں ایک ساتھ بول پڑے —— میں نے گھٹنے سیدھے کرتے ہوئے کہا۔ "راشن ہم خود لا کر دیں گے اور کبھی کبھی ہماری فرمائش پہ بھابی کو ہمارے من پسند کھانے بھی پکانے ہوں گے۔"

بملا ہنس پڑی ...... اور ہم ایک نئے رشتہ میں منسلک ہو گئے ... بملا سے ہنسی مذاق بڑھنے لگا۔ ہری رام دن کو کام پر رہتا اور میں زیادہ وقت گھر پر گزارتا۔ ہری رام گھر کی ذمہ داریوں سے بہت حد تک آزاد ہو گیا تھا۔ سودا سلف لانے کے لئے میں موجود تھا۔ راشن کی دقت پیدا نہ ہوتی تھی۔ اچھے سے اچھا پکنے لگا تھا اور بملا کے چہرے پر تفکرات کا موہوم سا عکس بھی باقی نہ رہا تھا۔ وہ ہر وقت بشاش بشاش نظر آتی تھی اور اس کے رنگ روپ میں ایسی شگفتگی اور نکھار پیدا ہوتا جا رہا تھا جیسے گلاب کا پھول شبنم میں نہا کر مسکرا رہا ہو ——

میرا کام سورج غروب ہونے کے بعد شروع ہوتا تھا۔ مگر اب میرا جی رات کا زیادہ حصہ باہر گزارنے کو نہ چاہتا تھا۔ اب میں شام کو وقت نکال کر سب کو فلم دکھانے کے لئے جانے لگا تھا —— بملا کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے میں کلکتہ کے حسن کی تعریف شروع کر دیتا۔ سونے اور ریشم کو اپنی باتوں کا موضوع بنا کر بملا کے چہرے پر ان کا ردِ عمل معلوم کرنے کی کوشش کرتا اور عورت جس کی سب سے بڑی کمزوری سونا اور ریشم ہے اس کے اندر ایک ہلچل سی مچا دیتی اور جب راسے دیدہ زیب قیمتی ساڑھیاں پہنے ہوئے عورتیں اس پاس مٹکتی تھرکتی نظر آتیں تو اس کے چہرے کی دلکشی میں ایک بے چین مسرت کروٹیں لینے لگتی اور اس بے چین حسرت کو ایک تڑپ اور جنون میں مبتلا کرنے کی خاطر میں رنگ محلوں کی پراسرار عشرتوں کی کہانیاں سنانے لگتا —— نواری نے ہری رام کو اپنے اعتماد میں

لے کر تاڑی سے اِسے متعارف کرادیا تھا۔ تاڑی کی کھٹاس پہلے تو ہری رام کے لئے جی متلانے کا سبب بنی تھی۔ پھر وہ یوں نظر آنے لگا تھا جیسے سنگیت منڈل میں بیٹھا ہولے ہولے جھوم رہا ہو —— اور میں بملا کو شیشے میں اُتارنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا — جو کچھ ان پر خرچ کیا تھا اس کی وصولی کو میں بیحد ضروری سمجھتا تھا۔ اب اِسے ہری رام کے بغیر بھی میرے ساتھ شہر کی سیر کا پروگرام بناتے ہوئے جھجک محسوس نہ ہوتی تھی۔ میں اس کے دِل و دِماغ پر اپنے سماج سے۔ اپنی روایات سے۔ اپنے اصولوں اور نظریات سے بغاوت کے نقوش ثبت کر رہا تھا۔ قیمتی ساڑھیاں اور سونے کے زیورات حاصل کرنے کی خاطر دوسروں کے لئے کھلونا بننے کی ترغیب دِلا رہا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی یقین دِلا رہا تھا کہ ایسا کرنے سے اِس کے گھریلو ماحول پر کوئی بُرا اثر نہ پڑیگا۔ اِسکی وفاداری پر کوئی حرف نہ آئے گا۔ کیونکہ اِس طرح اِس کے پتی کو بھی آسائشیں میسّر ہو جائیں گی —— وہ کچھ اِس حد تک میری معتقد بن چکی تھی کہ اس کے دِل و دِماغ پر بن سنور کر رہنے اور ریشم ملا سونا حاصل کرنے کا جذبہ غلبہ پانے لگا تھا۔ میری اس مہم میں رینو کا بھی معاونت کر رہی تھی۔ میں نے بملا سے بھی اس کا تعارف کرا دیا تھا۔ وہ بملا کو جب اپنے ماضی کی کرب ناک مفلسی کا حال سُنا کر اپنے پُر عشرت حال کا ذِکر کرتی تو بملا کے چہرے پر عجیب سے رنگ اُبھرتے مٹنے لگتے اور پھر ایک رات اُس نے اپنے ماضی سے بغاوت کا اعلان کر دیا — دوسری طرف نواری نے ہری رام کو اپنے رنگ میں ڈبو دیا تھا —— دونوں کے لئے ہم بے رحم دُشمن ہوتے ہوئے بھی ہم قابلِ تعظیم دوست تھے۔ نواری کے اُکسانے پر ہری رام اب دارو بھی پینے لگا تھا اور بملا کا لباس زیادہ دلکش اور قیمتی ہوتا جا رہا تھا۔ ہری رام ہماری شاطرانہ پالیسی سے بے خبر ان نوازشوں کو ہمارے خلوص کی انتہا سمجھ رہا تھا اور ہم اس کی بیوقوفی اور سادہ لوحی پر مسرور ہو رہے تھے —

ایک دِن اچانک میں خفیہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ پرشاد بدمعاش نے یا باسو بدمعاش نے مخبری کی ہے۔ اپنے بچاؤ کی انتہائی کوشش کے باوجود میں مات کھا گیا۔ میری اصلیت تو کسی پر ظاہر نہ ہو سکی مگر منشیات کے ثبوت کو مٹایا نہ جا سکا اور مجھے سزا ہو گئی۔ جیل میں کسی نے میری خیر خیریت معلوم کرنے کی فکر نہ کی۔ میں نے خود بھی تو کسی کا نام ظاہر نہ کیا تھا۔ سارا الزام اپنے اوپر

لے لیا تھا۔ اس نے مجھ سے ملاقات کر کے گل بازخاں کوئی خطرہ مول لینا نہ چاہتا تھا۔ البتہ تمہاری پر ضرور غصہ آتا تھا کہ اس نے بھی دامن چھڑا لیا تھا۔ حالانکہ گل بازخاں سے ملاقات کے بعد اسے میری سزا کا علم ہو جانا چاہیئے تھا۔ میری سزا کی میعاد اس وقت ختم ہوئی جب کلکتہ کی رونق تعصبات کے گہرے اندھیروں میں ڈوبی جا رہی تھی اور فسادات اپنی پوری بربریت کیساتھ شہر کے حسن کو بگاڑ رہے تھے ۔۔۔ تمہاری کا کوئی سراغ نہ مل سکا اور ہری رام اور ببلا کی موجودگی کا پتہ نہ چل سکا ۔۔۔ میں اب شہر میں لوگوں کے سنگدلانہ گھاؤ سے خوف کھانے لگا تھا اور پنجاب کی یاد بُری طرح ستانے لگی تھی۔ میں راستہ ہی میں تھا کہ پاکستان کی مملکت قائم ہونے کا اعلان ہو گیا ۔۔۔ امرتسر تک میں پنّا لال ہی بنا رہا اور اس کے بعد میں مہاجر بن گیا تھا۔ بے رحمانہ ماحول میں جوانی کے قیمتی لمحات گنوا کر میں بہت کچھ حاصل کر چکا تھا۔ موت کی سرگوشیاں سُن کر زندگی سے لگاؤ بڑھ گیا تھا۔ رہائش کے لئے ایک مکان اور کاروبار کے لئے ایک دکان حاصل کر کے میں نے خود کو یکسر بدل لیا اور جنرل مرچنٹس کی دکان میرے وقار اور شہرت کی موجب بن گئی۔ ایک مہاجر خاندان میں شادی ہونے کے بعد میں نے ماضی کی یادوں کے نقوش مٹانے کی کوشش شروع کر دی تھی اور کامیاب ہوتا جا رہا تھا۔ دہلی میں ٹھاکر اودھے سنگھ کے خاندان سے میرے سسرال والوں کے بڑے گہرے مراسم تھے اور انہی کی بدولت وہ فسادات کے دوران بڑی حفاظت سے پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اور یہی پُرخلوص تعلقات میرے دہلی میں آنے کا سبب بنے تھے اور آخری رات میں ہرش کے ہمراہ ہری رام کے سامنے آ گیا تھا ۔۔۔ ہری رام شاید اپنے جذبات پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔ وہ میرے پہلو میں بیٹھ کر میرے چہرے پر ٹکٹکی باندھے ہوئے گلوگیر لہجہ میں بولا۔

"آپ پنّا لال ہی ہیں۔ ہاں میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔" اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ رجنی عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور ہرش بُت بنا بیٹھا تھا۔ میرے سینے میں ایک تلاطم بپا تھا مگر میں خود کو اب ماضی کا ایک نمائندہ بنانے کو تیار نہ تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"انسان اپنی کھوئی ہوئی خوشیوں کی تلاش میں کبھی ایسی منزل پر آ جاتا ہے کہ اسے ہر چیز میں

۔۔۔انہیں کا پرتو نظر آنے لگتا ہے ۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ پنالال کی شکل مجھ سے ملتی جلتی ہو مگر میرا نام تو خواجہ انور ہے اور یہ کنور راود ھے سنگھ کا مہمان ہوں۔"

ہری رام اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔" شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں مگر دل نہیں مانتا۔ یقین نہیں آرہا کہ پنالال کی بجائے یہاں کوئی دوسری ہستی موجود ہو۔"

ہرنیش نے قریب کھسکتے ہوئے بے کل لہجہ میں پوچھا۔"پنالال کیا واقعی ایسی ہستی تھی۔ جس کی یاد نے آپکی زندگی میں غم ناک تغیر پیدا کر دیا ہے ؟"

ہری رام نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔" پنالال میرے ماضی کی ایک اہم کڑی تھا اور اس کڑی کے ٹوٹ جانے پر میں آج تک اندھیروں میں بھٹک رہا ہوں۔"

مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ وہ ابھی تک پنالال کی اصلیت سے بے خبر ہے۔ اسے اس لٹیرے کی شاطرانہ چالوں کا کوئی علم نہیں ہو سکا اور نہ ہی اسکی خباثتوں کو جان سکا ہے۔ میں نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

"آپکی بے تابانہ حرکات نے مجھے بیحد متاثر کیا ہے۔ امید ہے آپ مجھے پنالال کے متعلق مزید کچھ بتائیں گے۔ تاکہ میں بھی جان سکوں کہ اس ہستی میں ایسی کون سی خوبی تھی۔ جسے آپ ابھی تک فراموش نہیں کر سکے۔"

اس نے رجنی کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے اس کی موجودگی وہاں پر گوارا نہ ہو۔ پھر سر کو خفیف سی جنبش دے کر بولا۔

"نہیں سبھی بیٹھے رہو۔ سب کے سامنے ہی میں اپنے ماضی کو رسوا کروں گا۔" وہ پرسوز لہجہ میں پنالال سے پہلی اور آخری ملاقات کا حال سنا رہا تھا۔ اور میں اسکی معصومیت اور ملنساری کی کیفیت سے پشیمانی کی دلدل میں دھنسا جا رہا تھا۔ پنالال کی گم شدگی کا ذکر کرکے وہ سانس درست کرنے کے لئے رکا اور گرم شال سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا۔

"پنالال دراصل میری خوشیوں کا مرکز تھا۔ دو دن کے بعد بخاری اس کا کھوج لگاتے ہوئے ٹرام کے نیچے کچلا گیا۔ آخری سہارا بھی چھوٹ گیا اور میں اتنے بڑے شہر میں خود کو

تنہا محسوس کرتے بچوں کی مانند روتا رہا - کام پر جانے کو جی نہ چاہتا تھا - دارُوپی کر میں ان کی جدائی کے زخم مٹانے کی کوشش کرتا تھا اور زخم اور زیادہ گہرے ہو جاتے تھے - پنّالال کی موجودگی میں خود کو کلکتہ کا حاکم سمجھتا تھا اور اس کے بغیر میں ایک فالج زدہ مریض بن کر رہ گیا تھا - مسلسل غیر حاضری کی وجہ سے مجھے کام سے جواب مل گیا اور زندگی اور بھی اذیّت ناک بن گئی تھی - کملا مجھے برابر تسلیاں دے رہی تھی - اس نے ہمّت نہ ہاری تھی اور میرے اخراجات میں کمی پیدا نہ ہونے دی تھی - آخر مجھ سے یہ راز پوشیدہ نہ رہ سکا کہ مجھے فاقوں سے بچانے اور میری آسائش کی خاطر اس نے جسم بیچنے کا دھندا شروع کر رکھا ہے - پہلے تو میری غیرت جوش میں آ گئی اور پھر کملا کی بے غرض سیوا اور زندہ رہنے کی شدید تمنّا نے میرے ہونٹ سی دیئے - ہم نے ایک خوبصورت فلیٹ کرایہ پر لے لیا - پنّالال اب بھی بہت یاد آتا تھا - رجنی کی پیدائش کے بعد کملا کچھ رنجیدہ رہنے لگی تھی - میں نے اس کے دل کی گہرائی میں بہت جھانکا - مگر یہ راز معلوم نہ ہو سکا اور اس راز کو سینے میں چھپائے کملا ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہو گئی ——— رجنی اس وقت دو سال کی تھی - آمدنی کے تمام ذرائع ختم ہو چکے تھے اور زندگی پھر میرے لئے ایک المناک نوحہ بن کر رہ گئی تھی - نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس نے مجھے رجنی کی خاطر زندہ رہنے پر مجبور کر دیا تھا ——— مجھے ایک مارواڑی سیٹھ کے پاس ادنیٰ ملازمت مل گئی - خود کو بھول جانے کی خاطر میں ہر وقت کام میں جُتا رہتا تھا - میرے ہمسایہ میں ایک بنگالی بابو اننت کمار بنرجی رہا کرتا تھا - بڑا شریف اور ملنسار - رجنی دن بھر اسی کے گھر کھیلتی رہتی تھی - اس کی بھی تین لڑکیاں تھیں اور ان کے مستقبل کو سنوارنے کی خاطر وہ انہیں سنگیت کی تعلیم بھی دلا رہا تھا - رجنی بھی ان میں شامل ہو کر انہیں کا رنگ اختیار کرتی جا رہی تھی - میں بڑھاپے کے جھٹکے ہوئے کلس دیکھ کر ہانپ رہا تھا اور رجنی اپنی ماں کا روپ اختیار کرتی جا رہی تھی لو اسی دوران ایک اور حادثہ ہو گیا ——— میرے مالک کے پاس دہلی سے ایک بیوپاری آیا تھا - اس کے ساتھ میری ہی عمر کا ایک نوکر نسی بھی تھا - انہوں نے ایک ہفتہ کلکتہ میں قیام کرنا تھا - نسی مجھ سے کچھ مانوس ہو گیا - میں نے اسے گھر پر دعوت دی - کھانا کھاتے ہوئے اس کی نظر ہارمونیم پر پڑی اور اس نے پُر اشتیاق لہجہ میں پوچھا -

"کیا تمہیں گانے کا بھی شوق ہے؟"

مَیں نے مسکرا کر رجنی کے شوق کا ذکر کر دیا۔ اب وُہ بضد تھا کہ رجنی ضرور کوئی گانا سُنائے۔ مَیں نے اسکی دل شکنی مناسب نہ سمجھ کر رجنی کو پاس بُلایا۔ اِسے دیکھ کر ہنسی پہلے ہی شاید ہوش کھو گیا تھا۔ اِس سے بھجن سُنکر تو وہ جھوم جھوم کر تعریف کرنے لگا تھا۔ علیحدگی میں آکر وُہ مجھے ایک نئے موڑ پر آنے کی ترغیب دلانے لگا۔ اس نے میرے ماضی کی ساری رنگینیاں میرے سامنے بکھیر دیں، اور مَیں بلا کی نپی سیوا کے جذبے کو نئے رُوپ میں ڈھالنے کی خاطر رجنی کو یہاں لے آیا۔ پنّالال نے جن بہاروں کے گیت سُنائے تھے انہیں حاصل کرنے کی خاطر مَیں نے اپنے دل کو پتھر بنا لیا تھا اور اب آپکو یہاں دیکھ کر یہ پتھر پگھل کر رُوح میں گرم لاوے کی مانند اُترتا جا رہا ہے اور ندامت کی تیز کٹار میرے دماغ کو چھیدتی جا رہی ہے — "

اِس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ مَیں نے بھاری لہجہ میں کہا۔

"اب یُوں سمجھ لو کہ پنّالال ایک نئے رُوپ میں تمہارے پاس اِلتجا لے کر آیا ہے — "

"اِلتجا؟ "—

"ہاں اِلتجا — ہرشیں کو پنّالال کا بیٹا ہی سمجھ کر رجنی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دو۔ تمہیں کھوئی ہُوئی خوشیاں مل جائیں گی۔"

اِس نے چہرے سے ہاتھ اُٹھائے۔ مَیں نے اِسکی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں ستارے مسکرا رہے تھے۔

نعیمہ مسعود

پیلے مزار والے

شانو کی لُگائی کافر ہی تو تھی۔ اگر کافر نہ ہوتی اور اس کے دِل میں پاک ایمان ہوتا تو آج سے تین برس پہلے شانو کے پیر جی کی پیری مُریدی پگالیاں نہ بکتی۔ شانو کی لُگائی آج سے تین برس پہلے بھی کافر تھی اور آج بھی کافر ہے۔ شانو کا گھر بار چھوڑ دینے کے بعد بھی اُس کے کافر پن میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

پیلے مزار والے پیر جی کی شان میں تو آج تک کسی نے "ہوں" تک نہ کہی تھی اور شانو کی لُگائی نے تو اپنی گز بھر کی زبان سے نیلے پیلے دیدے مٹکا کر بہت کچھ خرافات بکتی جھکتی رہی تھی اور بکنے جھکنے کے بعد للوا کو کُولہے پہ دھرے — کپڑوں کی گٹھڑی سر پہ رکھ چل دی تھی ٹھمکتی ہوئی اپنے میکے کو — شانو کیا اُس کے باپ کا دیا کھاتا تھا جو رعب میں آجاتا ؟ اُس نے بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ جاتی ہے سُسری چلی جائے۔ اُس کی پھٹی جُوتی کی نوک سے۔ ثابت جُوتی اُن دنوں رہی ہی کب شانو کے پاس۔ سب ہی کچھ تو پیر جی کی نذر کر چکا تھا۔

پر للوا کی چنتا من کو ہر پل لگی رہتی اور سونی سونی انگنائی تو جیسے کاٹ کھانے کو دوڑے۔ نہ من کو بھائے نہ تن کو سہائے۔ ہائے پیر جی تیری کرامات کے صدقے۔ یہ دن بھی جیسے تیسے بیت ہی رہے تھے۔ کئی بار سوچ وچار کیا کہ کاشی کو جا کر منا لائے۔ نئی چھینٹ کے لہنگے اور چم چماتی چولی

کی رشوت پر — مگر اُس کا قصور ہی کیا تھا کوئی بات بھی تو ہونی ہو؟ نہ جانے چڑیل اتنی نک چڑھی اور بد دماغ کیوں ہو گئی تھی۔ شکل چڑیلوں ایسی مزاج پریوں جیسا۔۔۔۔ ارے لوگ تو اللہ والوں کے اُوپر بہت کچھ نچھاور کر دیا کرتے ہیں۔ اگر شانوں نے پیرجی کو نذر کرنے کے لئے اس کی چاندی کی پازیب اور رام جھول فروخت کر ڈالی تھی تو کون سی آفت ٹوٹ پڑی تھی؟ جو تاشی آپے سے باہر ہو گئی اور جا بیٹھی اپنے میکے۔۔۔۔۔۔۔

یہ شانو تو بڑے بھاگوں والا تھا کہ اُس نے تاشی کی رام جھول اور پازیب اللہ والوں کی نذر کر دی۔ ورنہ کون جانے کسی دن شانو اُنہیں سے کچّی حویلی کے برگد تلے بیٹھ کے جُوا کھیل لیتا۔ یا چرس اور گانجے کے دھوئیں میں پھونک ڈالتا۔ تو کون اُسے روک لیتا؟ یہ تو پیرجی نے ہی کچھ ایسی سیدھ ڈال دی کہ اُس کا دھیان کسی اور طرف بھٹکا ہی نہیں۔ نہ آگا یا سوچا نہ پیچھا یا دیکھا۔ پل کی پل میں روپیوں کی تھیلی لا پیرجی کے قدموں میں ڈھیر کر دی اور کھڑا ہو گیا ہاتھ باندھ کے۔

اب سے ٹھیک تین برس اور تین دن پہلے جب وہ للوا کا باپ نہ تھا اور تاشی پورے چھ برس کی بانجھ تھی۔ گاؤں کی دُوسری لگائیاں تو ادھر بیاہ کر آئیں اور ادھر جن دیئے تابڑ توڑ یہ تگڑے تگڑے سے پُوت —— مگر یہ تاشی جس نے چھ برسوں میں ایک چُوہیا کا بچّہ تک جن کر نہ دیا بس ہر وقت کڑک مُرغی کی طرح پر پھیلائے۔ گردن اکڑائے کڑکڑاتی پھرتی۔ جہاں کسی نے بچّے کا نام لیا اور اُس نے کڑکڑانا شروع کر دیا۔ کمبخت کی چربی اُترنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

شانو کو جب بھی اُس کے کڑک پن پر غصّہ آتا۔ وہ دانت پیس کر سوچتا۔ بس دھر دے اُس کی جنم جلی کر کہ یہ دو چار اُلٹے سیدھے ہاتھ۔ پھر چاہے سالی اپنی گڈّی سمیت بیکنٹھ کو ہی کیں نہ سدھار جائے۔ لیکن ہر بار پیلے مزار والے پیرجی سے آس لگا کر صبر کر لیتا۔

اُن دنوں پیرجی کسی دُوسرے گاؤں میں کرامات دکھا کر رحمت اور برکت نازل کر رہے تھے۔ اُن کا شہرہ بڑی دُور دُور تک پھیلا ہُوا تھا۔

ایک شام وہ بانجھ تاشی کی کُرٹی پر چوپال میں بیٹھا تاؤ کھا رہا تھا تو وہیں ایک مرجھلے سے کیکڑے نُما کاکا نے اُسے بتایا تھا۔

"غور کھو تو کیوں مارے گھنٹے اور پھکر کے سُوکھ سُوکھ چھوارہ بنا جاوے ہے۔ جرا پیلے مزار والے پیر جی کو اپنے گاؤں میں پدھار لینے دے۔ پھر دیکھو چُٹکی بجاتے یَن تجھے للوا کا بلوا نہ بنا دیا ہو تو مجھے سکھو رام نہیں چمار کہنا چمار۔"

اور شانو نے اپنے زرد رنگ کے بتیسوں دانت چمکاتے ہوئے کہا تھا۔

"سانچ کہے ہو کاکا؟"

"ہاں جی ہاں۔ ایکدم سانچ۔ جو جھوٹ بولے کالا چور کہلائے۔ بس جرا آ لینے دے پیر جی کو —— پر ایک بات اول ہی کہے دیوے ہوں۔ مان یا نہ مان ہے تیرے ہی بھلے کی۔ پیر جی اپنے مُریدوں کا دل آجمانے کے لئے پہلے بھینٹ لیتے ہیں۔"

"کیسی بھینٹ کاکا۔ آپن تو تن من دونوں ہی اُن پر نچھاور کر دیں۔ تم نے سمجھا کیا ہے۔ میں سچی شانو ہوں سچی شانو۔"

شانو اپنی مکھی مُونچھ پر بھی اکڑ تا ہوا بولا۔ مگر اُس کا یہ مکھی مُونچھ والا تاؤ کیکڑے نما کاکا کو پھُوٹی آنکھ نہ بھایا۔ وہ تو یہ بڑی بڑی جگادری مُونچھ کیساتھ داڑھی بھی رکھتے تھے۔ وہ اُس کے سچے پن کو دل میں ایک موٹی سی گالی دیکر مگر ظاہراً شانت ہو کر کہنے لگے۔

"وُہ تو بھیّا جتنا گُڑ ڈالے اُتنا ہی میٹھا پاوے۔ جو چیز تجھے جان سے زیادہ پیاری ہو بس وہی لے آئیو۔۔۔۔ پیر جی کے قدموں میں۔ پیر جی خوش ہو کر جو بھی دعا دیتے ہیں سیدھی اللہ میاں کے دربار جا پہنچتی ہے۔"

—— اور شانو کے بڑے کٹھن انتظار کے بعد جب پیلے مزار والے پیر جی نے اپنے پاک قدم اُس کے گاؤں کی دھرتی پر رکھے تو شانو کے بھی سوئے بھاگ جاگ اُٹھے۔ سب سے پہلے وُہی اُن کا مُرید بنا۔

جب وہ من کی مراد مانگنے سے پہلے کٹیا کے تلے سے اپنی جمع پونجی کھود کر لایا۔ تو اُسکی لگائی تاشی اپنی کرم کی بھول اُسے دیکھتے ہی معہ چھٹے اور پھکنی کے پل پڑی اُس پر:

"ہے ہے گجب کئے دیوے ہو۔ ساری کی ساری۔۔۔ ہائے دیاری دیا۔"

"اری اندھی ہوئی ہے کا۔ دیکھت ناہے۔ جسے پونجی موہ کو جان سے جیادہ پیاری جرور ہے پراپنے ہونے والے للوا سے پیاری ناہیں ہے۔۔۔۔ اِسے بھینٹ چڑھائے بغیر للوا کا باوا کیسے کہلاؤں گا ری۔۔۔۔۔"

اور جب تاشو نے کلک کلک کر اور بلک بلک کر اُس کو اور اُس کے پیرجی کو یہ موٹی موٹی من من بھر کی وزنی گالیاں سُنانی شروع کر دی تھیں تو اُسے بالکل یقین آگیا تھا کہ اُس کی لگائی کافر ہے۔ پکّی کافر۔ خُدا جانے کیا حشر ہوگا حرام جادی کا۔ دوزخ کی آگ میں پکے گی یا قبر میں کیڑے مکوڑوں کی غذا بنے گی۔ پیرجی کی شان میں گستاخی کرنا کوئی ہنسی کھیل تھوڑی ہے۔ بنگالی بابو گھوش پہ تو صرف ایک ہی گالی پر قہر ٹوٹ پڑا تھا۔ اُن کا بچہ دیکھتے ہی دیکھتے ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔۔۔۔۔ بھورے پنجابی کی تو تمام مرغیاں راتوں رات صفاچٹ ہوگئیں۔ اُن کے کٹے ہوئے سر بیشک پیرجی کی جھونپڑی کے سامنے والے گھورے پر پڑے ہوئے ملے۔

یہ قہر نہیں تو اور کیا تھا؟ بڑی عبرتناک سزا ملتی تھی کافروں کو۔

یہی سوچتے ہوئے شانو نے اپنی تمام پونجی پیرجی کے قدموں میں ڈھیر کر دی تھی اور کھڑا ہوگیا تھا ہاتھ باندھ کے۔

"ہے پیلے مزار والے پیرجی میری مُراد پوری کردو۔ کسم اللہ پاک کی عمر بھر کے لئے گلام بن جاؤں گا۔ مارے سے نہ ٹلوں گا اِن کدموں سے ۔۔۔ ایسی کھدمت کروں کہ آج تک نہ کی ہو کسی مائی کے لال نے ۔۔۔ بس ایک ۔۔۔ ہاں پیرجی بس ایک مُراد پوری کردو۔ ہے پیرجی۔۔۔"

ٹھیک اُسی وقت پیرجی اپنے پورے جلال میں آگئے۔ ان کی بڑی بڑی سُرخ انگارہ آنکھیں اُبل پڑیں ۔۔۔ اور زور سے گرجے۔

"مانگ بچہ۔"

"بچہ۔ بچہ۔۔ بچہ۔۔۔۔ شانو کے دانت اور کان دونوں تیزی سے بج اُٹھے اور وہ روتا ہُوا اُن کے قدموں میں گر پڑا تھا۔"

پھر اُس نے چٹ چٹ اُن کے پیر چُوم لئے تھے۔

واقعی یہ پیلے ہزارو ںوالے بڑے پہنچے ہوئے تھے۔ ابھی دل کی مُراد لب پر آئی بھی نہ تھی کہ انہوں نے علمِ غیب سے دِل کا راز جان لیا اور کہہ بیٹھے "مانگ بچہ۔"

وُہ بچہ مانگنے ہی تو آیا تھا اُن کے در پہ۔

"ہاں پیر جی" وُہ گڑگڑایا۔ "مجھے ایک للوا ولاد و پیر جی۔ تمہارے یہاں للوؤں کی کیا کمی ہے پیر جی ۔ جیادہ نہیں مانگتا۔ بس ایک للوا چاہیئے پیر جی۔۔۔۔۔"

اور پیر جی نے اپنی ایک ہزار ایک سو دانوں والی تسبیح کو ہاتھوں میں اُٹھا کر اُس کے اندر سے جھانکا ۔۔۔ مانو جنّت کی کھڑکی سے جھانک رہے ہوں ۔گرج کر بولے۔

"جنّت کی کھڑکی کھُلی ہوئی ہے ۔۔۔ اللہ میاں کا دربار لگا ہُوا ہے اور تیری مُراد کھُلی کھڑکی سے گزرتی ہوئی سیدھی اللہ میاں کے کانوں میں پہنچ رہی ہے ۔۔۔ جا ۔۔۔ اور جا کے اپنی لگائی کو شبھ گھڑی دیکھ یہ خبر سُنا۔"

بھلا شبھ گھڑی اِس کے علاوہ اور کون سی ہو سکتی تھی ۔ وُہ خوشی کے نشہ میں بدمست ہو کے پیروں سے دوڑتا ہُوا اور کسی مستانے سانڈ کی طرح جھُومتا ہُوا ڈیوڑھی میں داخل ہُوا۔ تاشی انگنائی میں نیم تلے پاؤں پسارے، اپنی میلی چکٹ چولی سے جُوئیں نکال نکال کر مار رہی تھی۔۔۔۔۔

شانو کو دیکھتے ہی اُس نے چولی پھینک پھر سنبھال لیا چُمٹا پھکنی اور کِل کِلاتی ہوئی دوڑی اُس کی طرف۔ شانو نے بھی اپنے بچاؤ کی خاطر اوکھلی کا مُوسل اُٹھا لیا اور تاشی کے سامنے تھوڑے فاصلے سے مُوسل گھُماتا ہُوا بولا۔

"میری جان جری سُن تو لے ۔ کیوں نیلے پیلے دِیدے کیوں چمکائے جات ہے ۔ پیلے ہزار

والے پیرجی کی کرامات سے میں للوا کا باوا بن جاؤں گا اور تو......

بھاڑ میں جائیں تیرے پیرجی۔ وہ چمٹا پھلنی زور سے بجاتی ہوئی چلائی۔ ہائے مرے نرموہی ساری کمائی لٹا آیا۔ ارے ابھاگی جیئی کھیریں تجھے دو گھڑی پہلے سنا دیتی۔ پر تو نے سنی ہی کب......

اب تالشو لاکھ چمٹا پھلنی پھٹکار پھٹکار کر سمجھاتی ہے کہ اسے کئی روز سے الٹیاں آ رہی ہیں —— وہ کھٹے میٹھے بیر کھانے اور اپلوں کی راکھ پھانکنے لگی ہے۔ اس کا پاؤں بھی بھاری ہو چلا ہے اور دل یوں یوں ہونے لگا ہے۔ جیسے.... جیسے.....

مگر شانو کب یقین کرنے والا تھا۔ وہ تو تاشی کی کڑکی دور ہوتی دیکھ پہلے مزار والوں کی کرامات کا قائل ہو رہا تھا۔

اور جس دن گھر کی سونی انگنائی "مواؤں مواؤں" کی ننھی منی فریادوں سے گونج رہی تھی اور اکھڑ تالشو مار کھائی سانڈنی کی طرح ڈکرائے جا رہی تھی —— تو شانو پہلے مزار والے پیرجی کے قدموں میں اوندھا پڑا دھاؤں دھاؤں روئے جاتا تھا۔

جیسی تاشی سندر اور تگڑی تھی ویسا ہی سندر اور تگڑا اس نے پوت جنا۔ اور شانو پیرجی کا منہ میٹھا کروانے کے لئے جب تاشی کی رام جھول اور پازیب فروخت کر آیا تو تاشی اس سے لڑ جھگڑ کر اپنے میکے جا بیٹھی۔ پیر فقیر کتنے ہی سچے اور پہنچے ہوئے کیوں نہ ہوں عورت ذات اپنے زیور دینے پر کبھی راضی نہ ہوگی۔ شانو کی بھی غیرت جوش میں آگئی۔ وہ اسے لینے سسرال نہیں گیا۔

پورے دو سال آہستہ آہستہ بیت گئے۔

دو سال گزر جانے کے بعد وہ پھر مٹھائی کا ایک دونا لئے پیرجی سے مراد مانگنے جا رہا تھا ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ سونی انگنائی نے سچ مچ اسے کاٹ کھایا تھا۔ تاشی کی یاد۔ منوا کی یاد اور وہ بے کل ہو اٹھا۔ دوڑا دوڑا گیا اور مٹھائی کا دونا ایک طرف رکھ پیرجی کے قدموں میں گر پڑا۔ روتا ہوا بولا۔

"ہے پیرجی مورا جیون سونا ہو گیو رے —— موری لگائی گھر بلا دو پیرجی کہ للوا بہت یاد

آئے ہے۔"

اور پیر جی ایک بار پھر گرج اُٹھے۔

"بچہ" بھینٹ چڑھا۔"

"بچہ" بھینٹ چڑھا؟؟؟" مانو کالے ناگ نے ڈس لیا ہو۔ وہ سُن ہو کر رہ گیا۔" واہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اپنی ساری کمائی لُٹا کر اور منتیں مُرادیں مانگ کر تو اُس کا للوا دو سال کا ہُوا ہے اور پیر جی کہتے ہیں بچہ بھینٹ چڑھا۔ نا جی نا یہ تو کسی تریوں ہوئی نا سکت ہے مو سے۔ یا اللہ پاک رحم کیجیئو۔"

جب وُہ مایُوسی کی تھکن سے چُور اُلٹے سیدھے پگ دھرتا گاؤں سے دُور پُل پار نکل گیا تو اُس نے نیم کے سائے تلے ایک بچہ کھیلتا ہُوا دیکھا اور وُہ رُک کر سوچنے لگا۔

"پیلے مزار والے پیر جی نے یہ کب کہا تھا کہ اپنا ہی بچہ بھینٹ چڑھا۔ اُنہوں نے تو صرف بچہ کی بھینٹ طلب کی تھی۔؟"

دُوسرے ہی لمحہ شانو انسان سے شیطان بن گیا۔

من کا سویا ہُوا پاپ جاگ اُٹھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جھپٹ کر بچہ کو گود میں اُٹھا لیا۔ دوڑا پیلے مزار والے کی طرف۔

ابھی دِن پُوری طرح نکلا بھی نہ تھا کہ دیکھتا ہے اُسکی لُگائی سر جھاڑ مُنہ پہاڑ۔ خاک اُڑاتی ہوئی سامنے سے چلی آرہی ہے۔ آہ و پکار کرتی ہوئی۔

"ہائے رے مَیں تو مورگئی رے ۔۔ ہائے ہائے مَیں تو مور گئی رے ۔۔۔۔"

اور شانو کی باچھیں مارے خوشی کے کانوں تک چِر گئیں ۔۔۔ پیر جی کی کرامات کے صدقے۔ اکھڑ ناشنی کتنی جلدی خاک اُڑاتی ہُوئی آن پہنچی۔ ضرور اُس کے دِل پر وحشت ہُوئی ہوگی پیر جی کے جلالی وظیفے کے اثر سے۔ پیر جی تو واقعی سچے اللہ والے نکلے۔ مگر مگر۔۔۔ یہ اکیلی کیوں ہے ۔۔۔ میرا للوا کہاں ہے؟

اُس نے گھبرا کر پوچھا۔

"ارے میرا اللو اکہاں ہے ری؟"

"ہے ربا وُہ تو کل شام سے ہی غائب ہے۔ ارے ہائے میں تو مورگئی رے۔۔۔۔"

"شام سے غائب ہے؟" مانو کلیجہ پر گولی لگی ہو آن کے۔ اری کہاں چھوڑ اتھا تو نے؟ شانو دہاڑا۔

"ہے میں ابھاگی تیرے ماموں کے بیٹا کو چھوڑ نے پل تک ہی آئی تھی۔۔۔ ارے ہائے رے۔۔"

"کیا؟؟"

اور شانو بے تحاشا پیلے مزار والے پیر جی کی جھونپڑی کی سمت دوڑ پڑا۔

مگر پیر جی راتوں رات اپنی کرامات کا اثر دکھا کر بھینٹے لیے کسی اور گاؤں کو سدھار چکے تھے۔

شانو نے بہت تلاش کیا مگر پیر جی کو نہ ملنا تھا نہ ملے

مہندر باوا

پتھر میں آگ

"آپ کو صاحب نے بلایا ہے۔"

سُریندر اپنی کُرسی پر پوری طرح بیٹھ بھی نہ پایا تھا کہ چپڑاسی کی آواز سے وہ چونک سا گیا۔ اور بیٹھنے کی بجائے کھڑا ہو کر سامنے ہال کمرے کی دیوار پر لٹک رہی گھڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ دس بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ وہ صاحب کے کمرے کی طرف چل دیا۔

"نمستے۔"

اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی صاحب کو منتظر پا کر ادب سے کہا۔ صاحب نے بائیں طرف دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے غُصّے سے پُوچھا۔

"تمہارے آنے کا وقت ہو گیا، مسٹر یہ کالج نہیں ہے۔ یہ دفتر ہے، یہاں وقت پر آنا ہوگا اور سارا دن جو تم اِدھر اُدھر دُوسرے کلرکوں سے گپ بازی میں لگے رہتے ہو یہ بہت غلط ہے۔ تمہیں یہاں کام کے لئے رکھا گیا ہے، سمجھے۔"

صاحب نے کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہہ دینے کی نیّت سے بات ختم کر دی اور کسی حد تک اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرنے لگا۔ جیسے یہ کوئی بہت بڑا بوجھ تھا جو اس نے سریندر کے کندھوں پر رکھ دیا ہو۔ سُریندر چُپ چاپ سُنتا رہا۔ اس نے کچھ بھی کہنا مناسب نہ سمجھا۔ حالانکہ

وہ جواب دینے کی ہمّت رکھتا تھا۔

"انسان کام سے ترقی کرتا ہے، فضول باتوں سے نہیں، سمجھے۔"

صاحب نے سریندر کو چپ پاکر رشوت دینے کے انداز میں سمجھایا۔

"جی"

سریندر کے "جی" کہنے کے انداز میں بڑا تیز طنز تھا۔ مگر نہ جانے صاحب اس طنز کو کیوں محسوس نہ کر سکا۔

صاحب بات ختم کر کے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ سریندر سوچتا ہوا باہر چلا گیا۔

"یہ افسر لوگ ہمیں کتنا بڑا فریب دیتے ہیں۔ ترقی کے جال میں انسانوں کو بے زبان مچھلیوں کی طرح پھانس لیتے ہیں۔ جال میں پھنسی ہوئی مچھلیاں تڑپ تڑپ کر مر جاتی ہیں اور ان ذلیل شکاریوں کو رحم نہیں آتا۔ ہم سے خوشیاں چھین کر ہمیں آنسو اور آہیں بخش دیتے ہیں اور جب ہم اپنے آنسوؤں اور آہوں کا حساب کرنے لگیں تو ان کی نظر میں یہ فضول باتیں ہوتی ہیں۔" سریندر کے چہرہ پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

سریندر کو ملازم ہوئے ایک سال سے اوپر ہو چکا تھا۔ وہ تمام ساتھیوں کی مشکلات کا حل چاہتا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ دوسروں سے الگ تھلگ سا لگتا تھا۔ جیسے وہ کسی دوسری دنیا کا باشندہ ہو۔ نیا نیا تھا اس لئے اس کے ذہن میں ماحول کا خوف نہیں تھا۔ بے فکر نوجوان تھا۔ اس کی زندگی پر بیوی بچوں کا بوجھ نہ تھا اور وہ بڑی بیباکی سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا کرتا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنے ساتھیوں کو کام کی زیادتی کا احساس کروایا اور ماحول کی تاریکی اور بے انصافی کو بے نقاب کیا۔ انہیں اپنے حق کے لئے لڑنے پر ابھارا۔ مگر یہاں تو زندگی تھکے ہارے مسافر کی طرح پڑی سسک رہی تھی۔ کسی نے اس کا ساتھ دینا مناسب نہ سمجھا۔ سبھی اس کو اپنے سے الگ خیال کرتے۔ جیسے کوئی پریوں کے دیس کا شہزادہ اپنی زندگی کی خوشحالیاں لئے ان کی تنگ دستیوں میں گھس رہا ہو۔

دفتر میں تمام ملازم یوں لگتے ہیں جیسے کسی ویرانے میں بہت سے بجھے ہوئے دیئے رکھے

ہوں۔ جلی ہوئی لوئیں دھُواں اُگل رہی ہیں۔ تیل ختم ہو چکا ہے اور خشک بتیاں دیئوں کی سطح پر لگی دھیرے دھیرے رو رہی ہیں۔ وہ کس کس میں تیل ڈالے۔ کس کس کی پیاس بجھائے۔ وہ کبھی کبھی بہت اُداس اور مایوس ہو جاتا۔

دھوئیں کے مرغولوں میں اُسے انسانی چیخیں سُنائی دیتیں۔ وہ ایک ایک چیخ کا گلا گھونٹ دینا چاہتا تھا مگر چیخوں کے ہجوم میں اُسے کوئی ایک چیخ اکیلی نظر نہیں آتی۔ تمام چیخیں ایک دوسرے میں کچھ اس طرح اُلجھی ہوئی ہیں کہ وہ پہروں ان چیخوں کے ڈھیر میں کسی ایک چیخ کا سِرا تلاش کرنے میں مصروف رہتا۔

اس نے ایک ایک چیخ کا بڑی دُور تک تعاقب کیا۔ وادیٔ نیند میں بیداری کی شمعیں روشن کیں۔ بڑھ رہے اندھیرے کے سینے پر احساس کی چھوٹی چھوٹی بہت سی موم بتیاں رکھ دیں۔ صاحب کو یہ سب کچھ بہت ناگوار گزرا۔ اس نے سریندر کو ہر ممکن طریقہ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر صبح کے اجالے کو کون روک سکتا ہے۔

جس طرح اندھیرے میں رہنے والوں کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو جاتی ہیں اور وہ اُجالے میں آنے سے گھبراتی ہیں۔ اسی طرح سریندر کے کچھ ساتھی بھی اُجالے سے ڈرتے تھے۔ عجیب بے حسی تھی ان لوگوں کی زندگی میں جیسے سانس لیتیں، چلتی پھرتیں اور باتیں کرتی لاشیں ہوں۔ جیسے مشینی پرزے اپنی اپنی جگہ فٹ حرکت کر رہے ہوں۔ وقت کے گزرنے کا کسی کو احساس تک نہیں آوازیں اُبھرتی ہیں اور بے معنی سے دفتری شور و غل میں دب کر رہ جاتی ہیں۔ آوازیں محض آوازیں ہی ہیں مشینی پرزوں کی آوازیں۔ کسی آواز میں کوئی لوچ نہیں۔ کوئی ترنم نہیں۔ کوئی گونج نہیں، کوئی ناد نہیں، بے معنی اور بے جان سی آوازیں۔

ان انسانی آوازوں میں کرسیوں کے اِدھر اُدھر سرکنے کی آوازیں بھی مِلی ہوتیں۔ بڑے بڑے رجسٹروں اور نیجروں کی ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھنے کی بھاری آوازیں بھی شامل ہوتیں۔ چپڑاسیوں کو بلانے والی گھنٹیوں کی آوازیں اور چاروں طرف بکھرے ہوئے ٹیلیفونوں کی آوازیں آپس میں

بالکل گڈمڈ ہو جاتیں۔ اکثر اوقات چپڑاسیوں کو غلطی لگ جاتی اور غلطی کا نتیجہ، افسروں کی گالیاں، جوان غریب معصوموں کی زندگی کا جزو بن کر رہ گئی تھیں۔ یہ سارا دن ان گالیوں کے ہجوم میں گھرے کام کرتے رہتے۔ دوسروں کو کھانا گرم کر کے کھلانے والے کبھی کبھی خود دن بھر بھوکے ہی رہتے۔

باہر سے دیکھنے والے اندر کام کرنے والوں کے بارے میں نہ جانے کس قدر مطمئن ہوں گے زندگی کی دوڑ سے اُکتائے ہوئے والدین کے کماؤ بچے۔ لاڈلی بیویوں کے مظلوم خاوند لاغر اور بیمار بچوں کے تاریک مستقبل باپ۔ اور کچھ حسد بھی کرتے ہوں گے۔ عالیشان بلڈنگ۔ صاف اور کشادہ دیواریں۔ شفاف اور مرمریں فرش۔ گیٹ پر دو باوردی چوبدار کھڑے ہیں۔ جن کی وردیوں پر چمک رہے بڑے بڑے بٹن ان کی زندگیوں کے ناسور ہیں اور وہ ان ناسوروں کو سینے پر لئے کھڑے ہیں۔ ایک کے کندھے پر بندوق ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی تھکا ہوا مسافر کندھے پر رکھے ہوئے مزدوری سامان کو بھی بہت بڑا بوجھ محسوس کر رہا ہو۔

جس طرح باہر کی روشنی اندر کے اندھیرے کا اندازہ نہیں کر سکتی اسی طرح آپ ماحول کی گھٹن کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس قدر صاف اور کشادہ دیواروں کے اندر شفاف اور مرمریں فرش پر اونچی کرسیوں پر بیٹھے کام کرنے والوں کی زندگیاں مفلسی۔ بیماری۔ بھوک اور تنگدستی کے بدنما داغوں سے داغ دار ہیں۔

ان بے حس دیواروں کو ہر روز صاف کیا جاتا ہے۔ مگر ان کو صاف کرنے والے بھنگی کو زندگی کے زخموں کو دھونے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ یہ زخم دن بدن بڑھتے جاتے ہیں۔ اس کا بوڑھا باپ دوائی اور خوراک کی کمی کی وجہ سے مر چکا ہے۔ اس کی بیوی آندھیوں میں جل رہے چراغ کی سی زندگی گذار رہی ہے۔ طویل بیماری سے اس کے معصوم بچے کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو چکی ہیں اور ٹیڑھی ٹانگیں کب تک زندگی کا بوجھ اٹھا سکیں گی۔ آندھیوں میں جل رہا چراغ کب تک جلتا رہے گا؟

اس طرف کبھی کسی نے توجہ نہیں دی۔ خود جگو بھنگی نے بھی کبھی غور نہیں کیا۔ سچی بات تو

یہ ہے کہ غور کرنے کی اُسے زندگی میں فرصت ہی نہیں ملتی۔ صبح و شام اور دن رات کام کا چکر ہی کچھ اس بے رحمی سے چلتا رہتا ہے کہ وہ کام کے علاوہ اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔ مرمریں فرش و دیگر ظروف کو صاف کرنے والے کی زندگی کی غلاظت کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ یہ ایک کڑوی حقیقت ہے جو سریندر کے سامنے ناچ رہی ہے۔ وہ بہت متفکر رہتا ہے۔ وہ ماحول کی اندھیری چادر کو پھاڑ ڈالنا چاہتا ہے۔ وہ بے حس دماغوں میں احساس کی جوت جگانا چاہتا ہے۔ مگر کبھی کبھی وہ خود بھی ماحول کے اندھیرے میں بھٹک جاتا۔ کبھی کبھی روشنی کے لئے جدوجہد کرنے والوں کو یوں محسوس ہوتا کہ اندھیرے کی سیاہی گہری ہوتی جا رہی ہے۔

ایک شام سریندر نے جگو بھنگی کے مردہ جسم میں زندگی کی لہریں بھر دیں۔ اُسے اس کی زندگی کی غلاظت کا احساس کروایا اور اندر کی دُنیا سے باہر کی دُنیا دکھائی۔ اُس کو بے حسی کے بوجھ تلے دبی قوتِ پرواز کا احساس کروایا اور اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ دوسری صبح وہ اپنے بچے کو کسی خیراتی ہسپتال لے گیا۔ واپسی پر صاحب نے اس کے بیدار احساس کو بڑی حقارت سے کچل کر رکھ دیا اور وہ غربت بھری مجبوریوں اور لاچاریوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔

"کہاں گئے تھے —؟"

صاحب کے ماتھے پر بل اور آنکھوں میں خون تھا اور سوال کچھ اس انداز سے کیا گیا تھا کہ جواب کی ضرورت ہی نہیں تھی، مگر پھر بھی ڈرتے ہوئے جگو نے جواب دیا۔

"جی ڈاکدار کول بچے نوں لے گیا سی۔"

"کیا ہوا بچے کو ہے؟"

"جی سرکار ٹنگاں ونگیاں ہین۔"

"بکواس بند کرو، کام چور کہیں کے۔ ٹانگیں سیدھی کروا کر اسکو فوج میں کپتان بنواؤ گے؟"

صاحب کو جگو کی اتنی جرأت بھی گوارا نہ ہوئی کہ وہ اپنے غموں کا یوں بے باکی سے اظہار کرے۔ جگو چپ رہا۔ صاحب نے جگو کی چپ پر ایک بھاری پتھر مارنے کے سے انداز میں کہا۔

"کیا تمہیں سیدھی ٹانگوں کی بدولت ملازمت ملی تھی؟"

"جی۔"

جگو خوف وہراس سے کانپ رہا تھا اور اس کے منہ سے جی سے زیادہ کچھ نہ نکل سکا۔

"جی کا بچہ۔ گٹ اوٹ، دوبارہ ایسی غلطی ہوئی تو نوکری سے الگ کر دیئے جاؤ گے۔"

جگو وہاں سے گٹ آؤٹ ہو کر آیا تو اس کے دماغ میں خیالات کا ہجوم چیونٹیوں کی طرح بڑھنے لگا۔ صاحب نے اس دفعہ معاف کر دیا۔ اس سے وہ قدرے خوش تھا اور اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ کیوں بچے کو ہسپتال لے کر گیا۔ اس نے گیلے کپڑے کو فرش پر رکھ کر زور زور سے رگڑنا شروع کر دیا جیسے خیالات کی چیونٹیوں کو مسل رہا ہو۔

سریندر نے کام کرتے ہوئے ہاتھ پر لگی گھڑی دیکھی اور اپنے سامنے کھڑے بیوپاری کی طرف نظریں اٹھا کر بڑے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اب کل آنا لالہ جی، دو بج گئے ہیں۔"

"ابھی تو پانچ منٹ ہی اوپر ہوئے ہیں۔"

منیم نے اپنے آپ کو سچ مچ لالہ جی سمجھ کر بڑی تیزی سے جواب دیا اور اپنے کاغذات آگے بڑھا دیئے۔ مگر سریندر نے بڑی بے رخی سے کاغذات واپس منیم کی طرف پھینکنے کے سے انداز میں ذرا تلخی سے جواب دیا۔

"جی ہاں پانچ منٹ ہی۔"

منیم بیچارا اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

سریندر نے رجسٹر ایک طرف رکھتے ہوئے ہال کمرے میں بیٹھے دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھا جو سر جھکائے اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ اس وقت دو بجکر دس منٹ ہو رہے تھے اور دو سے اڑھائی بجے تک انٹرول تھا۔ مگر کسی کو وقت کے گزرنے کا احساس نہیں تھا۔ فرشِ مرمر پر بے جان کرسیوں کے اِدھر اُدھر کھینچنے کی آوازیں انسانی آوازوں پر

حاوی تھیں۔ بے معنی سا شور و غل گندے تالاب کی لہروں کی طرح اِدھر اُدھر تیر رہا تھا۔ ماحول میں اُداسی اُبل رہی تھی۔ بڑی غمگین سی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ہر سُو افسردگی ناچ رہی تھی۔ سریندر کو یُوں لگا جیسے بہت سے لوگ سر جھکائے غم خیز نوحے پڑھ رہے ہوں۔ سبھی ہارے ہوئے جواریوں کی طرح لمبے لمبے چہرے لئے ایک دُوسرے کو اجنبی اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اُسے بڑی گہری خاموشی کا احساس ہُوا جیسے قبرستان کا سنّاٹا ہو، جیسے زندگی چُپکے چُپکے سسکیاں بھر رہی ہو۔ جیسے بیمار آخری ہچکی لے رہا ہو۔ وہ بیٹھا بیٹھا جھنجھلا اُٹھا اور چُپ چاپ اُٹھ کر باہر نِکل گیا۔

بازار کی آمدورفت سے اس کے خیالات کے تانے بانے ٹُوٹ گئے اور وہ بڑا پُرسکُون موڑ والی پان سگریٹ کی دوکان پر رُک گیا۔ پان کے پتّے زخمی دِلوں کی طرح پڑے تھے۔ کتھا چُونا کی مِلاوٹ سے اُسے یُوں لگا جیسے سُرخ خُون میں کسی نے زہر مِلا دیا ہو اور زہر آہستہ آہستہ تمام پتوں میں سرایت کر رہا ہے۔ ہر پتّے پر سونف۔ ملٹھی اور سپاری کی چھوٹی چھوٹی ڈھیری رکھی ہوئی تھی جیسے اِنسانی دِل پر ناکام محبت کے چھوٹے بڑے زخم ہوں۔ زخم جو ملبے کے ڈھیر کی طرح دِل پر بوجھ بنے پڑے ہوں اور اس ملبے کے ڈھیر میں ایک چھوٹی سی الائچی ہیرے کی طرح شفاف اور نِکھری ہوئی جھانک رہی تھی۔ جیسے گھُپ اندھیرے میں روشنی کی ہلکی سی لکیر ہو۔ جیسے آہوں اور سِسکیوں کے ہجُوم میں کوئی معصُوم قہقہہ گُونج رہا ہو۔

سُریندر کے خیالات پھر بہک گئے۔ اِس نے سامنے آئینے میں اپنے چہرے پر چھا رہی احساسات کی غم خیز سیاہی سے خوف زدہ ہو کر جلدی سے ایک سگریٹ لیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔

گو ابھی ڈھائی بجنے میں دس منٹ باقی تھے پھر بھی اُسے بازار میں بے مقصد اِدھر اُدھر اکیلے گھُومنا اچھا نہ لگا۔ وہ دفتر واپس آکر باہر ہی ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش کھینچ کر دھُواں ہوا میں یُوں چھوڑنے لگا جیسے کوئی اپنے ذہن پر چھا رہی اُداسی اور

ناامیدی کو فضا میں اُچھال رہا ہو۔

قریب قریب سبھی اپنے اپنے کام میں مگن تھے۔ کسی کو اپنے دِل کی دھڑکن تک کا احساس نہیں تھا۔

"دو سے ڈھائی بجے تک آدھا گھنٹہ چھٹی ہے تو پھر یہ کام چھوڑ کر آدھا گھنٹہ آرام کیوں نہیں کرتے۔ صُبح دس بجے سے کام کی دلدل میں پھنسے ہوئے اب ذرا سر اُٹھا کر سستا کیوں نہیں لیتے۔ کسی کو بھوک نہیں، پیاس نہیں، کسی قسم کی کوئی حاجت نہیں۔ یہ کیسی زندگی ہے۔"

سُرسید جیسے اپنے آپ سے اُلجھ رہا ہو۔

ہال کمرے کے درمیان ایک بڑی میز پڑی ہے۔ میز پر ایک طرف ٹیلیفون پڑا ہے۔ دُوسری طرف اور سامنے چھوٹے بڑے بہت سے رجسٹر اور سیجر پڑے ہیں۔ کچھ کاغذات بڑی بڑی موٹی فائلوں میں سے بُھوکے بچّوں کی طرح جھانک رہے ہیں اور میز کی بے جان کاغذی دنیا میں کھویا ہُوا شری دُکھی رام بیٹھا ہے۔

دُکھی رام کی زندگی دُکھ بھری ایک طویل داستان ہے جو چھوٹے سے وجُود میں نہ جانے کس طرح سما گئی ہے۔ اِس کے جسم پر محض کپڑے ہی کپڑے ہیں۔ گوشت اور ہڈیاں ممکن ہے کپڑوں کے بہت اندر جاکر ہوں تو ہوں ورنہ باہر سے دیکھنے والوں کو ہمیشہ اِس سلسلہ میں شک ہی رہیگا۔

چہرے پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک کے سوا کچھ نہیں دھرا۔ موٹے موٹے دُھندلے شیشوں کے بہت پیچھے چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہیں۔ جیسے بہت دور، ویرانے میں بجھے ہوئے دیئے پڑے ہوں، بڑی بے ڈھب سی ناک جو ہاتھی کی سُونڈ کی طرح اِس کے باریک اور چھوٹے چھوٹے لبوں پر جھکی ہوئی ہے۔ یُوں لگتا ہے جیسے یہ ناک بڑھتے بڑھتے اس کی آم کی گٹھلی جیسی ہوئی ٹھوڑی تک جا پہنچے گی۔ ہر پانچ منٹ کے بعد وہ نیچے ڈھلک رہی عینک کو اُوپر کر لیتا ہے اور بہہ رہی ناک کو بڑے زور سے اُوپر چڑھاتا ہے۔ کبھی کبھی

وہ بہہ رہی ناک کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کے سے انداز میں جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھ، اِس زور سے سُڑ سُڑ کرتا ہے، جیسے کِسی بیوپاری نے خود ہی دُور سے کُرسی کھینچ لی ہو۔ رومال جیب میں ڈال کر وہ ایک نظر سامنے بیٹھے ہوئے بیوپاریوں کی طرف بڑے فاتحانہ انداز میں دیکھ کر پھر اپنے کام میں محو ہو جاتا۔

وہ بہت کم بولتا ہے۔ فائلیں اُٹھاتا اور کھول کر بڑے انہماک سے کچھ پڑھتا، اوراق کو اُلٹ پلٹ کر اِدھر اُدھر کچھ دیکھتا اور دستخط کئے جاتا اور ایک طرف پھینکنے کے سے انداز میں رکھے جاتا۔ بڑے بڑے رجسٹر اور بیجروں کو اپنی طرف کھینچ کر کھولتا اور اُڑتی سی نظر ڈال کر چیک اور ڈرافٹ نکال کر رجسٹر اور بیجر ایک طرف دھکیل دیتا۔ پاس کھڑا چپڑاسی تیلو فائلیں رجسٹر اور بیجر واپس کلرکوں کے پاس رکھ آتا اور وفادار کُتّے کی طرح دُکھی رام کی میز کی ایک طرف کھڑا دُکھی رام کے تیزی سے چل رہے ہاتھوں کے اِشارے کا منتظر رہتا

ٹیلیفون پر بھی وہ بہت کم بات کرتا۔ ایک ہاتھ سے ریسیور اُٹھا کر وہ کان اور مُنہ کے درمیان رابطہ قائم کر کے خود بڑی بے نیازی سے کام کئے جاتا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی اور دُکھی رام ریسیور اُٹھا کر جیسے اپنے آپ سے کہتا

”جی! سی۔ ایل۔ بینک ۔“

”جی — ؟“

”ہاں، ہاں۔“

پھر وہ بڑی بے دلی سے ریسیور میز پر رکھ کر اپنے کام میں یُوں محو ہو جاتا جیسے فون کرنے والے کو قطعی بھول چکا ہو۔ مگر دُوسرے لمحہ جب چپڑاسی پاس آکر کھڑا ہوتا تو وہ بڑے تھکے ہوئے انداز سے میز پر رکھے ریسیور کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے زیرِ لب کہے گا۔

”آئی۔ ڈی۔ جی۔ سی۔“ ”ڈرانٹ پیلی“ ۔ یا پھر ”بیجر نمبر ۴“ جیسے شارٹ ہینڈ میں بات کر رہا ہو۔ نیلو جو پچھلے دس برس سے دُکھی رام کیساتھ بطور چپڑاسی کام کر رہا ہے دُکھی رام

کے اشارے اور زبان فوراً سمجھ جاتا اور بتائے گئے سیکشن سے بابو کو بلا لاتا۔

دُکھی رام پچھلے بائیس برس سے اسی دفتر میں کام کر رہا ہے۔ اس کے بیوی بچے بیمار ہوتے ہوں گے۔ اس کے رشتہ داروں کے ہاں شادیاں بھی ہوتی ہوں گی۔ اس کا اپنا جسم بھی گوشت اور ہڈیوں کا بنا ہوا ہے۔ اس پر بھی گرمی سردی کا اثر ہوتا ہوگا۔ مگر شائد ہی کبھی اس نے دفتر سے چھٹی لی ہو۔ سُنا ہے جب اس کا اکلوتا لڑکا چالیس دن ٹائیفائیڈ سے بیمار رہ کر چل بسا تو بھی اس نے نصف دن کی چھٹی لی تھی۔ بعد دوپہر وُہ دفتر چلا آیا تھا اور بالکل روز کی طرح کام کرنے لگا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کتنی بے حسی ہے ؟

سریندر کے جسم میں جیسے کپکپی سی دوڑ گئی ہو۔

چند دن ہوئے وُہ اپنے کسی دوست کو گاڑی پر چھوڑنے گیا تھا۔ بچھڑتے وقت اُسے ایک ہلکی سی اُداسی کا احساس ہوا تھا۔ ایک کمی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ واپسی پر اُسے یُوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کا کچھ کھو سا گیا ہو۔ مگر دُکھی رام اپنے لاڈلے بیٹے کو شعلوں کے سپرد کر کے بھی کس اطمینان سے دفتر آ بیٹھا ہوگا۔

سُریندر کو بہت بُرا لگا۔ اس نے اپنے خیالات کو جھٹک دیا۔ جیسے کڑوی تھوک ہو۔ مگر خیالات راہ کی گرمی کی طرح اُٹھ اُٹھ کر اُسے پریشان کر رہے تھے۔

دفعتاً وُہ بائیں طرف کسی بیوپاری اور کلرک کی تیز و تلخ گفتگو سے چونک اُٹھا۔

"بابو، میں پندرہ منٹ سے کھڑا ہوں۔"

بیوپاری کی آواز میں احتجاج کے ساتھ ساتھ احساسِ برتری کا تناؤ بھی تھا۔

"لالہ جی، کام ہی کر رہا ہوں کوئی بیکار تو نہیں بیٹھا۔"

سکھ چین سنگھ کام کی زیادتی سے نالاں تھا۔ اس لئے اس کے لہجے میں تلخی اور تیزی تھی

"کام کرتے ہو تو کسی پر احسان نہیں کرتے۔"

بیوپاری کے لہجے میں اب سکھ چین کی تلخی اور تیزی کا ردِ عمل تھا۔ جو دھیرے دھیرے

بڑھ رہا تھا۔

"جوتا ہے گھوڑے پر سوار ہی آتا ہے۔"

سُکھ چین نے زیرِ لب جیسے اپنے آپ سے کہا۔ مگر سامنے کونٹر پر کھڑے بیوپاری نے سُن ہی لیا اور یُوں اُبلنے لگا جیسے وُہ کوئی پولیس کا افسر ہو اور بابُو چور اُلٹے پر گناہ کرتا پکڑا گیا ہو۔

"پنچاہ روپے مہینہ اور دِماغ اِس قدر —— فرش دا کیڑا اور عرش سے اُڈاری۔"

بیوپاری غُصّے کی آگ میں جلتا ہُوا صاحب کے کمرہ کی طرف بابُو سُکھ چین کی شکائت کرنے چلا گیا۔

سُکھ چین کی زِندگی میں سُکھ ہے نہ چین۔ پچھلے دس برس سے وُہ اِس کلرکی کی دلدل میں پھنسا ہُوا ہے۔ شروع شروع میں سُنا ہے کہ وُہ بڑی لطیف طبیعت کا مالک تھا اور بڑی ہی نفیس باتیں کیا کرتا تھا۔ تیکھے خدّوخال، تیز اور چمکیلی آنکھیں، بھرا ہُوا چہرہ۔ سڈول جسم اور لباس جیسے کوئی کالج کا من چلا باپ کی بیماری کی وجہ سے مجبُوراً کسی کام سے چلا آیا ہو۔ باتیں اِسقدر شگفتہ اور معطّر کہ کبھی کبھی یُوں لگتا کہ تیز و خُوشبو بھرا گُلاب کسی نے خزاں زدہ گلے سڑے پھُولوں اور پتّوں کے ڈھیر میں پھینک دیا ہو۔ اخیر وُہ تر و تازہ گُلاب اِس گلے سڑے ڈھیر کا ایک حصّہ بن کر رہ گیا۔ اِسکی طبیعت کی لطافت زِندگی کی ناقابلِ قبُول تلخیوں کے ملبے تلے دب کر رہ گئی اس کی شگفتہ، معطّر اور نفیس باتیں دفتر کے بھاری بیجروں اور رجسٹروں کے اَن گِنت اوراق میں نہ جانے کہاں کھو گئی ہیں۔ بھرا ہُوا چہرہ پچکی ہوئی گیند کی طرح اِس کے مریل جسم کی منڈیر پر پڑا ہے۔ آنکھیں بڑی ویران اور لباس میں پیوند لگے ہوئے ہیں۔

جب وُہ نیا نیا ملازم ہُوا تھا تو اِس کے سینے میں بہُت بلند ارادے ہوں گے۔ جوان اُمنگیں ہوں گی۔ درخشاں مُستقبل ہوگا۔ زندگی سے پیار ہوگا۔ اپنوں کو سنوارنے کا جنوں ہوگا۔ کسی سے پیار ہوگا، کسی کو پا لینے کی چاہ ہوگی۔ کسی کو پرستش کرنے کی لگن ہوگی۔ تصوّر میں ایک چھوٹا سا گھر ہوگا جہاں اس کی محنت ہوگی، اِسکی محبّت ہوگی۔ اس کی محبّت کا ردِّعمل ہوگا۔

اِس کی مُحبّت کی چھوٹی بڑی روشنیاں ہوں گی۔ کبھی وُہ آنیوالے خوشگوار لمحوں کے تصوّر سے ہی مُسکرا دیا کرتا ہوگا مگر— مگر آج وُہ ماحول کے اندھیرے میں بھٹک رہا ہے، حالات کی کوکھ سے جنم رہی تلخیوں سے بے بس ہے، اسکی تمام اُمیدیں بجھی ہُوئی لَوؤں کی طرح دھُواں چھوڑ رہی ہیں، اِس کا پیار کسی اور کی گود میں سِسک رہا ہوگا اور وُہ ناکامی کی آغوش میں ضِدّی بچے کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ مگر آغوش میں اِس قدر چکناہٹ ہے کہ کوشش کے باوجود بھی وُہ سنبھل نہیں سکتا۔

سریندر نے کاؤنٹر پر جاکر سُکھ چین سے ازراہِ ہمدردی پُوچھا۔

"کیا بات تھی یار سُکھ چین؟"

"کُچھ نہیں یار، کام تو ختم نہیں ہوتا، اُوپر سے لوگ لڑنے چلے آتے ہیں۔"

سُکھ چین نے سر اُٹھائے بغیر رجسٹر پر لِکھتے لِکھتے جواب دیا۔

"پیارے یہ کام ختم نہیں ہوں گے، زِندگی ختم ہو جائیگی۔"

سریندر نے اسکی کمزور رگ پر اُنگلی رکھ دی۔

"زِندگی ختم نہیں ہو سکتی۔"

سُکھ چین یُوں چونک اُٹھا جیسے یک لخت اُسے کسی بہت بڑی حقیقت کا احساس ہُوا ہو۔

"جب تُم لوگوں نے حرکت نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے تو زِندگی کا ختم ہو جانا یقینی ہے۔"

سریندر نے اس کے مُنتشر جذبات کو ایک نقطہ پر لانے کی نیّت سے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اِتنے میں چپڑاسی نے آکر کہا۔

"باؤ سُکھ چین سِنگھ، آپ کو صاحب نے بُلایا ہے۔"

سُکھ چین نے جو پہلے ہی لاٹے کی طرح کھول رہا تھا۔ ایک نظر چپڑاسی کی طرف دیکھا اور بغیر کُچھ کہے صاحب کے کمرے کی طرف چل دیا، جیسے کوئی صدیوں کا بوجھ اُتار پھینکنے جا رہا ہو، جیسے کوئی رات بھر کا سویا ہُوا صُبح کے سواگت کے لئے بیدار ہو رہا ہو۔ جیسے کوئی

قوتِ پرواز سے بے خبر اِن پر بہت اوپر اُڑنے کی سعی کر رہا ہو۔ جیسے کوئی اندھیرے کے سینے میں روشنی کا مینار تعمیر کرنے چلا ہو۔ جیسے کوئی دھرتی کا سینہ چیرنے نکلا ہو۔ جیسے کوئی راستے کا پہاڑ کھودنے چلا ہو۔ جیسے کوئی صدیوں پرانے بہہ رہے دریاؤں کا رُخ بدلنے نکلا ہو۔

وہاں سے ہٹ کر سُرندر نے بڑے بڑے بیجروں اور رجسٹروں پہ جھکے ہوئے بابو جگجیت رام کو جگایا۔

"جگجیت رام، تمہیں آخر چھٹی نہیں ملی ناں پھر۔"

"ہاں یار، نہیں ملی۔ باپو کا گاؤں سے خط آیا تھا کہ ماں سخت بیمار ہے۔ بہت پریشان ہوں تم ہی بتاؤ کیا کروں؟"

جگجیت گویا رجسٹروں اور بیجروں میں کھویا ہوا ابھی بیمار ماں کے تیز سانس کی گرمی محسوس کر رہا تھا۔

"جب تک ہم لوگ اکٹھے ہو کر ایک آواز نہیں ہو جاتے، ہماری مائیں اسی طرح بیمار ہو کر اپنے بیٹوں کی راہ دیکھتی رہیں گی۔ ہمارے بوڑھے باپو اپنی آنکھوں کے سوکھے کٹورے لئے ہمارے منتظر کھڑے رہیں گے۔ ہمارے بھائی اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑ کر گلیوں میں آوارہ فلمی گیت گاتے پھریں گے۔ ہماری بہنیں بے زبان گائے بکریاں جان کر کسی طرف بھی ہانک دی جا سکتی ہیں اور ہم محض تماشائی بنے دیکھتے رہیں گے۔"

سُرندر نے جگجیت کے سینے میں سُلگ رہی آگ کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔ آگ بھڑک اٹھی شعلے مچلنے لگے، گرمی بڑھنے لگی۔ جگجیت رام کے بائیں طرف نیم مُردہ، ہمت ہارے زندگی کی چوٹوں سے نڈھال کام میں کچھ اس طرح کھویا ہوا تھا جیسے بڑے بڑے بیجروں اور رجسٹروں کے کھنڈرات میں کوئی تھکا ہوا مسافر سو رہا ہو۔ سُرندر اور جگجیت کی گفتگو کی تپش ہمت رائے نے بھی محسوس کی اور وہ نیند سے بیدار ہو کر کچھ اس طرح جگجیت کی طرف دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔

"مجھے بھی سریندر کی باتوں سے اتفاق ہے۔ واقعی اِس دلدل سے نکلنے کے لئے ہمیں مِل کر کوشش کرنا چاہیئے۔"

وقت گذرتا گیا۔ صبح و شام کا چکّر چلتا گیا، اور سریندر کے باغیانہ خیالات امر بیل کی طرح پھیلتے گئے اور سارے ماحول پر چھا گئے۔ اُس کی زندہ دِلی اور حقیقت پسندی دوسرے مُردہ جسموں میں سرایت کرنے لگی۔ سبھی اپنے اپنے ذہنی توازن میں کھولنے لگے۔ ہر کسی کا احساس بیدار ہو کر اِدھر اُدھر کی بُو سُونگھنے لگا۔ مجبُوریاں بڑھتے بڑھتے ایک نقطہ پر جمع ہو گئیں۔ درد پھیلتے پھیلتے بجر بکیلاں بن گیا۔ لہریں چلتی ــــ صدیوں پُرانے ریت کے کنارے گرنے لگے۔ اندر ہی اندر بہت سی چنگاریاں سُلگ رہی تھیں۔ بظاہر تو جلی ہُوئی راکھ ہی راکھ نظر آتی تھی مگر راکھ کے اندر کی چنگاریاں کسی تیز ہوا کے جھونکے کی مُنتظر تھیں۔

وہ نگاہیں جنہیں دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کے وجُود کا احساس تک نہیں تھا، اب بار بار اُسے گھُورنے لگیں۔ بے جان گھڑی کی سُوئیوں کی رفتار انسانی سانسوں کی تیزی کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی گئی اور اس تیزی میں اچانک تیز رفتاری اس وقت پیدا ہوئی جب صاحب نے بابو ایشور داس کی دس دن کی چھُٹی کی درخواست نامنظُور کرتے ہوئے دس دِن کی تنخواہ کاٹ لینے کا حُکم لکھ دیا۔

ایشور داس پہلے ہی بیوی بچّوں کے علاوہ بیمار بُوڑھے ماں باپ کا خرچہ اُٹھاتے اُٹھاتے کاٹ رہا تھا۔ وہ بیماری کاٹ کر جب واپس آیا تو اُسے یہ جان کر کہ اُس کی چھُٹی کی درخواست نامنظُور ہو گئی ہے اور دس دِن کی چھُٹّی کی تنخواہ کاٹی جا رہی ہے۔ تو وہ یُوں تڑپ اُٹھا جیسے کسی نے اُس کے سینے میں کیل ٹھونک دیا ہو۔ وہ دُوسرے کلرکوں کو یُوں اجنبی نگاہوں سے دیکھنے لگا جیسے ڈُوبنے والا حسرت سے کناروں کی طرف دیکھتا ہے۔ اُس کی ویران نگاہوں کے سامنے اس کا تاریک مستقبل ناچنے لگا۔ کہیں بُوڑھا باپ کھانسی کی شدّت سے نڈھال ہو رہا ہے۔ کہیں بُوڑھی ماں سردی سے ناکافی کپڑوں سے ٹھٹھر رہی ہے۔ جوان بیوی دُوسروں کے گھر برتن صاف کر رہی ہے اور بچے گلیوں میں آوارہ کُتوں کی طرح اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ جن کے گندے کپڑوں سے بدبُو آ رہی ہے۔ جن کے ناک بہہ رہے ہیں

جن کے سر کے بال، صحرا کے بادل کی طرح خشک ہیں۔ اس کا سانس اس کے خیالات کی طرح تیز چلنے لگا۔ وہ بیماری کاٹ کر آیا تھا۔ اس کو دماغی اور جسمانی آرام کی ضرورت تھی۔ مگر یہاں "اندھے کے ہاتھ سے لاٹھی بھی چھین لی گئی تھی"۔ پیاسے کے لئے یہی نہیں کہ اُسے پینے کے لئے پانی نہیں مل رہا بلکہ حالات اُسے تیز دوڑنے پر بھی مجبور کر رہے تھے۔ اس کا بیمار جسم شدّتِ احساس سے کانپنے لگا۔ اس کی کمزور ٹانگوں نے بیمار جسم کا معمولی سا بوجھ بھی اُٹھانے سے اِنکار کر دیا اور وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔

ایشور داس کے گرتے ہی دفتر میں چاروں طرف غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی۔ سبھی اپنا اپنا کام چھوڑ کر ایشور داس کی طرف لپکے۔ نریندر نے اس کا سر اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور پاس کھڑے چپراسی کو پانی لانے کے لئے کہا۔ اتنے میں باہر کا شور سُن کر صاحب بھی اپنے کمرے سے نکل آیا اور سبھی کو یوں اکٹھے دیکھ کر چلّانے کے سے انداز میں کہنے لگا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے چلو اپنا اپنا کام کرو۔"

صاحب آگے بڑھا تو سبھی نے ایک طرف ہٹ کر اُسے فرش پر بے جان پتھر کی طرح پڑے ایشور داس کو دیکھنے کا موقعہ دیا۔ صاحب نے دوبارہ حقارت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"جاؤ ـــ اپنا اپنا کام کرو، وقت ضائع نہ کرو، ابھی ہوش میں آجائے گا۔"

صاحب کا اندازہ تھا کہ سبھی خزاں کے خشک پتّوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھر جائیں گے۔ مگر سبھی جہاں تھے وہیں جمے رہے۔ صدیوں کی جھکی ہوئی نگاہیں اُٹھیں۔ بجھی ہوئی آنکھوں میں شعلے لپکنے لگے۔ بے جان اور مُردہ جسم چٹانوں کی طرح تن گئے۔ مدقوق چہرے تپے ہوئے لوہے کی طرح دہکنے لگے۔ ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح جھول رہے بازو کسی اَن جانے جذبے سے ساکن ہو گئے۔ دل دھڑک رہے تھے۔ ارادے مچل رہے تھے۔ پنچھی اپنی کھوئی ہوئی قوتِ پرواز کا جائزہ لے رہے تھے۔ عجیب چُپ تھی جو ہر زبان پر لگی ہوئی تھی۔ صاحب کو اِس چُپ سے ڈر سا لگنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ اِس چُپ کو توڑ دیا جائے مگر خواہش اور کوشش کے باوجود وہ ایسا نہ کر سکا۔ اُسے یُوں محسوس ہُوا جیسے یہ خاموشی اُسے نگل

جائیگی۔ اس کا گلہ گھونٹ دیگی۔ اس کے کپڑے نوچ کر اُسے چوراہے پر ننگا کھڑا کر دیگی۔ وہ بڑے بڑے قدم اُٹھاتا واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھا مگر پیچھے کا سناٹا اس کی پیٹھ پر وزنی ہتھوڑے کی طرح رقص کرتا رہا۔

چند منٹوں کے بعد ایشور داس کو ہوش آیا تو اُسے تمام ساتھیوں نے یقین دلایا کہ اس کی تنخواہ نہیں کاٹی جائیگی۔ اُسے چھٹی WITH PAY ملیگی اور اگر ایسا نہ ہوا تو اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہیں کیا جائے گا اور ساتھ ہی سُریندر نے چلانے کے سے انداز سے اپنے دبے ہوئے جذبات فضا میں اُچھال دیئے۔

"ینگ ایمپلائیز یونین"

"زندہ باد ــــ!"

تمام ساتھیوں نے اس زندہ دلی اور جوش سے زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ جیسے انہیں کوئی نجات کی راہ مل گئی ہو، صدیوں سے اندھیرے میں بھٹکنے والوں کو روشنی کی لکیر نظر آ گئی ہو اور نیند پر بیداری چھا رہی ہو ــــ اندر زندگی بیدار ہو چکی تھی اور باہر کی ٹریفک کسی بہت بڑے خطرے کے احساس سے ایک لمحہ کے لئے رُک سی گئی۔

صاحب اپنے کمرے میں شکست خوردہ بھیڑئیے کی طرح پریشان بیٹھا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

ہربنس سنگھ دوست

یادوں کی زنجیر

دِن پندرہ اگست کا ہی تھا۔

اب مجھے یہ یاد نہیں کہ تمہیں کِس نے مِلایا تھا مجھ سے "ٹیولی" میں تم پانچ چھ لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تھیں، جو سب کی سب میری شناسا تھیں۔ ان میں سے کسی ایک نے مجھے تم سے مِلایا تھا۔ تم ایک سفید دودھیا ساری میں ملبوس تھیں اور تمہارے چہرے پر دِن بھر گھومنے کی وجہ سے جو تھکان جھلک رہی تھی، اُس سے مجھے تمہارا چہرہ بڑا دلکش لگا تھا۔ معصوم ـــ ایک حد تک سنجیدہ بھی۔ اُن لڑکیوں سے یقیناً مختلف جو آئے دِن "ہیلو ـــ ہیلو" کے رشتے کے تحت ملتی رہتی ہیں۔

یہ ایک اور اتفاق تھا کہ میرے لئے چائے تمہیں ہی بنانی پڑی۔ کیونکہ تم اپنی چائے ختم کر چکی تھیں اور پتہ نہیں تم کِسی مُوڈ میں اور کن خیالات میں تھیں کہ تم نے شکر کے کئی چمچ میری پیالی میں ڈال دیئے اور جب میں نے پہلا گھونٹ بھرا تو مجھے سمجھ نہ آیا کہ کِس طرح سے تمہارا "شکریہ" ادا کروں۔ کِس طرح سے تمہیں بتاؤں کہ چائے میں کتنے چمچ شکر ڈالی گئی ہے۔ مَیں نے ہنس کر کسی ایک لڑکی سے کہا تھا۔

"آپ نے ان کو ناحق تکلیف دی، مَیں خود چائے بنا سکتا تھا۔ اگر کسی کا دِل نہ چاہے تو ضروری تو نہیں کہ اُسے چائے بنانے پر مجبور کیا جائے"۔

"مجبور ـــ!" تم نے جیسے چونک کر کہا تھا۔ "کیا مطلب ـــ؟"

مَیں نے دیکھا۔ تُم پریشان تھیں۔ "کیا چائے میں شکر نہیں ڈالی مَیں نے ــــ؟" اور اس کے بعد تُم نے شکر دانی سنبھال لی تھی۔

"جی نہیں، معلوم پڑتا ہے میری پیالی میں پُورے پیٹ کی شکر ڈال دی ہے آپ نے۔"

اور تُم نے معافی مانگنے کا ایک سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ مجھے بھی احساس ہُوا کہ جو ہونا تھا، وُہ ہو ہی گیا تھا، مجھے اس طرح نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ مَیں نے مُسکرا کر کہا تھا ـــــــــ "یا ہو سکتا ہے آپ کے ہاتھوں کا لمس ہی ایسا ہو کہ شکر کی مٹھاس کئی گُنا ہوگئی ہو۔" تمہاری ساری کی ساری سہیلیاں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں، اور تمہارے گالوں پر ایک سُرخی سی دوڑ گئی تھی۔

اُس دِن پندرہ اگست تھا اور تم سب دِن بھر شہر کی سجاوٹ اور چہل پہل دیکھتی رہی تھیں، اس لئے وہاں کافی دیر بیٹھنے کے مُوڈ میں تھیں۔ مجھے بھی اچھا لگ رہا تھا۔ جانے کیوں، تمہیں دیکھ کر میرا دِل وہاں بیٹھنے کو چاہ رہا تھا۔ لیکن مجبُوری تھی۔ ساڑھے سات بج چکے تھے، اور آٹھ سوا آٹھ بجے تک میرا ریڈیو اسٹیشن پہنچنا ضروری تھا کیونکہ سوا نو بجے مجھے وہاں سے ایک کہانی پڑھنی تھی۔

جب اُٹھتے ہوئے مَیں نے معذرت پیش کی اور جلد جانے کی وجہ بتائی تو مجھے اچھی طرح یاد ہے تُم نے پُوچھا تھا ـــــــــ "کتنے بجے ہے کہانی؟"

"سوا نو بجے"

"ضرور سُنیں گے۔"

"شکریہ" اور مَیں ایک بار پھر معذرت پیش کر کے وہاں سے چل دیا تھا۔ پتہ نہیں مُوڈ کا اثر تھا یا موسم ہی ایسا تھا۔ مَیں ریڈیو اسٹیشن کے لان میں بیٹھا بہت دیر تک سگریٹ پیتا رہا تھا۔ ڈیوٹی انچارج کو معلوم تھا کہ مَیں آچکا ہُوں اور لان میں بیٹھا ہُوں۔ نو بجے مجھے بلاوا آگیا۔ پندرہ منٹ یونہی اسٹوڈیو میں بیٹھے اخبار سے کھیلتے گزار دیئے۔ جب میرا نام بولا گیا اور میرے مائک میں جان آگئی تو مَیں نے کہانی نکالی اور پڑھنی شروع کر دی۔ ممکن ہے میرا پڑھنے کا انداز بھی اچھا ہو لیکن ایک تو کہانی ہی کچھ غمزدہ تھی، اس پر میری آواز میں پتہ نہیں کہاں سے اتنا سوز آگیا تھا، پتہ نہیں پندرہ منٹ کیسے

گذرے۔ کچھ ایسی ہی بھولی بسری یادیں تھیں جنہوں نے کہانی کا رُوپ لے لیا تھا اور میں پڑھتے وقت بالکل بھول گیا تھا کہ میں کہاں ہُوں اور کیا کر رہا ہُوں۔

اسٹوڈیو سے نکلا تو ریڈیو کے ایک دوست مل گئے" ــــ "یار، واقعی آواز کے بادشاہ ہو۔" میں تعریف یا تنقید سُننے کے مُوڈ میں نہیں تھا۔ میں نے مُسکرا کر ٹال دیا۔ کچھ ضروری کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد جب میں چیک لے کر نکل رہا تھا تو مجھے ریسپشنسٹ (RECEPTIONIST) نے آواز دی۔

"آپ کا فون۔"

میرا فون!.... میں نے سوچا اور ایک تانتے میں اَن گنت نام میرے ذہن میں آ گئے۔ یہ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ فون تمہارا ہے۔ تمہاری آواز اور تمہارا یہ جُملہ سُن کر ــــ

"آج شام کو سوا سات بجے "پنچولی" میں آپ سے مُلاقات ہوئی تھی نا، میں نے چائے میں....!"

میرا دِل خوشی سے ناچ اُٹھا تھا۔ مجھے ہر طرف بہار ہی بہار دکھائی دے رہی تھی۔ تم بھی میری کہانی اور کہانی سے زیادہ پڑھنے کے انداز سے مُتاثر ہُوئی تھیں۔ یہاں تک کہ تم نے مجھے فون کرنے کی ٹھان لی اور نہ جانے کن جذبات کے تحت تم نے مجھے اگلے دِن چائے پر بُلا لیا۔

وہ شائد چوتھی مُلاقات تھی جب ساحل کے کنارے بیٹھے ہوئے تم نے کہہ دیا تھا کہ میرے بغیر تمہارا دِل نہیں لگتا، اور میں نے تمہاری لمبی لمبی اُنگلیوں سے کھیلتے ہوئے کہا تھا، میں یہ بات کہنے کے لئے پتہ نہیں کب سے اِنتظار کر رہا ہُوں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے تم کالج نہیں جایا کرتی تھیں۔ دِن بھر میرے ساتھ گھومتی رہتیں۔ کبھی شہر کے اِس کونے کبھی اُس کونے۔ شائد ہی شہر کی کوئی جگہ چھوٹ گئی ہو جہاں ہم دونوں کی کچھ مُشترکہ یادیں وابستہ نہ ہوں۔ ہم ایک دُوسرے کے اِتنے نزدیک ہو گئے تھے کہ اب ہمیں آنے والے دِنوں کے بارے میں سوچ کر خوف سا آنے لگا تھا۔

ہمارے مذہب مُختلف تھے۔ اِس کا احساس آج ہو رہا ہے، ورنہ نہ مِلتے وقت، نہ قریب آتے وقت، نہ ایک دُوسرے کو اپنا سب کچھ دیتے وقت ہم نے کبھی محسوس کیا تھا کہ ہمارے خُدا

ہمارے آسمان، ہمارے چاند ستارے الگ الگ ہیں۔ جو کچھ بھی تھا ہم دونوں کا تھا اور جو نہیں تھا اُس سے ہم دونوں ہی محروم تھے۔

اور مجھے یاد ہے ایک دن ہم دونوں اِس فیصلے پر پہنچے تھے کہ ہم دونوں ایک دُوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اور اگلے دن ہم دونوں نے سعادت مند اور فرمانبردار اولاد کی طرح اپنے اپنے والدین سے بات چھیڑی تھی۔ سارے حالات بتائے تھے۔ ایک دُوسرے کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے تھے۔ لیکن ہماری کوئی کوشش بھی مذہب کی دیوار کو مسمار نہ کر سکی۔ اُس دِن پہلی بار ہمیں احساس ہُوا کہ ہم ایک دُوسرے کے نہیں ہو سکتے۔ اپنے اپنے گھر بات کر کے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی کیونکہ گھر کا ماحول بڑا عجیب سا ہو گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کئی دن ہم لوگ نہیں مل سکے تھے، اور اِس کے بعد ملے تو شدّت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ جو چیز ہمارے والدین، ہمارے رشتہ داروں، ہماری سماج کے لئے گُناہ تھی اس میں ہماری مُسرّت اور راحت نہاں تھی اور ہم لوگ یہی چاہ رہے تھے کہ دُنیا ہمیں ملنے نہیں دیتی تو نہ سہی۔ لیکن ہم ہر طرح سے ایک دُوسرے کے ہو جائیں۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ تیز و تند ہوا چل رہی تھی۔ بڑے بڑے تناور درخت اپنی جڑوں سے ہل رہے تھے اور کچھ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ ہوا کا کون سا تیز جھکّڑ کسے اپنی جڑ سے ہی اُکھیڑ دے ۔۔۔۔۔ اور آخر ہم دونوں اپنی بُنیادوں سے ہل گئے تھے۔

تمہارے گھر والوں کو اب احساس ہو گیا تھا کہ تم جوان ہو چکی ہو۔ تمہاری شادی کی بات شروع ہو گئی اور جیسے ہی تمہارے اِمتحانات ختم ہوئے شادی کی تاریخیں پکّی ہو چکی تھیں۔ تمہارا گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ پھر بھی تم دو ایک بار ملیں۔ لیکن عجیب طرح لگتا تھا۔ تمہاری رُوح کس نے سلب کر لی ہے میرا خود عجیب حال تھا۔ ساری شگفتگی، ساری بذلہ سنجی خدا جانے کہاں چلی گئی تھی اور ایک بار تو دل چاہا اپنے گھر والوں، اپنے بھائی بہنوں کی زندگی کے بارے سوچے بغیر، آؤ دونوں کہیں دُور — بہت دُور چلے جائیں لیکن نہیں، اِتنی ہمّت نہیں تھی ہم میں۔ ہم دونوں ایک دُوسرے کی مجبوریوں کو جانتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ چاہتے ہوئے بھی ہم ایک دُوسرے کے نہیں ہو سکتے تھے۔

تمہاری شادی ہو گئی۔ سُنا بڑے کھاتے پیتے گھر میں ہوئی۔ شوہر بھی بڑا خوبرو نوجوان تھا۔ میری

زندگی میں ایک عجیب سا خلا آ گیا۔ شادی میں فی الحال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہو جاتی تو یقیناً کہیں بھاگ جاتا۔ زندگی اجیرن سی ہو کے رہ گئی تھی...... دل کے بہلانے کے لئے میں نے نوکری کر لی۔ دن بھر دفتر میں رہتا اور شام سمندر کے کنارے گذار کر رات کو سو جاتا۔ سگریٹ پینے کی لت ایسی چمٹ گئی تھی کہ ایک لمحہ سگریٹ کے بغیر نہ رہ سکتا۔ کبھی کبھی تمہارے بارے پتہ چلتا تھا کہ تم سے عافیت ہو.... تمہاری شادی کو ایک ماہ سے زیادہ ہو چلا تھا۔

اُس روز بھی پندرہ اگست تھا اور شہر دُلہن کی طرح سجا ہُوا تھا۔ اُس روز بھی نوجوان لڑکے لڑکیوں کے گروپ گھوم گھوم کر شہر کا نظارہ کر رہے تھے۔ تاکہ شام کو پنڈالوں میں لُطف لیا جا سکے۔ اُس روز بھی ریڈیو پر لوگوں کے پروگرام ہوں گے۔ لیکن میں نے پچھلے دو ماہ سے ریڈیو کا کوئی نیا کنٹریکٹ قبول نہیں کیا تھا۔ میں بیٹھا ماضی کے بارے سوچ رہا تھا۔ ماضی ہمیشہ بہت تابناک ہوتا ہے اور اُسکی یادیں بیک وقت دل کو مسرّت و راحت بھی دیتی ہیں اور تڑپ اور جلن بھی۔

اچانک کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ جیسے کوئی خوابوں سے اُٹھ کے آ جائے۔ جیسے کوئی تصوّر میں سے جنم لے لے۔ تم میرے سامنے کھڑی تھیں اور بنا یہ سوچے ہوئے کہ اب ہمارا کیا رشتہ ہے، اب ہم ایک دُوسرے کے کیا لگتے ہیں، ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے اور جیسے گھنٹوں پڑے رہے تھے۔ ایک دُوسرے میں سما گئے تھے۔ ساری حدّیں پار کر گئے تھے۔

تب تم نے مجھے بتایا کہ تم کیوں آئی ہو۔ حیرت اور مسرّت سے میں نا چ اُٹھا تھا۔ تم مجھ سے زندگی بھر کی نشانی چاہتی تھیں۔ ایسی نشانی جسے تمہارے شوہر کے نام منسوب ہونا تھا۔ لیکن تم چاہتی تھیں، وُہ میری ہو۔ یہ تمہاری دیرینہ خواہش تھی، تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ جب جائز طریقے سے حقوق نہیں ملتے تو ناجائز راستے خود بخود اپنی آغوش کھولنے لگتے ہیں۔

اگلے دن بھی تم آئی تھیں اور اُس سے اگلے دن بھی۔ اب تمہارے لباس اور تمہاری باتوں میں بہت فرق آ گیا تھا۔ ہر لحاظ سے اب تم ایک دُلہن لگتی تھیں۔ باتیں اب تم محض برائے نام کرتی تھیں، چپ چاپ میری طرف دیکھتی رہتی تھیں۔

تمہیں وہ چیز مِل گئی ۔ تمہاری دیرینہ خواہش پُوری ہو گئی اور تُم نے آنا بند کر دیا ۔ مَیں تمہارے اور تمہارے خیالات کے بارے گھنٹوں بیٹھا سوچتا رہتا تھا ۔ مجھے تم بہت عظیم و مقدّس معلوم پڑتی تھیں تم نے اپنا دِل مجھے دیا تھا ۔ تم نے اپنی دوشیزگی مجھے دی تھی اور وہ نُور ۔ وہ تُوتِ وہ مسّرت جو ساری زِندگی تمہارے ساتھ رہنے والی تھی ، اُسے میرے ہی جسم سے نچوڑ کر تُم نے یہ فخر مجھے دے دیا تھا کہ اب تم ہر لحاظ سے میری ہو ۔ اپنے شوہر کو تم نے کیا دیا اور کیا دینے والی تھیں ، یہ مَیں کبھی نہیں سمجھ سکا ۔ کبھی کبھی مجھے مذاہب ، رسوم و قیود اور سماج پر غصّہ آتا تھا کہ اِس طرح سے اُنہیں کوئی اعتراض نہیں ، لیکن اگر دیانت داری سے شارعِ عام کسی کا ہونا چاہے تو اس کے لئے اِجازت نہیں مِلتی ۔

اِس کے بعد کئی ماہ مُلاقات نہ ہُوئی ۔ میرے جنم دِن پر تمہارا تار مِلا ۔ "یہ دِن بار بار آئے" ۔ اور مَیں یہ سوچتا رہا کہ یہ دِن آئے یا نہ آئے اب تمہیں اِس سے کیا فرق پڑتا ہے ..... تمہارے لئے اِس دِن کی کیا اہمیت ہے ۔ صرف ایک بار — ایک ہی بار تو اِس دِن کو ہم نے ایک ساتھ منایا تھا ، اور بس ۔

پھر ایک صُبح ہی تُم آپہنچیں ۔ مَیں رات کو کچھ کام کرتا رہا تھا ۔ اِس لئے ابھی تک سویا ہُوا تھا اپنے بالوں میں تمہاری اُنگلیوں کا لمس محسوس کر کے مَیں نے کوئی پیارا سا سپنا دیکھنا شروع کر دیا ۔ تب تُم نے آہستہ آہستہ حسبِ عادت میرے پاؤں دبا کر مجھے جگایا ۔ مَیں اُٹھا تو مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ مَیں پہلے سو رہا تھا یا اب سو رہا ہُوں ۔ تمہارے شوہر اب بہت دُور ایک نئے شہر میں جا رہے تھے اور تم صُبح پانچ بجے کی گاڑی پکڑ کر سات بجے مجھ سے مِلنے آپہنچی تھیں ۔ شائد آخری بار ، خدا جانے پھر مُلاقات ہو گی بھی یا نہیں ۔ تُم چُپ چاپ میرے پاس بیٹھی تھیں اور مَیں سوچ رہا تھا ، ہم لوگوں میں اب رشتہ ہی کون سا ہے ، اب ہم لوگ ایک دُوسرے کے کیا لگتے ہیں ، پھر کیوں ایک دُوسرے کا اِتنا خیال رکھ رہے ہیں ..... تُم میرے سینے پر سر رکھے بہت دیر تک روتی رہیں ۔ میری آنکھیں بھی نم تھیں یہ تصوّر بڑا تکلیف دہ تھا کہ کہیں یہ آخری مُلاقات ہی نہ ہو ۔ کون جانے پھر زِندگی میں کبھی ایک دوسرے کو مِلیں بھی یا نہ ۔

میرا کمرہ الگ تھلگ تھا۔ گھر کا کوئی فرد عام طور پر وہاں نہیں آتا تھا۔ جب ضرورت پڑتی میں ہی دوسرے کمروں میں چلا جاتا۔ اُس دن تم نے اپنے ہاتھوں سے کمرے کو نئے ڈھنگ سے سجایا۔ بھیگی بھیگی اُداس آنکھوں نے ہر چیز کو قرینے سے رکھا اور آخرکار مجھے اکیلا چھوڑ کر تم پھر چلی گئیں۔ لگتا ہے صدیاں گذر گئی ہیں اور میں تمہارے دیدار کو ترس گیا ہوں۔

اور آج پھر پندرہ اگست ہے۔ پچھلے ماہ میری شادی ہو چکی ہے۔ میری بیوی اپنی کچھ سہیلیوں کے ساتھ شہر کی رونق دیکھنے گئی ہے۔ میں چپ چاپ بیٹھا ہوں اور ماضی کی یادوں کے کنکر چبا رہا ہوں۔ ۱۵ اگست ہندوستان کی آزادی کا دن ہے۔ ایک یادگار دن ہے۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آتا کہ یہ دن میرے لئے مُسرّت کا ہے یا حسرت کا۔ مجھے اس دن اُداس رہنا چاہیئے یا خوش۔ اسی دن تم مجھے ملی تھیں۔ اسی دن تم نے اپنا گوہرِ حیات مجھے دیا تھا۔ اسی دن میری زندگی کا خوبصورت ترین قطرہ نچوڑ کر تم لے گئیں کہ تم اس کی پرورش کرو گی، اسے اپنی جان سے عزیز سمجھو گی۔

میری بیوی میرے بارے میں خدا جانے کیا سوچتی ہے، لیکن میں کبھی اُس کو کہیں اپنے ساتھ نہیں لے کے گیا۔ یہاں تک کہ دن میں کبھی میں اُس سے بات بھی نہیں کرتا۔ تمہیں یاد ہوگا کس نام سے میں تمہیں پکارا کرتا تھا۔ وُہی نام میں نے اُس کا رکھ دیا ہے۔ دن بھر دفتر میں رہتا ہوں۔ رات گئے جب آتا ہوں اور کھانا کھا کر بستر پر جاتا ہوں تو میرا ذہن تمہیں کمرے میں لے آتا ہے۔ میں تمہیں پکارتا ہوں اور تم اپنے تمام تر جلووں سمیت میرے پاس آجاتی ہو۔ مجھ سے باتیں کرتی ہو۔ تمہارا جسم میرے لئے پگھلنے لگتا ہے اور تمہارے ہونٹ شہد ٹپکانے لگتے ہیں۔۔۔۔ ساری رات ہم ایک دُوسرے کے پاس رہتے ہیں، ایک دُوسرے میں سمائے رہتے ہیں اور صبح ہوتے ہی تم چلی جاتی ہو۔ میری بیوی مجھ سے بات کرتی ہے تو میرا رویہ پھر وُہی ہو جاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں میں اپنی بیوی کو کیلئے رہا ہوں۔ تمہارے نام سے اُسے پیار کرتا ہوں۔ تمہارے نام سے اُسے پکارتا ہوں، تمہارے جلووں کو اُس کے جسم اور خطوط میں ڈھال دیتا ہوں اور تب اُسے اپنی قربت بخشتا ہوں۔

"مدر اینڈ چائلڈ" کے تازہ شمارے میں تمہارے بچے" کی تصویر شائع ہوئی ہے۔ ننھا سا بچہ

کتنا حسین اور پیارا معلوم پڑتا ہے۔ تم اور تمہارا پیار کتنے عظیم ہیں۔ بچے کا نام تم نے اپنا اور میرا نام ملا کے رکھا ہے۔ مجھے یاد ہے، یہ نام ہم نے تب سوچا تھا جب ہمیں اپنی مجبوریوں کا احساس نہیں ہوا تھا۔ جب ہمیں یہ پتہ نہیں تھا کہ جو ہم سوچتے ہیں وہ نہیں ہوگا، بلکہ وہ ہوگا جسے ہم سوچ ہی نہیں سکتے۔ تمہارے بچہ ہوگیا، اور تم نے اس نام کو اپنا لیا۔ تم ہر معاملے میں مجھ سے بازی لیتی جا رہی ہو۔ ہر لحاظ سے اپنے پیار کو ابدی اور غیر فانی بناتی جا رہی ہو۔

شام کے سائے مجھے ڈس رہے ہیں۔ کمرے میں اندھیرا ہے اور میں نے بتی نہیں جلائی۔ جانے کیوں اس وقت مجھے تمہاری قربت کا احساس ہو رہا ہے۔ تمہاری انگلیوں، تمہارے آنچل۔ تمہارے رخساروں اور تمہارے ہونٹوں کا لمس مجھے محسوس ہو رہا ہے، اپنے بالوں، اپنے ماتھے، اپنے ہونٹوں اور اپنی گردن پر اور مجھ پر ایک عجیب سا نشہ چڑھتا جا رہا ہے۔ میری آنکھیں سرور سے بند ہوتی جا رہی ہیں۔ مجھے اپنی بیوی کا وجود بھی وہ نہیں دے سکتا، جسے میں محض تمہارے تصور سے پا لیتا ہوں۔ میں اپنی بیوی کو پیار نہیں کر سکتا حالانکہ ہر لحاظ سے وہ ایک محبت کرنے لائق عورت ہے۔ وہ اپنا گھر، اپنے ماں باپ، اپنے بھائی بہن چھوڑ کر میرے پاس آئی ہے۔ میرے ساتھ رہتی ہے۔ میری خوشی اور بہبودی کے لئے دعائیں مانگتی ہے۔ اگر اسے اس حقیقت کا پتہ چلے تو کیا حالت ہوگی اس کی۔ .... کچھ ایسا ہی تم نے اپنے بارے میں بتایا تھا۔ تمہارا شوہر تمہارا کتنا خیال رکھتا ہے۔ سارے گھر کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں ہے۔ وہ تمہارے دم سے جیتا ہے۔ لیکن تم ——— تم اسے کیا دیتی ہو، تم اسے کیا دے سکتی ہو۔

ریڈیو پر کسی رہنما کی تقریر ہو رہی ہے۔ آج ہم ہر لحاظ سے آزاد ہیں۔ ہمیں ہر جائز خواہش کو پورا کرنے کی آزادی ہے۔ ہمیں آزادیٔ تحریر ہے.... ہمیں آزادیٔ تقریر ہے...... اور میں سوچ رہا ہوں۔ اگر آزادیٔ تقریر ہے تو ہم دونوں کے منہ پر تالے کیوں لگے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہونا چاہتے تھے، لیکن نہیں ہو سکے۔ کیا یہ خواہش ناجائز تھی۔ اگر یہ خواہش ناجائز تھی تو جائز خواہش دنیا میں کیا ہو سکتی ہے —— !؟

یہ ساری دُنیا بناوٹ اور تصنّع کے ملمّع تلے گھُٹ رہی ہے۔ یُوں لگتا ہے جیسے اس کا اپنا کوئی وجُود نہیں! اب اور فریب نہیں دیا جا سکتا۔ اب اور فریب نہیں کھایا جا سکتا۔ آزاد دیش میں کیوں اپنے ذہن، اپنی رُوح اور اپنے ضمیر کو زنجیروں میں جکڑے رہیں۔ میں اپنی باہیں پھیلائے کھڑا ہوں آؤ۔ آ کے تم میرے قدموں کیساتھ قدم ملا دو تاکہ ہم ایک ایسی منزل کی طرف گامزن ہو سکیں جہاں پہنچ کر ہماری ساری مجبوریاں کافور ہو جائیں۔ اپنے ساتھ اُس ہیرے کو، اُس گُہر کو بھی لے آؤ جسے ہم دونوں نے اپنے جسموں سے نچوڑ کر جنم دیا ہے اور جو ہماری عزیز ترین نشانی ہے۔ آؤ! اس کے ہاتھ ہم آنے والے زمانے کو پیغام بھیجیں گے کہ اے نئے زمانے کے لوگو! صحیح معنوں میں آزاد ہو، اپنے درمیان سے مذاہب، رسُوم و قیُود کی چھوٹی چھوٹی دیواریں مسمار کر دو۔ انسان کو انسان کے قریب آنے، محبّت کرنے اور ساتھ دینے کا حق دو۔ انسان کو چھوٹی چھوٹی کسوٹیوں پر پرکھ کر اُس کے وجُود کا مذاق نہ اُڑاؤ۔ اُسے انسانیت کی کسوٹی پر پرکھو اور پرکھنے کے بعد اُس کی قدر کرو۔ تاکہ دُنیا انسانوں کے رہنے کے لئے ایک مثالی جگہ بن سکے، اور ہمارے جیسے اَن گنت لوگوں کو سماج کی عطا کی ہوئی زنجیروں میں سِسک سِسک کر بلک بلک کر بے بسی کی زندگی نہ گزارنی پڑے۔

بقیہ صفحہ ۲۸۱ سے آگے "احساسِ گناہ"

سب لوگ بُت بنے کھڑے تھے۔ کسی نے مہاراج کو نہ روکا۔ کسی کی جُرأت نہ ہوئی کہ وہ بڑھ کر مہاراج کو روک لے۔ سبھی چپ چاپ دیکھتے ہی رہ گئے —— لالہ گُم سُم کھڑا تھا۔ جیسے وہ زمین میں دفن ہو گیا ہو۔ اُس کی پُوجا کی تھالی کے دیپ بجھ گئے۔ چہرہ پسینہ سے تر ہو گیا۔ سارے بدن میں بجلی سی تپنے لگی —— گاؤں والوں کی آنکھوں سے نفرت اور غم و غصّہ ٹپکنے لگا۔ وہ لالہ کو زہر آلود نگاہوں سے گھُورنے لگے۔ ان کے دلوں میں لاوا سا اُبلنے لگا تھا۔

لالہ گھبرا کر ایک طرف بھاگنے لگا۔ تو ہجوم نے "پکڑو" کا ایک فلک شگاف نعرہ لگایا اور لالہ لڑکھڑا کر نیچے کھڈ میں جا گِرا۔

مصنّفہ: مسز زیتون بانو　　　　ترجمہ:- تاج سعید

نَتھ
(ایک پشتو کہانی)

گذشتہ تیس برسوں سے وُہ دونوں بہنیں اِس گھر میں اسی حالت میں اکیلی رہتی تھیں نہ ماں نہ باپ اور نہ ہی کوئی اور عزیز تر بود۔۔۔ وُہ تیس برسوں سے اِسی طرح قدم بہ قدم چلتی ہوئی ایک ہی رفتار کے ساتھ زندگی گزار رہی تھیں۔ ایک غیر انقلابی زندگی جس میں نہ خُوشی تھی اور نہ ہی بظاہر کوئی بڑا غم۔۔۔ دادا کی ساری جائیداد کی یہی دونوں بہنیں خُود مختار تھیں، دور کے وارث بھی کچھ نہ بول سکتے تھے۔ ان کی بے داغ دوشیزگی کی وجہ سے صرف اِن کا اپنا گاؤں ہی نہیں بلکہ دور و نزدیک کے دُوسرے گاؤں بھی ان کی عزّت پر کسی قسم کا حملہ کرنے کو تیار نہ تھے، اور ان کا کام اپنے دادا کے مصلّے پر رات دِن عبادت اور صرف عبادت ہی تھا۔ کچھ زمین کی آمدنی تھی اور کچھ نذرانے، شکرانے، جو سب لنگر کے لئے تھے۔ ان کے نصیب یا حصّے میں اگر کچھ تھا تو بس یہی دو پیالی چائے اور دو وقت کی روٹی اور وُہ بھی انہیں مہمانوں کی طرح تیار ملتی تھی۔ پہناوا کیا تھا، رات دِن گرمی سردی چھینٹ کی موٹی شلوار، سفید قمیض اور گاڑھے کا دوپٹہ۔ جسے وُہ اپنے ارد گرد لپیٹے رکھتیں۔ دونوں بہنیں دُور دُور تک بیبیوں کے نام سے مشہور تھیں۔ ایک کو بڑی بی بی اور دوسری کو چھوٹی بی بی کہا جاتا تھا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ ان کا اصلی نام کیا ہے۔ لیکن چھوٹی بی بی کو بڑی

بہن کبھی کبھی مارو کے نام سے پکارتی تھی۔

جاڑے کا موسم تھا۔ بارشیں شروع ہو چکی تھیں۔ دونوں بہنیں معمول کے مطابق عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر اپنی اپنی چارپائیوں پر بیٹھی تسبیح رول رہی تھیں۔ لالٹین جل رہی تھی اور ابھی اس کی روشنی کو کم کرنے کی غرض سے بتی کو نیچے نہیں کیا گیا تھا۔ چھوٹی بی بی کو سردی لگ رہی تھی اور اُس کا خیال تھا کہ اپنے لئے بستر جا کے بنائے۔ کہ اتنے میں بڑی بی بی کی نظر چھوٹی بی بی کے چہرے پر پڑ گئی۔ اس کو آج پہلی مرتبہ اس کا چہرہ دوسرے ڈھب کا دکھائی دیا۔ اسے ایسا محسوس ہُوا کہ مارو کے بستر میں آج کوئی اور لیٹا ہُوا ہے یا پھر اسکی صُورت بدل گئی ہے، جو گذشتہ تیس سالوں سے وُہ دیکھتی آ رہی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھیں ہاتھ کی ہتھیلی سے مَلیں اور پھر سر کو اونچا کر کے دیکھا تو وُہ مارو ہی تھی جو بستر پر بیٹھی ہُوئی تسبیح کے دانوں کے ساتھ ساتھ اپنے ہونٹوں کو بھی ہلا رہی تھی، لیکن اس کی آنکھیں چھت کی کڑیوں کی سمت لگی ہُوئی تھیں —— بڑی بی بی بستر میں بیٹھ کر مارو کی چارپائی کی طرف تھوڑا سا جھکی اور کہا —— "مارو یہ تم نے کیوں نکال لی۔" اس نے اتنی دھیمی آواز میں پُوچھا، جیسے وہ نہ چاہتی ہو کہ مارو کے علاوہ کمرے کی کوئی دوسری چیز بھی اس کی بات سُن لے۔

"بی بی اپنا آپ بُرا دکھائی دیتا تھا۔" مارو نے جواب دیا۔

"اور مَیں تو کہتی ہُوں اب بُری لگتی ہو۔ بہت بُری۔"

بڑی بی بی نے اسی آہستگی اور دھیمی آواز سے کہا اور پھر بستر پر لیٹ گئی۔ اتنے عرصہ میں اسے ایسے معلُوم ہُوا تھا کہ وُہ کتنی بے آسرا ہیں، اس بڑی بھری دُنیا میں ان کا کوئی بھی تو نہیں۔ وُہ آج تک اس بات سے مطمئن تھی کہ مارو کس چیز کے سہارے زندگی بسر کر رہی ہے اور تھوڑی دیر پہلے اس نے جو دیکھا، پہلے تو اسے یقین نہ آیا اور جب یقین ہو گیا تو ساتھ ہی اس بات کا بھی یقین کر لیا کہ وُہ لاولد ہیں، بے سہارا ہیں۔ زندگی تو جیسے بھی ہو گذر ہی جائے گی اور گذر رہی ہے، لیکن جب وُہ مریں گی تو کیا ہو گا؟ قبر میں انہیں کون اُتارے گا؟ —— پرائے لوگ! —— غیر مرد! —— اُنہوں نے تو اس گھر کے باہر کبھی قدم بھی نہ رکھا تھا اور ان تیس برسوں میں

کسی شخص کا چہرہ بھی نہ دیکھا تھا ـــ "کیا ہوگا ـــ کیا ہوگا؟" ـــ اس خیال کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں سے گرم گرم پانی بہنے لگا۔ گرم گرم پانی!! اس نے اپنے آنسوؤں کو کبھی آنسو نہیں سمجھا بلکہ پانی ہی جانا تھا۔ اس کے آنسوؤں کی کیا قیمت ہو سکتی تھی؟ اس کے آنسو کون دیکھ سکتا تھا۔ ماں دونے تو ایک بات کہہ دی اور کروٹ بدل لی اور اب خاموش پڑی ہے۔ شائد سو چکی ہے لیکن وہ سوئی نہ تھی۔ ویسے یہ بڑی بی بی کا اپنا خیال تھا۔ وہ کیا جانے کہ وہ کیوں سو نہ سکتی تھی ـــــ اور پھر آج وہ کس طرح سوتی جبکہ وہ ماں باپ، چچا چچی اور تیس سال پہلے کی آباد دنیا میں گھوم رہی تھی۔ بڑی بی بی کو تو اب اس کے آنسو بھی دکھائی نہ دیتے تھے۔ جو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے سفید چہرے پر بہتے ہوئے چمکتے موتیوں کی طرح رک رک کر بکھرتے اور بکھر کر تکیئے میں جذب ہو رہے تھے۔ یہ سب بڑی بی بی اس لئے نہ دیکھ سکی کہ لالٹین اور بڑی بی بی کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ ایک ایک آنسو ٹپکنے کے ساتھ ساتھ ماضی کے نشیب میں آہستہ آہستہ ایک ایک سیڑھی اتر رہی تھی اور جتنی سیڑھیاں اترتی گئی اتنی ہی اسے ماں باپ کی باتیں واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں اور جب وہ پوری تیس سیڑھیاں گن گن کر اتر گئی تو اس نے اپنے آپ کو بھی اسی طرح جاڑے کی ایک یخ بستہ رات کو مخمل کے گرم لحاف میں لیٹا ہوا پایا لیکن اس سمے اس نے اپنی سانس روک رکھی تھی۔ ماں باپ دونوں ایک اہم بات پر آپس میں آہستہ آہستہ، ہولے ہولے گفتگو کر رہے تھے کہ اتنے میں یہ جاگ اٹھی۔ آدھی رات کی خاموشی اور سکوت میں ہر بات صاف سنائی دے رہی تھی۔

"تم بھی ٹھیک کہتے ہو لیکن میں کہتی ہوں کہ اگر کل مر گئی تو ویسے بھی لاولد ہونے کا مسئلہ اٹھایا جائے گا۔ اچھا ہی ہوگا کہ بیٹی کا گھر آباد دیکھ لوں۔ وہ پہلی تو شادی کے دوسرے سال ہی خاوند کو کھا گئی۔ لڑکی ہوئی نہ لڑکا۔ سو اسی طرح یہ تو تنہا رہ گئی۔ اس سے تو کچھ بن جائے گا نا؟"
ـــ یہ اس کی ماں کی آواز تھی جو درد بھرے دل سے نکلی تھی۔

"بات تو تم بری نہیں کرتیں۔ گو وہ میرا جان و جگر ہے لیکن پختو (غیرت) کا بھی تو کچھ تقاضا

ہے - میں کیسے اپنی طرف سے بات چھیڑ سکتا ہوں - شرم کی بات ہے - بہت ہی شرم کی" محسن شاہ نے دونوں بیٹیوں کی چارپائیوں کی طرف طائرانہ نظر ڈالی اور بیوی کو جواب دیا - اس نے بھی لڑکیوں کی طرف دیکھا کہ کہیں بیدار نہ ہو گئی ہوں اور جب اسے تسلّی ہو گئی کہ وہ دونوں سو رہی ہیں تو اس نے پھر بات چھیڑی -

" اپنوں میں کوئی بخوا اور شرم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا — اپنوں میں کیا شرم ؟" دونوں ہی سگے بھائی ہو - وہ ہم کو اچھی طرح جانتا ہے اور ہم ان کو — پوشیدہ اور مخفی کچھ بھی نہیں ، لڑکی تو پیدا ہوتے ہی ان کی ہو چکی تھی - اپنا نہ کوئی بیٹا ہے اور نہ بہو اور نہ ہی میں اتنی خوش نصیب ہوں کہ لڑکی کو اپنی آنکھوں سے دور کر کے ان کے لئے گھر خالی کرنا چاہتی ہوں ، اور نہ ہی میرا یہ خیال ہے کہ وہ انکار کریں گے تو کسی اور کو بیاہ دوں گی اور یا خدانخواستہ بھاگی تھوڑا جا رہی ہے - زندگی بھر وہ انتظار کر سکتی ہے یہ تو کوئی بات ہی نہیں - لیکن میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہے نا ! اور کچھ نہیں تو تھوڑی خوشی تو دیکھ لوں گی -"

"ٹھیک ہے مجھے فضل شاہ کے مزاج و عادات کا علم ہے - وہ بڑا ضدی ہے - جب تک اپنی ضد پوری نہ کرے - میرا خیال ہے وہ بیاہ کا نام تک بھی نہ لے گا - اگر عزیزوں کی شرم اور باتوں کا خیال نہ ہوتا تو وہ ایک بیٹے کی شادی پر دس طوائفیں نچاتا اور اگر اب طوائفیں نہ ہوتیں تو اس کا کہنا ہے کہ سات دن مولود شریف کراؤں گا - نزدیک کے تمام دیہات کو دعوت دوں گا اور دعوت بھی ایسی کہ تیس چالیس من چاول پکیں اور اسی طرح پندرہ بیس بھیڑیں صدقہ کروں گی - تب میرے دل کا ارمان پورا ہو گا -"

محسن شاہ نے یہ بات ایسے طریقے سے کہی جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ خود بھی اس کے لئے راضی ہے کہ ایسا ہی ہو ، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہو اور وہ بیٹی کو جو سامان جہیز میں دینا چاہتا ہے اس سے دس گنا اس کا سنہ بھی نہ ہے - ایک سسر کی حیثیت سے اور دوسرا بھتیجی اور بیٹی کی ڈولی ایسی دھوم دھڑکے کے ساتھ جائے کہ دونوں گھروں کی مدتوں کی آرزوئیں

پوری ہو جائیں — پھر وہ دن بھی آگیا جب اصل کمخواب کے دو تھان پسند کر لئے گئے اور ایک ایک تولہ سونا زرگر کی دکان پر زیوروں کے لئے دیدیا گیا اور فضل شاہ کے بیاہ کی تاریخ مقرر ہو گئی، دونوں بھائیاں ایک ہی دن گھروں سے نکلیں — یہ تو اپنا ہی کام تھا، ایک بھائی کی بیٹی دوسرے بھائی کے بیٹے سے بیاہی جا رہی تھی، دونوں بھائی اپنے لخت جگر ایک دوسرے کے حوالے کر رہے تھے بھتیجی چچا کے گھر جا رہی تھی اور وہ جس گھرانے کو مدعو کرتے تو وہ یہی کہتے۔ "دونوں ہی اپنے گھر ہیں یا یہاں یا وہاں، ایک ہی بات ہے۔" دوشیزاؤں نے لڑکی کو گھیر لیا اور عورتوں نے اپنے بکسوں اور صندوقوں کی جانچ پڑتال شروع کر دی کہ فضل شاہ کا بیاہ ہے "کون سے کپڑے اچھے ہوں گے اور کون کون سے پہنے جا سکیں گے" اور جب ان کا شادی کے دن کی طرف خیال جاتا تو تیرہ دن ابھی باقی تھے۔

نکاح کے دن کے سات روز پہلے قرب وجوار کے مشہور علماء اکٹھے ہونے شروع ہوئے اور پھر مولود شریف ہوا اور نعت خوانوں نے ابھی چار راتیں بھی جاگ کر نہ گزاری تھیں، پندرہ بچی بھیڑوں میں سے ابھی آٹھ بھیڑیں باقی تھیں اور سبز چائے کی پیٹی ابھی نصف سے زیادہ باقی تھی کہ فضل شاہ کے سینے سے اٹھتی ہوئی چیخیں ناقابلِ برداشت ہو گئیں اور جب ڈاکٹر نے اس کے جسم پر سے بھیڑ کا پوست اتارا تو غصے کیساتھ کہا۔ "تم لوگوں نے اپنی جاہلیت کی وجہ سے اس کو غرق کر دیا۔ یہ نمونیہ ہے نہ کہ موچ — اور کوئی اس کا انگ تو ٹوٹ نہ گیا تھا کہ تم لوگوں نے پوست چڑھا دیا اور پھر فضل شاہ میں اتنی طاقت نہ تھی وہ ہوا کھینچ سکتا۔ سانس لے سکتا اور اپنے اندر آہوں اور سسکیوں کے بہتے ہوئے سیلاب کو روک سکتا اور جب ڈاکٹر نے سٹیتھسکوپ اسکی چھاتی پر رکھا کہ پھیپھڑوں کے زخموں کی گہرائی معلوم کرے تو اس کے دونوں پھیپھڑے خالی غباروں کی طرح سینے کی دیواروں سے جدا الگ تھلگ لٹک رہے تھے —

"یہ نہیں ہو سکتا — یہ غیرت ہے — دوشیزہ کے لئے زندہ اور مردہ ایک ہی ہے — منگیتر کو دیکھنے کے لئے وہ کیسے آئیگی؟" لیکن اسکی ماں کی بڑائی کسی نے نہیں مانی۔ دونوں بھائیوں اور فضل شاہ کی ماں نے جو کہا اور کچھ کرنا چاہا کیا — پچازاد و

دِکھانے کے لئے اُسے لایا گیا۔ زرد چہرہ۔ ویران آنکھیں، جن میں نہ آنسو تھے اور نہ ہی زندگی کے کچھ آثار۔ اُجڑی ہوئی آنکھوں کے اپنے ویران گھر کی ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں کو دیکھا۔ چچا کی اُبھری ہوئی زندگی کے گھمبیر اندھیرے اس نے چارپائی پر دراز دیکھے۔ اپنے کانوں سے وُہ نالہ و شیون نہ سُن سکی۔ آنکھوں کا نُور لُٹ چکا تھا۔ بیاہ میں شریک عورتیں، جو اس کے خزاں زدہ درخت کے اِردگرد بیٹھی ہُوئی تھیں، دِکھائی نہ دے رہی تھیں۔ وُہ یہ نہ سمجھ سکی کہ یہ سب کیوں ہُوا اور کیسے ہُوا؟ —— کسی سے پُوچھ بھی تو نہ سکتی تھی، اس کی زبان خشک تالُو کیا تھا بے حِس و حرکت چمٹی ہُوئی تھی —— تیسری، ساتویں اور چہلم گزر گیا تو اسے ماں باپ کا یہ گھر غیروں جیسا معلُوم ہونے لگا اور جب رات کو وُہ بستر پر دراز ہوتی تو اِس خیال کیا تھا کہ اِس گھر میں یہ اِس کی آخری رات ہے۔ صُبح سُسرال سے ڈولی آجائیگی اور وُہ اپنے گھر چلی جائیگی، یہاں تو وُہ مہمان بن کر آئی ہے۔ لیکن جب اُسکی مہمانی دس گیارہ ماہ تک ختم نہ ہوئی —— اور پھر —— اچانک ایک دِن دونوں بہنیں ڈولی میں سوار چچا کے گھر کو روانہ ہوگئیں۔

”مَیں تو اپنے گھر جا رہی ہُوں لیکن یہ میری بہن میرے ساتھ کیوں —— ؟“ اس نے دِل میں کہا۔ ”شائد یہ میرے ساتھ مہمان بن کر جا رہی ہے۔“ اِس نے اپنے دِل کو تسلّی دی۔

”اِس کا دُوسرا بھائی بھی تو نہیں کہ —— اور ایک بھائی دو بہنوں .... تو یہ۔ تو یہ مَیں نے کیا کہہ دیا ہے؟ اور جب وُہ ڈولی سے باہر نکلیں تو گھر عورتوں سے بھرا پڑا تھا —— بڑی بہن دوڑ کر چچا کے اُوپر گر گئی، اور جب اُس نے دیکھا تو چچا کی ٹھوڑی بندھی ہوئی تھی اور وُہ بے حِس پڑا تھا۔

”ہائے ..... یہ اِس لئے .....!!“ وہ اب سمجھی کہ وُہ ڈولی میں یہاں کیوں لائی گئی ہیں یہ تو ان کے خاندان کا دستُور ہے کہ دوشیزگی کے دوران میں بُرقعہ استعمال نہیں کیا جاتا اور ڈولیوں میں آنا پڑتا ہے اور وُہ بھی تب جبکہ کوئی اپنا مر جائے۔ یہ تو ان کا چچا انتقال کر گیا ہے چچا بسُسر —— سُسر چچا ان میں سے کونسا رِشتہ قریب ہے؟ کونسا —— کونسا!! اور

لوگوں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی سُرخی اُمڈ آئی ہے۔ اسکی آنکھیں سُرخ ہوگئیں اور پھر عورتوں کے انبوہ میں کسی کی سب سے بلند چیخیں سُنائی دے رہی تھیں، یہ اس کے بین تھے۔ سِسکیاں اور بس سسکیاں ۔ ارمان اور آرزوؤں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

—— چچا کے دِل میں بھی ارمان بھرا تیر پیوست تھا۔ دس بارہ ماہ اِس نے بھی غیر مرئی دل کے گھاؤ سے خون تھوکا تھا۔ اب جبکہ گھاؤ کا منہ زیادہ کھل گیا تھا تو موت نے آکر اِسے ابدی نیند سُلا دیا تھا —— باپ اور بیٹا دونوں پہلو بہ پہلو سو گئے —— بیٹے کی برسی باپ کے چہلم کے دن ہوئی، باپ کا چہلم بیٹے کی برسی کے دن کیا گیا۔

"ایک بیٹی ایسی برباد ہوئی کہ بیوگی تیار ہی ہے اور دوسری کو تو میں بیوگی کی چادر نہیں اوڑھا سکتی۔ اس کی جوانی کیوں برباد کرنا چاہتے ہو۔ بھابی نے تو اجازت دیدی ہے، اگر تمہاری مرضی ہو تو —— پر تم اب اور کس کے لئے بٹھانا چاہتے ہو، دوسرے کون ہیں، یہی چار جگہیں ہیں کوئی پسند ہو تو بات طے کردو۔ میرا اپنا دِل تو ان چاروں رشتوں سے مطمئن ہے اور اگر یہ رشتے بھی اچھے نہ ہوں تو پھر میں اپنی مرضی سے ایک جگہ رشتہ کرتی ہوں، کیا میری مرضی کو اتنا دخل بھی نہیں؟"

ایک مرتبہ اس کی ماں چولہے کے پاس بیٹھی برملا کہہ رہی تھی۔ اس کو بیٹیوں کی موجودگی کا بھی احساس نہ تھا اور نہ اب اِسے رات کے سناٹے میں یہ سب کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

وہ خاموشی سے اپنے کمرے سے باہر چلی گئی "ماں تو جو کچھ بھی کہے، لیکن میں آج تم کو صاف بتاتی ہوں کہ مارو ایک جگہ کے لئے بھی راضی نہیں ہے۔" یہ اُس کی بڑی بہن کی آواز تھی۔ جس نے اس کے دِل کی آواز، ماں باپ تک پہنچادی تھی۔ ویسے وہ اپنے طور پر اِس قسم کی جرأت بھی نہ کرسکتی تھی۔ مرجاتی لیکن یہ بات...... توبہ توبہ ہرگز نہ کہتی —— "اگر ایک جگہ کے لئے بھی راضی نہیں ہے تو پھر کیا کریگی، کیا ہم دونوں کی جڑ اکھاڑنے کے درپے ہے؟ ہمارا نام ونشان اِس دُنیا سے مٹانا چاہتی ہے؟ یہ اس کا اپنا اختیار ہوگا نا؟ کہ جہاں اس کا جی آئے ہاں کردے! یہی مطلب ہوا نا۔ اِس کے لہجے میں طنز بھر گیا۔ "میں نہ کہتی تھی کہ منگیتر کو دیکھنے

کے لئے نہ جائے؟ لیکن تم کب مانتے تھے۔ تم تو ایک شرمیلے باپ کی طرح ان کی ہر بات سنتے رہے اور — "

"ما — ں، میری ناک میں یہ ..... یہ ..... موت کے تختہ پر — " اس کی زبان تالو کیساتھ چپک گئی اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی اور اپنا دوپٹہ اُتار لیا، وہ دوپٹہ جس کے بدلنے کی جب بھی ضرورت پیدا ہوتی، تو کمرے کے اندر دروازہ بندکر کے بدلتی — آج باپ کے سامنے اُتر گیا تھا کہ باپ بھی اس کا فیصلہ جان لے۔ لیکن باپ اس منظر کو نہ دیکھ سکا اور جلد ہی اُٹھ گیا۔ اور بھتیجے کی آخری نشانی کو بڑھ کر چوم لیا اور اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں باہر نکل آئیں — اس کا یہ فیصلہ ایسا فیصلہ نہ تھا جس سے کوئی باخبر نہ ہوتا۔ ہر کوئی جان گیا۔ تمام گاؤں کے لوگوں کو پتہ چل گیا اور جب چچی بھی جان گئی تو اس نے وہ تمام سامان جو ابھی اس کا اپنا نہ ہوا تھا — اور جوانمرگ فضل شاہ کا تمام مال و منال بھی اس کے پاس بھیج دیا اور جب اس کے ماں باپ بھی، دوسری دنیا کو سدھار گئے — اور آج جب اس کی عمر کچھ اُوپر پچاس برس کی ہو گئی تو — اسے اپنی جان بُری دکھائی دینے لگی اور وہ نتھ جو اس کی دوشیزگی کی نشانی تھی ابھی تک ناک میں پڑی ہوئی تھی — اس نے یہ نتھ ناک سے اُتار دی اور پرانے کمخواب کے پیچھے جو پُرانا زیورات کا ڈبہ پڑا تھا اس میں ڈال دی۔

جوہر میر

منّت

ادھر چاندرات ہوئی اور اُدھر عورتوں نے امام باڑوں کا رُخ کیا۔ ایک سے دُوسرے اور دُوسرے سے تیسرے امام باڑے قافلہ در قافلہ اور غول در غول عقیدتوں بھرے دِل لئے شہیدوں کے نام کے دیئے جلانے اور نیکی کا نام روشن کرنے جانے لگیں۔

سیاہ اور سفید بُرقعوں میں لپٹی ہوئی بُوڑھی عورتوں، جوان لڑکیوں اور ننھے مُنّے بچّوں کے شور و شغب سے گیارہ مہینوں سے سوئی ہُوئی گلیاں اور بازار جاگ اُٹھے۔ رنگ برنگے آنچلوں کی جھلملاہٹ سے ایسا معلُوم ہوتا تھا جیسے قوس قزح کی مخلُوق زمین پر اُتر آئی ہو اور جیسے گنگا جمنا کے بیٹے اور بیٹیاں ہولی کا تہوار منانے نکلے ہوں۔ اُن کی آوازوں سے بھی کچھ یُوں ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی ماہر اُستاد جلترنگ بجا رہا ہو یا جیسے کوئی تیز و تُندندی دُور پہاڑوں سے بہتی چلی آ رہی ہو۔

رات گئے تک عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہا۔ شمعیں روشن ہوتی رہیں اور پانی کی سبیلوں پر پھُول چڑھائے جاتے رہے۔ اگربتیوں کے معطّر دھوئیں سے امام باڑوں کی دیواریں بوجھل اور اُونگھتی ہوئی معلُوم ہوتی تھیں۔ دُکانداروں کے وارے نیارے تھے۔ شمعیں، پھُول اور اگربتیوں کے ڈھیر لگائے ہر بڑے چوراہے میں آنے جانے والوں کی جیبوں میں جھانک رہے تھے۔

اُن کے ہاتھوں میں لٹکے ہوئے پھولوں کے بڑے بڑے ہار بازاروں کو معطّر بنائے ہوئے تھے۔ منیاروں کی دکانیں بھی جگمگا رہی تھیں۔ وہاں بھی عورتوں اور مردوں کی بھیڑ لگ رہی تھی کوئی چاندی کے پھول خرید رہا تھا اور کوئی چاندی کے لٹو اور کوئی منت کے طوق اور کشکول بنوا رہا تھا۔ اُن کے چہروں پر ایک عجیب طرح کی بشاشت برس رہی تھی۔ اُن کے ہونٹ متبسّم اور آنکھیں مسرور تھیں۔

پچھلے برس اکبر کی ماں نے بھی علم سے ایک سیب مَس کر کے کھایا تھا اور منت مانی تھی کہ اگر اکبر امتحان میں پاس ہو گیا تو وہ چاندی کا لٹو چڑھائے گی۔ سیب کھانے کے بعد اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ اکبر ضرور امتحان میں پاس ہوگا اور پھر ہوا بھی یہی۔ اکبر پاس ہو گیا اور اس کا یقین درست ثابت ہو گیا۔ چاند رات آئی تو اُسے بھی چاندی کا لٹو بنانے کی فکر ہوئی۔ دو تین دکانوں سے نرخ پوچھنے کے بعد اُسے کچھ یوں محسوس ہوا کہ وہ چاندی کا لٹو علم پر نہ چڑھا سکے گی۔ اس خیال سے اُس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ وہ حضرت عباس علمدار کے رُعب و جلال کے تصوّر سے سہم سی گئی اور اکبر کی زندگی کے لئے دُعائیں مانگنے لگی۔ منّت پوری ہو جانے کے بعد اُسے اپنے یقین اور شہیدوں کی کرامات پر بہت زیادہ اعتماد ہو گیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ شہید سب کچھ کر سکتے ہیں اگر وہ مرادیں پوری کر سکتے ہیں تو سب کچھ چھین بھی سکتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ منت کا لٹو علم پر چڑھانا ازبس ضروری ہے اور شاید اسی لئے وہ اکبر کی زندگی کی دُعائیں مانگ رہی تھی۔

شہیدوں کے رُعب و جلال سے اُس کے رُونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اُس کے ماتھے کی لکیریں گہری ہو گئیں اور اس کے بوڑھے چہرے پر سیاہی سی پھیل گئی تھی۔

اُس نے دو تین دکانداروں سے قیمت پوچھ کر تھوڑے داموں والا لٹو خریدنا چاہا۔ مگر اُسے اپنی منشاء کے مطابق کوئی بھی لٹو نہ ملا۔ ایک دکاندار سے تو وہ بڑی دیر تک اُلجھتی بھی رہی لیکن وہ پانچ روپے سے کم پر راضی نہ ہوا۔ جب کچھ بھی نہ بنا تو وہ ایک دکاندار سے کہنے لگی۔

"چلو نیا نہ سہی۔ پچھلے سال کا پرانا ہی دے دو۔"

دکاندار اُس کی بات پر ہنسنے لگا اور اکبر کی ماں اُسے پاگل سمجھ کر چلی آئی۔ راستے میں وہ اُسے دل کھول کر بددعائیں دیتی رہی۔ "موا جہنمی! وہی عملدار اس کی گردن توڑے۔ کمبخت خدا سے نہیں ڈرتا۔"

ہر سال کی طرح اس سال بھی امام باڑوں میں بڑی چہل پہل تھی پھولوں کے ڈھیر، عطر و دھوئیں کے بادل، شربتوں کے گھڑوں کے ڈھیر، نذر و نیاز کے پُرخلوص اہتمام۔ عقیدت کے آنسو اور درد و کرب میں ڈوبے ہوئے ماتمی نعرے! سبھی کچھ تھا۔

بڑے امام باڑے میں مجالس کا خاص اہتمام تھا۔ شمس العلماء کو خاص طور پر بڑی دور سے بلوایا گیا تھا۔ رات کو اُن کی تقریر سن کر ثواب دارین حاصل کرنے والوں سے امام باڑہ کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا۔ امام باڑے کے صحن اور دالانوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی۔ اُوپر کوٹھے پر عورتوں کا جمِ غفیر رنگین دوپٹوں اور برقعوں کی اوٹ سے تقریر سنتا۔ اُن کی آنکھیں شمس العلماء کے بوڑھے اور مقدس چہرے پر اُس وقت تک جمی رہتیں جب تک کہ وہ آخری دُعا نہ پڑھا لیتے۔ تقریر ختم ہونے کے بعد امام باڑے کے کشادہ صحن میں ماتم ہونے لگتا۔ گورے چٹّے اور بھرے بھرے سینوں والے جوان دائرہ بنا کر ماتم کرتے۔ اُن کے سفید بھرے بھرے سینے تھوڑی ہی دیر میں لال بھبوکا ہو جاتے۔ اُس وقت چلمنوں کے پیچھے گریہ و زاری کا کہرام سا بپا ہو جاتا۔ پھر اس کے بعد تبرک تقسیم ہونے کی باری آتی اور سب لوگ جوق در جوق اپنی اپنی منزل کی طرف جانے لگتے اور اُونگھتی ہوئی گلیاں پھر جاگ اُٹھتیں۔

راستے میں عورتیں اپنی اپنی بضاعت کے مطابق مجلس پر تنقید و تبصرہ کرتیں۔ کسی کی خوش آوازی کی تعریف، اور کسی کے بھونڈے پن کی مذمت! لیکن عام طور پر بھرے بھرے لال بھبوکا سینے زیادہ زیر بحث رہتے تھے۔

اُس روز جب سب عورتوں کے ساتھ اکبر کی ماں امام باڑے سے گھر آ رہی تھی تو وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اُسے نہ تو شمس العلماء کی تقریر کا خیال تھا اور نہ ہی لال بھبوکا سینے اُس کے پیشِ نظر

تھے۔ اُس کے دِماغ پر چاندی کا لٹو سوار تھا جو دُنیا کی طرح گردش کر رہا تھا۔ وُہ پُوری کی پُوری چاندی کے لٹو میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔

وُہ بیوی تھی۔ اُس کا خاوند عالمِ شباب ہی میں ایک حادثے کی نذر ہو گیا تھا۔ اُن دِنوں اکبر صرف دو ہی مہینے کا تھا جب اُس کا پہلا اور آخری سہارا ٹُوٹ گیا تھا تو وُہ آگے پیچھے لوگوں کے گھروں میں اُوپر کا کام کرنے لگی۔ اُس نے لوگوں کے برتن اور کپڑے دھو دھو کر اکبر کی پرورش کی۔ وُہ برتنوں اور کپڑوں کے ساتھ ساتھ اکبر کے مستقبل کی سیاہی بھی دھوتی رہی۔ جس سے اُس کے ہاتھوں پر لاتعداد کالی کالی لکیروں کا ایک جال سا بچھ گیا اور وُہ اُس جال میں گھِر کر رہ گئی۔

اب اکبر بارہ سال کا ہو چکا تھا۔ اُس نے پانچویں جماعت پاس کر لی تھی اور اب وُہ چھٹی جماعت میں آ چکا تھا۔ پچھلے سال جب وُہ پانچویں جماعت میں تھا تو بیوہ ماں نے بڑے ارمانوں سے اُس کے پاس ہونے کی مِنّت مانی تھی اور جب وُہ منت پُوری ہو چکی تھی تو چڑھاوا نہ تھا اور اب وُہ سوچنے لگی تھی کہ کاش اُس نے لٹو کے حصُول کے لئے بھی ایک سیب کھلایا ہوتا۔

اُس کے پاس کُل دس رُوپے تھے۔ جن میں اُسے محرّم کے کئی لوازمات پُورے کرنے تھے۔ شمعیں جلانی تھیں۔ اگر بتیّاں اور پھُول خریدنے تھے۔ اکبر کے لئے کالی قمیض سِلوانی تھی۔ سوا روپے کی حاضری دینی تھی۔ سبیل کے لئے شربت کا ایک گھڑا لے جانا تھا اور پھر اُوپر کی کئی ایک اور باتیں بھی پُوری کرنا تھیں اور دس روپے کا ایک نوٹ اِن تمام چیزوں کے لئے بالکل ناکافی تھا۔ وُہ دو ایک گھروں میں قرض مانگنے بھی گئی مگر سب نے اپنے اپنے خرچ اُنگلیوں پر گِن کر بتا دیئے اور وُہ دِل شکستہ ۔۔۔ آئی۔

بارہ سال پہلے کے اُجڑے ہوئے گھر میں بھی کچھ نہ رکھا تھا جو بیچ کر کام چلاتی۔ ایک ایک کر کے وُہ سب کچھ بیچ باچ کر کھا چکی تھی۔ اب صرف گنتی کے چند کپڑے اور برتن رہ گئے تھے جو اگر بیچنا بھی چاہے تو کوئی نہ خریدتا۔

امام باڑے کے صحن میں جب وُہ دُنیا بھر کے بچّوں کے گلے میں چاندی کے طوق اور کشکول

دیکھتی تو اُس کا دِل دھڑکنے لگتا۔ اُسے اکبر کی خالی خالی گردن دیکھ کر رونا سا آتا اور اُس کا جی چاہتا کہ سب بچّوں کے گلے سے طوق اور کشکول اُتار کر اپنے اکبر کے گلے میں ڈال دے۔ لیکن پھر شہیدوں کے رعب اور تقدّس سے وُہ سہم جاتی۔ اُس کا غصّہ سرد پڑ جاتا۔ وہ اکبر کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیتی اور اُس کا خالی گلا چومنے لگتی۔

اکبر کا دِل بھی اپنی ماں ہی کی طرح دُوسروں کے گلے میں طوق اور کشکول دیکھ کر پگھلتا رہتا۔ اُس کا بھی جی چاہتا کہ کاش کوئی یہ تمام طوق اور کشکول ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس کی گردن میں ڈال دے۔ لیکن ایسا کوئی معجزہ نہ ہُوا اور اُس کی گردن خالی ہی رہی۔

اکبر کی ماں رات کو جب شمس العلما کی تقریر سُننے آتی تو اکبر کو بھی ساتھ لاتی۔ وُہ خود تو اُوپر کوٹھے پر دُوسری عورتوں کے پاس چلی جاتی اور اکبر نیچے صحن میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے گپیں ہانکتا رہتا۔ وُہ ذاکروں سے سُنتے سُنائے معجزات۔ روائیتیں اور حدیثیں ایک دُوسرے کو سُناتے اور اپنی اپنی معلُومات کا رعب جماتے رہتے۔ اکبر کی زبان بڑی تیزی سے چلتی تھی لیکن اِس سال وُہ کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ اُس کی نگاہیں دُوسروں کے گلے میں پڑے ہوئے طوق اور کشکولوں پر ٹکیں۔ ایک دِن اُس نے اپنے ایک ساتھی کے کشکول کو ہاتھ لگایا اور انجان بن کر پُوچھا۔

"یار اِن کڑیوں کا کیا مطلب ہے؟"

"ابے تجھے یہ بھی معلُوم نہیں، یہ تو چُنّی فقیروں کی نشانی ہے۔ ہم سب چُنّی فقیر ہیں نا!" — عقیل نے ہنس کر جواب دیا۔

عقیل اُس کا بڑا گہرا دوست تھا۔ اکبر کی ماں بڑی رات تک عقیل کے گھر برتن مانجھتی رہی تھی۔ عقیل اور اکبر کی دوستی اُس وقت سے چل رہی تھی۔

"کبھی پہنی جو نہیں!"

اکبر نے جھینپ کر جواب دیا۔ پھر اُس نے ہمّت کر کے عقیل کے گلے سے کشکول اُتار لی اور اپنی گردن میں ڈال لیا اور اُس کی کڑیاں گِننے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے بادِلِ نخواستہ

کشکول عقیل کو واپس دے دیا۔ جتنی دیر کشکول اُس کے گلے میں رہا وُہ خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے تو مَیں بھی فقیر بن گیا۔ لیکن کشکول واپس کرنے کے بعد اُس کا چہرہ پھر مُرجھا گیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فقیر بننے کی خواہش اُس کے دِل میں بُری طرح چٹکیاں لینے لگی۔

مجلس کے بعد جب ماتم کی باری آتی تھی تو اکبر اور اُس کے تمام ساتھی اپنی اپنی قمیضیں اُتار کر صحن میں ماتم کرتے تھے۔ ہر سال وُہ اپنا الگ دائرہ بناتے تھے اور اپنے ننھے ننھے سینوں پر خلوص اور عقیدت کی تھاپ لگاتے تھے۔ لیکن اِس سال اکبر نے ماتم نہ کیا اور وُہ سبیل پر ہی بیٹھا رہا۔ اُس کا دِل اُداس تھا جو رشک اور طلب کی آگ میں بُری طرح جل رہا تھا۔ چاندی کا لٹو اُسے کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ اُسے خوف تھا کہ اگر اُس کی ماں نے چاندی کا لٹو نہ چڑھایا تو وُہ آئندہ اِمتحان میں ضرور فیل ہو جائے گا اور پھر شائد کبھی بھی پاس نہ ہو سکیگا۔

اُس روز جب اُس کے ساتھی ماتم کرنے لگے تو اکبر نے پہلے چند دِنوں کی طرح کپڑے نہ اُتارے اور اپنے دوستوں کی قمیضیں سمیٹ کر پانی کی سبیل پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ جتنی دیر عقیل ماتم کرتا رہا اکبر اُس کا کشکول اپنے گلے میں ڈالے رہا اور اُس کی ڈھارس بندھی رہی۔ وُہ سوچتا تھا کہ کاش یہ لمحے طویل ہو جائیں، عقیل اِسی طرح ماتم کرتا رہے اور یہ اُس کا طوق اور کشکول میرے گلے میں پڑا رہے۔

تھوڑی دیر بعد جب عقیل نے اپنا طوق اور کشکول واپس لیا تو اکبر نے اپنی ساری خوشیاں چاندی کے اُس ننھے سے کشکول میں ڈال دیں۔

وُہ بڑا سمجھدار تھا۔ اُس نے کبھی اپنی ماں سے ضِد نہ کی تھی کہ وُہ اُسے طوق اور کشکول بنا دے وُہ جانتا تھا کہ طوق اور کشکول بہت مہنگے بنتے ہیں۔ اُسے یہ بھی احساس تھا کہ اُس کی ماں چاندی کا لٹو بنوانے کی بھی طاقت نہیں رکھتی۔ احساس کی یہ دبی دبی چنگاریاں اُس کے نازک سے دِل کو جلا کر بھسم کر دیتیں۔

اکبر کی ماں جب اپنے بیٹے کو اپنے دوستوں میں یوں بجھا بجھا دیکھتی تو اُس کے سینے پر

سانپ لوٹ جاتے وُہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگتی - اُس کے رونے کی آواز نیچے مرد بھی سُنتے اور سب یہی سمجھتے کہ وُہ شہیدوں کے غم میں رو رہی ہے - اِس کے دِل کا حال کوئی نہ جانتا تھا کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ اُسے اپنے کتنے غم ہیں - اُس کی اپنی کتنی آرزوئیں شہید ہو گئی ہیں۔

وُہ چاند رات ہی سے چاندی کے لوٹے کے غم میں گھُل رہی تھی - اُس پر کھانا پینا تک زہر ہو گیا تھا منّت مان کر اُس نے اپنے لئے دُکھ مول لے لیا تھا - وُہ دِل ہی دِل میں اپنے آپ کو کوستی تھی کہ اُس نے سیب کھایا ہی کیوں تھا - لیکن جب پھُولوں سے لدے ہوئے علم کی طرف دیکھتی تھی تو اس کے جلال اور تقدّس سے کانپ سی جاتی اور رحم و کرم کی دُعائیں مانگنے لگتی تھی - غیر ارادی طور پر اُس کے مُنہ سے ڈھلے ڈھلائے فقرے نکلنے لگے اور پھر وُہ آنسو پونچھ کر چُپ ہو رہتی - رونے سے اُس کا دِل قدرے ہلکا ہو جاتا -

ساتویں کو جب جلوس نکلا تو وُہ بھی دُوسری عورتوں کیساتھ جلوس کو ایک نظر دیکھنے کے لئے کسی بالاخانے پر چڑھ گئی - اُسے بالاخانے کے برآمدے میں بیٹھنے کے لئے اچھی سی جگہ مل گئی جہاں سے اُسے پُورا جلوس صاف دِکھائی دے سکتا تھا - آگے آگے علم - پھر بچوں کی ٹولی - اس کے بعد مردوں کا ماتمی جلوس اور آخر میں شبیہہ ذوالجناح جس کے دونوں طرف دو علم تھے اور پھر اس کے بعد پانی کی سبیلیں - اُس نے ایک نظر میں پُورا جلوس دیکھ لیا - پھر اُس کی نگاہیں بچوں کی ٹولی پر آکر جم گئیں - وُہ اکبر کو ڈھونڈنے لگی - اکبر اور عقیل کپڑے پہنے ہوئے بچوں کے ماتمی دائرے کے ہمراہ تھے - وہ زور زور سے چلّانے لگی - ماں کی آواز سُنکر اکبر دوڑا دوڑا بالاخانے پر چڑھ آیا - عقیل بھی اُس کے پیچھے آگیا -

"کیوں ماں ؟" اُس کی سانس بُری طرح پھُول رہی تھی -

"تم دونوں ماتم کیوں نہیں کرتے - " وُہ بگڑ کر پُوچھنے لگی -

اور اُن دونوں نے جواب میں اپنے کُرتے اُتار کر اُسے تھما دیئے - عقیل نے اپنی قمیص کے ساتھ طوق اور کشکول بھی اُس کے حوالے کر دیئے اور وُہ دونوں ماتم کرنے چلے گئے -

اس شام کو اکبر کی ماں بہت خوش تھی۔ وہ سبیل پر شمعیں جلانے کے بعد آنکھیں بند کئے دعا مانگ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لال کاغذ پر لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی۔ دعا سے فارغ ہو کر اس نے اکبر کا ہاتھ تھاما اور علم پر پھول چڑھانے چلی گئی۔ پھول چڑھا کر اس نے لال کاغذ کی پڑیا کھولی اور چاندی کا لٹو علم کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر اس نے حاضری بھی دی۔ شربت کا گھڑا بھی اور سبھی کچھ پورا کر دیا۔

رات کو وہ حسبِ معمول مجلس سننے کے لئے اوپر عورتوں میں جا بیٹھی۔ نیچے اکبر عقیل کے ساتھ بیٹھا ہوا حضرت عباس کی شجاعت کے قصے سن رہا تھا۔ وہ بار بار عقیل کو اپنی منت کا لٹو دکھا رہا تھا۔ لیکن عقیل بالکل چپ اور گم سم تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا جیسے اس کی کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو۔ اکبر نے جب اسے اس طرح چپ دیکھا تو جھلا گیا۔

"کیوں یار بات کیوں نہیں کرتے؟"

عقیل تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کشکول اتارا اور چاندی کی کڑیاں گننے لگا۔

"یار دو کڑیاں کم ہو گئی ہیں۔"

وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

ابن فرید ایم اے علیگ

اے غمِ دل

زندگی اس کے لئے بہت بڑا صدمہ تھی۔ غریب ماں باپ کے درمیان پیدا ہونا یُوں بھی ایک بہت بڑی لعنت ہوتی ہے۔ لیکن اُس کے لعنتی پن میں اس کے کالے رنگ۔ بھدّی موٹی ناک اور چھوٹی چھوٹی چُندھیائی ہوئی آنکھوں نے اور اضافہ کر دیا تھا۔ اپنی اس مکرُوہ صُورت کو لے کر جب وُہ پیدا ہوئی تو اُس کے باپ نے گھن کے ساتھ اپنا مُنہ پھیر لیا۔ اُس کی پدرانہ شفقت کو اس قدر بھی جوش نہ آیا کہ وُہ اُس کو گود میں اٹھانے کے بجائے ایک پُرطمانیت نظر کے ساتھ دیکھ ہی لیتا۔ جب اُس کے سامنے وُہ لائی گئی تو غریب باپ نے بڑی بیزاری کے ساتھ اپنی نظریں پھیر لیں اور خاموشی کیساتھ اُٹھ کر چلا گیا، اور سبزی فروش کی دوکان کے لکڑی کے پڑے پر بیٹھ کر حُقّہ گڑگڑانے لگا اور کثیف۔ پھیلتے ہوئے دھُوئیں کو پراگندہ ذہن کیساتھ گھُورتا رہا۔ باپ کا اس طرح اُٹھ کر چلا جانا اُس کی ماں کو بڑا شاق گذرا۔ جیسے اُس نے اِس سیاہ بدنما جنگلی بلّی کو پیدا کرکے بہت بڑا گُناہ کیا ہے۔

دائی نے جب اُسے پوتڑے پر اُٹھا کر ماں کے حوالے کیا تو اُس نے بھی پوتڑے کی اس غلاظت کو دیکھ کر مُنہ پھیر لیا اور کوٹھڑی کے اندھیرے سیلے ہوئے کونے میں متلاشی نظروں سے گھُورنے لگی۔ اُس ننھی سی کالی کلوٹی جان کو معلوم نہیں اپنی یہ ہتک ناگوار گذری یا نہیں، لیکن اُس نے

شور برپا کردیا۔ اُس کی اُکھڑی اُکھڑی بھونڈی رونے کی آواز سے کوٹھری گُونج اُٹھی اور ماں نے بھاری بھاری تھپکیوں سے بے زاری کیساتھ اُسے چُپ کرانے کی کوشش کی۔ یہ شاید اُس کا پہلا احتجاج تھا، اور یہ بھی بے صدا ثابت ہُوا۔ ماں نے جب اس کا کوئی امکان نہ دیکھا کہ یہ شور بند ہوگا تو اُس نے اُسے روتا ہُوا ہی چھوڑ دیا اور وُہ بے ڈر ہوکر غافل ہوگئی۔

زندگی کی اِبتدا جب اِس طرح ہو تو مستقبل میں اچھی توقعات کون قائم کرسکتا ہے؟ اِتنی بڑی فلسفیانہ بات، پیدا ہوتے ہی اُس کی سمجھ میں کیسے آسکتی تھی؟ لیکن جیسے جیسے اُس کا سن بڑھتا گیا اُس کی زندگی اس کے لئے بہت بڑا صدمہ ثابت ہوتی گئی۔ چھوٹے اور بڑے بھائی بہنوں نے (جو صُورت اور شکل میں اِس سے لاکھ درجہ بہتر تھے) اُس پر حکومت جتانی شروع کردی، جا و بے جا سرزنش بھی کردیتے اور جب وُہ بغاوت کرتی تو ماں کے بھاری وزنی دوہتڑ اُس کی چاند پر اِس تیز رفتاری کیساتھ برسنے شروع ہوجاتے کہ اُس کی کھوپڑی بھنّا اُٹھتی۔ وُہ لاکھ سہمی سہمی سی رہتی، سب الگ تھلگ وقت گذارتی۔ لیکن اس کے بھائی بہن تفنن طبع کے لئے اُسے کونے کھدروں سے تلاش کرکے چھیڑتے اور جب وُہ واویلا مچانے پر ماں کے ہاتھوں سے پٹتی تو وُہ دُور کھڑے تماشہ دیکھتے اور بے حیائی کیساتھ ہنستے رہتے۔ وُہ اپنی بے بسی پر تلملا اُٹھتی۔ سب کو کوسنے لگتی اور نتیجے میں اور بھی زیادہ بھگتان بھگتتی۔ اس کا بدن بے رحمی کی مار سے دُکھنے لگتا تو دِل میں بھی ٹیسیں اُٹھنے لگتیں لیکن وُہ نہ اپنے بدن کے درد کا علاج کرپاتی اور نہ دِل کی ٹیسوں کا مطلب سمجھ پاتی۔

اُس کی سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا تھا کہ وُہ کیوں زندہ ہے؟ اُس کے گھر والوں کو کیا ضرورت ہے؟ البتہ یہ وُہ ضرور سمجھتی تھی کہ دُوسروں کی مار کھانے، گھڑکیاں سُننے اور جانوروں کی طرح بے پناہ کام کرنے کے سِوا دُنیا میں اُس کا کوئی دُوسرا مصرف نہیں ہوسکتا۔ بس یہ سب کچھ گوارا کرتی رہتی۔ یُوں بھی اُسے سب کچھ سمجھ لینے کی ضرورت کیا تھی؟ نہ اُسے کچھ سمجھایا گیا تھا اور نہ اُسے اس طرف توجہ دینی چاہیئے۔ ماں کو اپنے دوسرے بچوں کی حمایت سے اتنی

فرصت کہاں تھی؟ اور باپ تو اُس کے پیدا ہونے پر ہی نظریں پھیر چکا تھا۔ باپ کے زندہ ہوتے ہونے پر بھی اس کے وجود سے وہ مانوس نہ تھی۔ سب سے بدصورت اور سب کے لئے باعثِ نفرت بن کر وہ جیتی رہی، اور اپنے جوانی کے دنوں کو تیزی کے ساتھ پکڑنے کے لئے بڑھتی رہی۔

اور اس مرحلے پر یا اس منزل پر پہنچ کر ہی اُسے ایک شرارے کی طرح ماں اور باپ کی محبت کا نظارہ ہُوا اور پھر وہ محبت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مُندمل ہو گئی۔ اب وہ زندگی کی ان سرحدوں کو پار کر چکی تھی جو ماں باپ کو لڑکی کی طرف سے بے حد فکر مند کر دیتی ہیں۔ اُس کا باپ غریب تو ضرور تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ فاقوں پر بسر کرنی پڑتی ہو۔ شاید اسی وجہ سے اگر وہ اُس کے سلسلے میں انتظار کرتا تو شائد ایک کھاتا پیتا خاندان تلاش کر لیتا، لیکن وہ تو اُس کی پیدائش پر ہی مایوس ہو چکا تھا۔ چنانچہ اُس کی ٹکڑوں میں زیادہ دیر گھلنا بھی اُس نے مناسب نہ سمجھا اور جھٹ پٹ ایک کارخانے کے مزدور لڑکے رئیس کے ساتھ اس کا پلّو باندھ دیا۔

رئیس کی تنگ و تاریک کوٹھری میں پہنچ کر اس نے طمانیت کا سانس لیا۔ کم از کم اب اُسے بھائی بہنوں کی ستم رانیوں اور ماں کی تنفّاوتوں سے نجات تو مل گئی تھی۔ اُس نے رئیس کے ساتھ اپنی زندگی بڑے سکون کیساتھ گذارنے کا پروگرام بنا لیا۔ لیکن زندگی گذارنا اُسے معلوم کب تھا؟ رئیس اُس کی ماں کی طرح حکم چلانا اور بھائی بہنوں کی طرح غاجو کرنا نہیں جانتا تھا۔ سیدھی سادی اور نیک طبیعت رکھنے والے مزدور کو باہر کے دھندوں سے کب فرصت تھی جو وہ اِس کلوٹی بلّی کو ہانکتا رہتا۔ بے خوف و خطر زندگی حاصل کر کے وہ بھی تمام ذمّہ داریوں سے سبکدوش ہو گئی، اور بڑے اطمینان کیساتھ بچّوں پر بچّے پیدا کرنے لگی۔

رئیس نے اُس کے اِس مشغلے سے کوئی تعارض نہ کیا، مگر اپنی جگہ پر اُس نے دن بدن اپنی محنت اور کوششوں میں مزید اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ مزدوری اُسے راس نہیں آ رہی تھی۔ اخراجات بڑھ رہے تھے۔ تنگ دستی کا احساس بھوت بن کر مسلّط ہو رہا تھا، وہ

اپنی کوٹھری واپس آتا تو پہروں اپنے ہی خیالات میں کھویا رہتا۔ بلّی سے اُلجھنے کی نوبت نہ آتی اور بلّی بھی اُس کی اِس خاموشی اور قدرے لاتعلقی کو بسا غنیمت سمجھ کر اُسے نہ چھیڑتی۔ اُسے بس اپنے بچّوں سے تعلق تھا جن کو وہ اُسی طرح سے پال پوس رہی تھی۔ جس طرح اُس کی ماں نے اُسے پالا تھا۔ اُن کی بے پناہ پٹائی کرنا، ہر وقت گرجتے برستے رہنا، یہی تو وہ برتاؤ تھا جو ماں نے اُس کیساتھ روا رکھا تھا، اور یہی وہ اپنے بچّوں کیساتھ روا رکھ رہی تھی۔ اِس رویّہ کے سوا اُس نے اور سیکھا ہی کیا تھا؟ رئیس بیچارے کو یہ بھی معلوم نہ تھا، بچپن سے لاوارث بچے کی حیثیت سے پروان چڑھنے والے مزدور نے نہ ماں کا پیار جانا تھا اور نہ اُس کے بگڑے تیور دیکھے تھے۔ شائد یہی وجہ تھی کہ بلّی بچّوں کے ساتھ جس طرح پیش آتی تھی وہ اُسی کو درست سمجھتا تھا۔ البتہ ایک خیال اُسے بُری طرح پریشان کئے ہوئے تھا اور وہ یہ تھا کہ بلّی بچّوں کو چھوڑ کر کسی کام پر نہیں جاسکتی اور وہ اکیلا سب کے لئے پیٹ بھر روٹی کما نہیں سکتا۔ ہفتوں اِس اُلجھن میں مبتلا رہنے کے بعد اُس نے یہی فیصلہ کیا کہ مزدوروں سے خالی بچنے والے وقت میں وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرے گا اور ایک دن وہ یہ بھی کر گذرا۔ جب اُسے ہفتے بھر کے بعد چھٹا ملا تو وہ تھوک فروش کے یہاں سے مختصر سا پرچون کا سامان لے آیا، اور کوٹھری کے سامنے چھابڑی لگا کر بیٹھ گیا۔

چھٹا بٹنے کا انتظار بلّی کو بھی تھا، ہفتہ بھر کی جنس کا اُسے انتظام کرنا تھا، مگر شام کو جب اِس کے ہاتھ پر ایک پیسہ بھی نہ آیا تو وہ رئیس سے اُلجھ پڑی۔ یہ پہلی جنگ تھی جو اُس نے اپنا گھر چھوڑنے کے بعد رئیس سے کی تھی اور جس میں اُس نے وہی رول ادا کیا تھا جو وہ اپنے گھر میں ادا کرتی رہتی تھی، مگر رئیس نے نہ تو اُس کی ماں کا رول ادا کیا اور نہ اُس کے بھائی بہنوں کے رویّے کو اپنانے کی کوشش کی۔ وہ مستقبل کے بڑے سہانے خواب دیکھ رہا تھا۔ اِس لئے خاموشی سے اُٹھ کر کوٹھری کے باہر چلا گیا۔ بلّی نے اُس کے پیچھے دھڑاکے کے ساتھ کوٹھری کے دروازے بند کر دیئے اور اپنی بھڑاس بچّوں کو بُری طرح پیٹ کر نکالنے لگی۔

رئیس کوٹھری کے باہر کھڑا کچھ دیر تو سوچتا رہا۔ لیکن بالآخر بچوں کی گریہ وزاری نے اس کا دل پگھلا دیا۔ اُس نے کوٹھری کا دروازہ کھلوانے کے لئے بلّی سے لاکھ التجائیں کیں۔ لیکن اُس نے ساری رات کوٹھری کا دروازہ بند رکھا اور رئیس اپنے مستقبل کے حسین خواب ـــــ اپنی چھابڑی ـــــ کے پاس رات گذارنے پر مجبور ہو گیا۔

بلّی کو اس جنگ میں فتح ہوئی تو وہ اب اپنی پہلی سی سہمی سہمائی زندگی پر قانع نہ رہی، آخر اپنی زندگی کا ایک قابلِ لحاظ حصّہ وہ بھی تو دوسروں سے دب کر گذار چکی تھی۔ اب اُسے موقع میسّر آیا تھا کہ وہ بھی دوسروں پر غالب آئے۔ وہ محرومی اور محزونی جو سالہا سال کنوار پنے میں اُسے گھُن کی طرح کھاتی رہی تھی، اب اُس کے اندر غضب کے پیکر میں ڈھل چکی تھی۔ اُس نے بات بات پر رئیس سے جھگڑنا اور اُلجھنا شروع کر دیا۔ رئیس کو جب کوٹھری کے اندر سکون نہ ملا تو وہ کوٹھری کے باہر اپنے کاروبار میں سکون تلاش کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ابتدا ہی سے اُس کی طبیعت کی سادگی اور مزاج کی نرمی نے اُسے عام مزدوروں کی روش سے الگ کر رکھا تھا۔ اس سے بلّی کے رویّے سے دل برداشتہ ہو کر اُس نے دل بستگی کا کوئی اور سامان تلاش کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ اپنی اس محدود زندگی ہی کو کُل کائنات سمجھنے میں مگن تھا۔ شاید اسی بناء پر اُس کے کاروبار نے اُس کی توجہ اور خلوص کو حاصل کر کے ترقّی کرنی شروع کر دی۔ رئیس اب رئیس احمد بن گیا۔ تنگ تاریک کوٹھری ایک مختصر سے صاف سادہ مکان میں تبدیل ہو گئی اور بلّی بھی راندۂ درگاہ نہ رہی۔ بچوں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ مدرسے کی شکل دیکھی اور رئیس احمد نے بھی اپنے کاروبار پر قابو پانے کے لئے شُد بُد پڑھنا لکھنا سیکھ لیا۔ لیکن جو چیز نہ بدلی وہ بلّی کے مزاج کی خشونت تھی۔ اس میں اُس بیچاری کا بھی کوئی قصور نہ تھا، آخر وہ کہاں سے تہذیب و آداب سیکھتی؟ اُس کی اپنی عمر کا اتنا حصّہ بڑی بے کسی کے عالم میں گذرا تھا۔ اُس نے ہمدردی، محبت، شفقت کا کبھی مُنہ بھی نہ دیکھا تھا، رئیس احمد نے اگر اُس سے نفرت نہ کی تھی تو وہ بھی یہ سب کچھ اُسے دینے سے قاصر رہا تھا، ایک خاموش، خاموش بُت نما انسان جذبات کی حقیقی دولت سے کیسے فیضیاب ہو سکتا تھا؟ بلّی کے سامنے جو دُنیا پھیلی ہوئی تھی وہ بڑی

خطرناک تھی - اُس سے ہر وقت چوکنا رہنے کی ضرورت تھی ورنہ کیا معلوم کس وقت کون سا صدمہ برداشت کرنا پڑ جائے - وہ ساری عمر اسی دھڑکے کے ساتھ گذارتی آئی تھی - اور اب بھی اِسی خدشہ کی بناء پر ہر وقت منہ نوچ لینے کے لئے تیار رہتی تھی - رئیس احمد زندگی میں فراخی اور طمانیت حاصل کرنے کے بعد بلّی کے اِس طرزِ عمل کی طرف سے شاکی ہو گیا تھا - وہ چاہتا تھا کہ خود اُس کی اپنی زندگی کی طرح بلّی کی زندگی بھی پُرسکون اور مطمئن ہو جائے - لیکن یہ کیسے ہو رئیس احمد کو خود بھی معلوم نہ تھا - بلّی جب کبھی ایسی حرکت کرتی جو رئیس احمد کو ناگوار ہوتی تو وہ اُسے ٹوک دیتا اور بلّی خود کو غیر محفوظ سمجھ کر رئیس احمد پر حملہ کر دیتی - اُس کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہونے لگتا کہ رئیس احمد بھی اُس کی ماں کی طرح اپنے بچوں کے پیار پر اُسے ایذا پہنچانا چاہتا تھا - بچپن کی ایذائیں برداشت کرتے کرتے اب بھی اُس کی ایک ایک ہڈی دُکھ رہی تھی - اب وہ مزید برداشت کی قوت اپنے اندر نہیں پاتی تھی، اور اسی طرح رئیس احمد اس کے مزاج میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوئی راہ نہیں پا رہا تھا - زندگی رئیس احمد اور بلّی دونوں کے لئے بڑی تلخ ہو گئی تھی، خلیج بڑھتی چلی جا رہی تھی اور سکون ناپید ہوتا جا رہا تھا -

رئیس احمد کے لئے یہ نیا غم، جو در اصل نیا نہیں تھا، بڑا تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا، وہ بلّی سے دن بہ دن دُور ہوتا جا رہا تھا، اور بلّی رئیس احمد کی اِس کشیدگی سے ہراساں ہوتی جا رہی تھی - اب کیا ہو وہ کچھ سمجھ نہیں سکتی تھی، اُس کا ذہن ایک بار پھر بچپن کی طرح کھوکھلا ہو گیا تھا اور رئیس احمد ایک "نئے کاروبار" ایک "نئی چھابڑی" کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگا - اُس کے مقام اور مرتبے میں ارتقاء نے اُسے زیادہ شائستہ احباب کا حلقہ فراہم کر دیا تھا، جن میں سے ایک پروفیسر عبدالرحمٰن بھی تھا - رئیس احمد کی دولت پروفیسر عبدالرحمٰن کے لئے بہت بڑی لالچ تھی، پُرانے معلّمی کے پیشے سے پنشن پانے کے بعد آمدنی کے ذرائع تو محدود ہو چکے تھے لیکن اخراجات کو محدود کرنے کی کوئی سبیل پیدا نہیں ہوئی تھی - رئیس احمد اپنے سرمائے کو اپنے احباب کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرنے میں دریغ محسوس نہیں کرتا تھا - اگر اس کے بدل کے طور پر اُسے سکون اور ہمدردی میسّر آ جائے

کیونکہ یہی وہ چیز تھی جسے نہ وہ فٹ پاتھ پر بچپن گذارتے وقت پا سکا تھا، اور نہ بلّی کے ساتھ کوٹھری سے کوٹھی تک مل سکا تھا، پروفیسر عبدالرحمٰن نے جب اس کے ہرے ہرے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی تو اُس نے آنکھیں بند کر کے خود کو پروفیسر کے حوالے کر دیا، اور اپنے سارے دُکھ ایک ایک کر کے بیان کر دیئے۔

پروفیسر نے اپنے مشوروں کی اُجرت تو وصول کر لی، مگر وہ اب تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ رئیس احمد کو اپنے خلوص کا احساس کیوں کر دلائے۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد اُس کے ذہن نے آخر یاوری کی اور پروفیسر کے ذریعہ رئیس احمد کو پہلی بار احساس ہُوا کہ اس کی چڑچڑی بلّی صرف بدزبان اور بد دماغ ہی نہیں ہے بلکہ بدصورت بھی ہے اور اس بدصورتی ہی کے صلے میں بھدّے۔ بدصورت بچوں کا جھول اس کے نصیب میں آیا ہے۔ رئیس احمد کو یہ نئی طرز حاصل ہوئی تو وہ بلّی کا کچھ عجیب نظروں سے جائزہ لینے لگا، اور بلّی اِن اجنبی نظروں سے خائف ہو کر طرح طرح کے خطرات کو منڈلاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ رئیس احمد اب اسے صرف ٹوکتا ہی نہیں تھا بلکہ بعض اوقات ایسے جملے بھی چست کر جاتا تھا جو اس کے بچپن کے زخموں کو ہرے کر جاتے تھے۔ وہ تلملا اُٹھتی تھی اور انجام کار اور بھی زیادہ پُرخشونت ہو جاتی تھی۔

پہلے جب چھوٹی چھوٹی دھمکیاں رئیس احمد کی طرف سے آنے لگیں تو وہ اُن کا مقابلہ اپنی نادانی کی بنا پر جوابی حملوں سے کرتی رہی مگر جب ایک دن رئیس احمد اُس کے رویّہ پر اُس پر بُری طرح برس پڑا تو وہ بھی جان کی امان نہ پا کر اُس پر پل پڑی۔ رئیس احمد نے اُسے زور کا دھکّا دیا۔ فرش پر وہ مردہ چھپکلی کی طرح گر پڑی۔

"ٹھیک کہتا ہے پروفیسر مجھے۔ دوسری شادی کر لینی چاہیئے۔ تب ہی اِس کلموہی سے نجات ملے گی۔" رئیس احمد بڑبڑاتا ہُوا اور پیر پٹختا ہُوا چلا گیا۔

اور بلّی فرش پر نہیں تحت الثریٰ میں گرتی چلی گئی۔ پروفیسر! پروفیسر! بھیانک نتھنوں نے اُس کی دُنیا لوٹ لی۔ اِس سے پہلے بھی رئیس احمد اسکی شکل و صورت پر طنز کر چکا تھا، اس کی

بدصورتی کا مذاق اُڑا چکا تھا۔ یہ باتیں اُسے نئی نئی سی لگی تھیں۔ رئیس احمد سے جب سے شادی ہوئی تھی، اُس طرح کا کوئی حملہ نہیں کیا تھا۔ مگر اس درمیان جب سے رئیس احمد نے پروفیسر کو کاروبار کرا دیا تھا، ان باتوں کو سُن کر اس کا دِل بُری طرح دھڑکنے لگا تھا، اور اب اِن حملوں نے تو جیسے اُس کے آہنی رگ پٹھوں سے پُوری قوّت کھینچ لی۔ رئیس احمد دُوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ کیوں؟ کیا اس لئے کہ وُہ بدصورت ہے؟ اِس لئے کہ وُہ رئیس احمد سے جھگڑتی ہے؟ اور اگر رئیس احمد نے دُوسری شادی کر لی تو۔۔۔۔؟ اُس نے اپنے گالوں کو دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالا اور اپنے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں۔ پھر وُہ اُٹھ کر کمرے کی طرف بھاگی۔ اُس نے اندر سے دروازے بند کر لئے اور پلنگ پر گر کر سسکیاں بھرنے لگی۔

پُورا دِن یُونہی کمرے میں بند رہ کر گذر گیا۔ شام پڑوسن سے زبردستی دروازہ کھلوایا تو ساتھ ہی ایک بھیانک خبر بھی لائی۔ بلّی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا۔ رئیس احمد نے اپنی مختصر سی زندگی میں جو ترقی کی تھی وُہ حالانکہ تیز رفتار تھی لیکن اب وہ اِتنا کم عمر بھی نہیں تھا۔ آٹھ بچوں کا باپ۔ اپنی زندگی کی نصف مسافت طے کر چکا تھا اور پروفیسر عبدالرحمن جس لڑکی کیساتھ دوسری شادی کرا رہا تھا وُہ رئیس احمد سے عمر میں نصف سے زیادہ نہ تھی۔ اِتنی جلدی یہ بات کیسے طے ہو گئی۔ بلّی سمجھنے سے قاصر تھی۔ اُس کا دِل و دماغ تاویل کرنے سے معذور تھا۔ یہاں تو اُس کی پُوری زندگی ہی ایک تنکے کی طرح طُوفان کی نذر ہو چکی تھی۔ اُسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وُہ رئیس جس نے غُربت سے لے کر فراغت تک اپنی زندگی بلّی کے ساتھ گذاری ہے اب وُہ اُس کے اِس قصُور پر کہ وُہ اُس سے چمٹ گئی تھی اِتنی بڑی سزا دے گا۔ وُہ خوشگواری کے سانحے کے بدلے میں اُس کی پُوری زندگی کو ایک سانحہ میں تبدیل کر دے گا۔ اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی محبت سے محروم کر دے گا اور اب دُوسرے دیار میں دادِ عیش دے کر اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حسد کی آگ میں جلاتا رہے گا۔ وہ اب تک رئیس احمد پر اعتماد کرتی آئی تھی، اب بھی اُسے اعتماد تھا۔ وُہ پڑوسن کی اِس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھی اور پھر وُہ کیسے مان لے کہ ایک باپ اپنی انتہائی کم سِن لڑکی کا ہاتھ ایک ادھیڑ مرد

کے ہاتھ میں پکڑا دے گا۔ اُسے یہ دلیل بڑی معقول معلوم ہوئی۔

"مگر وہ لڑکی تو بڑی کم سن ہے، اُس کا باپ کیسے راضی ہو گیا؟"

اُس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پڑوسن سے پوچھا۔

"بیٹی وہ پروفیسر عبدالرحمٰن کا قرضدار ہے۔ یہ قرض اس کے لئے مچھلی کا کانٹا بن گیا ہے بے چارا انکار کیسے کرتا؟ بیٹی دینے پر مجبور تھا۔"

اور تب بلّی نے اپنا دل دونوں ہاتھوں سے تھامنے کی کوشش کی اور غش کھا کر ایک بار پھر فرش پر گر پڑی اور فرش کے بجائے تحت الثریٰ میں گرتی چلی گئی۔

نگارش

کوئی کاروباری سلسلہ نہیں ہے۔ یہ آپ ادیبوں کا اپنا پرچہ ہے۔ اس کی زندگی اور کامیابی کے لئے آپ بھی اپنے حلقۂ احباب میں کوشش کریں۔

اُردو کی معیاری کتابیں ۔ اور ادبی رسائل

خریدیئے اور دوسروں کو خریدنے کا مشورہ دیجئے!

یہی واحد ذریعہ ہے اُردو کے معیاری ادب کو زندہ رکھنے کا

زبانی تعریفیں ——— تحریری قصیدے ——— نعرے بازیاں

نہ اُردو ادب کو زندگی دے سکتی ہیں!

نہ اُردو زبان کو!!

شری وشنو
مصنف

ناظر انصاری
مترجم

واپسی

واسلی اب ایک بہادر سپاہی تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ فوجی نہ تھا۔ بلکہ خارکوف کے قریب ایک گاؤں کا نامور کسان تھا۔ وہ بیجوں، پودوں اور مویشیوں کا بڑا ماہر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سارے گاؤں میں نہ صرف اُسکی دھاک بیٹھی ہوئی تھی بلکہ اُس کی بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی۔ اُس کا گھر گاؤں والوں کے لئے بیش قیمت مشوروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہی واسلی ۲۰ رجون ۱۹۴۱ء کو جس روز جرمنی نے اچانک حملہ کر دیا رُوس کی سُرخ فوج میں داخل ہو کر اپنی حسین بیوی اور دو لڑکیوں سے رُخصت ہُوا اور خارکوف چلا گیا۔

اُس کے کارناموں سے بہت جلد ثابت ہو گیا کہ وُہ ایک بلند مرتبہ سپاہی ہے۔ اُسے امتیازی اعزاز عطا کر کے محاذِ جنگ پر بھیج دیا گیا۔ پُورے ۲۸ ماہ تک واسلی محاذِ جنگ پر ڈٹا رہا۔۔۔ اِس طویل مُدّت میں رُوسی افواج کو مسلسل پسپا ہونا پڑا۔

پسپائی کے وقت رُوسی فوجوں کو مختصر وقت میں بیسیوں کام کرنے پڑتے تھے۔ اُن کی کوشش ہوتی تھی کہ ایک بھی ایسی چیز دُشمن کے ہاتھ نہ آنے پائے جس سے اُس کی قوّت میں اضافہ ہو سکے۔ گاؤں والوں کو کس کس چیز کی ضرورت ہے۔ کون کون سی چیزیں دُشمن کے لئے مُفید ہو سکتی ہیں اس بارے میں واسلی ماہرِ فن تسلیم کیا گیا۔ فوج میں اس کی قدر و منزلت نسبتاً بڑھ گئی۔ اِس

اضافی قدر و منزلت سے اُسے یہ نقصان پہنچا کہ وُہ اپنی فوج کے لئے لازمی و لابدی ہو کر رہ گیا اور رُخصت حاصل کرنا اُس کے لئے ناممکن سا ہو گیا۔ جس طرح ایک بڑے ٹینک کو میدانِ جنگ سے دُور لے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اُسی طرح واسلی کو فرنٹ سے دُور بھیجنا غیر ممکن سا تسلیم کیا جانے لگا۔ پسپا ہوتے ہوئے اپنا سبھی کچھ برباد کرتے جانے کے رُوسی نظریئے سے جرمن فوجی کچھ اس قدر جل بھن گئے کہ وہ نحیف و زار رُوسی بُوڑھوں، بچوّں اور عورتوں پر نہائت وحشیانہ مظالم کرنے لگے۔ رُوسی گوریلا، فاتح جرمن فوجوں کو اس قدر پریشان کرتے تھے کہ بعض اوقات جرمنوں کو اپنی فتح شکست کی طرح گراں گزرتی تھی۔ اُس کا غصہ جرمن فوجی کمزور رُوسی مستورات۔ بُوڑھوں اور بچوّں پر نکالتے تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ بہت جلد رُوسی اور جرمن ایک دُوسرے سے گہری نفرت کرنے لگے۔ یہ رُوسی اور جرمن مخاصمت سانپ اور نیولے کی دُشمنی سے کہیں بڑھ کر ثابت ہوئی۔ رُوسی کسانوں پر ظلم ڈھاتے ہوئے اگر کوئی جرمن، رُوسی فوجیوں کے ہاتھ لگ جاتا تو اُس کی بڑی دُرگت بنائی جاتی۔ لیکن واسلی اُن لوگوں میں سے تھا جو ایسے موقعہ پر بھی اپنے ساتھیوں کو کسی جرمن پر ظلم کرنے سے باز رکھتے تھے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا۔ جرمنوں کی طرح اگر ہم بھی وحشی اور درندے بن گئے تو ہم میں اور نازیوں میں فرق ہی کیا رہ گیا۔ ہم کمیونسٹ سپاہیوں کو کوئی ایسا فعل نہیں کرنا چاہیئے جس سے سپاہیوں کی دلیر جماعت کی عظمت کو داغ لگے۔ جرمنوں کی مسلسل پیش قدمی جاری تھی۔ واسلی کا گاؤں، صُوبہ سبھی نازیوں کے زیرِ اقتدار آ گئے۔ اُسے اپنے بیوی بچوں کی خبر ملنی بند ہو گئی۔ واسلی پر ایک قسم کا جنون سوار ہو گیا۔ بیسیوں مرتبہ وُہ موت کے مُنہ میں کُودا لیکن کامیابی کیساتھ زندہ بچ آیا۔ آخر واسلی کو یہ خوش قسمتی بھی میسر ہوگی کہ وُہ عصرِ حاضر کی دُنیا میں تاریخ کی مکمل اور سب سے زیادہ دلیرانہ جنگ — یعنی اسٹالن گراڈ کی جنگ میں بھی حصہ گیر ہو سکے۔ ہزاروں توپوں۔ سینکڑوں ٹینکوں اور بیشمار طیاروں کی شبانہ روز آگ کی بارش سے اسٹالن گراڈ کی کئی فلک بوس عمارتیں زمین دوز ہو گئیں۔ لیکن واسلی جیسے سپاہیوں نے اسٹالن گراڈ میں اپنی اولوالعزمی

اور شجاعت کا ایک نیا معیار قائم کر کے دکھا دیا۔ اسٹالن گراڈ زمین پوس ہو گیا لیکن جیت بھی اسٹالن گراڈ ہی کی ہوئی۔ اسٹالن گراڈ کی اس فتح نے گویا رُوس کی تقدیر ہی بدل دی۔ اپنے نام سے منسوب شہر کی فتح نے گویا رُوسی قائد اسٹالن کی قسمت کو چار چاند لگا دیئے۔ رَن کی گردش اب دُوسری سمت مُڑ لی۔ واسلی کے بٹالین کمانڈر کو اب واسلی کا خیال آیا۔ اُسے روس کا سب سے بڑا تمغہ اسٹالن کراس عطا کیا گیا۔ ساتھ ہی اُسے یہ بھی بتلایا گیا کہ اُسکی فوج اب خارکوف کی طرف روانہ ہو رہی ہے اور خارکوف کے ساتھ ہی ساتھ اُسے اپنے کنبے سے مُلاقات کرنے کے لئے دس دِن کی چھٹی مِلے گی۔

بھگوڑے جرمنوں کا تعاقب کرتے ہوئے واسلی کی فوج برق رفتار تیزی سے خارکوف تک پہنچی۔ معلوم ہوا کہ واسلی کے گاؤں پر اب تک جرمنوں کا تسلّط قائم ہے۔ اپنے کمانڈر سے اجازت لے کر چند مُنتخب رُفقاء کے ہمراہ واسلی اُسی رات اپنے گاؤں کے لئے روانہ ہو گیا۔ جب وُہ اپنے گاؤں کے قریب پہنچا تو صُبح ہو چکی تھی مگر سُورج اب گہری دُھند میں چھُپا ہُوا تھا۔ آسمان سے تیزی کیساتھ برف باری ہو رہی تھی۔ اِس کے باوجُود دُور ہی سے واسلی نے دیکھا کہ گاؤں کے کئی حِصّوں سے گہرا دھُواں اور آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ وُہ سمجھ گیا کہ جرمن گاؤں سے بھاگ گئے ہیں اور بھاگتے ہوئے آگ لگاتے گئے ہیں۔ یہی غنیمت تھا کہ برفباری کے باعث آگ زیادہ پھیلنے نہ پائی تھی۔ سب سے پہلے واسلی اور اُس کے ساتھیوں نے آگ بُجھانے میں مدد دی۔ برفباری کی رفتار میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ اس لئے آگ بجھانے میں اِن لوگوں کو زیادہ وقت صرف کرنا نہ پڑا۔ آگ بُجھاتے وقت فطری طور پر واسلی کے دِل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وُہ اپنے بیوی بچوں سے جا کر مِلے۔ وُہ اُدھر جانے ہی والا تھا کہ قریب کے نیم شکستہ مکان کی اوٹ سے اُسے کسی عورت کے سِسک سِسک کر رونے کی آواز آئی۔ رحمدل واسلی سے نہ رہ گیا۔ وُہ فوراً اُس طرف چل دیا۔ مکان کی پُشت میں ایک کھلی جگہ تھی اُس نے دیکھا کہ وہاں ایک عورت سِسک سِسک کر رو رہی ہے۔ معلوم ہُوا کہ وُہ بڑی دیر سے رو رہی ہے۔ روتے روتے اُس کی طاقت نے جواب دے دیا ہے۔ واسلی کو دیکھ کر وُہ زار زار رونے لگی۔ واسلی نے روس اور جرمنی کی جنگ میں پوشیدہ ایک ان ہونی

تک حصہ لیا تھا۔ اِس عرصے میں نہائت درد انگیز اور خطرناک واردات اُس کی نگاہوں کے سامنے پیش آئیں۔ لیکن اِس قدر دردناک منظر اُس کی نگاہوں نے شاید کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میدان میں سفید برف کا فرش بچھا ہُوا تھا۔ برف پر بچوں کی نیم سوختہ سیاہ لاشیں پڑی تھیں چھ سالہ ایک لڑکا اور چار سالہ ایک لڑکی اور ان بچوں کی ماں قریب ہی بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔ ماں نے بتایا کل رات جب جرمن درندے یہاں سے جانے لگے تو اُنہوں نے ہمارے مکانوں کو آگ لگانی شروع کر دی۔ ہم سب لوگ تو بھاگ کر چھپ گئے یہ بچے کہیں دُور کھیل رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ اپنی چچی کے گھر گئے ہیں۔ مَیں بدنصیب دوڑ کر اُس گڑھے میں چھپ رہی۔ وہاں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ گھر کو جلتا ہُوا دیکھ کر بچے دوڑے ہوئے ادھر آئے اور ایک دوسرے سے چپک کر سہمی نگاہوں سے مکان کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ پانچ سات جرمن فوجیوں نے اُنہیں پکڑ لیا۔ بچوں کو دیکھ کر مَیں اُن کی جانب بڑھی ہی تھی کہ جرمن فوجیوں کو دیکھ کر پھر سے گڑھے میں اُتر گئی۔ مجھے یقین تھا کہ وُہ بچوں کو معصوم جان کر چھوڑ دیں گے۔ دو تین منٹ تک اُن جرمنوں میں کوئی مشورہ ہوتا رہا۔ اُس کے بعد جرمنوں نے اُن دونوں بچوں کو اُٹھا کر بیک وقت اُس بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا۔ جلتے ہوئے مکان کی روشنی میں مَیں نے یہ سب کچھ دیکھا اور اپنے کانوں سے اِن معصوم بچوں کی چیخیں بھی سُنیں۔ بچوں کو آگ میں پھینکنے کے بعد جرمن یہاں سے چلے گئے۔ مَیں چلّائی، کچھ لوگ میری مدد کو آئے ہم لوگوں نے دہکتی ہوئی آگ سے اِن بچوں کو نکال تو لیا مگر آپ لوگ دیکھ ہی رہے ہیں کہ یہ کس حالت میں ہیں۔"

بہادر حاسلی سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ معصوم بچوں کی اِن نیم سوختہ لاشوں کو اگر اُس نے مزید لمحہ بھر بھی دیکھا تو وُہ پاگل ہو جائے گا۔ ایک لفظ بولے بغیر وُہ اس تیزی سے روانہ ہُوا جیسے کسی بھوت سے ڈر کر بھاگ رہا ہو۔ وُہ اپنے کُنبے کے لئے بہت متفکر اور متردد تھا۔ ایک ہی سانس میں بھاگ کر جب وُہ اپنے مکان کے اندر پہنچا تو یہ دیکھ کر اُسے

اطمینان ہُوا کہ نہ صرف اُس کا مکان بلکہ باغ اور پائیں باغ سب صحیح سلامت ہے۔ لیکن اُسی وقت اُس نے محسوس کیا کہ یہ خاموشی یہ سنّاٹا کیا ہے۔ قطعی موت کا سا سنّاٹا۔ برآمدے میں داخل ہو کر واسلی نے نہایت پریشان کُن حالت میں دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کوئی آواز نہیں آئی۔ مسلسل بلند آواز سے اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

دوسری بار۔۔۔۔۔

تیسری بار۔۔۔۔۔۔

چوتھی بار۔۔۔۔۔۔

لیکن کوئی جواب نہ مِلا۔ واسلی صحن میں اُتر آیا اور آواز دی۔ انّا! پیاری انّا — یہی اُس کی بیوی کا نام تھا۔ اُس کی بلند آواز میں ایک قسم کی لرزش تھی۔ دوسرے لمحے اُسے جواب مِلا "حضور!"

واسلی نے دیکھا اُس کا بوڑھا پڑوسی سویر چلا آ رہا تھا۔ اُس نے بڑی بیتابی سے پوچھا۔

"کہو سویر! میری انّا کہاں ہے؟ لیزا اور ماریا کہاں ہیں؟"

سویر نے کہا "وہ باغ کے پیچھے ایک گڑھے میں چھپے ہوئے ہیں۔" آپ کے مکان میں جرمن کمانڈر نے اپنا اڈا بنا لیا تھا۔ اُس کے خوف سے وہ لوگ اب تک وہیں پوشیدہ ہیں۔ آپ یہیں رُکئے میں اُنہیں بلا لاتا ہُوں — واسلی کی جان میں جان آئی — وہ بڑی بیقراری سے اپنی بیوی اور بچّوں کا انتظار کرنے لگا — بہت جلد اُس نے ایک عورت کے ہیولے کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

"اُف کیا یہی انّا ہے — انّا کو وہ ایک دوشیزہ کی صورت میں چھوڑ گیا تھا۔ اُس کی دوشیزگی کہاں غائب ہوگئی۔ اُس کے چہرے پر بیشمار جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اُس کا ہاتھ تھامے ہوئے یہ جو کمزور سی لڑکی چلی آ رہی ہے یہ ماریا ہوگی۔ اب پانچ سال کی معلوم ہوتی ہے۔ واسلی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ آگے بڑھ کر اُس نے اپنی بیوی کو سینے سے لگایا۔ لیکن یہ کیا۔

شوہر کو دیکھ کر بھی انّا کے چہرے پر مسکراہٹ کی جھلک تک نہ آئی - واسلی کو محسوس ہُوا گویا وہ مردہ لاش سے مِل رہا ہے - اُس نے اپنی چھوٹی لڑکی کو گود میں اُٹھا لیا اور انّا سے پُوچھا "لیزا کہاں ہے ؟ اب تو وہ کافی بڑی ہو گئی ہو گی - "

انّا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے - اُس نے بولنا چاہا مگر مُنہ سے آواز نہ نکلی - ہونٹوں پر لرزش آکر رہ گئی - صرف اُنگلیوں سے وُہ باغ کی سمت اشارہ کر سکی - واسلی کو گمان ہُوا کہ شاید لیزا بیمار ہے - وُہ انّا کا ہاتھ پکڑ کر اُسے مکان کی پُشت کی طرف لے چلا - اُس کا ہمسایہ سوبر چُپ چاپ ہمراہ چل رہا تھا - باغ کا میدان برف پوش ہو چکا تھا - ایک لمحے کے لئے واسلی نے محسوس کیا کہ وُہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے - آج صبح اُس نے جو انتہائی دردانگیز اور دِل ہلا دینے والا منظر دیکھا تھا وُہ اُس کے ذہن پر مسلط تھا - یہاں بھی باغ کے ایک گوشے میں سفید سفید برف پر ایک بچے کی نیم سوختہ لاش پڑی ہوئی تھی - دفعتہً انّا چیخ مار کر رو پڑی - بچی بار بار سسکنے لگی اور بُوڑھا سوبر آنسو پونچھنے لگا - تب کہیں واسلی کے فہم و ادراک بیدار ہوئے اور اب وُہ سمجھا کہ وُہ خواب نہیں دیکھ رہا تھا ، یہ تو حقیقت ہے - سامنے اُس کی بیٹی لیزا کا نیم سوختہ جسم پڑا تھا - اُس کی لیزا واقعی بڑی ہو گئی تھی - اُس کا جسم نکھر آیا تھا - کل تک وُہ زندہ تھی - پُورے ۲۹ مہینوں تک وُہ باپ کی واپسی کا انتظار کرتی رہی اور اس کے بعد ..... ؟

واسلی دفعتاً بیحد خطرناک بن گیا - بہادر سپاہی کا جذبہ اب بیدار ہو چکا تھا - اپنی روتی ہوئی بیوی کے شانوں پر اُس نے آہستہ سے ہاتھ رکھا اور کہا :-

"انّا ! صبر کرو ، ہمت سے کام لو اور مجھے بتاؤ کہ یہ کیا ہُوا ؟"

انّا پھر خاموش رہی - لیکن بُوڑھے سوبر نے کہنا شروع کیا :-

"جرمن کمانڈر نے آپ کے مکان کو اپنا اڈّا بنا لیا تو انّا اور بچے باغ کے پچھلے حصّے کے ایک گڑھے میں چھپ کر رہنے لگے - گاؤں والوں کی یہی کوشش تھی کہ جرمنوں کو یہ پتہ نہ لگے کہ انّا کا شوہر ایک فوجی افسر ہے - جس تکلیف سے انّا اور اس کے بچوں نے دن گذارے ہیں ...."

واسلی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا :-

"یہ سب باتیں جانے دو دوست ۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ لیزا کو کیا ہوا ۔"

اتنا کہہ کر اُس نے لیزا کے مُردہ جسم پر ایک نگاہ ڈالی اور اس کے نیم سوختہ چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا ۔

ایک لمحے کے لئے سوبر خاموش ہو گیا ۔ گویا اپنے بیان کو جاری رکھنے کے لئے طاقت جمع کر رہا ہو ۔ اُس کے بعد لرزہ خیز آواز میں بولا ۔ "پرسوں ، جب جرمن کمانڈر کی سالگرہ تھی رات کو اُس نے اپنے چند ساتھیوں کیساتھ شراب پی ۔ جب سب لوگ چلے گئے اور وہ اکیلا رہ گیا تو اُس نے اپنے اردلی سے کہا" کوئی لڑکی پکڑ لاؤ ۔"

آدھی رات کا وقت تھا ۔ اردلی کو انا اور بچوں کا مقام عافیت معلوم تھا ۔ وہ بدمعاش وہاں جا پہنچا ۔ سب لوگ گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے ۔ وہ چپ چاپ لیزا کو وہاں سے اٹھا لایا ۔ باہر آتے ہی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لیزا جاگ گئی تو اردلی نے اُس کا منہ دبا دیا تاکہ چلّا نہ سکے ۔ جرمن کمانڈر نے جب اس سے جبراً اپنی حیوانی خواہش پوری کرنا چاہا تو اوّل تو وہ خوشامد اور عاجزی کرنے لگی ۔ لیکن جب وہ شیطان باز نہ آیا اور اُس نے لیزا کو اپنی طرف کھینچا تو لیزا نے اتنے زور سے اُس کے گالوں پر اپنے دانت گاڑ دیئے کہ اُس بدمعاش کا ایک رُخسار کٹ ہی گیا ۔ طیش میں آکر کمانڈر نے پستول سے لیزا کا کام تمام کر دیا ۔ اور اپنا جُرم پوشیدہ رکھنے کے لئے لیزا کی لاش کو کمبل سے لپٹوا کر اُس پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی ۔"

اتنا کہہ کر سوبر خاموش ہو گیا ۔ واسلی خاموشی سے ٹکٹکی باندھے لیزا کے ادھ جلے جسم کی طرف دیکھتا رہا ۔ انّا اب تک سنبھل گئی تھی ۔ وہ اپنے شوہر کے قریب آکر کھڑی ہو گئی ۔ اور اُس کے بالوں میں پیار سے اُنگلیاں چلانے لگی ۔ لیکن واسلی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی ۔ واسلی اب بھی اُسی طرح ٹکٹکی باندھے ہوئے لیزا کے نیم سوختہ جسم کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ معاً واسلی نے محسوس کیا کہ یہ سامنے پڑا ہوا نیم سوختہ ، مسلے ہوئے پھول سا جسم اُس کی عزیز دختر لیزا

کا جسم نہیں ہے۔ یہ تو اُسکی عظیم المرتبت اور ذی وقار ماں ـــــ مادرِ روس کے ہزاروں لاکھوں ضعیف و ناتواں۔ معصُوم و بے گُناہ فرزندوں کی لاش ہے اور واسلی جانتا ہے کہ وُہ کون سا مجسّم شیطان ہے جس نے مادرِ روس کے گھر کے وسیع و عریض صحن کو ایک طُول طویل قبرستان میں تبدیل کر دیا ہے۔

واسلی نے اپنے آپ میں ایک نئے عزم، نئی طاقت اور نئی جلن محسوس کی، وُہ چپ چاپ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے اپنی بیوی کو یہ بھی نہیں بتایا کہ وُہ چُھٹی لے کر آیا ہے۔ ماریا کو پیار کر کے اُس نے انّا کو الوداع کہی اور اُسی وقت خارکوف کے لئے روانہ ہو گیا۔ اُس کے کمانڈر کو دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ واسلی چُھٹی کے پہلے ہی روز خارکوف لوٹ آیا ہے اور اصرار کر رہا ہے کہ اُس کی چُھٹی منسُوخ کر دی جائے۔ جب تک لڑائی جاری ہے اُسے ایک لمحے کی بھی چُھٹی نہیں چاہیئے۔ ۲۹ مہینے تو معمُولی عرصہ ہے اگر لڑائی ۲۹ سال تک بھی جاری رہے تو وُہ زندگی کے آخری سانس تک نازی جرمنیوں کیخلاف ہونیوالی اِس جنگ میں کبھی رُخصت نہ لے گا۔

واسلی اب ایک بدلا ہُوا انسان تھا۔ اُسکی شجاعت اور اولوالعزمی پہلے کی نسبت کئی گُنا بڑھ گئی تھی لیکن اُس پر ایک قسم کا جنُون سوار ہو گیا تھا۔ اُسے لفظ جرمن سے نہائت گہری نفرت ہو گئی تھی۔ کسی جرمن کو مار کر اُس کے دلِ مجرُوح کو گویا ایک قسم کی ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی۔ وُہ پیشتر کی طرح زندہ دل۔ خُوش مزاج اور باتُونی نہ رہا تھا۔ اب وُہ ہمیشہ خاموشی اور سکُون کے ساتھ جنگ کے کسی نہ کسی کام میں مشغُول رہتا۔ لیکن جہاں کسی جرمن کے نام کی بھنک اُس کے کانوں میں پڑتی اُس کا ہاتھ اپنے پستول پر جا پہنچتا۔ اپنی ڈائری میں اُس نے یہ تین فقرے درج کر رکھے تھے۔

(۱) کسی جرمن کے لئے معافی نہیں ہے۔

(۲) کسی جرمن کے لئے رحم نہیں ہے۔

(۳) کسی جرمن کو مارنا بہت بڑا ثواب ہے۔

اور معلوم نہیں رُوسی فوج میں ایسے کتنے واسلی تھے جو انتقام کی دہکتی ہوئی آگ سے ہر وقت شعلہ بداماں رہتے تھے۔ اب واسلی اپنی زندگی کو نسبتاً عزیز سمجھنے لگا تھا۔ دلیر تو اب وُہ پہلے سے بھی زیادہ تھا لیکن پہلے کی طرح موت کے مُنہ میں نہیں کُودتا تھا۔ اب وُہ زندہ رہنا چاہتا تھا اور محض زیادہ سے زیادہ جرمنوں کو مارنے کے لئے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وُہ پولینڈ کی جنگ میں گولی کھا کر زخمی ہو گیا تو اُس کے غم کی انتہا نہ رہی۔ جنگ کے میدان میں اُسے بیہوشی کی حالت میں پایا گیا تھا۔ اسی حالت میں اُسے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ جب اُسے ہوش آیا اور اپنی کمزوری کا علم ہوا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ہسپتال کے ڈاکٹروں اور نرسوں نے واسلی کے شجاعانہ کارنامے سُن رکھے تھے۔ یہ بات اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ واسلی جیسا دلیر شخص زخم کے درد سے رو سکتا ہے لیکن بہت جلد اُنہیں بھی واسلی کے دلی جذبات کا علم ہو گیا۔ زخم کی گہرائی اور قلبی اذیّت دونوں وجوہات سے واسلی کو تیز بخار چڑھ آیا۔ حرارت کی شدّت سے وُہ بڑبڑانے لگا۔ یہ دیکھ کر اس کی نگراں نرس کے تعجّب کی کوئی حد نہ رہی کہ رنج و غم سے مایوس اور مضطرب ہونے والا واسلی بخار کی بیہوشی میں کسی بیفکر انسان کی طرح چہک رہا ہے۔ نرس کے لئے یہ انوکھا تجربہ تھا وہ سُننے لگی۔

"وُہ مارا، واہ میرے یار! میرا نشانہ کتنا درُست ہے۔ گرمی، گرمی کہیں باقی نہیں ہے۔ وولگا کی دھار بھی اب کے خشک ہو گئی ہے۔ کوئی فکر نہیں۔ مَیں اب کے اتنے جرمن ماروں گا کہ اُن کے خُون کی روانی سے وولگا کی دھار میں باڑھ آ جائے گی۔ وُہ مارا! واہ اِن جرمنوں کو مارنا کتنا آسان ہے۔ ایک دو تین، دس بیس تیس، سو دو سو تین سو۔"

"شاباش بہادر و!!!"

واسلی جب صحت مند ہو کر شفاخانے سے نکلا جنگ کا محاذ جرمنی کے فرینک فرٹ شہر تک جا پہنچا تھا۔ رُوسی فوجیں فرینک فرٹ کا محاصرہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور

جرمن عجیب سکتے کی سی حالت میں تھے۔ ہٹلر کا حکم تھا کہ لڑتے لڑتے جان دیدو مگر پیچھے مت ہٹو۔ فرینک فرٹ کے فوجی افسر بخوبی واقف تھے کہ روسیوں کا طوفانی ریلا وہ نہ روک سکیں گے شہر کی حفاظت بھی ناممکن تھی اور پیچھے ہٹنے کی انہیں اجازت نہ تھی۔ وہ شکست تسلیم کرکے صلح کا خیال بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ انہیں حکم تھا کہ اگر کسی جرمن پر شک ہو جائے کہ وہ شکست تسلیم کرکے روسیوں سے صلح کے لئے جا رہا ہے تو اسے گولی مار دو۔ خواہ وہ کیسا ہی اعلیٰ افسر کیوں نہ ہو صرف یہی ممکن تھا کہ وہ جان دے سکتے تھے یا گرفتار ہو سکتے تھے اور جرمن فوجی یہی کر رہے تھے۔ سب سے بڑی مشکل فرینک فرٹ کے شہریوں کو تھی۔ خاص طور پر بچوں۔ ضعیف ناتواں بوڑھوں مردوں اور عورتوں کو۔ شہر چھوڑ کر فرار اختیار کرنے کے لئے اُن کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا اور نہ کوئی وسیلہ ہی تھا شہر کی ایک عمارت سے قلعہ بندی کا کام لیا جا رہا تھا۔ روسی ہوائی جہاز اور روسی ٹینک اور روسی توپیں فرینک فرٹ کی عمارتوں کو زمین دوز کرتے جا رہے تھے۔ واسلی آج ہی صبح اس محاذ پر پہنچا تھا۔ دن بھر وہ اپنی حسرتوں کو خوب شاد کام کرتا رہا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے نہ صرف ہزاروں جرمن دم توڑ رہے تھے بلکہ اُن سے بھی زیادہ تعداد میں شہری فنا کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے۔ فرینک فرٹ کی وہ دُرگت بنادی گئی تھی جو آج تک کسی روسی شہر کی نہ بنائی جا سکی تھی۔ گذشتہ ۴ مہینوں سے واسلی اس چیز کا خواب دیکھتا رہا ہے کہ کب وہ کسی خاص بڑے جرمن شہر کی وہی حالت بنانے کے قابل ہوگا جو حالت جنگ کے آغاز سے جرمن فوجی روسی شہروں کی بناتے آئے ہیں۔ آج اُس نے حقیقی طور پر محسوس کیا کہ فرینک فرٹ کا آتشکدہ اُس کے گاؤں کے آتشکدے سے کئی گنا بڑا ہے۔ شام ہو گئی تھی۔ فرینک فرٹ کی شعلہ بداماں عمارتوں کا مشاہدہ کرنے کے لئے واسلی تن تنہا آگے بڑھ گیا۔ آگ کے یہ مشتعل شعلے اس کے غمگین قلب کو گویا چندن کی ٹھنڈک بخش رہے تھے۔ فرینک فرٹ کا یہ شکستہ اور جلتا ہوا محلہ پوری طرح ویران پڑا تھا۔ دفعتاً قریب ہی سے کسی کمزور جاندار کے رونے کی دردناک آواز واسلی کو سنائی دی۔ شعلوں کی دھوں دھوں آواز آ رہی تھی۔ یہ

آواز بہت دھیمی دھیمی تھی۔ لیکن اسمیں جو درد تھا وہ اسے مضطرب کر رہا تھا۔ واسلی کا دل ایک بار کانپ اُٹھا۔ وُہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ یہ کس جاندار کی آواز ہے۔ واسلی نے بغور سُنا تو قریب کی جلتی ہوئی عمارت کے تہہ خانے سے آواز آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اُس نے سوچا کہ شاید یہ دُشمن کا فریب ہو۔ اپنے پستول پر ہاتھ رکھ کر وُہ آہستہ سے تہہ خانے میں اُتر گیا۔ اِرد گرد کے دہکتے ہوئے مکانات کی روشنی سے تہہ خانہ روشن تھا۔ ایک جرمن دوشیزہ مری پڑی تھی اور اُس کے سینے سے لپٹی ہُوئی ڈھائی تین سال کی پھُول کی سی شگفتہ بچّی نہ جانے کب سے چِلّا رہی تھی۔ لمحہ بھر اُدھر دیکھنے کے بعد بے اختیار ہو کر واسلی نے اُس معصوم بچّی کو گود میں اُٹھا لیا۔ بچی روتے روتے مایوس ہو چکی تھی۔ واسلی کی گود میں پہنچتے ہی اُس کا رونا تو بند ہو گیا لیکن گھنٹوں روتے رہنے کے بعد ردِّ عمل کے طور پر اب وُہ رہ رہ کر اور بھی دردناک سسکیاں بھرنے لگی۔

تہہ خانے میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ واسلی اُس لڑکی کو گود میں لے کر باہر چلا آیا۔ باہر آتے ہی اُسکو خیال آیا کہ میں تو فرنٹ میں ہُوں۔ یہ دُشمن کا پہلا شہر ہے جسے تباہ کیا جا رہا ہے۔ اپنی زندگی کا یہ پہلا دن ہے جب میں نازی وحشیوں کا یہ قلعہ اُکھاڑ پھینکنے کا نیک کام کر رہا ہوں اور یہ چمگادڑ کی طرح چیں چیں کرنے والی لڑکی ایک جرمن لڑکی ہے جسے میں ناحق اُٹھا لایا ہوں۔ واسلی نے اُس لڑکی کو غصّے کی نگاہ سے دیکھنا چاہا لیکن کوشش کرنے کے باوجود وُہ یُوں نہ ہو سکا۔ لڑکی کا سسکنا اب بند ہو چکا تھا۔ واسلی کو اپنی طرف تاکتا دیکھ کر وُہ دھیمی آواز سے بولی۔ "پاپا!" اور ساتھ ہی وُہ بیحد معصوم اور خوشگوار انداز سے مسکرا اُٹھی۔ واسلی نے جنگ کے زمانے میں ہم ہم بیہودی تک، ایک مرتبہ بھی ایسی پاک اور معصوم مسکراہٹ نہ دیکھی تھی۔ اُسے یاد آیا۔ آج سے پُورے چار سال قبل جب وُہ فوج میں داخل ہوا تھا ماریا کی ٹھیک یہی عُمر تھی اور وُہ بالکل اسی انداز سے مسکرایا کرتی تھی۔ ماریا کی یاد کے ساتھ ہی اُسے اپنی عزیز بیٹی لیزا کی یاد بھی آ گئی۔ ایک جرمن درندے کے

بیدردی سے اُس بے گناہ اور نیک لڑکی کی جان لے لی ——— اور یہ بچی بھی تو کسی جرمن ہی کی لڑکی ہے ۔ واسلی بیتاب ہوگیا - اُس نے چاہا کہ اپنے اندرونی جذبۂ انتقام کو بیدار کرے اور اپنے آپ کو بیدرد اور ظالم حیوان کے روپ میں منتقل کرے - ایک ایسا بیدرد حیوان جو اس ننھی بچی کے اگر ٹکڑے ٹکڑے نہ کر سکے تو کم از کم اُس شیطان جرمن کی طرح اس لڑکی کو جرمن مکانوں کی مشتعل آگ میں تو پھینک سکے - بچی ایک مرتبہ پھر سے محبت آمیز لہجہ میں بولی ——— "پاپا !" لمحہ بھر خاموش رہ کر تتلی زبان میں اُس نے کہا - "مجھے بھوک لگی ہے پاپا !"

واسلی نے محسوس کیا کہ وہ کمزوری کا شکار ہو رہا ہے - اپنی فوجی قوتوں کو مکمل طور پر مجتمع کرکے اُس نے چاہا کہ اگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تو کم از کم اُس بچی کو وہیں چھوڑ تو دے - جبراً اپنے چہرے کے نقوش خوفناک بنا کر واسلی نے بچی کو اپنے سینے سے دور کرنے کی کوشش کی لیکن شاید وہ غلطی سے واسلی کو اپنا حقیقی پاپا سمجھ بیٹھی تھی - ممکن ہے اُس کا باپ کہیں جرمن فوج میں ہوگا اور بڑے محبت آمیز لہجہ میں بولی ——— "پاپا ! پاپا !!" واسلی نے پھر بھی کوئی پرواہ نہ کی - اُس ننھی سی بچی کو ایک جھٹکے سے اُس نے اپنے سینے سے دور کر دیا اور اُس سنسان سڑک پر تنہا چھوڑ کر تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا - بچی ایک لمحے کے لئے سہم تو گئی - لیکن اُس کے بعد اُسکی رہی سہی ضعیف ذہانت نے اُسے سنبھال لیا - "پاپا ! پاپا !!" چلاتی ہوئی وہ بھی جہاں تک بن سکا تیزی سے واسلی کے پیچھے دوڑی - تھوڑے ہی فاصلے پر ایک موڑ تھا - واسلی وہاں پہنچ کر ایک شکستہ دیوار کے عقب میں چھپ گیا - وہاں سے اُس نے پُشت کی سمت دیکھا - بچی تھوڑی دور تک دوڑی - اس کے بعد یک لخت مایوس ہو کر جلتی ہوئی سڑک کے درمیان بیٹھ گئی اور اس خوفناک رات کے سناٹے میں وہ کمسن بچی دل ہلا دینے والے لہجے میں مسلسل چلانے لگی -

"پاپا ! پاپا !! پاپا !!!"

آخرکار واسلی مجبور سا ہوگیا۔ ایک کمسن بچّی نے غلطی سے اُسے اپنا باپ سمجھ لیا ہے اُس کے نہ ماں باپ ہیں اور نہ کوئی عزیز ——— نہ جانے اُس نے کب سے نہ تو کھانا کھایا ہے اور نہ پانی پیا ہے۔ مگر یہ سب کچھ بھول کر وہ صرف اپنے فرضی پاپا کو پکارے جا رہی ہے۔ عقب سے نکل کر واسلی تیزی کے ساتھ واپس لوٹا اور اُس معصوم بچّی کو اس قدر محبّت سے اپنے سینے سے لگایا جیسے حقیقتاً وہ اپنی ہی بیٹی سے مل رہا ہے۔

برلن میں رُوسی فوجیں داخل ہوگئیں۔ جرمنوں نے شکست تسلیم کرلی۔ ہٹلر اور اُس کے سارے نازی ساتھی رُوپوش ہوگئے۔ ہر طرف فتح کے شادیانے بجنے لگے۔

جب واسلی اپنے گھر واپس آیا تو دس سال کی لیزا کی جگہ تین سال کی ایک جرمن لڑکی کو اپنے ساتھ لیتا آیا۔

وہ لوگوں سے اب یہی کہتا تھا میری لیزا

میری پیاری لیزا رُوپ بدل کر واپس آگئی ہے۔

درشن کمار بھولا

ہنسی کی موت

شادی کے بعد جب کملا میکے واپس آئی تو اُس کی سہیلیوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سب حیرت اور شش و پنج میں پڑ گئیں کہ چند دنوں میں یہ تبدیلی اُسمیں کیسے ہو گئی؟ اُس کا سانولا چہرہ جیسے گلاب کی طرح کھِل اُٹھا تھا۔ اُسکی سیدھی سادھی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں عجیب سے چراغ جل اُٹھے تھے۔ اُس کے تیکھے رنگین ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ رقصاں تھی

شیلا سے اُسکی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ وُہ رشک آمیز لہجے میں بولی۔

"ہائے کیا روپ اُتارا ہے اِس ناگن نے۔ نظر بھر دیکھنا بھی محال ہو رہا ہے۔۔۔ !"

کملا نیچی نظروں سے مُسکرا دی۔ شیلا اُس کے قریب جُھک کر شرارت سے بولی۔

"ذرا غور سے دیکھنا۔ ابھی یہ اُٹھ کر پاگلوں کی طرح ناچنے لگی تھی۔۔۔ !"

"کیوں۔۔۔ ؟" سب کی جیسے چیخیں نِکل گئیں۔

کملا بھی ایکدم گھبرائی ہوئی چونک پڑی۔ وہ ذرا بناوٹی غُصّہ آنکھوں میں اُتار کر شیلا کو دیکھنے لگی۔

شیلا کچھ آگے بڑھ کر سب کو سُنانے لگی۔

"جانتی ہو اِس سہاگن کو کیا خاوند مِلا ہے۔۔۔ اُخ! ۔۔۔ سسرال والوں نے کیسے

چمن کو بیچارے کا نام رکھا ہے ــــ سُنا ہوگا تم نے ــــ ترکمان ہیرالال جی ـ باپ کا نام ہے شری پنالال جی ــــ پُورا خاندان ہے بیا جوہری کی دُکان ــــ ذرا اس کی طرف بھی دیکھو کیسی آنکھ جھپکتے ہی کملا سے "کنچن بالا" بن گئی ہے ــــ!"

اس کی جلی کٹی باتیں سُنکر کملا کو چپ رہنا پڑا۔ ورنہ کوئی اور موقعہ ہوتا تو وُہ ضرور اس کو ایسا منظر دِکھاتی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ وہ ذرا سنجیدہ ہو کر بولی۔

"مطلب کی بات کرو ــــ!"

"اچھا تو پھر بتاؤ اِن دِنوں تمہارے تن بدن پر کیا کچھ بیتی۔ ذرا احتیاطاً ہمیں بھی بتا دو یہ ڈھیر سا گُلابی رنگ کہاں سے چُرالائی ہو۔ تمہارے پر تو نظر ٹھہرانا مشکل ہو رہا ہے۔ کیا کرتی رہی ہو وہاں ــــ پھر اس کا ہاتھ کھینچ کر دکھاتے ہوئے ــــ ابھی تک تو بیچاری کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں اُتری ــــ!"

"کیا بکواس کرتی ہو۔" کملا نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔

"اب بس بھی کرو، چھوڑو۔ بیچاری کو بہت ہو چکا مجاق۔" ایک نے دبی زبان میں چٹکی لی۔

"کیوں، تمہیں بھی درد ہو رہا ہے کیا ــــ!"

"اری اب چپ بھی کریگی یا یونہی جائیگی۔ دیکھتی نہیں ساتھ کے کمرے میں وُہ بیٹھے ہیں۔ کیا سوچیں گے وُہ دل میں کہ کیسی بدمعاش لڑکیاں ہیں یہ ــــ!"

کملا دبی آواز میں قریب قریب چیخ کر بولی۔

"وہ سے تمہاری مُراد کیا۔ . . . ."

"ترکمان ہیرالال جی مہاراج سے ہی ہے ــ کیوں ــ!"

اتنا کہہ چکنے کے بعد وُہ کملا کے اُوپر جھک کر اس کے کان میں پھسپھسانے لگی۔ سب ایک ٹک اُسی طرف دیکھنے لگیں۔

"میں نہیں جانتی تیری اس بکواس کا مطلب کیا ہے۔" کملا قدرے غُصّے میں بولی۔

"اچھا ذرا غور سے سُنو۔" کہہ کر شکیلا اُس کے کان میں سمجھانے لگی۔
اُس کے انگارے کی طرح چلتے ہوئے لبوں کی طرف دیکھ کر اُس کی رازدارانہ بات کا سب مُدعا سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔
"کیا کہا۔؟!" حیرت سے وُہ چیخ پڑی۔
"نہیں سمجھی۔!"
"تمہارا مطلب۔؟"
"میرا مطلب۔ میرا مطلب۔۔۔۔۔ کہہ کر وُہ پھر پھُسپھانے لگی۔
سُنکر کملا کا چہرہ حیرت سے فق ہو گیا۔ شیلا کی غلاظت گندی بات اُس کی رُوح تک کو چیر گئی۔ پھر ایکدم اُس کے چہرے پر شرم و حیا کی سُرخی دوڑ گئی۔
پھر وُہ جواب دیئے بغیر دیئے اُٹھ کر بھاگ گئی۔
شام کو خاوند کے واپس جانے سے کملا کا دل اُداس ہو گیا۔ اُس کی رخصتی کے وقت وُہ کمرے سے باہر تک نہ نکلی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد آخر وُہ نامراد لوٹ گیا۔
رات کو سونے کیوقت کملا کو گُم سُم پاکر شیلا اُس کے بستر پر آدھمکی اور اُسے چھیڑنے لگی۔
"اِس حالت میں کیا تمہیں نیند آ جائے گی۔"
کملا ایکدم غُصّے میں جل کر بولی۔
"تُو بہت زیادہ بکواس کرنے لگی ہے۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں۔!"
شیلا اُس سے بُری طرح چمٹ کر اُسے منانے لگی۔
"اوہ! ناراض ہو گئی کمّو رانی۔!"
"بس۔ بس زیادہ نخرے نہ کرو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ جاؤ تم۔!"
اور وُہ کروٹ بدل کر سونے کا سوانگ کرنے لگی۔
"بس ایک بات اور بتا دو۔؟"

وہ اُسے اپنی طرف کھینچ کر بولی۔

"ورنہ دفع ہوتی ہو یا دوں ایک ــــ!"

وہ ہاتھ تان کر بولی۔

"او مائی ڈارلنگ! غصّہ چھوڑو اور میری طرف دیکھو۔ سچ بتاؤ کیا اُن کے جانے کا تمہیں رنج ہوا ہے۔ دِل میں کچھ درد تو نہیں ہو رہا ــ؟"

"ہو رہا ہے تمہیں کیا ــ!" وہ منہ بنا کر بولی۔

"شام کو جب وہ جا رہے تھے تو تم اُن سے ملی کیوں نہیں؟"

"نہیں ملی نہیں کیا ــ جاؤ بھاگو یہاں سے ــ!"

"کتنا پھوہڑ پن کا ثبوت دیا تم نے شام کو ــ اگر مل لیتی تو کیا ہو جاتا ــ!"

"تو اپنی بکواس بند کرے گی یا بلاؤں چاچی کو ــــ قسم سے تو نے میری جان کھا لی ہے۔

"کیا بیہودہ سوال پوچھ رہی ہے جن کا نہ سر ہے نہ پیر ــ!"

"سچ بتاؤ ــ کیا واقعی وہ تمہیں پسند کرتے ہیں ــ؟"

"کرتے ہیں یا نہیں کرتے ہیں تمہارے پیٹ میں کیوں درد ہو رہا ہے۔ جب تمہارا بیاہ ہوگا تو دیکھ لینا تمہارا خاوند کیسے تم کو شیشے میں اُتارتا ہے ــــ! اب زیادہ بکواس نہ کرو اور اُٹھ کر چلی جاؤ ورنہ دھکے دے کر باہر نکال دُوں گی ــــ!"

"اچھا ایک جاتے جاتے دے دو۔!"

"کیا ــــ؟"

"یہ میری جان ــــ!" اور بڑھ کر اُس نے اُس کے گلابی گال کو کاٹ کھایا اور بھاگ کھڑی ہوئی۔

کملا مُنہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

یُوں تو شیلا اور کملا آپس میں سگی بہنیں تھیں مگر اُن کا پیار اور نقرے بازی اِس رشتے

کوکب کا نیاگ چپکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بہنوں سے بڑھ کر دوست اور رفیق سمجھتی تھیں۔ چوری چوری وہ زندگی کی ڈھکی چھپی...... باتوں پر رائے زنی کیا کرتی تھیں۔ دونوں کی عمروں میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ میٹرک پاس کیا تھا۔ اس کے بعد ان کے ماں باپ نے ان کو آگے نہیں پڑھایا اور ان کے بیاہ کی فکر میں کوئی اچھا گھر تلاش کرنے لگے۔ اس دوڑ دھوپ میں اچانک شیلا پر ٹائیفائیڈ نے ایسا حملہ کیا کہ بیچاری مرتے مرتے بچی۔ اس چند دن کی بھیانک بیماری نے اس کے شباب کو گھن کی طرح چاٹ لیا تھا۔ جب وہ بیماری سے اٹھی تو اس کی جوانی بیماری کی سلوٹوں میں کہیں دفن ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ اتنا اترا ہوا اور کمزور نظر آنے لگا کہ وہ آئینے کے سامنے جاتی ہوئی گھبراتی تھی۔

اسی دوران کملا کی منگنی ایک جگہ طے ہو گئی اور کچھ ہی دنوں میں شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ شیلا کے لئے انہوں نے انتہائی بھاگ دوڑ کی مگر نتیجہ مایوس کن ثابت ہوا۔ کیونکہ لڑکے والے رشتہ کرنے سے پہلے لڑکی کو دیکھنے کے خواہشمند تھے۔

آخر جب کملا کے بیاہ میں کچھ ہی دن رہ گئے تو ایک جگہ شیلا کی بات بھی پکی ہو گئی۔ اس چھوٹی سی خبر نے سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ شیلا کو اس منگنی کی بہت خوشی ہوئی۔ جب پہلی بار اس نے یہ خبر سنی تو وہ یہ عظیم خوشی برداشت نہ کر سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کملا اس کی یہ حالت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پھر وہ اسے سینے سے لگا کر دلاسے دینے لگی ـــ

شادی میں کافی چہل پہل رہی۔ کملا کی سہیلیوں نے اسے بڑھ چڑھ کر تحفے پیش کئے۔ شیلا اس ساری چہل پہل میں تتلی کی طرح رنگین بھڑکیلے کپڑے زیب تن کئے چہکتی پھری۔

اس نے جی بھر کر کملا کو ستایا۔ جب برات آئی تو دروازے پر ہی اس کے خاوند کو روک کر ایسی ایسی گندی اور بیہودہ باتیں سنائیں کہ بیچارہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ حقیقت

میں وُہ دُبلا پتلا اور انتہائی شرمیلا لڑکا تھا۔ سب نے مِل کر اُسے ایسا اُلّو بنایا کہ اس کے دار خطا ہو گئے بار بار جھینپ کر وُہ بغلیں جھانکنے لگتا۔

جب رُخصتی کا وقت آیا تو کملا روہانسا مُنہ بنا کر شیلا سے لپٹ گئی۔ پھر سسکیاں بھرتی ہوئی اُس سے معافی چاہی۔

اُس کی رقت آمیز آواز سُن کر شیلا کا بھی گلا بھر گیا۔ مگر جھٹ وُہ اپنے پر قابُو پا کر طنزیہ انداز میں کہہ اُٹھی۔

"یہ جھوٹ مُوٹ کے آنسوؤں کو پونچھ لو اور چُپ چاپ جا کر ڈولی میں بیٹھ جاؤ — ذرا پکڑو تو اسے یہ تو ابھی سے دوہری ہوئی جا رہی ہے —!"

اُسکو سہیلیوں کے حوالے کر کے وُہ اکیلے کمرے میں جا کر خُوب پھُوٹ پھُوٹ کر رو دی۔ جب دل کا غبار چھٹ گیا تو پچھلے دروازے سے نِکل کر اُوپر چھت پر چلی گئی اور سارا نظارہ وہیں کھڑے ہو کر دیکھا۔ نیچے آنے کی اُسے ہمّت نہ ہوئی۔

اِس موقعہ پر شیلا کا منگیتر اور ساس بھی حاضر تھے۔ اُن کو دیکھ کر اُس کے نیچے جاتے ہوئے قدم تھرانے لگے۔ اپنے ہونے والے خاوند کو اس چہل پہل میں موجود پا کر شیلا کا دِل عجیب سی سہانی خوشی سے بھر گیا۔ اُس کے مضبوط کسرتی جسم کو دیکھ کر اُس کی اُمنگوں کی جھجک بڑھ گئی۔ اُس کی چوڑی چکلی پیٹھ کی طرف بڑی مُشتاق نظروں سے دیکھتی ہوئی وُہ اُن اکیلی تنہا راہوں پر جا نکلی۔ جہاں اُس کے تصوّر کا محبُوب کب سے کھڑا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ وُہ بھاگتی ہوئی اُس کے کھُلے بازوؤں میں جا گِری اور اُس کے سینے پر سر رکھ کر سِسکنے لگی۔

نیچے صحن سے دو تین سہیلیوں نے اُسے اُوپر چھت پر دیکھ کر آوازیں کسیں۔ وُہ شرما کر پیچھے ہٹ گئی اور دیوار کی آڑ سے اپنے منگیتر کی طرف دیکھتی رہی۔

شادی میں ابھی چار پانچ دِن باقی تھے —— کہ ایک روز شیلا کی ساس بمعہ اپنے صاحب زادے کے بغیر کسی کو اطلاع کئے آن دھمکیں۔ اُن کے صاحبزادے کو چند دوستوں نے

بھکا دیا تھا کہ لڑکی دِق کی مریضہ ہے۔ اُسی شک کو مٹانے کے لئے وُہ بیٹے کو ساتھ لیکر آ پہنچی۔

اُن کی طرزِ گفتگو کا اندازہ ایکدم بدلا ہُوا تھا۔ اُنہوں نے صاف ہی کہہ دیا کہ لڑکے کو شک ہو گیا ہے وُہ لڑکی کو دیکھے بنا ہرگز شادی نہیں کرے گا۔

یہ سُنکر شیلا کے ماں باپ ہکّے بکّے رہ گئے۔

یہ صحیح تھا کہ گذشتہ بیماری نے شیلا کے جسم کی ساری جوانی اور ساری خُوبصورتی کو جونک بن کر چُوس لیا تھا۔ اُس کا کمزور چہرہ دیکھ کر اب بھی ایسا محسُوس ہوتا تھا جیسے وُہ مستقل طور پر بیمار ہے۔ جیسے کوئی پُراسرار بیماری اُسے کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرتی جا رہی ہے۔

ماں بیٹے کی یہ شرط سُنکر شیلا کے ماں باپ تذبذب میں پڑ گئے۔ وُہ کیا کریں۔ کیا نہ کریں یہی سوچتے رہ گئے۔ یہ بھنک ہوا کے پروں پر تیرتی ہوئی کسی طرح کملا اور شیلا کے بھی کانوں میں پڑ گئی۔ شیلا تو سُنکر خزاں رسیدہ شاخ کی طرح ٹُوٹ کر گر پڑی۔ کملا نے ہمت نہیں ہاری وُہ جلدی جلدی کچھ سوچنے لگی۔ پھر وُہ اُٹھ کر ماں باپ کے کان میں کچھ کہہ آئی۔ وُہ لڑکی دکھانے کے لئے راضی ہو گئے۔ آکر اُس نے بڑے پیار اور احتیاط سے شیلا کو سجایا۔ سنوارا اور پھر اُس کو تھامے ہوئے وُہ بڑے کمرے میں لے گئی۔

وُہ نیچی نظریں کئے اُن کے پاس جاکر بیٹھ گئی۔

اُس کے منگیتر نے ایک بار نظر بھر کر اُسکی طرف دیکھا۔ اتنی دیر میں جیسے اُس نے اُس کے تمام وجود کو کھنگال کر باہر پھینک دیا۔ اس کے بعد اُس کی طرف دیکھنا اُس نے گوارا تک نہ کیا۔

اُس کی ماں بیٹے کے اِس انداز کو فوراً سمجھ گئی۔

پھر وُہ کچھ بھی کہے بنا چلے گئے۔

تیسرے دن لڑکے والوں نے اپنا آخری فیصلہ بھجوا دیا اور رشتہ ٹوٹ گیا۔

کملا کو یُوں محسوس ہُوا جیسے ہنسی کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔ شوخی کی بانہیں کاٹ دی گئی ہوں برسات کی جل تھل کرتی بدلی کا سارا پانی اندر ہی اندر کسی نے نچوڑ لیا ہو۔

بلدیو سنگھ آزاد

ور کی تلاش

پورے تین دن بعد بابو کرشن دیو جوشی اُداس اُداس گھر میں داخل ہوا۔ صحن میں کھیلتے ہوئے بچے اُسے دیکھ کر "پتاجی، پتاجی" چلا اُٹھے اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔

جوشی نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھیلا اُن کے حوالے کر دیا۔ بچے اندر کمرے کی طرف دوڑے۔ یہاں اُن کی ماں چارپائی پر بیٹھی ننھے گگو کے مُنہ میں چھاتی دیئے اُسے تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

صحن کے مشرقی کونے میں جوشی کی لڑکی کیلاش انگیٹھی سُلگا رہی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ صحن میں لگے ہوئے جامن کے درخت کی شاخوں سے بچتی بچاتی سُورج کی زرد کرنیں سامنے دیوار سے ٹکرا رہی تھیں۔ جن کا عکس کیلاش کے معصوم چہرے پر پڑ رہا تھا۔ اور وہ کسی کہنہ مشق مصوّر کی حسین ترین تخلیق معلوم ہوتی تھی۔

اندر سے بچے اپنے حصّے کی ریوڑھیاں لے کر چلاتے ہوئے باہر کی طرف دوڑے تو جوشی بوجھل قدموں سے اندر گیا۔

گندمی رنگ پر ہلکی ہلکی جھرّیاں، چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک چڑھائے، گنجی چندیا، کنپٹیوں پر سفید بال۔ چالیس، پنتالیس سال کا جوشی چہرے

پر تین دن کی ناکام جدّو جہد کے آثار لئے کمرے میں داخل ہُوا تو جیسے پارو کو دھچکا سا لگا۔ اس نے جلدی سے گُگو کے مُنہ سے چھاتی نکال کر انگیا میں اڑس لی اور اپنے ننگے پیٹ کو پھٹے ہوئے قمیص سے ڈھانپتے ہوئے بولی۔

"کیوں ؟"

"بڑی مُشکل ہے۔"

جوشی اس طرح بولا جیسے اُسے بولنے میں دُکھ ہوتا ہو۔

پینتیس چھتیس سال کی پارو جو عالمِ شباب میں بیحد حسین تھی اور جس کے جسم کے زاویوں اور گولائیوں میں بڑی کشش اور جاذبیت تھی، اب اپنے جسم سے نو بچّوں کو جنم دینے کے بعد کسی انجان مصوّر کی نامکمّل تصویر معلوم ہوتی تھی جس میں زردی ہی زردی تھی۔ وہ اُداس اُداس نگاہوں سے اپنے پتی کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ جیسے اس کے دِل کی بات جاننے کی سعی کر رہی ہو۔

دفعتاً وہ پکار اُٹھی۔ "کیلاش !"

کیلاش چائے کی پیالی اُٹھائے اندر آ رہی تھی۔ بہت دھیرے سے بولی۔

"جی"

جوشی نے پارو کو اور پارو نے جوشی کو دیکھا۔ دونوں نے ایک ساتھ سوچا ــ "کتنی سیانی ہے۔ کتنی سُگھڑ۔"

"بیٹی جلدی سے روٹی بنا لے۔ بھوک لگی ہوگی تیرے پتاجی کو۔" پارو نے کہا تو کیلاش سر کو ہلکا سا خم دیتی ہوئی دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی ہوئی باہر چلی گئی۔

جوشی نے چائے کا گھونٹ بھرا تو پارو بولی۔ "سیتا کے ہاں گئے تھے ؟"

"سب سے پہلے وہاں ہی گیا تھا۔" جوشی نے جواب دیا۔ "اُس نے جو لڑکا بتایا اُسے دیکھنے بھی چلا گیا۔" وہ چائے کا گھونٹ بھرنے کے لئے خاموش ہو گیا۔

"کیسا ہے لڑکا؟" پارو نے پُوچھا۔

"لڑکا خوبصورت ہے۔ ملازم بھی ہے لیکن جہیز بہت زیادہ مانگتے ہیں۔"

"کتنا؟" جہیز کے نام پر پارو قدرے اُداس ہو گئی۔

"اتنا کہ اپنا یہ مکان بیچ دو، اور تمہارے دو تین گہنے مِلا کر بھی پُورا نہ ہو۔"

مصّور کی نامکمّل زرد تصویر اور بھی زیادہ زرد ہو گئی۔ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولی۔

"بیٹیاں بُری بلا ہیں ربّا!"

کیلاش کی عمر بھی کوئی زیادہ نہ تھی۔ یہی کوئی تیرہ چودہ سال کی ہوگی۔ بھولی بھالی حسین سی لڑکی۔ متناسب جسم جس پر اس کی ماں کے کپڑے فٹ آجاتے تھے۔ بولتی بھی تو دھیرے سے، جیسے اُونچا بولنے میں پھُول سے ہونٹوں کے ٹُوٹنے کا خدشہ ہو۔ چلتی تو یوں آہستہ آہستہ جیسے اس رفتار کے گھٹنے بڑھنے سے دھرتی کو دُکھ ہوگا۔ اتنی خاموش اور دھیمی مزاج کہ جوشی کو کبھی محسوس نہ ہُوا تھا کہ گھر میں جوان بیٹی ہے۔

تین دن پہلے سویرے ہی جب چوکیدار نے اُسے بتایا کہ رات کیلاش جگدیش سے چھُپ چھُپ کر دھیرے دھیرے باتیں کر رہی تھی تب اسے احساس ہُوا کہ وُہ ایک جوان بیٹی کا باپ ہے۔

چوکیدار نے یہ بات بڑے رازدارانہ طور پر کہی تھی۔ "بابُوجی! میں بھی بیٹی والا ہوں۔ بات پھیلنے سے بدنامی ہوتی ہے۔ کہیں دیکھ بھال کر بیٹی کا رِشتہ کر دو!"

جوشی کا سر شرم سے جُھک گیا تھا اور۔

اُسی روز سے ایک ہفتے کی چھُٹی لے کر وُہ بیٹی کے لئے بَر کی تلاش میں تھا۔ مگر لڑکے والے یُوں بات کرتے جیسے کوئی بڑی قیمتی شے فروخت کر رہے ہوں۔

جوشی کے حالات ایسے نہ تھے کہ وُہ کیلاش کے لئے مُنہ مانگی قیمت ادا کر کے داماد خرید سکتا۔ وُہ نو بچوں کا باپ تھا۔ سب سے بڑی دو لڑکیاں بیاہ کے بعد اپنے اپنے گھروں میں

تھیں۔ جن کی شادیوں پر اُٹھایا ہُوا قرضہ ابھی تک اس کے سر تھا۔ کیلاش سے چھوٹی تین اور لڑکیاں تھیں اور سب سے چھوٹے تین لڑکے تھے۔

جوشی ایک سرکاری دفتر میں اسسٹنٹ تھا۔ سوا دو سو روپیہ تنخواہ اور اتنا بڑا کنبہ۔ یہی وجہ تھی کہ تین دن تک تین چار جگہ کی خاک چھان کر وہ مایوس ہو گیا تھا۔ اُسے احساس ہو گیا تھا کہ جہاں بھی جاؤ لڑکوں کی منڈی لگی ہو گی۔ اور منڈی کے بھاؤ تک اس کی پہنچ نہ تھی۔

وہ چائے کی پیالی پیتا ہُوا یہ سوچ رہا تھا کہ سوکھے ٹکڑے کھا کر اور ماں کا اُتارا پہن کر بھی چھوکریاں عشق کیسے کرنے لگتی ہیں۔ اس نے اپنے ماضی کی طرف نگاہ دوڑائی۔ اس کی مصروف زندگی میں ایک کوئی بھی لمحہ نہ تھا جب وہ کسی چھوکری سے رات کی تاریکی میں چھپ کر ملا ہو۔ میٹرک پاس کرتے ہی اس کی شادی ہو گئی۔ پھر بچوں کا تانا بانا بندھ گیا۔

اسے کیلاش پر بہت غصّہ آیا۔ "آخر یہ تو سوچ لیا ہوتا کہ عشق بھوکے پیٹ اور ننگے تن رہنے والوں کا کھیل نہیں۔ یہ تو امیروں کے چوچلے ہیں۔ مایا کے کھیل۔"

"سنتے ہو!" اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ پارو نے پھر سے چھاتی ککو کے مُنہ میں دے دی اور بولی۔ "ایک بات کہوں؟"

جوشی نے موٹے موٹے شیشوں والی عینک اُتاری اور اپنے قمیض سے شیشے صاف کرتا ہُوا بولا۔ "کہو!"

"جگدیش بھی اپنا ہی تو لڑکا ہے۔ اگر یہاں ہی کر دیں تو......"

پارو نے اپنی بات کا ردِّ عمل دیکھنے کے لئے جوشی کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

جوشی نے عینک پھر سے آنکھوں پر جمالی اور ایک ٹک پارو کو دیکھنے لگا۔ زرد چہرے پر ممتا کی بیشمار بکھری ہوئی لکیریں جوشی کے چہرے پر سے منظوری کے آثار ڈھونڈ رہی تھیں۔

جوشی کا دل چاہا کہ بڑھ کر پارو کا مُنہ چوم لے۔ لیکن بچّوں کا خیال آڑے آگیا۔ بولا۔

"میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ وہ بھی اپنا ہی لڑکا ہے۔ خوبصورت ہے۔ ملازم بھی ہے۔ شریف ہے اور پھر دونوں ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے ہیں۔"

جگدیش خوبصورت تھا۔ جوشی کے دفتر میں ہی کلرک تھا۔ جوشی کی ہی کوششوں سے وہ کلرک لگا تھا۔ جگدیش کا باپ رام نرائن جوشی کا بہت دوست تھا۔ بلکہ دونوں کے تعلقات بھائیوں جیسے تھے۔ ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔

جگدیش کے ذکر پر بہت سی خوشگوار یادیں جوشی کے ذہن کے نہاں خانوں سے نکل کر اس کے سامنے آگئیں۔

جب کیلاش پیدا ہوئی تھی تو جگدیش کی عمر پانچ سال کی تھی۔ اس وقت بابو رام نرائن نے کہا تھا۔ "بھئی کشن! میں تو اس گڑیا کو اپنے جگدیش سے بیاہوں گا۔"

جوشی نے جب ہنستے ہوئے ہاں کہا تھا تو دونوں اس طرح گلے ملے تھے جیسے یہ رشتہ پکا ہو گیا ہو۔ کئی سال پہلے رام نرائن دل کے دورے کی وجہ سے سُرگباش ہو گیا تھا۔ اس وقت جگدیش کی عمر بڑی مشکل سے تیرہ چودہ سال کی تھی۔ جوشی نے ہر طرح انہیں دلاسا دیا۔ جگدیش کے اور کوئی بہن بھائی نہ تھا۔ بوڑھی ماں تھی۔ اُن کے حالات اچھے تھے۔

جگدیش بالکل اپنے باپ جیسا تھا۔ خاموش طبع اور باوقار شخصیت کا مالک۔ کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ دفتر میں محنتی کلرکوں میں سے تھا۔ دفتر کے وقت کے بعد زیادہ تر وقت وہ کتابوں کے مطالعے میں صرف کرتا تھا۔

جگدیش کی ماں سوماں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تو اب بھی اُن تعلقات کو جو برسوں پہلے دو کلرکوں کے درمیان استوار ہوئے تھے نبھائے جا رہی تھی۔ ابھی دو ماہ گذرے جوشی کی بڑی لڑکی کرشنا کے لڑکا پیدا ہو کر پرلوک سدھار گیا تھا۔ اُن دنوں سوماں بیمار تھی۔ باوجود منع کرنے کے وہ ماتم پرسی کرنے کے لئے گئی تھی۔

"میرا دوہترا مر گیا۔" بخار میں تپتے ہوئے وہ رو کر بولی۔ "تم کون ہو مجھے روکنے والے۔"

سوماں اب بھی بیمار تھی۔ جگدیش جب دفتر چلا جاتا تو کیلاش اس کے پاس چلی جاتی۔ دوا پلاتی۔ سر دباتی۔ سر میں گھی ڈالتی۔ بہت سیوا کرتی تھی اس کی۔ سوماں بھی کئی بار بخار کی حالت میں اسے گلے لگا کر پیار کرتی۔ کہتی۔ "بیٹی! تمہارا لیکھا میں کہاں دوں گی؟"

یہ سب سوچ کر بابو جوشی کو قدرے اطمینان ہوا۔

"ابھی جاؤ سوماں بہن کے ہاں۔" جوشی نے پارد سے پوچھا۔

پارد کے چہرے پر نہ جانے کہاں سے خون دمک پڑا۔ اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "نہیں سویرے جانا۔ شام کی بات اچھی نہیں ہوتی۔"

اس رات جوشی کو بہت گہری نیند آئی کیونکہ تین دن پہلے تفکرات نے اسے بہت پریشان کر رکھا تھا۔

دوسرے دن سویرے ہی وہ جگدیش کے گھر چلا گیا۔ سوماں چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی اور پاس ہی جگدیش کرسی پر بیٹھا تھا۔ سامنے تپائی پر چائے کی پیالی پڑی تھی اور گھٹنوں پر کوئی کتاب رکھے پڑھ رہا تھا۔

سفید کھدّر کے کرتے پاجامے میں ملبوس انیس بیس سال کا جگدیش جوشی کو بہت اچھا لگا۔ گورے چٹے گول چہرے پر شباب کی لالی۔ لڑکیوں کی طرح حجاب کے پردوں میں لپٹی ہوئی آنکھیں — پتلے پتلے خوبصورت ہونٹ —

"کتنی اچھی رہے گی یہ جوڑی۔" جوشی نے دل میں کہا اور سوماں کو نمستے کہہ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے بہن؟"

"بس ٹھیک ہے بھائی!" سوماں دھیرے سے بولی۔ "تم سناؤ۔ پارد کہتی تھی کہ تم کوئی لڑکا دیکھنے گئے ہو۔ کوئی بنی بات؟"

"غریب لڑکیوں کے لئے لڑکے کہاں ملتے ہیں بہن۔" پھر جھجکتے جھجکتے اس نے

دل کی بات کہی۔ "بہن! تم تو میرے حالات سے واقف ہو۔ کنبہ بڑا ہے۔ کمانے والا اکیلا ہی ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ باہر گھومنے سے کیا فائدہ۔ جگدیش جو ہے۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے ہیں۔"

سوماں کی بیمار آنکھوں میں مسرت ناچ اٹھی "تمہارا بچہ ہے۔ جو مرضی کرو۔"

کتاب پر جھی ہوئی جگدیش کی نظریں ایک دم اوپر اٹھیں "نہیں چاچا جی۔" وہ بولا۔ "یہ نہیں ہوگا۔"

جگدیش چونک کر اٹھا اور "مجھے یہ شادی منظور نہیں ماں۔" کہہ کر بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔

جوشی بابو سکتے میں آ گیا اور یوں گم سم سوماں کو دیکھنے لگا جیسے غلطی سے کسی غیر کے گھر چلا آیا ہو۔

مدن بھار دولج

تنکے کا سہارا

کمرے میں موت کی سی خاموشی تھی اور سریش سوچنے لگا کبھی اِس کمرے میں قہقہے گونجا کرتے تھے۔ وُہ کِتنے پیارے دِن تھے۔۔۔۔ کتنی رات گئے تک وُہ کیلاش اور سونیا بھابی کے پاس بیٹھا رہتا۔ خوب گپّیں لگتیں۔ باتیں ہوتیں، گھریلو باتیں۔ بچّوں کی نفسیات، اِرد گِرد کے ماحول پر تبصرہ آرائی۔ بس یونہی سی باتیں ہوتی رہتیں۔ کیلاش کو کِتنے ہی گیت یاد تھے۔ بھابی کِتنا اچھا ہارمونیم بجالیتی تھیں۔ نیلم تب بہت چھوٹی تھی اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے تالیاں بجاتی کِتنی پیاری لگتی تھی۔ وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہ ہوتا۔ رات کے گیارہ بجے کی آخری بس بھی نکل جاتی اور اُسے پیدل ہی اپنے گھر واپس آنا پڑتا۔۔۔۔ مگر وُہ کِتنے مزے کے دِن تھے۔

پھر کیلاش چل بسا۔ اُسے اپنے دوست کی موت کی خبر پُورے دو مہینے بعد مِلی تھی۔ وُہ سیر سپاٹے کے لئے کشمیر گیا ہُوا تھا۔ آج دو سال ہو چلے تھے اِس بات کو ——————

سونیا بھابی آئیں اور میز پر چائے رکھ کر کچھ منٹ سریش بابو کو دیکھتی رہیں پھر یکا یک باہر چلی گئیں۔

"وہی پیلی ساڑھی پہنی ہے سونیا بھابی نے۔" اُسے خیال آیا اور۔ تو وُہ اچھے کپڑے پہنتی تھی مگر آج پھر وُہی بوسیدہ سی پیلی ساڑھی —— جب وُہ کشمیر سے لوٹ کر یہاں آیا تھا تو بھی

ساڑھی پہنے اُس نے دروازہ کھولا تھا۔ وُہ غم کا مجسمہ بنی بے جان تصویر کی طرح اُسے دیکھ رہی تھی۔ کتنی اُداس، کتنی ویران نظریں تھیں ـــــ یکایک وُہ رو دی تھی۔ پھر میلے کچیلے سے کپڑے پہنے نیلم آئی تھی۔ اُسکی ناک بہہ رہی تھی۔ اپنی ممی کو چپ کرانے کی کوشش میں ساڑھی کا پلّہ کھینچتے کھینچتے وُہ خود بھی سسکیاں بھرنے لگی تھی۔ اُس کی سسکیاں سُنکر سوینا اور زور سے رونے لگی تھی۔ یہ سب دیکھ کر ایک طوفان سا اُٹھا تھا۔ اُس کے دل میں ــ تبھی اُس نے سوچا تھا کہ گھر میں بلب فیوز ہو جائے تو گھٹا ٹوپ اندھیرے سے موم بتی کی روشنی ہی بہتر ہے۔ کچھ دنوں کے بعد اُس نے بھابی سے کہا۔

"بھابی، اگر میں یہیں تمہارے پاس چلا آؤں تو کیا حرج ہے۔"

بھابی چپ ہو گئیں تھیں۔ انہوں نے ٹالنے کی غرض سے کہا تھا۔

"سریش بابو، مجھے ایک جگہ مل رہی ہے کرشنا ہائی اسکول میں کیا خیال ہے تمہارا ــ نیلم کو میں ساتھ لے جایا کروں گی۔"

پھر اُس نے باتوں ہی باتوں میں کہا تھا

"مکان کے ایک کمرے میں میرا گزارہ ہو جائے گا بھابی، چالیس کرائے کے دینا ہی ہوں گے یہ بھی گھر کا خرچ ہے۔ اگر مجھے گھر کا کھانا ملنے لگ جائے تو میری خراب صحت بھی ٹھیک ہو جائے۔"

بھابی کو چپ دیکھ کر اُس نے کہا تھا۔

"میرا کیا ہے۔ اور کون ہے میرا۔ اکیلی جان ہوں۔"

"سریش بابو، اکیلے ہی تو نہیں رہنا ہمیشہ۔ جب شادی ہو گی تو......"

"لیکن جب تک نہیں ہوتی تب تک تو آپ کے پاس رہ سکتا ہوں۔ تب تک نیلم بھی ذرا بڑی ہو جائیگی اور تمہارا سروس کرنا بھی مشکل نہ ہوگا۔"

بڑی مشکل سے سوینا بھابی مان گئی تھیں۔

گھر میں تھوڑی سی روشنی ہو گئی تھی۔ کچھ مُسکراہٹیں پھر بکھرنے لگی تھیں۔ اُجڑے باغ میں ہریالی

کی اُمید ہو چلی تھی۔ نیلم کا مُرجھایا چہرا اب کچھ کھِل اُٹھا تھا۔ اب ہر وقت وہ "انکل۔ انکل" کی رٹ لگائے رہتی۔

"یہ چیز میں انکل کو دکھاؤں گی، ہیں ممّی۔"

"فلاں چیز مجھے انکل لا دیں گے، دیکھ لینا۔"

سریش آفس سے آتے وقت اُس کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لاتا۔

"کیا لائے ہو انکل۔"

"با۔ جہ"

وہ جیب سے باجہ نکال کر بجانے لگتا۔

"مجھے دو، مجھے دو انکل۔" وہ کودنے لگتی۔

اُسے یوں مچلتا دیکھ سریش کو عجیب تسکین سی ہوتی۔

سونیا بھی اب اُتنی اُداس نہ رہتی تھی۔ اُس کے چہرے پر بھی کچھ تازگی آ چلی تھی۔ اُداس ہونٹ پھر سے مُسکرانا سیکھ رہے تھے۔ کھوئی کھوئی سی آنکھوں میں اب قدرے چمک آ رہی تھی۔ کبھی کبھی ضرور پرانی باتیں یاد آ کر اُسے رلائی سی آ جاتی مگر اب زیادہ تر وہ کچھ مطمئن سی رہنے لگی تھی۔ اب کبھی کبھی وہ تینوں کوئی اچھی سی پکچر دیکھنے بھی چلے جاتے۔ کسی چھٹی کو شہر سے باہر سیر وغیرہ کا پروگرام بھی بن جاتا۔

سریش خوش تھا۔ کیونکہ نیلم اور سونیا خوش تھیں، یہی اُسکی آرزو تھی۔

سریش نے چائے کی پیالی کی طرف دیکھا جو کچھ دیر ہوئی سونیا رکھ گئی تھی۔ اُس میں ایک مکھی پڑ گئی تھی اور چائے بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اُس نے پیالی ایک طرف سرکا دی۔ آج وہ چائے کی میز پر اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ اچانک اُسے اُس دن کا واقعہ یاد آیا۔

سونیا اور وہ یہیں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ نیلم باہر سے کھیلتی ہوئی آئی اور سریش

سے لپٹ کر بولی۔

"آہا۔ انکل ۔ میرے پاپا بن گئے ہو۔ ہیں نا ممی۔"

سریش اور سونیا نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر دونوں کی نظریں جھک گئیں سونیا نے شرما کر اپنا منہ گھٹنوں میں دے لیا۔ اور سریش کا منہ ایکدم سرخ ہو گیا۔ نیلم کی خوشی جاتی رہی۔ مجرمانہ انداز میں بولی۔

"وہ جو بلو ہے نا انکل، اس کی ممی کہہ رہی تھی۔"

لوگوں کی انگلیاں اٹھنے لگی تھیں۔ محلے میں چرچے بھی ہونے لگے تھے۔ کئی باتوں کی بھنک سریش کے کانوں میں بھی پڑی تھی۔ ایک شام وہ تینوں کوئی پکچر دیکھ کر آ رہے تھے۔ گلی کا موڑ مڑتے ہی کسی کی آواز آئی۔

"عیش کر بیٹھے" پری ہاتھ لگ گئی ہے۔"

اندھیرے میں سریش کو پتہ نہیں چلا کہ کس نے کہا ہے۔ ورنہ وہ اس کا سر کچل دیتا۔

شروع شروع میں وہ ضرور تلملایا تھا۔ مگر اب یہ باتیں پرانی ہو چکی تھیں۔ وہ ایسی باتوں کا عادی ہو چکا تھا اور وہ چٹان کی طرح کھڑا تھا۔

"وہ یہیں رہیگا۔ دنیا جو چاہے بکتی رہے۔" اس نے سوچا تھا۔

مگر آج وہ یہاں سے چلے جانے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ سونیا کے ساتھ وعدہ کئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ وہ رات اسے اچھی طرح سے یاد تھی جب ناول پڑھتے پڑھتے کرسی کے پیچھے سونیا جابی کو کھڑے پایا تھا۔

"سوئے نہیں ہو، سریش بابو۔"

اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

"کیوں کیا بات ہے جابی، طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"نیند نہیں آ رہی۔"

اُس نے پھیکی سی مُسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

کچھ دیر وُہ اُسکو دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہئیے سریش بابُو۔"

"دُنیا کو بکنے دو، تُم پرواہ نہ کیا کرو۔"

"نہیں مجھے ہی کچھ اِس طرح محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں۔ . . . ."

چونک کر دیکھا تھا اُس نے سونیا بھابی کو ـــــ وُہ کہہ رہی تھی۔

"یہ عجیب بات ہے سریش بابُو کہ جتنا مَیں سوچتی ہُوں کہ تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہئیے اُتنا ہی ڈر لگتا ہے کہ کہیں تُم سچ مُچ نہ چلے جاؤ۔"

"مَیں کبھی نہیں جاؤں گا، بھابی۔"

"وعدہ کرتے ہو۔"

"ہاں ہاں، مگر یہ کیا پُوچھتی ہو مجھ سے۔"

اور سونیا اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھ کر اپنے کمرے کو لوٹ گئی تھی۔ مگر تب وُہ نہیں سمجھا تھا کہ وُہ نظریں کیا کہنا چاہتی ہیں۔

سونیا بھابی آئیں اور میز پر سے ٹھنڈی چائے کی پیالی اُٹھا کر چپ چاپ جھکی جھکی نظروں سے واپس چلی گئیں

"یہ سونیا بھابی کو ہو کیا گیا ہے ـــ اُسے پتہ ہی نہیں چلا۔"

اُس نے سوچا ـــــــــ

کل شام آفس سے لوٹ کر اُس نے ایسے ہی کہا تھا۔

"بھابی، بہت کام کیا ہے آج تو۔ بس سر درد ہونے لگا۔"

اور وہ یکایک اتنی فکر مند ہو گئیں کہ انا سین منگوائی اور چائے کیساتھ دیتے ہوئے بولی۔

"بس بس بستر سے نکلنا نہیں۔ لیٹے رہو۔ موسم بہت خراب ہے آج کل۔"

اور پھر رات کو سر دبانے بیٹھ گئیں۔ لاکھ منع کرنے پر بھی وہ کتنی رات تک سر دباتی رہیں۔

رات بارش تھی اور کھڑکی کی ٹین کی چھت پر ٹن ٹن ٹن کی جھنکار میں نہ جانے کب اُسکی آنکھ لگ گئی۔ جب آدھی رات کو اُسکی نیند کھلی تو اُس نے دیکھا سونیا اُس کے بستر میں سوئی پڑی ہے۔

گھبرا کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"بھابی!"

اور سونیا جاگ رہی تھی۔

پہلی بار اُس نے اُن چوربتیوں کو دیکھا جو سونیا کی آنکھوں میں نہ جانے کب سے جلنے لگی تھیں اور سونیا نے اُسے اِس طرح سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

"ہاں سریش بابو — یہ سب سچ ہے۔ جو تم دیکھ رہے ہو۔ مجھے کچھ ہو گیا ہے۔ سچ مچ میں پاگل سی ہو رہی ہوں۔"

یکایک اُسکی کلائی پکڑتے ہوئے سونیا نے کہا تھا۔

"مجھے چھوڑ کر چلے تو نہیں جاؤ گے، سریش بابو۔"

وہ بھونچکا سا سب دیکھ رہا تھا۔

"نہیں"

آواز جیسے کسی گہرے تاریک کنویں سے آئی ہو۔

مگر آج وہ جانے کے متعلق سوچ رہا ہے — اور سونیا نے وہی پیلی ساڑھی صبح سے پہن رکھی ہے، مگر وہ کیا کر سکتا ہے؟ صبح کے سونیا کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونجنے لگے —

"جو چیز تم دے ہی نہیں سکتے سریش بابو، اُسے چھیننے کا مجھے کوئی حق نہیں — تم جا رہے ہو اور میں تمہیں روک بھی تو نہیں سکتی۔"

اُسے دبی دبی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

ابراہیم اختر

احساسِ گناہ

پچھلی پہر کا مرجھایا ہوا چاند پچھم کی سرمئی آنکھوں میں ڈوب رہا تھا۔ لالہ دیش بھگت کی عالیشان کوٹھی دھرتی کے سینہ پر پورے شباب کے عالم میں کھڑی تھی۔ گاؤں کی جھونپڑیاں زرد چاندنی میں بالکل بے حس و حرکت کھڑی نظر آتی تھیں۔ لالہ اپنے کمرے میں مسہری پر بچھے ہوئے مخملی بستر میں محوِ خواب تھے

نوکر نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک بھرپور آواز گونجی۔

"کون ہے — ؟"

"مالک، میں ہوں آپ کا خادم —" للو کی آواز خوف و ہراس سے کانپ رہی تھی۔

"کیا ہے؟" لالہ کی آواز میں کوئی خوش خبری سننے کی آرزو تھی۔

"آپ کی گنگا، مالک باہر والے کمرے میں بٹھا آیا ہوں۔"

"تم بہت۔ اچھے ہو للو، مان گئی ہے۔" لالہ نے شاباش دینے کے انداز میں پوچھا۔

"آپ جائیں، مان جائے گی۔ آپ منا ہی لیں گے آخر۔"

للو نے اپنے تجربے اور لالہ کی ہمت کو ایک ساتھ تھپتھپاتے ہوئے جواب دیا۔

گنگا بہت مچلی اور چیخی مگر لالہ نے اسے آخر منا ہی لیا اور گنگا جو پہلے ہی ماں کی موت سے نڈھال تھی اپنے ٹوٹتے ہوئے جسم کو گھسیٹتی چور لٹے ہوئے مسافر کی طرح چل دی۔

صبح ہوتے ہی لالہ نے گنگا کی ماں کی چتا جلانے کا پورا انتظام کر دیا۔ گاؤں والے گنگا کیساتھ ہمدردی کے ساتھ ساتھ لالہ کی فراخ دِلی کا بھی چرچا کر رہے تھے۔ ہر طرف لالہ کی نیک نامی بلند اخلاقی اور انسان پرستی کی گونج تھی اور اس گونج میں گنگا کا عظیم غم دب کر رہ گیا تھا۔

گنگا اب اِس دُنیا میں بالکل اکیلی تھی۔ مرگھٹ سے واپسی کے بعد سبھی اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور رات ہونے لگی تو گنگا کو بڑا خوف ہُوا۔ دو تین عورتیں جو اس کے قریب بیٹھی تھیں اُسے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہہ رہی تھیں۔ اتنے میں لالہ کا نوکر للّو آیا۔ کہنے لگا۔

"لالہ جی نے گنگا کو اپنے ہاں چلے آنے کو کہا ہے۔"

گنگا جو صُبح سے بے جان پتھر کی طرح سرد اور مُنجمد تھی چونک اُٹھی مگر دوسری عورتوں نے دلاسا دیا اور کہا۔

"ہاں بیٹی۔ اب تُمہارا یہاں کون ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ لالہ نے خُود بلا لیا ہے۔"

للّو چلا گیا۔ عورتیں بھی چلی گئیں اور محبت میں گنگا بھی نہ جانے کِدھر بہہ گئی۔

آن کی آن میں گاؤں میں گنگا کی تلاش شروع ہو گئی۔ مگر گنگا نہ ملی۔ لالہ کے کارندے اور گاؤں والے نصف رات تک ڈھونڈتے رہے۔ مگر نہ جانے گنگا کدھر گئی۔ آکاش پر اُڑ گئی یا دھرتی کھا گئی۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ ساری رات لوگ چہ میگوئیاں کرتے رہے۔ لالہ بھی بہت پریشان رہا جیسے اُسکی کوئی بڑی قیمتی شے گُم ہو گئی ہو۔

وقت گزرتا گیا اور گنگا گذرے ہوئے وقت کی ایک کڑی بن کر بھول گئی۔

ایک صُبح پجاری جگن ناتھ مندر کے دروازے میں پہنچ کر ٹھٹھک گیا۔ اُس نے پھٹی پھٹی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دُھندلی روشنی میں اُسے کوئی نظر نہ آیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے گٹھڑی کو ٹٹولا۔ اُس کے سینے میں کسی نے زور سے ہتھوڑا برسا دیا۔ وہ سٹ پٹا کر وہاں سے بھاگنا ہی چاہتا تھا مگر اُسے کوئی اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور اُس کے دِل کے کسی تاریک گوشے میں برسوں کی سوئی ہوئی ایک باپ کی محبت جاگ اُٹھی اُس نے دیوانہ وار گٹھڑی کو اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا

چیتھڑے میں لپٹا ہوا بچّہ! اسے اپنا ہی بچّہ دکھائی دیا۔ اُس کی کوئی اولاد نہ تھی اور برسوں سے وُہ اپنے بچّے کی صُورت کے لئے ترس گیا تھا۔ اُس بڑھاپے میں اُسے سب سے بڑا دُکھ یہی تھا کہ بھگوان نے اُسے ایک بھی بچّہ نہ دیا ــــــ وُہ بڑی دیر تک بچّے کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھا رہا۔ اخیر وُہ وہاں سے اُٹھ کر سیدھا اپنے گھر کو چلا گیا۔ پُوجا کی تھالی وہیں پڑی رہی۔ اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وُہ آج بغیر پُوجا کئے ہی واپس چلا آیا ہے۔ وُہ دیر تک بچّے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اُس نے پیار میں آکر بچّے کو گُدگُدایا۔ بچّے کی آنکھ کُھل گئی اور وُہ آنکھیں میچ کر بُسُورنے لگا۔ تھوڑی دیر تک تو وُہ مُنہ بسور کر جمائیاں لیتا رہا اور پھر منمنانے لگا۔ جگن ناتھ نے اُسے اُٹھا کر گود میں لے لیا اور اُسے بہلانے لگا۔ اُس کے بہلانے پر بھی اُس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا ــــــ بچّے کی آواز سُن کر پڑوس کے لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے اور دو تین مرد عورتیں جگن ناتھ کے گھر میں آ دھمکے۔ جگن ناتھ نے اُنہیں دیکھ کر بڑے فخر سے کہا ــ

"میرا بچّہ! ــــــ دیکھو بھگوان نے دیا ہے ــــ"

وہ ایک ماں کی طرح لوریاں دینے لگا۔

"پنڈت جی! ــــ کہاں سے اُٹھا لائے یہ ــــــ کیا آسمان سے ٹپک پڑا؟"

پنڈت برابر مُسکرائے جا رہا تھا۔

"نہیں لچھمن! ــــــ بس سمجھ لو یہ بھگوان کی دین ہے ــــ آج صُبح جب میں پُوجا کو جا رہا تھا تو مندر کے دروازے پر پڑا مل گیا۔ بھگوان جانے کس بھاگیہ وان نے چھوڑا ہے۔ شائد میرے ہی ــــــ"

لچھمن نے بات کاٹ دی۔

"تو مندر کے دروازے پر کوئی چھوڑ گیا ہے ــــــ!!"

ایک گہرا طنز تھا جسے جگن ناتھ سمجھ نہ سکا۔ وُہ ایک دُوسرے کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے وہاں سے واپس ہو گئے۔

گاؤں کی پُرسکون فضا میں جیسے بارُود کا گولہ پھٹ پڑا۔ جیسے سارے گاؤں میں تعفّن پھیل گیا ہو۔ بڑے بُوڑھوں کے کانوں میں یہ خبر گرم گرم سیسے کی طرح اُتر گئی۔ اُن کی اُونچی ناکیں جیسے زُکام سے سڑسڑانے لگیں۔ الہڑ کنواریوں نے مارے شرم کے اپنا مُنہ آنچلوں میں چھپا لیا۔ بُوڑھی کھوسٹ عورتوں کے سروں میں جیسے جوئیں کسمانے لگیں۔ گاؤں کے مکھیا اور چودہری سر جوڑ کر بیٹھ گئے ——— لالہ نے جگن ناتھ کو بہت سمجھایا لیکن وہ بچّہ کو اپنے سے جدا کرنے پر تیار نہ ہُوا۔

ایک رات پنچائت بلائی گئی۔ لالہ جی پنچائت کی چوکی پر بیٹھے مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش میں تھے۔ پنڈت ایک طرف اپنی گود میں بچہ لئے بیٹھا تھا۔ ایک کونے میں عورتیں تھیں جو پنڈت کو دیکھ دیکھ کر کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ گاؤں کے منچلے گبرو جوان ایک طرف حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ کبھی وہ پنڈت کو دیکھتے تھے اور کبھی چور نظروں سے دُور کھڑی ہوئی گوالنوں کو دیکھ رہے تھے۔ دو چار بُوڑھے لالہ کے اطراف گھٹنوں کے بل بیٹھے اِس اِنتظار میں تھے کہ کب لالہ پنچائت شروع کریں اور ہمیں بولنے کا موقع ملے۔

آخر پنچائت شروع ہوئی۔ کسی نے کہا کہ پولیس میں رپٹ لکھوائی جائے۔ کسی نے رائے دی کہ زبردستی پنڈت جی سے بچّہ چھین کر اناتھ آشرم میں چھوڑ آئیں اور کسی نے چاہا کہ پنڈت جی کو اب گاؤں سے نکال دیا جائے۔

جب سب اپنی اپنی کہہ چکے تو پنڈت جی سے پُوچھا گیا تو وہ بھیک مانگنے کے سے انداز میں کہنے لگے۔

"مجھ سے بچّہ مت چھینو۔ مَیں گاؤں چھوڑ کر چلا جاتا ہُوں۔"

پنڈت گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ گاؤں والے گنگا کی طرح پنڈت کو بھی بھول گئے۔

بُوڑھے جو آخری سانسیں گن رہے تھے دھرتی کی آغوش میں لیٹ گئے۔ کچھ گنوار اور

اور شوخ کنواریاں جو گاؤں کی جیتی جاگتی زندگی تھیں اب اپنے اپنے پتی کے گھروں کو جا چکی تھیں اور ان کے گھروں کی چھتوں سے پالنے لٹک رہے تھے۔ کچھ سُہاگنیں اپنی بیوگی کی اُداس شامیں گزار رہی تھیں۔ گاؤں کی زندگی اب وقت کے دوسرے نشیب و فراز سے گذر رہی تھی۔ وہ گبرو اور کڑیل بے فکرے نوجوان جو طاقت اور بہادری میں دور دور تک مشہور تھے اب ان کے مضبوط اور تنومند جسم سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے ـــــ پرانی مسندوں پر اب نئے بوڑھے آنے لگے تھے ـــــ آموں کی شاخوں میں جھولے پڑے ملہار کی تانیں جنگلی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو میں گم ہو گئیں۔

ایک دن گاؤں کی سوئی ہوئی زندگی چونک پڑی، سُونی فضا کا دِل دھڑک اٹھا۔ گاؤں کے سوکھے ہوئے چہروں پر رونق آ گئی۔ جیسے ان کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار نے آ کر سرگوشی کی ہو۔ گاؤں سے باہر ایک اونچے ٹیلہ پر ایک نوجوان سادھو نیم برہنہ آنکھیں بند کئے سمادھی لگائے بیٹھا تھا۔ کسی کو پتہ نہیں کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔ کس دیش کا باسی ہے۔ کچھ تو یہ سمجھ بیٹھے کہ شائد مہاراج آکاش سے خود اُتر آئے ہیں۔ سادھو نوجوان اور خوبصورت تھا۔ کشادہ پیشانی پر راکھ ملی ہوئی تھی۔ لمبی لمبی جٹیں گردن سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ بال گہرے سیاہ اور چمکیلے تھے جو ہوا کے ایک جھونکے سے اِدھر اُدھر اُڑ جاتے تھے ـــــ گاؤں میں اس کی آمد کی خبر منٹوں میں پھیل گئی اور پورا گاؤں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے، جوان سب ہی اسے دیکھنے دوڑ پڑے۔ اس نئی گونج نے لالہ کے بوڑھے کانوں میں بھی چٹکی بجائی اور وہ بھی گاؤں والوں کیساتھ ہو لئے۔

گاؤں والوں نے اس ٹیلہ کو جس پر سادھو مہاراج سمادھی لگائے بیٹھے تھے جو کانی بنجر اور پتھریلا تھا صاف اور ہموار کر دیا۔ لالہ جی نے اپنے خرچ سے سادھو مہاراج کے لئے ایک شاہیانہ نصب کرنا چاہا۔ لیکن اس بوڑھی عورت نے جو شائد ان کی بھگت تھی انکار کر دیا اور کہا کہ گرو تم مہاراج کو تمہاری کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جاڑوں کی سخت سے سخت راتوں میں بھی ایسے ہی ننگے بدن تپسیا کرتے ہیں۔ اس نے صرف اتنی اجازت دی کہ گاؤں والے مہاراج کے چرن

چھو سکتے ہیں۔ گاؤں والوں کے دلوں میں مہاراج کی بے غرضی پر اور بھی عقیدت بڑھ گئی۔ ہر کوئی اپنی من کی مرادوں کے لئے اِلتجائیں کرنے لگا۔ کوئی اپنی جوان بیٹی کے لئے اچھا ساور مانگنے لگا تو کوئی اپنا کھیت مہاجن کے چنگل سے چھڑانے کے لئے گڑگڑانے لگا۔ کوئی اپنے بیمار بچے کے لئے صحت کی بھیک مانگنے لگا۔ کوئی اپنے بُوڑھے کھوسٹ باپ کی موت کا جتن کرنے لگا تو کوئی بہو اپنی جاہل اور لڑاکا ساس سے چھٹکارا پانے کی بنتی کرنے لگی۔ کوئی بے اولاد ننھے منّے بچّے کے لئے ماتھا رگڑنے لگے ——— لالہ دینش بھگت کا تو اصول ہو گیا کہ وہ دن میں کئی بار جا کر گوتم مہاراج کے درشن کرتے اور ان کے چرنوں میں گیندے کے تازہ پھول چڑھاتے۔

گوتم مہاراج نے کبھی آنکھیں نہ کھولیں۔ کبھی کسی سے کھانے پینے کے لئے کچھ طلب نہ کیا۔ کوئی جانتا نہ تھا کہ وہ اور ان کی بوڑھی بھگت کیا کھاتے ہیں۔ ان کو سمادھی لگائے ہوئے چار مہینے گزر گئے۔ جانے ان کی سمادھی کب ختم ہو گی۔ کب وہ اپنی زبان سے گاؤں والوں کو آشیرواد دیں گے۔

گوتم مہاراج کی خبر دور دور کے گاؤں تک پھیل گئی اور لوگ بھاگ دوڑتے ہوئے ان کے چرن چھونے کے لئے آنے لگے۔ ہر وقت ان کی سمادھی پر میلہ سا لگا رہنے لگا ——— !

ایک دن چپکے سے کسی نے لالہ کے کانوں میں آ کر کہا گوتم مہاراج آج سمادھی سے اُٹھ جائیں گے اور رات دس بجے پوجا کے لئے مندر کو آئیں گے۔

یہ سنتے ہی لالہ چہک اُٹھے۔ اُنہوں نے پورے گاؤں میں منادی کرادی۔ ہر شخص اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا اور لالہ نے بڑے دھوم دھام سے پورا اِنتظام مکمل کر لیا۔ رات آئی تو جیسے گاؤں کی تاریک فضا جگمگا اُٹھی۔ مندر سے سمادھی تک چراغ روشن کر دیئے گئے گھی کے چراغوں کی سوندھی سوندھی بُو سے ساری فضا بوجھل ہو گئی ——— لالہ نئی پگڑی سر پر لپیٹے۔ نئے لباس میں ملبوس، پوجا کی تھالی ہاتھ میں لئے گاؤں والوں سے آگے آگے چلنے لگے۔ ایک عجیب سماں تھا۔ جیسے آکاش کے تارے دھرتی پر اُتر آئے ہوں۔ لالہ کے پیچھے گاؤں کے بوڑھے تھے۔ ان کے پیچھے کچھ نوجوان، دوسری قطار میں کچھ بوڑھی عورتیں اور حسین دوشیزائیں

اپنے نازک ہاتھوں میں تھالیاں لئے اپنے من کی مرادیں سینوں میں دبائے ہوئے دھیمے دھیمے چل رہی تھیں ———— لالہ، گوتم مہاراج کے کچھ فاصلہ پر جا کھڑے ہوئے۔ مہاراج بدستور سمادھی میں تھے۔ ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مہاراج نے آنکھیں کھول دیں۔ ان کی سرخ بڑی بڑی نشیلی آنکھیں، جیسے ان کے چہرہ پر دو دیپ جل اٹھے ہوں چاروں طرف گھوم کر ان کی نظریں لالہ دینش بھگت پر آکر جم گئیں۔ مہاراج کی آنکھوں کا رعب اور جلال دیکھ کر لالہ جی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ مہاراج کی تیز نظروں کی تاب نہ لاکر کانپ اٹھے اور گھبرا کر سر جھکا دیا۔ مہاراج کی بھرپور آواز فضا میں گونج اٹھی۔

"انسان اپنے ظاہر کو کتنا خوشگوار اور پوتر رکھتا ہے مگر من کے اندر کتنا کھوٹ، کتنا میل، کتنی خودغرضی اور کتنی بدی ہوتی ہے۔ ایک روپ میں ہم بھگوان کو پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں، اور دوسرے روپ میں اس پر نثار ہو ہو جاتے ہیں۔"

ہر سو ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مہاراج کی آواز ڈوبتی سی لگی۔

لالہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کا کلیجہ نوچ رہا ہو۔

مہاراج کی آواز پھر ابھری

"جہاں لالہ جیسے نیچ اور پاپی ہوں وہاں ہماری آشیرواد کام نہیں کر سکتی۔ جہاں بھگوان کو مندر سے نکال دیا جاتا ہے۔ جہاں مظلوم کنیا کی عصمت لوٹ لی جاتی ہے جہاں بالک کو شیطان کہا جاتا ہے اور شیطان اپنے کو بھگوان سمجھ رہے ہوں وہاں ہم نہیں رہیں گے۔"

مہاراج نے پلٹتے ہوئے بوڑھی خادمہ سے کہا۔

"آؤ گنگا ماں، ہم یہاں نہیں رہیں گے —" اور مہاراج اور بوڑھی دونوں ٹیلے سے نیچے اترنے لگے۔

(بقایا صفحہ ۲۱۶ پر)

ایم اے عاصی

بیداریٔ احساس

گھر میں خوشی چھم چھم کرتی آئی۔

بھلا ایسے موقعہ پر ابّا اور امّی برادری اور پڑوسیوں کو کیسے بھول جاتیں۔ گھر گھر لڈو تقسیم کئے گئے۔ گھر کا ہر فرد یوں خوش نظر آرہا تھا جیسے ان سب کے ہاتھ کوئی بڑا خزانہ لگ گیا ہو۔

نواب منزل کا ہر فرد اُٹھا اُٹھا پھر رہا تھا ———— حالانکہ چند دن پہلے ہی "نواب منزل" میر انیس کا مرثیہ معلوم دیتی تھی۔

واجدہ کو اپنی اس نوکری پر سب سے زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ کیونکہ جس فضاء، جس ماحول اور جس قسم کے سٹاف کی وہ متلاشی تھی بالکل ویسی ہی فضاء، ویسا ہی ماحول اور سٹاف اس حج کمپنی کا تھا اور پھر سابقہ دفتروں سے یہاں سو روپے تنخواہ بھی زائد اور نری پُری افسری۔

گو نواب صاحب نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی نوکریاں کرتی پھرے۔ اگر نواب صاحب کے یہاں کوئی لڑکا ہوتا تو شاید پھر واجدہ کے نوکری کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا یا پھر نواب صاحب کو اقتصادی جھٹکوں نے مجبور نہ کیا ہوتا۔

نواب صاحب تیموری خاندان کے خاندانی نواب تھے۔ اب نوابوں والے ٹھاٹھ ختم ہوئے عرصہ ہو چلا تھا اور نواب صاحب اپنے آپ کو جس خول میں پیٹے ہوئے تھے وہ اب جگہ جگہ سے ٹوٹ رہا تھا اور اس ٹوٹے ہوئے خول کو پیوند لگانے کے لئے واجدہ کا نوکری کرنا ازحد ضروری تھا۔

اور اِس برق رفتاری کو دیکھ کر اُمّی کی کوکھ بھی اللہ میاں نے کچھ ایسے کل پرزوں سے بنائی تھی کہ وہ سال میں ایک مورتی تو گھڑ ہی دیتیں اور اب تک وہ دس لڑکیوں کو جنم دے چکی تھیں۔ نواب صاحب بھی ساٹھے پاٹھے تھے لیکن مرد کی جوانی رہے یا نہ رہے اِس کا جوش و خروش باسی کڑھی کے اُبال کی طرح ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور کچھ یہی حال امّی کا تھا لیکن نواب صاحب والا ولولہ نہ تھا۔ لیکن اِس کے باوجود امّی کے جسم میں وہ گرمی تھی جو ٹھہر ٹھہر کے مہک رہی تھی جو ہر سال ظاہر ہوتی۔ نواب صاحب کی پوری اولاد میں واجدہ ازل سے بڑی گنوں والی مشہور تھی۔ وہ عام لڑکیوں میں سے نہ تھی، وہ گریجویٹ تھی۔ وہ اِن لڑکیوں میں سے نہ تھی جو موم کی مورتی کی طرح اپنے خالق کے تخیّل کی گرمی سے پگھل سکتی ہو اور وہی تو وہ نواب منزل کے وقار کو قائم رکھنے کے لئے خوفناک چٹانوں سے ٹکرا رہی تھی اور اگر واجدہ کو یہ نوکری نہ ملتی تو نواب صاحب شاید پاگل ہو جاتے۔ کیونکہ وہ کئی بار اپنی قسمت کو رو بیٹھے تھے اور اپنی زندگی کے اِن سب پھلوں کو کڑوا محسوس کرنے لگے۔ وہ تو اللہ حاجی کریم بخش کا بھلا کرے جس نے نواب صاحب کو پاگل ہونے سے بچا لیا اور اِن پھلوں کی کڑواہٹ کو مٹھاس میں بدل دیا۔ ورنہ خدا جانے اِس نواب منزل کے ہر فرد پر کیا گذرتی۔ حاجی کریم بخش نواب صاحب کے پرانے دوست تھے جس کی وجہ سے واجدہ کو جلد نوکری مل گئی اور وہ بھی سیکشن افسر کی۔

واجدہ کی جب تیسری نوکری چھوٹی تو سب گھر والے یوں محسوس کرنے لگے جیسے دُنیا کی ہر چیز، ہر خوشی اِن کے ہاتھوں سے چھوٹ چلی ہے اور اِس نوکری کے چھوٹنے کی خبر سُن کے برادری، گھر، محلہ کا ہر فرد دوڑا چلا آتا تھا۔

"کیسے چھوٹ گئی اب پھر واجدہ کی نوکری"

جیسے نوکری چھوڑنا بھی ہمالہ کی چوٹی کو سر کرنا تھا۔

"میں تو کہتی ہوں" بُوا نے امّی سے کہا۔ "اب تو کوئی سکول کھول لے۔"

"اور نہیں تو کیا۔" ہاجرہ خالہ نے امّی سے کہا۔ "اب تو کوئی سکول کھول لے۔"

"اور نہیں تو کیا۔" ہاجرہ خالہ نے امی سے کہا۔ "جیسے نوکری کرنے کا ہی ٹھیکہ لے رکھا ہو۔"

"ہوں" بوا نے اپنی عینک سے جھانکتے ہوئے امی سے کہا۔ "آخر اس کی اپنے افسروں سے چھنتی کیوں نہیں۔" لیکن بچاری امی ان بڑی بڑی ناک والیوں سے کیونکر کہتیں کہ اس نواب منزل کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں اور اگر واجدہ نے نوکری نہ کی تو یہ کھوکھلی بنیادیں دھڑام سے نیچے آگریں گی۔

واجدہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی مگر بوا کا نواب منزل میں داخل ہونا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ نہ چاہتی تھی کہ بوا ان کے گھر آیا جایا کرے۔ اسی بوا کٹنی ڈلہ کی وجہ سے واجدہ برادری اور محلے میں ایک اہم موضوع بن چکی تھی اور اسکی ذات سے عجیب وغریب باتیں منسوب ہونے لگی تھیں اور یہ باتیں چھتوں کو پھلانگتی برادری اور بوا کے گھر کا گشت لگاتی ہوئیں واجدہ کے ماتھے پر چپک گئیں۔

وہ تو بوا کی خیریت جانئے جو نواب صاحب کے کانوں تک یہ باتیں نہ پہنچ سکیں ورنہ نواب صاحب تو غضب میں آکر بوا کو کھیل کے دانے کی طرح پھر سے اُڑا دیتے۔

نواب صاحب کے گھر کا ہر فرد پنج وقتہ کا غازی تھا۔ آنے جانے ملنے اور اڑوس پڑوس والے ہمیشہ منہ میں انگلی داب کے کہتے۔

"ماشاء اللہ، چشم بد دور۔ خدا ہر ماں باپ کو ایسی ہی لڑکیاں دے۔ جس کے دیکھنے سے نظریں شاد اور دل سرور ہو۔" بچیاں اتنی تعریف سن کر پھولے نہ سماتیں اور عجز و انکسار سے کہتیں ــــ "خداوند کریم تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے، عاقبت کا ثواب اسی دنیا میں مل گیا۔" ــــ اور پگھلی ہوئی موم بتی کی طرح ان کا سارا وجود عجز کے سانچے میں ڈھل کے رہ جاتا۔ رُواں رُواں خوشی سے کپکپا اُٹھتا۔ نواب صاحب کا خیال تھا بلکہ ان کا ایمان تھا کہ جسم نجات کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ بہت شائد اسی لئے انہوں نے سب لڑکیوں کو اسی اصول کے ماتحت روحانی تربیت دی تھی لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی روحانی تربیت واجدہ کے جسم کی نشوونما کو نہ روک سکی اور اس کے جسم کے پیچ وخم نے شباب کی شکل اختیار کر لی حتی کہ وہ ایک حسین مجسمہ بن گئی

اور اس حسین مجسمہ کو سابقہ نوکریوں میں بڑے کٹھن مراحل سے گذرنا پڑا۔

آج بھی واجدہ جب اپنے پہلے دفتروں اور وہاں کے عملہ کے بارے میں سوچتی ہے تو اس کا رُواں رُواں خوف سے کانپ اُٹھتا ہے۔ چہرے کی رنگت زرد پڑ جاتی ہے اور اُداسی کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں اس کے ذہن کی سطح پر پھیلنے لگتی ہیں۔ اس کی نظروں کے سامنے بھوک سے بلبلاتے وحشی ناچنے لگتے۔ واجدہ کو اپنے افسروں کی دعوتیں یاد آنے لگتیں جن کا مقصد محض جذبات کی بے حیائی کا مظاہرہ کرنا تھا۔ یہ جتنا عرصہ ان دفتروں میں رہی اس کی شخصیت بکھری رہی اس کا شعور شل رہا اور اگر واجدہ اپنے آفیسروں کے جذبات کا احترام کرنا چاہتی بھی تو شائد نہ سکتی کیونکہ اس کے اندر مریم تھی۔ سیتا تھی اور پھر اسے اس بند کلی کا بھی تو پاس تھا جس میں ایک دوشیزہ کا دل دھڑکتا ہے اور نواب صاحب کی وُہ رُوحانی تربیت کا بھی تو بہت سا اثر تھا

جب مریم اور سیتا نے وُہ ہر بات ماننے سے انکار کر دیا جس سے نسائیت۔ پاکیزگی اور اکڑی ہُوئی گردن خم ہو جاتی ہے تو اس انکار پر بچاری واجدہ کو کسی نہ کسی بہانے نوکری سے الگ کر دیا جاتا۔

نواب صاحب واجدہ کی نوکری چھُوٹنے پر ہمّت ہار بیٹھتے۔ ویسے اب نواب صاحب میں وُہ پہلا سا کس بل نہ رہا تھا۔ حالانکہ نواب صاحب کو سرکار کی طرف سے ایک معقول رقم بطور گذارہ الاؤنس ملتا تھا۔ لیکن اس الاؤنس کا تیسرا حِصّہ "چڑیا گھر" پر صرف ہو جاتا تھا۔ ان کو جانوروں کا بڑا شوق تھا۔ لہذا نواب منزل میں کتّے۔ کبوتر۔ تیتر۔ بٹیر۔ بلیاں۔ اٹلی کے رنگ برنگے طوطے مُرغیاں وغیرہ بہت نظر آتے تھے۔

ہر دیکھنے والی آنکھ نواب منزل کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس کے مکین کس حال میں ہیں۔ اس کی خستہ دیواریں۔ اُکھڑا ہُوا پلستر دیکھ کر نواب صاحب کی اقتصادی حالت کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ تھا اور کبھی ایک وُہ وقت تھا کہ جب نوابِ منزل کی اینٹ اینٹ سے نوابیت ٹپکتی تھی۔ نواب صاحب کی ساری زندگی عیش وعشرت میں گذری تھی۔ دولت کی فراوانی۔

مصاحبین کے غلط مشورے۔ غرض کہ ہر وقت عشرت کی مُرلیا بجتی۔ لیکن یہ سب کچھ شادی سے پہلے تھا۔ شادی کے بعد تو نواب صاحب گھر کے گورکھ دھندے میں اِس طرح مصروف ہوئے کہ پھر اِس سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔

معاً نواب صاحب کے ذہن میں کسٹم آفس۔ امریکن فرم اور انشورنس کمپنی اُبھر آئی۔ ان کی سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آسکی کہ آخر واجدہ کو نوکری سے الگ کیوں کرتے رہے۔ حالانکہ اِن نوکریوں کے لئے نواب صاحب نہ جانے کن کن لوگوں سے ملے ہوں گے۔ یہ مُعمّہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔

واجدہ جہاں بھی گئی جس حیثیت سے گئی اِس کے جاتے ہی کسٹم آفس۔ امریکن فرم اور انشورنس کمپنی کے عملے اور افسروں کی آنکھیں اِسے دیکھتے ہی لٹو کی طرح باہر نکل آتیں۔ اِن کے چہرے کا گوشت پھڑکنے لگتا۔ ڈھیلی ڈھالی عام قسم کی ٹائیاں شوخ رنگ ہو جاتیں۔ سُوٹ ڈرائی کلین ہونے لگتے۔ قمیضیں سٹارچ ہونے لگتیں اور بعض کی فرنچ کٹ کلین شیو میں تبدیل ہو جاتیں۔ اِن دنوں واجدہ کی زندگی اپنی زندگی نہ تھی بلکہ ان لوگوں کی تھی لیکن کیوں ——— لیکن اب جج کمپنی میں اِس کی زندگی اپنی زندگی تھی۔ یہاں بھوک سے بلبلاتے وحشی نہ تھے بلکہ وہ چہرے تھے جن کو اصل زندگی کا نمائندہ کہا جا سکتا تھا اور پھر حاجی کریم بخش کس قدر شریف۔ کس قدر نیک تھے۔ وُہ واجدہ کا ہر طرح سے خیال رکھتے۔ اُنہوں نے اپنے فطری قہقہوں کو سمیٹ کر واجدہ کے لئے وقف کر دیئے اور اِس پیار میں پدرانہ شفقت گھلی ہوئی ہوتی۔

واجدہ کی ایک اپنی سطح تھی جس سے وُہ نیچے نہیں اُتر سکتی تھی۔ جس کی وجہ سے وُہ سنجیدہ اور مُتین بنی ہوئی تھی۔ دُوسرا اُسے اپنی ذمّہ داریوں کا بھی پُورا پُورا احساس تھا۔ جنہیں وُہ بڑی تندہی سے سرانجام دیتی۔ اگر واجدہ کا اپنا کیریکٹر یا نواب صاحب کی رُوحانی تربیت نہ ہوتی یا پھر واجدہ کے اندر مریم اور سیتا نہ ہوتیں تو پھر یقیناً وُہ حالات نہ ہوتے جو آج تھے اور نہ ہی پہلی نوکری چھُوٹتی اور سب سے بڑی وجہ یہ کہ اس کے بارے میں کوئی سکینڈل سُننے میں نہیں آتا اور آج تک واجدہ کی ذات

سے جو عجیب و غریب باتیں منسوب ہو چکی تھیں وہ سارا کیا دھرا لوا کٹنی ڈلہ کا تھا۔

اگرچہ برادری اور محلے والیاں اکیلے میں واجدہ کی گذشتہ نوکریوں پر ناک بھوں چڑھایا کرتیں لیکن جب واجدہ سامنے آجاتی تو نہ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں جھک آجاتی۔ اور تو اور تیسری نوکری چھوٹنے پر نواب صاحب بھی اسے مخدوش نگاہوں سے گھورتے تھے اور واجدہ سے یوں ہمکلام ہوتے جیسے اپنی فراخدلی کی وجہ سے اس کے گذشتہ گناہ معاف کر دیئے ہوں۔

لیکن اب تو حالات یکسر بدل چکے تھے۔ واجدہ اب ملازم تھی۔ نواب منزل کے افراد کی کفیل۔ گھر کا ہر فرد خوش تھا۔ اب خیر سے دوسری لڑکیاں منہ ہاتھ کی ہو چکی تھیں تو امی تخت نشین ہو گئیں۔ پنج وقتہ نمازی۔ کڑکڑاتے جاڑے ہوں یا منہ زور گرمی۔ فرض ان کے لئے بہرحال اوّل تھا۔

واجدہ بھی اس ملازمت میں بہت خوش تھی۔ گھر میں پھر سے گہما گہمی ہو گئی۔ ادھر نواب صاحب کے چڑچڑاپے میں بھی اضافہ ہو گیا۔

حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ سورج کے طلوع و غروب کا اندازہ اگر کسی کو ہو سکتا ہے تو وہ صرف خدا ہے۔

کچھ حالات اس قسم کے پیدا ہوئے کہ حاجی کریم بخش کو اپنا کاروبار وسیع کرنا پڑا۔ نیا عملہ بھرتی کرنا پڑا۔ پورے ملک میں اپنی ایجنسی کی شاخیں قائم کرنی پڑیں اور اس طرح پرانے عملہ کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا۔

حاجی کریم بخش کی مدت کی خواہش پوری ہوئی۔ گورنمنٹ نے حاجی صاحب کے نام دو سو بیڈ فورڈ گاڑیوں کا امپورٹ پرمٹ جاری کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ واجدہ کی دفتری ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں اور تنخواہ بھی۔

حاجی کریم بخش کی دو سو بیڈ فورڈ گاڑیاں کراچی کی بندرگاہ پر پہنچ چکی تھیں لیکن انہیں چلانے سے پہلے ان سب گاڑیوں کا بیمہ ہونا قانونی طور پر ضروری تھا اور یہ کام کم سے کم تین چار دنوں کا تھا۔ لیکن حاجی صاحب بضد تھے کہ جتنی جلدی ہو سکے ہو جائے۔ لہٰذا بحیثیت سیکشن انسر کے یہ

کام واجدہ کو کرنا تھا۔ اور ویسے بھی واجدہ کو انشورنس ٹریڈ سے اچھی طرح سے واقفیت تھی۔ حاجی صاحب کا حکم پاتے ہی واجدہ نے ان گاڑیوں کے متعلق تفصیلات نوٹ کر کے اسی انشورنس کمپنی کے دفتر پہنچی جہاں وہ پہلے ملازم تھی۔

واجدہ کے دفتر جاتے ہی دفتر کے بڑے ہال میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسا شور ہُوا سب عملے کے چہروں پر خوشی اور حیرت کے ملے جلے آثار صاف طور پر نظر آ رہے تھے اور جیسے ان بھوک سے بلبلاتے وحشیوں کے ہجوں میں پھر سے تالیاں سی بجنے لگیں۔ آنکھیں لٹو کی طرح باہر آ گئیں اور واجدہ کو یوں محسوس ہُوا کہ ان کی تشنہ نگاہیں اس کے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں۔ واجدہ نے دل برداشتہ ہو کر ان گاڑیوں کے کاغذات جنرل مینیجر کے حوالے کر دیئے۔

"دیکھئے چودھری صاحب"۔ واجدہ نے جنرل مینیجر سے کہا۔"یہ کام ہر صورت آج ہی ہونا چاہیئے۔"

جنرل مینیجر نے اپنی چکنی کھوپڑی سے پسینے کے دانوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"مس واجدہ دیکھئے۔ کوشش تو یہی ہوگی"۔

پھر لمحہ بھر کے لئے دونوں خاموش ہو گئے۔

واجدہ جتنی دیر یہاں ٹھہری وہ بذاتِ خود پریشان رہی۔ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا۔ اس کے ذہن میں ہتھوڑے پڑتے رہے۔ اسے دیکھ کر سٹاف میں کہنیاں چلتی رہیں۔ انگلیاں اُٹھتی رہیں۔ آنکھوں میں عُریاں اشارے جھلکتے رہے۔ سٹاف اسے دیکھ کر مسکراتا رہا۔ حالانکہ واجدہ کی آنکھوں میں اُداسی اور بے بسی کے سوا کچھ نہ تھا۔

واجدہ کے کاغذات مکمل نہ ہو سکے۔ اسے کل پھر ان بھوکے بلکتے وحشیوں میں آنا پڑے گا مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ کیا وہ حاجی کریم بخش سے یہ کہہ دیتی کہ آپ کسی اور کو یہ ڈیوٹی دیں لیکن نہیں۔ واجدہ یہ بات اور پھر حاجی کریم بخش سے کہتی جن کو اس پر پورا اعتماد۔ پورا بھروسہ تھا۔ جن کے پیار میں پدرانہ شفقت کی جھلک تھی۔

لیکن آج کاغذات مکمل نہ ہونے پر تو حاجی کریم بخش بھی جھنجھلا اُٹھے۔

"واجدہ بیٹی یہ کاغذات تو ہر صورت آج تیار اور مکمل ہونے چاہئیں تھے۔ خواہ تمہیں وہاں ایک دو گھنٹے اور ٹھہرنا پڑتا —— خیر بیٹے کل تم صبح سیدھے انشورنس کمپنی ہی جانا اور کل ہر حالت میں کاغذات مکمل ہو جائیں۔"

واجدہ کی حالت ایک مرجھائے ہوئے پھول کی طرح سے تھی۔ واجدہ کو اپنی اِس غلطی کا شدت سے احساس ہوا کہ اِسے کسی دوسری انشورنس کمپنی میں جانا چاہیئے تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو صرف دو تین گھنٹوں کا ہی کام رہ گیا تھا۔

رات بھر وُہ سو نہ سکی۔ کیونکہ اب انشورنس کمپنی میں جاتے ہوئے اُسے ڈر محسوس ہوتا تھا۔ لیکن ہمت کر کے جب صبح وُہ انشورنس کمپنی پہنچی تو نقشہ ہی بدلا ہُوا تھا۔ وہی ڈھیلی ڈھالی عام قسم کی ٹائیاں، پھر ایک دفعہ شوخ رنگ ہو چکی تھیں۔ ڈرائی کلین کئے ہوئے سُوٹ پھر ایک مرتبہ باہر نکل آئے تھے۔ سٹارچ کی ہوئی قمیضیں پھر نظر آ رہی تھیں۔ سب کے چہرے کلین شیو سے پھر چمکنے لگے تھے۔ واجدہ کے ذہن میں اس وقت عجیب کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اِس کے پاؤں ڈگمگانے لگے تھے وُہ گرتے گرتے بچی بڑی مشکل سے وُہ جنرل مینیجر کے دفتر تک پہنچ سکی۔ جنرل مینیجر کو دیکھ کر واجدہ کو گرتے گرتے ایک بار پھر سنبھلنا پڑا۔ جنرل مینیجر بھی امریکن سُوٹ کے ساتھ ایک شوخ رنگ کی ٹائی لگائے ہوئے تھا اور کمرہ کی فضا بھینی بھینی خوشبُو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ واجدہ کو یُوں محسوس ہُوا جیسے آج اِس کے آنیسے غیر معمولی گہما گہمی پیدا ہو گئی ہے۔ وُہ ہکا بکا تھی اور لاشعوری طور پر اُسے یُوں محسوس ہُوا کہ جیسے کسی نے اس کے ذہن کا وُہ بند کمرہ جو مُدت سے بند پڑا تھا کھٹاک سے کھول دیا۔

"مس واجدہ آپ کے کاغذات ایک گھنٹہ تک تیار ہو جائیں گے۔" جنرل مینیجر نے مُسکرا کر کہا۔

مگر واجدہ خاموش تھی۔

"اور ہاں میں نے ہیڈ کلرک کو ہدایت کر دی ہے کہ کاغذات مکمل ہوتے ہی آپ کے حوالے کر دے اور میں کسی ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔"

مگر واجدہ خاموش تھی ——— اور جنرل منیجر باہر جا چکا تھا۔ واجدہ کچھ دیر بعد اُٹھی اور ہال میں پہنچ گئی جہاں سٹاف اپنے کام میں لگا ہوا تھا اور ہیڈ کلرک ان کاغذات میں ڈوبا ہوا تھا۔ معاً واجدہ کو محسوس ہوا کہ جیسے اس کے اندر دُکھ اور مایوسی کے کئی دائرے پے در پے پھیلتے اور اس کے وجود میں گھلتے جا رہے ہیں۔ بالکل جیسے ٹھہرے پانی میں کنکریاں گر جائیں وہ اسی کرب کی حالت میں واپس جنرل منیجر کے کمرہ میں آ گئی۔

لیکن اس کی آنکھیں ——— اب اس کی آنکھوں میں اُداسی اور بے بسی نام کو بھی نہ تھی۔ شوخی تھی، چمک تھی، خمار تھا اور تبسم تھا لیکن یہ سب کیوں تھا اور یہ کس جذبہ کے تحت تھا۔

"یہ لیجئے اپنے کاغذات" یہ آواز ہیڈ کلرک کی تھی۔

"اوں" واجدہ نے "اوں" اس طرح کہا جیسے خواب میں ہو۔ وہ حیران تھی کہ اتنی جلدی کاغذات کیسے تیار ہو گئے۔

"تو مکمل ہو گئے کاغذات۔" واجدہ نے کچھ اس طرح سے کہا جیسے کاغذات کے مکمل ہونے میں شک تھا۔

"جی ہو گئے یہ آپ کے سامنے پڑے ہیں" ہیڈ کلرک نے اپنی گول گول آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

"اور سُنیئے ——— دیکھئے آپ ان کاغذات کو ایک مرتبہ چیک کر لیں۔ کہیں کوئی غلطی نہ رہ جائے اور میں کل آ کر لے جاؤں گی۔"

اور یہ کہہ کر واجدہ کمرہ سے باہر نکل آئی اور ہال سے گذرتے ہوئے ایک سرسری نگاہ سٹاف کو حیرتی ہوئی نہ جانے کہاں پہنچ گئی اور ہیڈ کلرک ہکا بکا کھڑا دیکھتا رہا۔ اسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

حاجی کریم بخش جو پہلے ہی کاغذات کے سلسلے میں پریشان تھے وُہ آج واجدہ کو دیکھ کر اور پریشان ہو گئے۔

واجدہ نے آج اپنے لباس کے انتخاب میں بڑی نفاست سے کام لیا تھا۔ اس کے اس لباس میں اس کے جسم کے خطوط اور قوسیں بڑے دلفریب انداز میں نمایاں تھیں۔ حاجی صاحب واجدہ کے اس نئے رُوپ پر ہٹپٹا کے رہ گئے۔

"آج کاغذات مکمل ہونے چاہئیں۔"

"آج تو یقیناً مکمل ہو جائیں گے۔" واجدہ نے اپنی لٹ درست کرتے ہوئے کہا۔

اور واقعی آج کاغذات مکمل ہو گئے تھے۔ ویسے تو وُہ کاغذات کل بھی مکمل ہی تھے۔ واجدہ کی آنکھوں میں آرزوئیں بھوکے بچے کی طرح بلکنے لگیں۔ اس کے اندر کی جنس جاگ اُٹھی اور وُہ ایک رُومان پرور شاعر کے تخیل کی طرح پرواز کرنے لگی۔

اُوپر۔!

اور اُوپر۔!!

اور اُوپر ہی اُوپر۔!!!

نواب منزل کے ہر فرد کو واجدہ جادوگرنی نظر آنے لگی۔ جس نے یک لخت اپنا یا رُوپ اختیار کر لیا تھا۔

دفعتاً واجدہ نے محسوس کیا کہ جیسے وُہ جج کمپنی میں جھک مار رہی ہے اور کسی ویرانے میں چل پھر رہی ہے۔ وسیع کائنات میں حقیر کیڑے کی طرح رینگ رہی ہو۔ جج کمپنی کا سٹاف اسے مُردہ نظر آنے لگا جن میں زندگی کی رمق نہ ہو — اور اس نے استعفیٰ دے دیا۔

گھر کی لمبی لمبی ناکوں والی عورتوں نے برادری میں نکلنا چھوڑ دیا۔ امّی اور نواب صاحب کو یُوں لگا جیسے نواب منزل دھڑام سے نیچے آگری ہو۔

"واجدہ"، دُور جیسے بادل کڑکا۔ "تم نے استعفیٰ کیوں دیا؟" نواب صاحب نے غصہ میں کانپتے ہوئے پوچھا لیکن واجدہ بڑی احتیاط سے سر پر پلّو ڈالے نظریں جھکائے یُوں بیٹھی تھی جیسے کسی پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہی ہو۔

پریم کمار ساز

کڑوا گھونٹ

جانِ من! حسبِ معمول تمہارا خط الف لیلیٰ کی لال جلد کے تلے چھپا کر شدّت سے تنہائی کا انتظار کرنے لگی اور آدھی رات گئے جب موم بتی کی ہلکی ہلکی روشنی میں سپردِ نظر کیا تو خلافِ آرزو دماغ میں بھینی بھینی خوشبو نہیں بلکہ کڑواہٹیں انگڑائیاں لینے لگیں!! اور رہ رہ کر امّاں کی گالیاں، شاہدہ کے لال سینڈل، شہزادی کے طمانچے اور خالدہ کی گرما گرم جھڑپیں جنہوں نے یکے بعد دیگرے تمہارا استقبال کیا مجھے اکسانے لگیں۔

میں نے سوچا کہ آج تمہارا استقبال میری بجائے پالتو کتّے کی طرف سے ہو۔ جو عرصہ سے تمہارے ہاتھ پاؤں چاٹ چاٹ کر تنگ آچکا ہے۔

شائد تمہیں یاد ہو کہ تم نے پچھلے دسمبر پورے چاند کی رات میں کتنے حسین انداز میں لہروں اور کناروں کی گواہی دے کر چاند اور ستاروں کی بھیگی بھیگی ہواؤں کے جھونکوں اور رات کی رانی کی عطر آگیں مہک کے بیچ رومان اور محبت کی باتیں کرتے ہوئے میرے کندھے پر اپنا سر رکھ کر اور میری عنبریں زلفوں سے کھیلتے ہوئے تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ میں مرتے دم تک صرف اور صرف تمہارا ہی رہوں گا۔

جب تم نے میرے عارض و رخسار کے قریب اپنے لب لانے کی کوشش کی تھی تو میں نے

کانپتے ہوئے کہا تھا "محبت کی سُلگتی ہوئی آگ کے شعلوں کو گرم رکھنے کے لئے ایندھن کی کتنی ضرورت ہے۔ تمہیں اِس سے آگاہی ہے نا؟" مگر تمہاری باتیں بدستور اُسی رُخ میں بہتی رہیں جس کو اپنانے کے لئے مَیں نے سو بار انکار کیا۔ کیونکہ میرے قریب۔ ایسی باتوں کا سلسلہ شادی کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔

پھر اچانک تمہارا موڈ خراب ہوگیا! پیار کی جگہ ہلکی ہلکی تُرشی نے لے لی اور تم یکایک وہاں سے چلتے بنے جیسے تمہیں پیغامِ اجل آگیا ہو۔ مَیں گھنٹوں بیٹھی سوچتی رہی۔ کیا تمہیں سچ مچ مجھ سے محبّت ہے یا میرے وجود سے اپنے دِل کی آگ بجھانے کی ناکام کوشش کر رہے ہو۔ محبّت تو خُدا کی دین ہے۔ محبت زندگی کی اُن حقیقتوں کی آئینہ دار ہُوا کرتی ہے۔ جن میں نفس نہیں بلکہ صدقِ دِلی کے شیریں چشمے اُبل رہے ہوں۔ مگر یہاں وُہ بات نہیں۔ یہاں تو فقط ایک بوسے پر ہی قناعت ہُوا کرتی تھی!

گردشِ ایام صیف وصبو سے پلٹ کر ہر بار آتشیں حادثات کا رُوپ دھارن کرتی رہی ہے۔ ہر بار چاند کی مدھم سی روشنی گمراہی کا سامان پیدا کرتی رہی ہے — ! زندگی کی کروٹیں خُدا کرے تمہیں بھی وُہ دِن دِکھائیں جب خالی پیٹ موتیے کی جھاڑیوں میں اُلجھی ہوئیں ساڑھیاں نہیں بلکہ کسی تنُور کی نیم گرم چپاتیاں یاد آتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تمہیں ایسے دِن دیکھنے نصیب نہیں ہوئے۔ کیونکہ تم ہر بار حوالات سے بھاگ کر میری زُلفوں کے سائے میں آ چھپے — ! کاش! یہ زُلفیں اُس وقت بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کو سمیٹ کر تمہیں زندگی کی پُرخار راہوں پر دھکیل سکتیں۔ یہ مخمور نگاہیں جن میں تم ڈوب جایا کرتے تھے ایسے شرارے اُگل سکتیں جو تمہارے غلیظ ذہن کو ہِلا کر تمہیں اِنسانیت کی راہ پر ڈال سکتیں اور تمہیں یہ احساس ہو جاتا کہ مذاق اور محبت میں اتنا ہی فرق ہے۔ جتنا کہ تمہاری صُورت اور تمہارے کردار میں! تمہیں دیکھ کر کوئی بھی اِس بات کا یقین نہیں کر سکتا۔ تم پانچ بچوں کے باپ ہو۔ مَیں نہیں سمجھ سکتی کہ ایک اِنسان ایک وقت ایک حسین وجمیل دوشیزہ کو دھوکہ بھی دے سکتا ہے اور پانچ

بچّوں کا پیٹ بھی بھر سکتا ہے۔ مگر اب میں باوثوق کہہ سکتی ہُوں کہ جب تم میری باہوں سے نکل کر
گھر پہنچے تو بیگم نے اپنی لکڑیوں اور آٹے کی بات دوہرائی اور تم نے کریم اور سینٹ کی بات بدلتے ہوئے
یہ کہہ دیا ہوگا کہ وُہ روپے تو صاحب کی شراب میں خرچ ہو گئے اور یکایک اُسے بھی اپنی باہوں کی گرفت
میں لے لیا۔! اور تم ہی کہو کون ایسے برفاب جسم ہیں جو انسانی باہوں کی حرارت عزیزی میں
پگھل کر نہیں رہ جاتے۔ وقت کی بات ہے کہ وُہی اِنسان جو زندگی میں اِتنے رول ادا کر سکتا ہے
آخر میں خُود اپنی غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر اُسی حسین ماحول سے اُسے نفرت سی ہو جاتی ہے
جس کا کبھی دِلدادہ ہُوا کرتا تھا۔ شائد تمہیں یاد ہو گا کہ ایک مرتبہ تم نے مجھ سے فوری طور پر سَو روپے
منگوائے تھے جبکہ تُم میرے حالات سے پُوری طرح واقف تھے؟ اِقتصادی حالات نے مجھے
بُری طرح کچل رکھا تھا۔ مگر ہائے رے عشق ---!! جسمیں اِنسان سچ مچ اندھا ہوتا ہے میں
نے پھر بھی وقت کی نزاکت کو نہ سمجھتے ہوئے اپنا نکلس جو میری ماں کی آخری نشانی تھا گروی رکھ
کر تمہیں سو روپے کا بندوبست کر دیا۔ جو میں آج تک نہ چھڑا سکی۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ وُہ سو روپے
شاہدہ - انجم۔ ناز وغیرہ کی سیر و تفریح۔ سینما اور کلبوں میں کس بے دردی سے خرچ کئے گئے
یہ تم بہتر جانتے ہو۔ مجھے کیا عِلم تھا کہ یہ جو تُم سوانگ رچا کر پہروں ٹسوے بہا بہا کر اپنی جھوٹی
مُحبّت کا ڈھول پیٹا کرتے تھے ایک دِن میری تباہی اور بربادی کا سامان بن جائے گا۔ تُم
نے عورت کی ذات کو بے وفا کہا ہے۔ مگر کبھی مردوں اور اپنے متعلق بھی تُم نے سوچا ہے؟
کیا یہی مردوں کی وفا کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ دِن دہاڑے کُھلم کُھلا پندرہ پندرہ رُومان لڑا سکتا
ہے۔ میرے خیال میں یہ بھی بزرگوں نے دُرست کہا ہے اور شائد یہ بھی حقیقت ہے کہ عورتوں
کو بگاڑنے میں بھی تم جیسے مکّار اور بدچلن مردوں کا ہی ہاتھ ہوتا ہے ---؟ جسے تم عشق
کہتے ہو وُہ ایک چونچلا ہے۔ ایک ناٹک ہے۔ جو پردہ گرتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ذرا
اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھو تو تمہیں خُود بخود تمہارے کردار ابھرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مختلف
لڑکیوں کی لٹوں کے بال جو تمہارے پاس بطور تحفہ پڑے ہیں اور جن لڑکیوں کو گمراہ کرتے

میں تم بڑی ہوشیاری سے کامیاب ہوئے کیا یہ تمہارے بلند اخلاق و کردار کے مظہر ہیں۔

تمہاری شادی کی خبر سُن کر افسوس ہُوا اور وہ بھی اُس معصوم کلی پر جو تمہاری ہوس کا شکار ہونے والی ہے! تمہاری ماں گھر میں ایک بیوی کے ہوتے ہوئے یہ جو چوتھی شادی آج سیٹھ گٹار ڑوالا کی لڑکی سے کرنے جا رہی ہے وہ محض اپنی پرانی روایات کو قائم رکھنے کے لئے ہے۔ جہیز۔ کاروں۔ کوٹھیوں اور ریڈیو گرام کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے ہے تاکہ تم اور امیر بن کر اُن لڑکیوں کو بھی گمراہ کر سکو جن پر تمہاری نگاہ بد پڑ چکی ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ تمہارا یہ فریب کہاں تک کامیاب ہوگا جبکہ ہر شادی کے چار دن بعد ہی دُلہن ٹھکرا دی جاتی ہے۔

مگر وہ پانچ بچے جو تمہارے سامنے دیوار بننے والے ہیں اور جہاں تمہاری شاطرانہ چالیں ریت کے گھروندوں کی طرح مٹ جانے والی ہیں کیونکہ اُس وقت تم بالکل مجبور اور بے بس ہوگے۔ وہ بیگمات جو آج بالا خانوں کی زینت ہیں اور تمہارے جیسے اوباش انسانوں کی دلجوئی کے لئے اُس کی آہوں، سسکیوں اور رِستے ہوئے ناسور سے گھٹے ہوئے ماحول میں ٹھمری دادرے کی جو داد انہیں ملتی ہے وہ تم جیسے سماج کے ٹھیکیداروں۔ مکّار اور ذلیل انسانوں کے منہ پر ایک ایسی چپت اور پھٹکار ہے کہ تمہارا روم روم کانپ اُٹھے گا۔ جس سماج کو تم ڈھونڈ رہے ہو وہ سماج دراصل تم خود ہی ہو۔ بہتر ہوگا کہ وہ پستول جو بھرا تیار رکھا ہے اپنے سینے میں داغ لو۔۔۔!!

تم آج سماج کی آڑ لے کر جو گناہ کر رہے ہو اُس سے تمہاری رُوح کو کبھی چین نصیب نہ ہوگا یاد ہے تم جذبات میں بہہ کر سماج کی دھجیاں اُڑایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے جب بھی نوجوان لڑکی اور لڑکا آپس میں ملتے ہیں ایک دُوسرے کو والہانہ پیار کرنے لگتے ہیں تو سب سے پہلے سماج ہی اُن کے درمیان روکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ مگر میں نے آج تک کبھی سماج کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اگر کبھی وقت آیا تو میں اُس سماج کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دوں گا۔!! لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ گرجنے والی گھٹا چار قطرے پانی سے بھی محروم ہُوا کرتی ہے؟

آج شائد سماج تمہاری دھجیاں اُڑانے کے لئے پر تول رہا ہے۔

عبدالحئی خاں

شفا گوالیاری

کچھ دن ہوئے کہ سیاست اور ثقافت کی نئی قدروں کے ساتھ ساتھ ادبی فکر، خیال، ہئیت اور اصول کے سانچے بدل گئے۔ غمِ جاناں کی خلش کیا تھا غمِ دوراں کی ہمہ گیری بھی شامل ہو گئی۔ نئی شاعری نے گیسو کھولے۔ رومان اور محبت کی گھنیری چھاؤں میں عوامی احساسات کی نغمگی پھیلی اور فکر کی وسعتوں نے پھیل کر نظم وضبط کی حدوں کا رشتہ توڑ دیا اور انقلاب کے تقاضوں نے شاعری کی بے پناہ قوتوں کو مجتمع کرنا شروع کیا۔ اردو شاعری کو یہ عجیب وغریب توفیق ۱۹۳۶ء میں ملی۔ ۱۹۳۶ء میں ایشیائی ملکوں کی غلامی کا وہ عہد جس میں اس خطۂ ارض کے بسنے والے کروڑوں انسانوں نے آزادی اور حریت کی آواز اٹھائی جس کی گونج سے تاریخ عصر کے اوراق پھڑپھڑانے لگے۔ یہی وہ وقت تھا جبکہ دوسری جنگِ عظیم کے فتنے جاگ رہے تھے۔ معاشی نظام۔ غلامی۔ جہالت اور سامراجیت کی ماری ہوئی دنیا بیدار ہو رہی تھی۔ اردو ادب تیزی سے غیر ملکی اثرات قبول کر رہا تھا۔ یہ اثرات اچھے بھی تھے برے بھی۔ کیونکہ اسی ذہنی ہیجان کے دور میں ہمارے چند افسانہ نگاروں کی افسانوی فضاؤں میں تجزیۂ نفسی کے دریچے کھلے اور جنسی بے راہ روی کا میلان عام ہونا شروع ہوا۔ حقیقت نگاری کا صحت مند رجحان لذت اور بدکاری کا مرتکب ہوا۔ کیٹس کی جمالیات کی روپہلی چاندنی میں "سلمیٰ" کا سربند شباب

محشر بپا کرنے لگا۔ یہ شیریں رومانیت اور رسمی انقلاب کا ہنگامہ اِس دور کے زیادہ تر شعرا کے یہاں مِلے گا۔ بہت کم ایسے تھے جن کی آوازیں مٹھاس، ذہن میں ٹھہراؤ، فکر میں آنچ، لہجہ میں اعتدال اور انداز میں آب وتاب موجود رہی یا جن کی شاعری اور ادبی کاوشوں کا نیا محل قدیم خیالات کے توانا اور صحت مند عناصر کی بنیاد پر قائم ہُوا ہو اور جن کے یہاں تفکر، احساس اور خلوص کی پُرکاری کے ساتھ ساتھ فنکارانہ صلاحیتیں بھی بدرجہ اتم موجود ہو۔ ہمیں اِس روشنی میں چند ہی شعراء مِلتے ہیں اور اِس مختصر فہرست میں شفا گوالیاری کا نام بھی شامل ہے۔ جو آیاتِ شفاء، فیضِ حیات اور شاخِ زیتون جیسے شعری صحیفوں کے خالق اور تغزّل کی دُنیا میں اپنے ہم عصروں میں ایک نمایاں اور اہم مرتبہ کے مالک ہیں۔

ادب کے ایک معلّم کی حیثیت سے جہاں مجھے بہت سی محرومیوں کا دُکھ رہا ہے وہاں یہ بھی ہُوا کہ شفا کے کلام کو ملک کے معیاری رسائل میں پڑھنے اور متاثر ہونے کے باوجود اُن کے کلام کا کوئی مجموعہ حاصل نہ کر سکا۔ اِدھر تین چار ماہ پیشتر مجھے موصوف کی متذکرہ بالا تینوں تصنیفات کے مطالعہ کا موقع مِلا۔ اِن مجموعوں کی ظاہری شکل وصورت اچھی نہیں۔ کیونکہ اُردو حروف کے حسن وآرائش کو اِس بدنام "بُتِ سنگی" کے شکنجے سے چمٹ کر کافی نقصان اُٹھانا پڑا اور جس کے لئے میرے خیال میں ٹائپ بہرحال ایک بہتر صورت ہوتی۔

آیاتِ شفاء پچاس سے زائد غزلوں کا مجموعہ ہے۔ یہ شفا کا نقشِ اوّل ہے۔ اِن غزلوں کے مزاج میں جو لوچ اور بانکپن اور ان کی تہوں میں جو رمزیت، کشادگی اور شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش ہے وہ بلا شُبہ شفا کی صلاحیتوں کے اعتراف پر مجبور کرتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اِن غزلوں کو پے در پے سانحات کا شکار ہونا پڑا اور اِسی لئے کہیں کہیں پران کا رنگ وروغن مسخ ہو گیا ہے۔ اِس کی وجہ یوں ہے کہ شفاء نے جس عہد میں شاعری شروع کی وہ سیاسی اور ہنگامی ہونے کے باوجود قدامت اور روایت کے جام کا آخری گھونٹ پی رہا تھا۔ ادب کی اُونچی دُکانوں پر بیٹھے ہوئے نفوسِ قدسیہ، اچھے یا بُرے شاعر کی میزان سے خرید و فروخت

اور جوڑ توڑ میں مصروف تھے۔ داغ اور امیر کی صحبتوں کے چراغ گُل نہ ہو سکے تھے۔ ریاض کے بوتل کی کاگ اُڑ چکی تھی لیکن فضاء میں خمار جُوں کا تُوں تھا اور حسرت، اصغر اور فانی اپنی تمام خوبیوں کے باوجود عشق کے تجربات۔ تصوف کے اصطلاحات اور "مرمر کے جیئے جانے" کی تمنا لئے کھڑے تھے اور اِن حالات میں شفاء کی شاعری کی پذیرائی ہوئی۔ اِن مضامین کا فطری اثر اُن کی شاعری پر بھی پڑا۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اُنکی شاعری کو یہ داغ لگ گیا۔ ورنہ وہ پاکیزہ تغزل جس کے زور پر شفا کی شاعری کا "غنچہ" وا ہوا تھا اِس آلودگی کی طرف کبھی ہاتھ نہ بڑھاتا۔ وہ ایک سانحہ تھا، ناگزیر سانحہ جو ابتدائے شاعری میں کم و بیش ہر شاعر کے یہاں واقع ہوتا ہے شعرائے اُردو کے دواوین اُٹھاتے جائیے۔ اُنکو چھوڑیئے جن کی شاعری تذکرہ اور تاریخ کے صفحات پُر کرنے کے لئے وجود میں آئی۔ اُن کو لیجئے جن کے فکر و خیال کی تجلیاں، زماں و مکاں کی حدود کو طے کرتی ہوئی ماضی، حال اور مستقبل کی وسیع کائنات پر چمکتی ہیں۔ میری مراد غالب اور اقبال سے ہے۔ اِن عظیم ہستیوں کی ابتدائی شاعری سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُنہوں نے اُس زمانے کے مروجہ اصول شاعری مضامین اور خیالات کی کس حد تک تقلید کی اور کس مقام پر پہنچ کر اُن کے فکر کا پرندہ اُچھل کر آفتاب و ماہتاب کی دُنیاؤں کی سیر کرنے لگا۔ کیا غالب اپنی تمام تر وسیع النظری اور ہمہ گیری کے باوجود اُن پیچ در پیچ، رمزیاتی اور استعاراتی اندازِ شاعری سے آنکھ کھولتے ہی آزاد ہو سکے تھے اور کیا اُنکی بعد کی غزلوں سے جو تازگی اور شگفتگی محسوس ہوتی ہے وہ اُن کے دورِ اوّل کی غزلوں میں موجود ہے۔ اِسی طرح اقبال کو برسوں کی صحرا نوردی کے بعد وہ شاہین مِل سکا جس میں قوت اور عمل کا فولاد تھا اور جو "پنجۂ صیاد" سے آنکھیں لڑا سکتا تھا۔ غرض اِسی طرح ہر شاعر کے ذہن کی ترتیب اور تعمیر کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ قانونِ حیاتیات کی طرح طفلی سے جوانی کی طرف تقلید سے تجدید کی طرف۔ اطاعت سے سرکشی کی طرف۔ اِس سے میرا مقصد اقبال اور غالب جیسے عظیم شعراء پر بحث کرنا نہیں بلکہ گفتگو یوں تھی کہ شفا نے بھی ابتدائے شاعری میں اُن شعرا کی تقلید کی جن کے ہاتھوں حسین غزل کی حرمت بگڑ رہی تھی اور جو

غزل پر "رمزیت" کے ہیپناٹزم HYPNOTISM کا گہرا عمل کر کے اُسے "ماسوا" اور "ماورا" کے دھندلکوں میں بھیج چکے تھے۔ لیکن شفا کے یہاں یہ تقلید، نری تقلید بھی نہیں۔ کیونکہ "آیاتِ شفا" کے ہر شعر سے شاعری کی منفرد صلاحیتوں کا رس ٹپک رہا ہے اور انکی قادر الکلامی، صلاحیت اور نظم کی قوتوں کی بشارت بھی ملتی ہے۔ وہ تصوف کی بےخودی اور بے ہمگی کے راستے ہوں یا تقدیر کی جباری غم کی نمناکی ہو یا موت کا اندیشہ۔ کوئی بھی مضمون ہو شفا کی زخمی صلاحیتوں نے اپنی پوری قوت کا مظاہرہ کیا ہے۔ شاعری ایک فطری قوت ہے جو اپنی توانائی اور لچک کے ہاتھوں اگر توپوں کے دہانے بند کر سکتی ہے تو مژگان کی نوک سے پتھر کا دل پانی پانی کر سکتی ہے۔ یہ جوش و خروش، اضطراب و اضطرار، ہنگامہ و وحشت، جنوں و آگہی کی منزلوں سے چل کر مشاہدہ و تجربہ کی زمینوں سے پھوٹتی ہے۔ جیسے کہ آتش فشاں پہاڑ یا جادو کا درخت۔ مشاہدہ و تجربہ کے ضمن میں یہ بات بھی یاد آگئی کہ عشق اور معاملاتِ عشق کے وہ مضامین جو غالب، مومن اور حسرت کے یہاں تجربہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن تجربوں کی فضاء میں ان شعراء کی غزلوں میں جو شگفتگی، سپردگی، شکست، گداخت، اور سوز محسوس ہوتا ہے اور جن کی وسیع وادیوں میں ان بزرگوں کے فکر کی جوئبار ملتی ہے۔ وہ تجربہ شفا کے یہاں ہے ہی نہیں۔ "آیاتِ شفا" تو مجھے بار بار یقین دلاتی ہیں کہ شفاء نے کوئی عشق نہیں کیا ان کا عشق سنا سنایا ہے ورنہ وہ آتش فشانی، وہ توپوں کے دہانے بند کرنے والی اور مژگان کی نوک سے پتھر کا دل پانی پانی کرنے والی شاعری ضرور ملتی اور آیاتِ شفاء کے اشعار ان کے اس "کفر" کو خدا خدا کر کے توڑتے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ وہ شاعری کی روح اور قوت لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ آیاتِ شفاء کے مطالعہ سے ہمیں مسرت ہوتی ہے کہ عشق، تصوف، تقدیر اور اسی طرح کے مضامین سے پُر ہونے کے باوجود ایک اچھا مجموعۂ کلام ہے جسمیں کہیں کہیں پر اشعار میں وہ تیکھاپن ہے جو دل کی دنیا بدل دے مگر زبان نہ کھلوائے۔

تصوف پر میرا مطالعہ وسیع نہیں۔ پھر بھی میں نے مطالعہ کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ ان وادیوں کے حال و قال میں جذب ہو کر بہت سے بہترین دماغوں سے دنیا محروم ہو گئی۔

رہبانیت اور فرار کے طریقوں نے بعض صُوفیائے کرام کے نفس کو آسُودہ ضرور کیا ہے۔ اُن کے جذبۂ تصوف کو اطمینان ضرور مِلا۔ لیکن عین خدائی نافرمانی کا سبب بھی بنا۔ تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں مگر یہ خیریت گذری کہ شفاؔ بہت جلد اس بادہ کے نشہ سے آزاد ہو گئے۔ پھر بھی اِس کے اثر سے اُن کی اِبتدائی شاعری آزاد نہ رہ سکی۔

نقاب اُٹھاؤ، تمہیں آج کھُل کے دیکھیں گے ∴ وُہ ہونگے اور جو تابِ جمال لا نہ سکے

نظر والے نہیں کرتے ہیں تکلیفِ جہاں گردی ∴ اُٹھا کر ایک ذرّہ نقشِ دُنیا دیکھ لیتے ہیں

اُس جگہ پہنچا ہُوں آخر بیخودیٔ عشق میں ∴ جس جگہ خود میری ہستی بھی نہ پہچانی مجھے

کسی کی کیا خطا، پردہ ہے خود اپنی نگاہ ہی کا ∴ وُہ پردے میں نہاں کب ہے وہ پردے میں عیاں ہو کر

وُہ ہر جگہ مکیں ہیں کلی ہو کہ پھُول ہو! ∴ یعنی وہاں نہاں ہیں جہاں سے عیاں نہیں

اِسی طرح غم سے متعلق اُن کے یہاں جابجا اشعار مِلتے ہیں۔ آیاتِ شفاؔ کی غزلوں میں غم کی بوندیں ہر صفحہ پر ملتی ہیں۔ غم ایک ناگزیر، اضطراری کیفیت کا نام ہے۔ جِس کا رسمی یا جبری اظہار شاعر کی مجبُوری اور بے بسی کا پتہ دیتا ہے۔ غم کے مختلف عناصر ہیں۔ کبھی کبھی غمِ جاناں سے غمِ دوراں اور غمِ دوراں سے غمِ آفاق تک اِس کے سِلسلے پھیل جاتے ہیں۔ لیکن اِن سب کیفیتوں میں غم کے تجربہ اور تلخی سے لُطف لینا اور اُس کی پہنائیوں میں عزم و دلولہ کے جبر و مقابلہ کی کسی نامعلوم مقدار کی قُوتوں کی تلاش کرنا ایک بہت بڑے جری شاعر کا کام ہے۔ مَیں نہیں کہتا کہ شفاؔ میں یہ جُرأت اور پُرکاری ملتی ہے کیونکہ جیسا کہ مَیں پہلے کہہ چکا ہُوں آیاتِ شفاؔ رسمی روایاتی اور قدامت پسند شاعری کی تُربت کی نوحہ خواں ہے۔ جسے اُس دور کے بُزرگ شعراء کے احترام اور تتبّع کی گوناں نے "طاقتِ پرِ پرواز" سے محروم کر رکھا ہے۔ پھر بھی ایک اُداس فضا کا شاعرانہ اظہار ضرور مِلتا ہے اور اسی طرح چند در چند خیالات کے حامل وہ غزلیں ہیں جِن میں بعض اچھے اشعار بھی ہیں۔ مثلاً :۔

جب شبِ غم بجھنے لگتا ہے دلِ ناکامیاب ∴ کوئی تاریکی میں چُپکے سے بڑھا دیتا ہے لَو

(باقی صفحہ ۷۷۴ پر)

راجندر سنگھ بیدی

اپنے دُکھ مجھے دے دو

شادی کی رات بالکل وُہ نہ ہُوا جو مدن نے سوچا تھا۔

جب چکلی بھابی نے پھسلا کر مدن کو بیچ والے کمرے میں دھکیل دیا اور اندر سامنے شالو میں لپٹی ہوئی اندھیرے کا بھاگ بنی جا رہی تھی۔ باہر چکلی بھابی، دریا باد والی پھُوپھی اور دُوسری عورتوں کی ہنسی رات کے خاموش پانیوں میں مصری کی طرح دھیرے دھیرے گھُل رہی تھی۔ عورتیں سب یہی سمجھتی تھیں اتنا بڑا ہو جانے پر بھی مدن کچھُ نہیں جانتا کیونکہ جب اسے بیچ رات کے نیند سے جگایا گیا تو وُہ ہڑبڑا رہا تھا — "کہاں کہاں لئے جا رہی ہو مجھے؟"

ان عورتوں کے اپنے اپنے دِن بیت چُکے تھے۔ پہلی رات کے بارے میں ان کے شریر شوہروں نے جو کچھُ کہا اور مانا تھا اس کی گُونج تک ان کے کانوں میں باقی نہ رہی تھی۔ وُہ خود رس بس چُکی تھیں اور اب اپنی ایک اور بہن کو بسانے پر تُلی ہوئی تھیں۔ زمین کی یہ بیٹیاں مرد کو تو یُوں سمجھتی تھیں جیسے بادل کا ٹکڑا ہے۔ جس کی طرف بارش کے لئے مُنہ اُٹھا کر دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ نہ برسے تو منتیں ماننی پڑتی ہیں۔ چڑھاوے چڑھانے پڑتے ہیں۔ جادُو ٹُونے کرنے پڑتے ہیں۔ حالانکہ مدن کالکا جی کی اس نئی آبادی میں گھر کے سامنے کھُلی جگہ میں پڑا اُسی وقت کا مُنتظر تھا۔ پھر شامتِ اعمال پڑوسی سبطے کی بھینس اس کی کھاٹ ہی کے پاس بندھی تھی جو بار بار پھنکارتی ہوئی مدن کو سُونگھ جاتی تھی اور

وہ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر اسے دُور رکھنے کی کوشش کرتا ———— ایسے میں بھلا نیند کا سوال ہی کہاں تھا؟

سمندر کی لہروں اور عورت کے خون کو باستہ بنانے والا چاند، ایک کھڑکی کے راستے سے اندر چلا آیا تھا اور دیکھ رہا تھا - دروازے کے اس طرف کھڑا مدن اگلا قدم کہاں رکھتا ہے۔ مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اسے اپنا آپ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلی کا کھمبا ہے جسے کان لگانے سے اسے اندر کی سنسناہٹ سنائی دے جائیگی۔ کچھ دیر یونہی کھڑے رہنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر پلنگ کو کھینچ کر چاندنی میں کر دیا تاکہ دُلہن کا چہرہ تو دیکھ سکے۔ پھر وہ ٹھٹھک گیا۔ جبھی اُس نے سوچا — اندو میری بیوی ہے، کوئی پرائی عورت تو نہیں جسے نہ چھُونے کا سبق بچپن ہی سے پڑھتا آیا ہوں ———— شالو میں لپٹی ہوئی دُلہن کو دیکھتے ہوئے اس نے فرض کر لیا، وہاں اندو کا منہ ہوگا اور جب ہاتھ بڑھا کر اس نے پاس پڑی گٹھڑی کو چھوا تو وہیں اندو کا منہ تھا..... مدن نے سوچا تھا وہ آسانی سے مجھے اپنا آپ نہ دیکھنے دیگی۔ لیکن اندو نے ایسا کچھ نہ کیا جیسے پچھلے کئی سالوں سے وہ بھی اسی لمحے کی منتظر ہو اور کسی خیالی بھینس کے سونگھتے رہنے سے اسے بھی نیند نہ آرہی ہو۔ غائب نیند اور بند آنکھوں کا کرب، اندھیرے کے باوجود سامنے پھڑپھڑاتا ہوا نظر آرہا تھا۔ ٹھوڑی تک پہنچتے ہوئے عام طور پر چہرہ لمبوترا ہو جاتا ہے لیکن یہاں تو سبھی گول تھا۔ شاید اسی لئے چاندنی کی طرف گال اور ہونٹوں کے بیچ ایک سائے دار کھوہ سی بنی ہوئی تھی۔ جیسی دو سرسبز اور شاداب ٹیلوں کے بیچ ہوتی ہے۔ ماتھا کچھ تنگ تھا لیکن اس پر سے ایکا ایکی اُٹھتے والے گھنگھریالے بال ————

جبھی اندو نے اپنا چہرہ چھڑا لیا جیسے وہ دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہو لیکن اتنی دیر کے لئے نہیں۔ آخر شرم کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ مدن نے ذرا سخت ہاتھوں سے یونہی سی ہوں ہاں کرتے ہوئے دُلہن کا چہرہ پھر سے اُوپر کو اٹھا دیا اور شرابی سی آواز میں کہا۔

"اندو!"

اندو کچھ ڈر سی گئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی اجنبی نے اس کا نام اس انداز سے پکارا تھا اور وہ اجنبی کسی خدائی حق سے رات کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ، اس اکیلی، بے یار و مددگار عورت کا اپنا ہوتا جا رہا تھا۔ اندو نے پہلی بار ایک نظر اوپر دیکھتے ہوئے پھر آنکھیں بند کر لیں اور صرف اتنا سا کہا "جی!" ۔۔۔ اسے خود اپنی آواز کسی پاتال سے آتی ہوئی سنائی دی۔

دیر تک کچھ ایسا ہی ہوتا رہا اور پھر ہولے ہولے بات چل نکلی، اب جو چلی سو چلی وہ تھمنے ہی میں نہ آتی تھی۔ اندو کے پتا، اندو کی ماں، اندو کے بھائی، مدن کے بھائی بہن، باپ، ان کی ریلوے میل سروس کی نوکری، ان کے مزاج، کپڑوں کی پسند، کھانے کی عادت، سبھی کچھ کا جائزہ لیا جانے لگا۔ بیچ بیچ میں مدن بات چیت کو توڑ کر کچھ اور ہی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اندو طرح دے جاتی تھی۔ انتہائی مجبوری اور لاچاری میں مدن نے اپنی ماں کا ذکر چھیڑ دیا جو اسے سات سال کی عمر میں چھوڑ کر دق کے عارضے میں چلتی بنی تھی۔ "جتنی دیر زندہ رہی بےچاری،" مدن نے کہا۔ "بابوجی کے ہاتھ میں دوائی کی شیشیاں رہیں۔ ہم اسپتال کی سیڑھیوں پر اور چھوٹا پاشی گھر میں چیونٹیوں کے بل پر سوتے رہے اور آخر ایک دن ۔۔۔ ۲۸ مارچ کی شام ۔۔۔" اور مدن چپ ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ رونے سے ذرا ادھر اور گھگھی سے ذرا ادھر پہنچ گیا۔ اندو نے گھبرا کر مدن کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اس رونے نے پل بھر میں اندو کو بھی اپنے پن سے ادھر اور بیگانے پن سے ادھر پہنچا دیا تھا ۔۔۔۔ مدن اندو کے بارے میں کچھ اور بھی جاننا چاہتا تھا لیکن اندو نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور کہا۔ "میں تو پڑھی لکھی نہیں ہوں جی ۔۔۔ پر میں نے ماں باپ دیکھے ہیں، بھائی اور بھابیاں دیکھی ہیں بیسیوں اور لوگ دیکھے ہیں۔ اس لئے میں کچھ سمجھتی بوجھتی ہوں ۔۔۔۔ میں اب تمہاری ہوں ۔۔۔ اپنے بدلے میں تم سے ایک ہی چیز مانگتی ہوں۔"

روتے وقت اور اس کے بعد بھی ایک نشہ سا تھا۔ مدن نے کچھ بے صبری اور کچھ دریا دلی کے ملے جلے شبدوں میں کہا۔ "کیا مانگتی ہو؟ تم جو کچھ کہوگی میں دوں گا۔"

"پکی بات؟" اندو بولی۔

مدن نے کچھ اُتاولے ہو کر کہا — "ہاں ہاں — کہا جو پکّی بات۔"

لیکن اس بیچ میں مدن کے من میں ایک وسوسہ آیا — میرا کاروبار پہلے ہی مندا ہے اگر اندو کوئی ایسی چیز مانگ لے جو میری پہنچ ہی سے باہر ہو تو پھر کیا ہوگا؟ لیکن اندو نے مدن کے سخت اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ملائم ہاتھوں میں سمیٹتے اور اُن پر اپنے گال رکھتے ہوئے کہا —

"تم اپنے دُکھ مجھے دے دو۔"

مدن سخت حیران ہوا ساتھ ہی اسے اپنے آپ سے ایک بوجھ بھی اُترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پھر چاندنی میں ایک بار اندو کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ جان پایا۔ اُس نے سوچا یہ ماں یا کسی سہیلی کا رٹا ہوا فقرہ ہوگا جو اندو نے کہہ دیا۔ جبھی ایک جلتا ہوا آنسو مدن کے ہاتھ کی پُشت پر گرا۔ اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا — "ویسے — !" لیکن ان سب باتوں نے مدن سے اس کی ہیمیت چھین لی تھی۔

مہمان ایک ایک کر کے سب رُخصت ہوئے۔ چکلی بھابی دو بچّوں کو اُنگلیوں سے لگائے سیڑھیوں کی اُونچ نیچ سے تیسرا پیٹ سنبھالتی ہوئی چل دی۔ دریاباد والی پھُوپھی جو اپنے "نو لکھے" ہار کے گُم ہو جانے پر شور مچاتی، واویلا کرتی ہوئی بیہوش ہو گئی تھی اور جو غُسل خانے میں پڑا مل گیا تھا جہیز میں سے اپنے حصّے کے تین کپڑے لے کر چلی گئی۔ پھر چاچا گئے جن کو ان کے جے پی ہونے کی خبر تار کے ذریعے سے ملی تھی اور جو شاید بدحواسی میں مدن کی بجائے دلہن کا مُنہ چُومتے چلے تھے۔

گھر میں بوڑھا باپ رہ گیا تھا اور چھوٹے بہن بھائی۔ چھوٹی دُلاری تو ہر وقت بھابی کی بغل ہی میں گھسی رہتی۔ گلی محلّے کی کوئی عورت دُلہن کو دیکھے یا نہ دیکھے، دیکھے تو کتنی دیر تک دیکھے، یہ سب اس کے اختیار میں تھا۔ آخر یہ سب ختم ہوا اور اندو آہستہ آہستہ پرانی ہونے لگی۔ لیکن کالکاجی کی

اس نئی آبادی کے لوگ اب بھی آتے جاتے مدن تو اس کے سامنے رُک جاتے اور کسی بھی بہانے سے اندر چلے آتے۔ اندو انہیں دیکھتے ہی ایک دم گھونگھٹ کھینچ لیتی لیکن اس چھوٹے سے وقفے میں انہیں جو کچھ دکھائی دے جاتا وہ بنا گھونگھٹ کے دکھائی ہی نہ دے سکتا تھا۔

مدن کا کاروبار گندے بروزے کا تھا۔ کہیں بڑی سپلائی والے دو تین جنگلوں میں چیڑ اور دیودار کے پیڑوں کو جنگل کی آگ نے آ لیا تھا اور وہ دھڑ دھڑ جلتے ہوئے خاک سیاہ ہو کر رہ گئے تھے۔ میسور اور آسام کی طرف سے منگوایا ہوا بروزہ مہنگا پڑتا تھا اور لوگ اسے مہنگے داموں خریدنے کو تیار نہ تھے۔ ایک تو آمدنی کم ہو گئی تھی اس پر مدن جلدی ہی دکان اور اس کے ساتھ والا دفتر بند کر کے گھر چلا آتا۔ گھر پہنچ کر اس کی ساری کوشش یہی ہوتی کہ سب کھائیں پئیں اور اپنے اپنے بستروں میں دبک جائیں۔ جبھی وہ کھاتے وقت خود تھالیاں اُٹھا اُٹھا کر باپ اور بہن کے سامنے رکھتا اور ان کے کھا چکنے کے بعد جھوٹے برتنوں کو سمیٹ کر نل کے نیچے رکھ دیتا۔ سب سمجھتے ہوئے بھابی نے مدن کے کان میں کچھ پھونکا ہے اور اب وہ گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ مدن سب سے بڑا تھا، کندن اس سے چھوٹا اور پاشی سب سے چھوٹا۔ جب کندن بھابی کے سواگت میں سب کے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے پر اصرار کرتا تو باپ دھنی رام وہیں ڈانٹ دیتا ——
"کھاؤ تم ——" وہ کہتا۔ "وہ بھی کھا لیں گے۔" اور پھر رسوئی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا اور جب بہو کھانے پینے سے فارغ ہو جاتی اور برتنوں کی طرف متوجہ ہوتی تو بابو دھنی رام اسے روکتے ہوئے کہتے۔ "رہنے دو بہو برتن صبح ہو جائیں گے۔"

اندو کہتی۔ "نہیں بابوجی —— میں ابھی کئے دیتی ہوں جھپاکے سے۔"

تب بابو دھنی رام ایک لرزتی ہوئی آواز میں کہتے۔ "مدن کی ماں ہوتی تھی، تو یہ سب تمہیں کرنے دیتی؟" ...... اور اندو ایک دم اپنے ہاتھ روک لیتی۔

چھوٹا پاشی بھابی سے شرماتا تھا۔ اس خیال سے کہ دلہن کی گود جھٹ سے ہری ہو، چکلی بھابی اور دریا باد والی پھوپھی نے ایک رسم میں پاشی ہی کو اندو کی گود میں ڈالا تھا، جب سے اندو

اسے نہ صرف دیور بلکہ اپنا بچّہ سمجھنے لگی تھی۔ جب بھی وہ پیار سے پاشی کو بازوؤں میں لینے کی کوشش کرتی تو وہ گھبرا اُٹھتا اور اپنا آپ چھُڑا کر دو ہاتھ کی دُوری پر کھڑا ہو جاتا، دیکھتا اور ہنستا رہتا۔ پاس آتا نہ دُور ہٹتا۔ ایک عجیب اتفاق سے ایسے میں بابُوجی ہمیشہ وہیں موجود ہوتے اور پاشی کو ڈانٹتے ہوئے کہتے۔ "ارے جا نا۔ بھابی پیار کرتی ہے، ابھی سے مرد ہو گیا ہے تو؟"......

اور دُلاری تو پیچھا ہی نہ چھوڑتی۔ اس کے "مَیں تو بھابی کے ساتھ ہی سوؤں گی۔" کے اصرار نے بابُوجی کے اندر کوئی جناردھن جگا دیا تھا۔ ایک رات اسی بات پہ دلاری کو زور سے چپت پڑی اور وہ گھر کی آدھی کچّی آدھی پکّی نالی میں جا گری۔ اندو نے لپکتے ہوئے پکڑا تو سر پر سے دوپٹہ اُڑ گیا۔ بالوں کے پھول اور چڑیاں، مانگ کا سیندور، کانوں کے کرن پھول سب ننگے ہو گئے۔ "بابُوجی!" اندو نے سانس کھینچتے ہوئے کہا......۔ ایک ساتھ دُلاری کو پکڑنے اور سر پر دوپٹہ اوڑھنے میں اندو کے پسینے چھُوٹ گئے۔ اس بے ماں کی بچّی کو چھاتی کے ساتھ لگائے ہوئے اندو نے اسے ایک ایسے بستر میں سلا دیا جہاں سرہانے ہی سرہانے، تکیے ہی تکیے تھے۔ نہ کہیں پائنتی تھی نہ کاٹھ کے بازو، جوڑ تو ایک طرف کہیں کوئی چُبھنے والی چیز بھی نہ تھی۔ پھر اندو کی انگلیاں دلاری کے پھوڑے ایسے سر پر چلتی ہوئی اسے دُکھا بھی رہی تھیں اور مزا بھی دے رہی تھیں۔ دلاری کے گالوں پر بڑے بڑے اور پیارے پیارے گڑھے پڑتے تھے۔ اندو نے ان گڑھوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہائے ری منّی تیری ساس مرے۔ کیسے گڑھے پڑ رہے ہیں گالوں پر ——!"

منّی نے منّی کی طرح کہا۔ "گڑھے تمہارے بھی تو پڑتے ہیں بھابی۔"

"ہاں منّو!" اندو نے کہا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

مدن کو کسی بات پر غصّہ تھا، وہ پاس ہی کھڑا سب کچھ سن رہا تھا، بولا۔ "مَیں تو کہتا ہُوں ایک طرح سے اچھّا ہی ہے۔"

"کیوں اچھّا کیوں ہے؟" اندو نے پوچھا۔

"ہاں —— نہ اُگے بانس نہ بجے بانسری...... ساس نہ ہو تو کوئی جھگڑا ہی نہیں رہتا۔"

اندو نے ایکا ایکی خفا ہوتے ہوئے کہا "تم جاؤ جی، سو رہو جا کے ..... بڑے آئے ہ ..... آدمی جیتا ہے تو لڑتا ہے نا؟ مرگھٹ کے جیسے چاپ سے جھگڑے بیٹھے۔ جاؤ نا، رسوئی میں تمہارا کیا کام ؟"

مدن کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ بابو دھنی رام کی ڈانٹ سے باقی بچے تو پہلے ہی سے اپنے اپنے بستروں میں یوں جا پڑے تھے جیسے دفتر میں چٹھیاں سارٹ ہوتی ہیں۔ لیکن مدن وہیں کھڑا رہا۔ احتیاج نے اسے ڈھیٹ اور بے شرم بنا دیا تھا لیکن اس وقت جب اندو نے بھی اسے ڈانٹ دیا تو وہ روہانسا ہو کر اندر چلا گیا۔

دیر تک مدن بستر میں پڑا کسمساتا رہا۔ لیکن بابوجی کے خیال سے اندو کو آواز دینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کی بے صبری کی حد ہو گئی جب منی کو سلانے کے لئے اندو کی لوری سنائی دی "تو آنند یا رانی، بورائی ستانی۔"

یہی لوری جو دلاری منی کو سلا رہی تھی، مدن کی نیند بھگا رہی تھی۔ اپنے آپ سے بیزار ہو کر اس نے زور سے چادر سر پر کھینچ لی۔ سفید چادر کے سر پر لپیٹنے اور سانس بند کرنے سے خواہ مخواہ ایک مُردے کا تصور پیدا ہو گیا۔ مدن کو یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہے اور اس کی دلہن اندو اس کے پاس بیٹھی زور زور سے سر پیٹ رہی ہے، دیوار کے ساتھ کلائیاں مار مار کر چوڑیاں توڑ رہی ہے اور پھر گرتی پڑتی، روتی چلاتی رسوئی میں جاتی ہے اور چولہے کی راکھ سر پر ڈال لیتی ہے، پھر باہر لپک جاتی ہے اور باہیں اٹھا اٹھا کر گلی محلے کے لوگوں سے فریاد کرتی ہے "لوگو! میں لٹ گئی" اب اسے دوپٹے کی پرواہ نہیں، قمیص کی پروا نہیں، مانگ کا سیندور، بالوں کے پھول اور چڑیاں جذبات اور خیالات کے طوطے تک اڑ چکے ہیں ----

مدن کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے۔ حالانکہ رسوئی میں اندو ہنس رہی تھی۔ پل بھر میں اپنے سہاگ کو اجڑتے اور پھر بس جانے سے بے خبر۔ مدن جب حقائق کی دنیا میں آیا تو آنسو پونچھتے ہوئے اپنے اس رونے پر ہنسنے لگا ..... ادھر اندو ہنس تو رہی تھی لیکن اس کی

ہنسی دبی دبی تھی۔ باؤجی کے خیال سے وہ کبھی اُونچی آواز میں نہ ہنستی تھی، جیسے کھلکھلاہٹ کوئی ننگا پن ہے، خاموشی۔ دوپٹہ اور دبی دبی ہنسی ایک گھونگھٹ۔ پھر مدن نے اندو کا ایک خیالی بُت بنایا اور اس سے بیسیوں باتیں کر ڈالیں۔ یوں اس سے پیار کیا جیسے ابھی تک نہ کیا تھا۔۔۔۔ وہ پھر اپنی دُنیا میں لوٹا جس میں ساتھ کا بستر خالی تھا۔ اس نے ہولے سے آواز دی۔ — اندو! اور پھر چپ ہو گیا۔ اس اُدھیڑ بُن میں وہ بورائی مستانی نندیا اس سے بھی لپٹ گئی — ایک اُونگھ سی آئی لیکن ساتھ ہی یوں لگا جیسے شادی کی رُت والی، پڑوسی سیٹھے کی بھینس مُنہ کے پاس پھنکارنے لگی ہے۔ وہ ایک بے کلی کے عالم میں اُٹھا، پھر رسوئی کی طرف دیکھتے، سر کو کھجاتے دو تین، جماہیاں لے کر لیٹ گیا — سو گیا —

مدن جیسے کانوں کو کوئی سندیسہ دے کر سویا تھا۔ جب اندو کی چوڑیاں بستر کی سلوٹیں سیدھی کرنے کے لئے کھنک اُٹھیں تو وہ بھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ یوں ایکدم جاگنے میں محبت کا جذبہ اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ پیار کی کروٹوں کو توڑے بغیر آدمی سو جائے اور ایکا ایکی اُٹھے تو محبت دم توڑ دیتی ہے۔ مدن کا سارا بدن اندر کی آگ سے پھنک رہا تھا اور یہی اس کے غصّے کا کارن بن گیا۔ جب اس نے کچھ بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"سو — تم آگئیں؟"

"ہاں!"

"مُنّی — سو گئی؟"

اندو جھکی جھکی ایکدم سیدھی کھڑی ہو گئی۔ "ہائے رام!" اس نے ناک پر اُنگلی رکھتے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "کیا کہہ رہے ہو۔۔۔۔ مرے کیوں بیچاری، ماں باپ کی ایک ہی بیٹی۔"

"ہاں —!" مدن نے کہا۔ "بھابی کی ایک ہی نند۔" اور پھر ایک دم تحکمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "زیادہ منہ مت لگاؤ اس چڑیل کو۔"

"کیوں اس میں کیا پاپ ہے؟"

"یہی پاپ ہے۔" مدن نے اور چڑتے ہوئے کہا۔ "وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تمہارا۔ جب دیکھو جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہے۔ دفان ہی نہیں ہوتی۔"

"ہا ——" اندو نے مدن کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بہنوں اور بیٹیوں کو یُوں تو دھتکارنا نہیں چاہیئے۔ بے چاری دو دن کی مہمان۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں ایک دن چل ہی دیگی۔" اس کے بعد اندو کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں، باپ، بھائی، بہن، چچا، تایا سبھی گھوم گئے۔ کبھی وہ بھی ان کی دلاری تھی جو پلک جھپکتے ہی نیاری ہو گئی اور پھر دن رات اس کے نکالے جانے کی باتیں ہونے لگیں، جیسے گھر میں کوئی بڑی سی بانبی ہے جس میں کوئی ناگن رہتی ہے اور جب تک وہ پکڑ کر پھنکوائی نہیں جاتی گھر کے لوگ آرام کی نیند سو نہیں سکتے۔ دُور دُور سے کیلنے والے، نتھنے کرنے والے، دنت پھوڑنے والے ماندری بلوائے گئے۔ بڑے بڑے دھنونتری اور موتی ست گر —— آخر ایک دن اُتّر پچھم کی طرف سے لال آندھی آئی جو صاف ہوئی تو ایک لاری کھڑی تھی۔ جس میں گوٹے کناری میں لپٹی ہوئی ایک دُلہن بیٹھی تھی، پیچھے گھر میں، ایک سُر پر بجتی ہوئی شہنائی بین کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ پھر ایک دھچکے کے ساتھ لاری چل دی......

مدن نے کچھ برافروختگی کے عالم میں کہا —— "تم عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہو۔ ابھی کل ہی اس گھر میں آئی ہو اور یہاں کے سب لوگ تمہیں ہم سے زیادہ پیارے لگنے لگے؟"

"ہاں!" اندو نے اثبات سے کہا۔

"یہ سب جھوٹ ہے..... یہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تمہارا مطلب ہے میں ——"

"دکھاوا ہے یہ سب —— ہاں!"

"اچھا جی!؟" اندو نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا۔ "یہ سب دکھاوا ہے میرا؟" اور اندو اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی اور سرہانے میں مُنہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ مدن

اسے منانے ہی والا تھا کہ اندو خود ہی اُٹھ کر مدن کے پاس آگئی اور سختی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی — "تم جو ہر وقت جلی کٹی کہتے رہتے ہو — ہوا کیا ہے تمہیں؟" ...... شوہرانہ رعب داب کے لئے مدن کے ہاتھ بہانہ آگیا۔ "جاؤ جاؤ — مدن نے کہا — "مجھے تم سے کچھ نہیں لینا۔"

"تمہیں کچھ نہیں لینا۔ مجھے تو لینا ہے۔" اندو بولی۔ "زندگی بھر لینا ہے۔" اور وہ چھینا جھپٹی کرنے لگی۔ مدن اُسے دھتکارتا تھا اور وہ اس سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ وہ اس مچھلی کی طرح تھی جو بہاؤ میں بہہ جانے کی بجائے آبشار کے تیز دھارے کو کاٹتی ہوئی اُوپر ہی اُوپر پہنچنا چاہتی تھی۔ چٹکیاں لیتی، ہاتھ پکڑتی، روتی ہنستی وہ کہہ رہی تھی ——

"پھر مجھے 'پھاپھا کٹنی' کہو گے؟"

"وہ تو سبھی عورتیں ہوتی ہیں۔"

"ٹھہرو — تمہاری تو —" یوں معلوم ہوا جیسے اندو کوئی گالی دینے والی ہو — اور اس نے منہ میں کچھ منمنایا بھی۔ مدن نے مڑتے ہوئے کہا "کیا کہا؟" اور اندو نے اب کے سنائی دینے والی آواز میں دہرا دیا۔ مدن کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اگلے ہی لمحے میں اندو مدن کے بازوؤں میں تھی اور کہہ رہی تھی "تم مرد لوگ کیا جانو؟ — جس سے پیار ہوتا ہے اس کے سبھی عزیز پیارے معلوم ہوتے ہیں، کیا باپ، کیا بھائی اور کیا بہن ——" اور پھر ایکا ایکی کہیں دور دیکھتی ہوئی بولی — "میں تو دُلاری منی کا بیاہ کروں گی۔"

"حد ہوگئی۔" مدن نے کہا۔ "ابھی ایک ہاتھ کی ہوئی نہیں اور بیاہ کی بھی سوچنے لگیں۔"

"تمہیں ایک ہاتھ کی دکھتی ہے نا؟" اندو بولی اور پھر اپنے دونوں ہاتھ مدن کی آنکھوں پر رکھتی ہوئی کہنے لگی۔ "ذرا آنکھیں بند کرو اور پھر کھولو ——" مدن نے سچ مچ ہی آنکھیں بند کر لیں اور جب کچھ دیر تک نہ کھولیں تو اندو بولی — "اب کھولو بھی۔ ..... اتنی دیر میں تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔" جبھی مدن نے آنکھیں کھول دیں۔ لمحہ بھر کے لئے اسے یوں لگا جیسے

سامنے اندو نہیں مُنی بیٹھی ہے اور وُہ کھو سا گیا ——

"مَیں نے تو ابھی سے چار سُوٹ اور کچھ برتن الگ کر ڈالے ہیں اِس کے لئے۔" اندو نے کہا اور جب مدن نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ "تم کیوں پریشان ہوتے ہو... یاد نہیں اپنا وچن؟ —— تم اپنے دُکھ مجھے دے چکے ہو۔"

"ایں؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا اور جیسے بے فکر سا ہو گیا لیکن اب کے جب اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹایا تو وہاں ایک جسم ہی نہیں رہ گیا تھا ساتھ ایک روح بھی شامل ہو گئی تھی۔

مدن کے لئے اِندو روح ہی روح تھی۔ اندو کے جسم بھی تھا لیکن وُہ ہمیشہ کسی نہ کسی وجہ سے مدن کی نظروں سے اوجھل ہی رہا —— ایک پردہ تھا، خواب کے تاروں سے بُنا ہوا، آہوں کے دھوئیں سے رنگین، قہقہوں کی زرتاری سے چکاچوند، جو ہر وقت اندو کو ڈھانپے رہتا تھا۔ مدن کی نِگاہوں اور اس کے ہاتھوں کے دوشاسن صدیوں سے اس دروپدی کا چیر ہرن کرتے آئے تھے جو کہ عرفِ عام میں بیوی کہلاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ اسے آسمانوں سے تھانوں کے تھان، گزوں کے گز کپڑا ننگاپن ڈھانپنے کے لئے مِلتا آیا تھا۔ دوشاسن تھک ہار کے یہاں وہاں گرے پڑے تھے لیکن دروپدی وہیں کھڑی تھی عزت اور پاکیزگی کی سفید ساری میں ملبوس وُہ دیوی لگ رہی تھی اور ——

مدن کے لوٹتے ہوئے ہاتھ خجالت کے پسینے سے تر ہوتے۔ جسے سُکھانے کے لئے وہ انہیں اوپر ہوا میں اُٹھا دیتا اور پھر ہاتھ کے پنجوں کو پُورے طور پر پھیلاتا ہوا، ایک تشنجّی کیفیت میں اپنی آنکھوں کی پھیلتی پِٹتی ہوئی پتلیوں کے سامنے رکھ دیتا اور پھر اُنگلیوں کے بیچ میں سے جھانکتا —— اندو کا مرمریں جسم، خوش رنگ اور گداز سامنے پڑا ہوتا۔ استعمال کے لئے پاس ابتذال کے لئے دور ...... کبھی جب اندو کی ناکہ بندی ہو جاتی تو اس قسم کے فقرے ہوتے ——

"ہائے جی! گھر میں چھوٹے بڑے سبھی ہیں، وہ کیا کہیں گے؟"

مدن کہتا۔ "چھوٹے سمجھتے نہیں — بڑے انجان بن جاتے ہیں۔"

اسی دوران میں بابو دھنی رام کی تبدیلی سہارنپور ہو گئی۔ وہاں وہ ریلوے میل سروس میں سلیکشن گریڈ کے ہیڈ کلرک ہو گئے۔ اتنا بڑا کوارٹر ملا کہ اسمیں آٹھ کنبے رہ سکتے تھے۔ لیکن بابو دھنی رام اسمیں اکیلے ہی ٹانگیں پھیلائے پڑے رہتے۔ زندگی بھر وہ بال بچوں سے کبھی علیحدہ نہیں ہوئے تھے۔ سخت گھریلو قسم کے آدمی، آخری زندگی میں اس تنہائی نے ان کے دل میں وحشت پیدا کر دی۔ لیکن مجبوری تھی، بچے سب دلی میں مدن اور اندو کے پاس تھے اور وہیں اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ سال کے خاتمے سے پہلے انہیں بیچ میں سے اٹھانا ان کی پڑھائی کے لئے اچھا نہ تھا۔ بابو جی کو دل کے دورے پڑنے لگے۔

بارے گرمی کی چھٹیاں ہوئیں اور ان کے بار بار لکھنے پر مدن نے اندو کو کندن، پاشی اور دلاری کے ساتھ سہارنپور بھیج دیا — دھنی رام کی دنیا چہک اٹھی۔ کہاں انہیں دفتر کے کام کے بعد فرصت ہی فرصت تھی اور کہاں اب کام ہی کام تھا۔ بچے، بچوں ہی کی طرح، جہاں کپڑے اتارتے، وہیں پڑے رہنے دیتے اور بابو جی انہیں سمیٹتے پھرتے۔ اپنے مدن سے دور، السائی ہوئی رتی، اندو تو اپنے پہناوے تک سے غافل ہو گئی تھی۔ وہ رسوئی میں یوں پھرتی تھی جیسے کانجی ہاؤس میں گائے — باہر کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر اپنے مالک کو ڈھونڈا کرتی ہے۔ کام وام کرنے کے بعد وہ کبھی اندر ٹرنکوں پر لیٹ جاتی۔ کبھی باہر کنیر کے بوٹے کے پاس اور کبھی آم کے پیڑ تلے، جو آنگن میں کھڑا سینکڑوں ہزاروں دلوں کو تھامے ہوئے تھا —

ساون بھادوں میں ڈھلنے لگا۔ آنگن میں سے باہر کا دریچہ کھلتا تو کنواریاں، نئی بیاہی

ہوئی لڑکیاں پینگ بڑھاتے ہوئے گاتیں —— جھولا کن نے ڈار دیے امریاں —— اور پھر گیت کے بول کے مطابق دو جھوٹتیں اور دو جھُلاتیں اور کہیں چار مل جاتیں تو بُول بھلیاں ہو جاتیں ادھیڑ عُمر کی بُوڑھی عورتیں ایک طرف کھڑی تکا کرتیں - اندو کو معلوم ہوتا جیسا وہ بھی ان میں شامل ہو گئی ہے - جبھی وہ مُنہ پھیر لیتی اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی سو جاتی - بابوجی پاس سے گذرتے تو اسے جگانے اُٹھانے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتے - بلکہ موقعہ پاکر اس کی شلوار کو جو بہو دھوتی سے بدل آتی اور جسے وہ ہمیشہ اپنی ساس والے پُرانے صندل کے صندوق پر پھینک دیتی، اُٹھاکر کھونٹی پر لٹکا دیتے - ایسے ہیں انہیں سب سے نظریں بچانا پڑتیں - لیکن ابھی شلوار کو سمیٹ کر مڑتے ہی تو نیچے کونے میں نگاہ بہو کے محرم پر جا پڑتی - تب ان کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ یوں شتابی کمرے سے نکل جاتے جیسے سانپ کا بچہ بل سے باہر آگیا ہو - پھر برآمدے میں ان کی آواز سُنائی دینے لگتی —— اوم نمو بھگوتے واسو دیوا ——

اڑوس پڑوس کی عورتوں نے بابوجی کی بہو کی خوبصورتی کی داستانیں دُور دُور تک پہنچادی تھیں - جب کوئی عورت بابوجی کے سامنے بہو کے پیارے پن اور سڈول جسم کی باتیں کرتی تو وہ خوشی سے پھول جاتے اور کہتے - "ہم تو دھنیہ ہو گئے، امی چند کی ماں! شکر ہے ہمارے گھر میں بھی کوئی صحت والا جیو آیا -" اور یہ کہتے ہوئے ان کی نگاہیں کہیں دُور پہنچ جاتیں جہاں دق کے عارضے تھے، دوائی کی شیشیاں، اسپتال کی سیڑھیاں یا چیونٹیوں کے بل، نگاہ قریب آتی تو انہیں موٹے موٹے اگدرائے ہوئے جسم والے کئی بچے بغل میں، جانگھ پر، گردن پر چڑھتے اُترتے ہوئے محسوس ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے ابھی اور آرہے ہیں - پہلو پر لیٹی ہوئی بہو کی کمر زمین کے ساتھ اور کولھے چھت کے ساتھ لگ رہے ہیں اور وہ دھڑا دھڑ بچے جنتی جارہی ہے - اور ان بچوں کی عمر میں کوئی فرق نہیں - کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، سبھی ایک سے —— جڑواں —— تو ام ... اوم نمو بھگوتے ——

آس پاس کے لوگ سب جان گئے تھے اندو بابوجی کی چہیتی بہو ہے - چنانچہ دودھ اور چھاچھ

کے مٹکے دھنی رام کے گھر آنے لگے اور پھر ایک دم سلام دین گوجر نے فرمائش کر دی۔ اندو سے کہا "بی بی! میرا بیٹا آر۔ ایم۔ ایس میں تُلی رکھوا دو۔ اللہ تم کو اجر دے گا۔" اندو کے اشارے کی دیر تھی کہ سلام دین کا بیٹا نوکر ہو گیا، وہ بھی سارٹر، جو نہ ہو سکا اس کی قسمت۔ ہمسایاں ہی زیادہ نہ تھیں۔

بہو کے کھانے پینے اور اس کی صحت کا بابو جی خاص خیال رکھتے تھے۔ دودھ پینے سے اندو کو چڑ تھی۔ وہ رات کے وقت خود دودھ کی بالٹی میں پھینٹ، گلاس میں ڈال، بہو کو بلانے کے لئے اس کی کھٹیا کے پاس آجاتے۔ اندو اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اٹھتی اور کہتی "نہیں بابو جی! مجھ سے نہیں پیا جاتا۔"

"تیرا تو سسر بھی پئے گا۔" وہ مذاق سے کہتے۔

"تو پھر آپ پی لیجیے نا۔" اندو ہنستی ہوئی جواب دیتی اور بابو جی ایک مصنوعی غصے سے برس پڑتے۔ "تو چاہتی ہے بعد میں تیری بھی وہی حالت ہو جو تیری ساس کی ہوئی؟"

"ہوں ـــ ہوں ـــ" اندو لاڈ سے روٹھنے لگتی۔ آخر کیوں نہ روٹھتی۔ وہ لوگ نہیں روٹھتے جنہیں منانے والا کوئی نہ ہو۔ لیکن یہاں تو منانے والے سب تھے، روٹھنے والا صرف ایک۔ جب اندو بابو جی کے ہاتھ سے گلاس نہ لیتی تو وہ اسے کھٹیا کے پاس سرہانے کے نیچے رکھ دیتے ـــ اور "لے یہ پڑا ہے ـــ تیری مرضی ہے پی ـــ نہیں مرضی تو نہ پی ـــ" کہتے ہوئے چل دیتے۔

اپنے بستر پہ پہنچ کر دھنی رام دلاری مُنّی کے ساتھ کھیلنے لگتے۔ دلاری کی بابو جی کے ننگے پنڈے کے ساتھ پنڈا گھسانے اور پیٹ پر منہ رکھ کر پھکڑا اچھالنے کی عادت تھی۔ آج جب بابو جی اور منی یہ کھیل کھیل رہے تھے، ہنس ہنسا رہے تھے تو منی نے بھابی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "دودھ تو خراب ہو جائے گا بابو جی ـــ بھابی تو پیتی ہی نہیں۔"

"پئے گی، ضرور پئے گی بیٹیا ـــ" بابو جی نے دوسرے ہاتھ سے پاشی کو ہٹاتے ہوئے

کہا ـ "عورتیں گھر کی کسی چیز کو خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتیں ـ"

ابھی یہ فقرہ بابوجی کے منہ ہی میں ہوتا کہ ایک طرف سے "ہُشت — ہے خصم کھانی ـ" کی آواز آنے لگتی ـ پتہ چلتا ہُو بلی کو بھگا رہی ہے اور پھر کوئی غٹ غٹ سی سُنائی دیتی اور سب جان لیتے بہو — بھابی نے دُودھ پی لیا ـ کچھ دیر کے بعد کندن بابوجی کے پاس آتا اور کہتا ـ

"بوجی — بھابی رو رہی ہے ـ"

"ہائیں ؟" بابوجی کہتے اور پھر اُٹھ کر اندھیرے میں دُور اسی طرف دیکھنے لگتے جدھر بہو کی چارپائی پڑی ہوتی ـ کچھ دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر لیٹ جاتے اور کچھ سمجھتے ہوئے کندن سے کہتے ـ "جا — تو سو جا — وہ بھی سو جائے گی اپنے آپ ـ"

اور پھر لیٹتے ہوئے بابو دھنی رام آسمان پر کھلے ہوئے پرماتما کے گلزار کو دیکھنے لگتے اور اپنے من کے بھگوان سے پوچھتے —

"چاندی کے ان کھلتے بند ہوتے ہوئے پھولوں میں میرا پھول کہاں ہے ؟" اور پھر پورا آسمان انہیں درد کا ایک دریا دکھائی دینے لگتا اور کانوں میں ایک مسلسل ہاؤ ہو کی آواز سُنائی دیتی جسے سُنتے ہوئے وہ کہتے ـ "جب سے دُنیا بنی ہے انسان کتنا رویا ہے !" — اور وہ روتے روتے سو جاتے ـ

اندو کے جانے کے بیس پچیس روز ہی میں مدن نے واویلا شروع کر دیا ـ اس نے لکھا میں بازار کی روٹیاں کھاتے کھاتے تنگ آ گیا ہوں ـ مجھے قبض ہو گئی ہے ـ گُردے کا درد شروع ہو گیا ہے ـ پھر جیسے دفتر کے لوگ چھٹی کی عرضی کے ساتھ ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھیج دیتے ہیں ، مدن نے بابوجی کے ایک دوست سے تصدیق کی چٹھی لکھوا بھیجی ـ اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو

ایک ڈبل تار ——— جوابی ———

جوابی تار کے پیسے مارے گئے لیکن بلا سے۔ اندو اور بچے لوٹ آئے تھے۔ مدن نے اندو سے دو دن سیدھے مُنہ بات ہی نہ کی۔ یہ دُکھ بھی اندو ہی کا تھا۔ ایک دن مدن کو اکیلے میں پا کر وہ پکڑ بیٹھی اور بولی۔ "اتنا مُنہ پھیلائے بیٹھے ہو —— میں نے کیا کیا ہے؟"

مدن نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ "چھوڑ دو —— دُور ہو جا میری آنکھوں سے —— کمینی ——"

"یہی کہنے کے لئے اتنی دُور سے بلوایا ہے؟"

"ہاں!"

"ہٹاؤ اب"

"خبردار —— یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ تم جانا چاہتیں تو کیا بابوجی روک لیتے؟"

اندو نے بے بسی سے کہا۔ "ہائے جی —— تم تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں بھلا انہیں کیسے کہہ سکتی تھی؟ سچ پوچھو تو تم نے مجھے بلا کر بابوجی پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کچھ نہیں —— ان کا جی بہت لگا ہوا تھا بال بچوں میں۔"

"اور میرا جی؟"

"تمہارا جی؟ —— تم تو کہیں بھی لگا سکتے ہو۔" اندو نے شرارت سے کہا اور کچھ اس طرح سے مدن کی طرف دیکھا کہ اس کی مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہو گئیں۔ یوں بھی اسے کسی اچھے سے بہانے کی تلاش تھی۔ اس نے اندو کو پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ "بابوجی تم سے بہت خوش تھے؟"

"ہاں!" اندو بولی۔ "ایک دن میں جاگی تو دیکھا سرہانے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"اپنی قسم"

"اپنی قسم نہیں ——— میری قسم کھاؤ۔"

"تمہاری قسم تو مَیں نہیں کھاتی ——— کوئی کچھ بھی دے۔"

"ہاں!" مدن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کتابوں میں اسے سیکس کہتے ہیں۔"

"سیکس؟" اندو نے پُوچھا۔ "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہی جو مرد اور عورت کے بیچ ہوتا ہے۔"

"ہائے رام!" اندو نے ایکدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "گندے کہیں کے ——— شرم نہیں آتی بابُوجی کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے؟"

"تو بابُوجی کو شرم نہ آئی تجھے یُوں دیکھتے ہوئے؟"

"کیوں؟" اندو نے بابُوجی کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اپنی بہُو کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔"

"کیوں نہیں۔ جب بہو تم ایسی ہو۔"

"تمہارا من گندا ہے۔" اندو نے نفرت سے کہا۔ "اسی لئے تمہارا کاروبار بھی گندے بروجے کا ہے۔ تمہاری کتابیں سب گندگی سے بھری پڑی ہیں۔ تمہیں اور تمہاری کتابوں کو اس کے سوا کچھ دِکھائی نہیں دیتا۔ ایسے تو جب مَیں بڑی ہوگئی تھی تو میرے پتاجی نے مجھ سے ادھک پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ تو کیا وہ بھی...... وہ نگوڑا ——— جس کا تم ابھی نام لے رہے تھے۔" اور پھر اندو بولی۔ "بابُوجی کو یہاں بلا لو۔ ان کا وہاں جی نہیں لگتا۔ وُہ دُکھی ہوں گے تو کیا تم دُکھی نہیں ہو گے؟"

مدن اپنے باپ سے بہُت پیار کرتا تھا۔ گھر میں ماں کی موت نے بڑا ہونے کے کارن سب سے زیادہ اثر مدن ہی پر کیا تھا۔ اسے اچھّی طرح سے یاد تھا۔ ماں کے بیمار رہنے کے باعث جب بھی اُس کی موت کا خیال مدن کے دِل میں آتا تو وُہ آنکھیں مُوند کر پراتھنا شروع کر دیتا ——— اوم نمو بھگوتے داسو دیوا. اوم نمو...... اب وُہ نہیں چاہتا تھا باپ کی چھتر چھایا بھی سر سے اُٹھ جائے۔ خاص طور پر ایسے

میں جبکہ وہ اپنے کاروبار کو بھی جما نہیں پایا تھا۔ اس نے غیر یقینی لہجے میں اندو سے صرف اتنا کہا
"ابھی رہنے دو۔ بابوجی کو۔ شادی کے بعد ہم دونوں پہلی بار آزادی کیساتھ مل سکے ہیں۔"
تیسرے چوتھے روز بابوجی کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا خط آیا۔ میرے پیارے مدن کے تخاطب میں میرے پیارے کے الفاظ شور پانیوں میں دھل گئے تھے۔ لکھا تھا۔ "بہو کے یہاں ہونے پر میرے تو وہی پرانے دن لوٹ آئے تھے۔ تمہاری ماں کے دن، جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی تو وہ بھی ایسی ہی الھڑ تھی۔ ایسے ہی اُتارے ہوئے کپڑے ادھر اُدھر پھینک دیتی اور پتا جی سمیٹتے پھرتے۔ وہی صندل کا صندوق، وہی بیسیوں خلجگن، میں بازار جا رہا ہوں، آ رہا ہوں، کچھ نہیں تو وہی بڑے یا ربڑی لا رہا ہوں۔ اب گھر میں کوئی نہیں۔ وہ جگہ جہاں صندل کا صندوق پڑا تھا، خالی ہے......"
اور پھر ایک آدھ سطر اور دھل گئی تھی۔ آخر میں لکھا تھا۔ "دفتر سے لوٹتے سمے، یہاں کے بڑے بڑے اندھے کمروں میں داخل ہوتے ہوئے میرے من میں ایک ہول سا اُٹھتا ہے......" اور پھر ——— "بہو کا خیال رکھنا، اسے کسی ایسی ویسی دایہ کے حوالے مت کرنا۔"
اِندو نے دونوں ہاتھوں سے چٹھی پکڑ لی۔ سانس کھینچی۔ آنکھیں پھیلائی، شرم سے پانی پانی ہوتی ہوئی بولی ——— "میں مر گئی۔ بابوجی کو کیسے پتہ چل گیا؟"
مدن نے چٹھی چھڑاتے ہوئے کہا۔ "بابوجی کیا بچے ہیں؟ ——— دُنیا دیکھی ہے۔ ہمیں پیدا کیا ہے۔"
"ہاں مگر۔" اندو بولی۔ "ابھی دِن ہی کے ہوئے ہیں؟"
اور پھر اس نے ایک تیز سی نظر اپنے پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی بڑھنا بھی شروع نہیں کیا تھا اور پھر جیسے بابوجی یا کوئی اور دیکھ رہا ہو اس نے ساری کا پلّو اس پر کھینچ لیا اور کچھ سوچنے لگی۔ جبھی ایک چمک سی اس کے چہرے پر آئی اور وہ بولی ——— "تمہاری سسرال سے شرنی آ گئی"
"میری سسرال؟ ——— اوہاں؟" مدن نے راستہ پاتے ہوئے کہا۔ "کتنی شرم کی بات ہے۔ ابھی چھ آٹھ مہینے شادی کو ہوئے ہیں اور چلا آیا ہے۔" اور اس نے اندو کے پیٹ

کی طرف اشارہ کیا۔

"چلا آیا ہے یا تم لائے ہو؟"

"تم ـــــ یہ سب قصور تمہارا ہے۔ کچھ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔"

"تمہیں پسند نہیں؟"

"ایک دم نہیں؟"

"کیوں؟"

"چار دن تو مزے لے لیتے زندگی کے"

"کیا یہ جنگلی کا مچا نہیں؟" اِندو نے صدمہ زدہ لہجے میں کہا۔ "مرد عورت شادی کس لئے کرتے ہیں؟ بھگوان نے بن مانگے دے دیا نا؟ پوچھو ان سے جن کے نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا کچھ کرتی ہیں؟ پیروں فقیروں کے پاس جاتی ہیں۔ سمادھیوں، مجاروں پر چوٹیاں باندھتی شرم و حیا کو تج کر دریاؤں کے کنارے ننگی ہو کر سرکنڈے کاٹتی، شمشانوں میں مسان جگاتی ـــ"

"اچھا! اچھا" مدن بولا "تم نے بکھان ہی شروع کر دیا۔ اولاد کے لئے تھوڑی عمر پڑی تھی؟"

"ہوگا تو!" اندو نے سرزنش کے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "جب تم اسے ہاتھ بھی مت لگانا۔ وہ تمہارا نہیں میرا ہوگا۔ تمہیں تو اسکی ضرورت نہیں، پر اس کے دادا کو بہت ہے، یہ میں جانتی ہوں۔"

اور پھر کچھ خجل، کچھ صدمہ زدہ ہو کر اندو نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ وہ سوچتی تھی پیٹ میں اس ننھی سی جان کو پا لینے کے سلسلے میں اس جان کا ہوتا سوتا تھوڑی بہت ہمدردی تو کرے گا ہی۔ لیکن مدن چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایک لفظ بھی اس نے منہ سے نہ نکالا۔ اندو نے چہرے پر سے ہاتھ اٹھا کر مدن کی طرف دیکھا اور ہونے والی پہلوٹن کے خاص انداز میں بولی ـــ

"وہ تو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سب پیچھے ہوگا۔ پہلے تو میں بچوں گی ہی نہیں۔۔۔۔ مجھے بچپن ہی سے وہم ہے اس بات کا۔"

مدن بھی جیسے خائف ہوگیا —— یہ خوبصورت "چیز" جو حاملہ ہونے کے بعد اور بھی خوبصورت ہوگئی ہے، مر جائیگی ؟ اس نے میٹھے کی طرف سے اندو کو تھام لیا اور پھر کھینچ کر اپنے ہاتھوں میں لے آیا اور بولا۔ "تجھے کچھ نہ ہوگا اندو۔۔۔ میں تو موت کے منہ سے بھی چھین کے لے آؤں گا تجھے —— اب ساوتری کی نہیں، ستیہ وان کی باری ہے ——"

مدن سے لپٹ کر اندو بھول ہی گئی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دکھ ہے۔۔۔۔

اس کے بعد بابوجی نے کچھ نہ لکھا۔ البتہ سہارنپور سے ایک سارٹڑ آیا۔ جس نے صرف اتنا بتایا کہ بابوجی کو پھر سے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ایک دورے میں تو وہ قریب قریب چل ہی بسے تھے۔ مدن ڈر گیا، اندو رونے لگی؛ سارٹڑ کے چلے جانے کے بعد ہمیشہ کی طرح مدن نے آنکھیں موندیں اور من ہی من میں پڑھنے لگا —— اوم نمو بھگوتے ......

دوسرے ہی روز مدن نے باپ کو چٹھی لکھی —— "بابوجی! چلے آؤ..... بچے بہت یاد کرتے ہیں اور آپکی بہو بھی ——" لیکن آخر نوکری تھی۔ اپنے بس کی بات تھوڑی تھی۔ دھنی رام ـــــ کے مطابق وہ چھٹی کا بندوبست کر رہے تھے۔۔۔۔ ان کے بارے میں دن بدن مدن کا احساس جرم بڑھنے لگا۔ "اگر میں اندو کو وہیں رہنے دیتا تو میرا کیا بگڑ جاتا ——؟"

وجے دشمی سے ایک رات پہلے مدن اضطراب کے عالم میں بیچ والے کمرے کے باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی اور وہ چونک کر دروازے کی طرف لپکا۔ بیگم دایہ باہر آئی اور بولی۔ "مبارک ہو بابوجی —— لڑکا ہوا ہے۔"

"لڑکا ؟" مدن نے کہا اور پھر متفکرانہ لہجے میں بولا۔ "بی بی کیسی ہے ؟"

بیگم بولی۔ "خیر مہر ہے —— میں نے ابھی تک اسے لڑکی ہی بتائی ہے۔۔۔۔ زچہ

زیادہ خوش ہو جائے تو اس کی آنول نہیں گرتی نا؟"

"او۔۔۔۔۔" مدن نے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا اور پھر کمرے میں جانے کے لئے آگے بڑھا۔ بیگم نے اسے وہیں روک دیا اور کہنے لگی "تمہارا اندر کیا کام؟" اور پھر ایکا ایکی دروازہ بھیڑ کر اندر لپک گئی۔

مدن کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ اس وقت خوف سے نہیں —— تسلّی سے یا شاید اس لئے کہ جب کوئی اس دنیا میں آتا ہے تو ارد گرد کے لوگوں کی یہی حالت ہوتی ہے۔ مدن نے سن رکھا تھا کہ جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو گھر کے در و دیوار لرزنے لگتے ہیں۔ گویا ڈر رہے ہیں کہ بڑا ہو کر ہمیں بیچے گا یا رکھے گا۔ مدن نے محسوس کیا جیسے سچ مچ ہی دیواریں کانپ رہی تھیں۔۔۔ ۔۔۔ زچگی کے لئے چکلی بھابی تو نہ آئی تھی کیونکہ اس کا اپنا بچہ بہت چھوٹا تھا البتہ دریا باد والی پھوپھی ضرور پہنچی تھی جس نے پیدائش کے وقت رام رام، رام رام کی رٹ لگا دی تھی اور اب وہی رٹ مدھم ہو رہی تھی۔

زندگی بھر مدن کو اپنا آپ اس قدر فضول اور بیکار نہ لگا تھا۔ اتنے میں پھر دروازہ کھلا اور پھوپھی نکلی۔ برآمدے کی بجلی کی مدھم سی روشنی میں اس کا چہرہ بھوت کے چہرے کی طرح ایک دم دودھیا سفید نظر آ رہا تھا۔ مدن نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا —— "اندر ٹھیک ہے نا پھوپھی —— ؟"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!" پھوپھی نے تین چار بار کہا اور پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ مدن کے سر پر رکھ کر اسے نیچا کیا، چوما اور باہر لپک گئی ——

پھوپھی برآمدے کے دروازے میں سے باہر جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ بیٹھک میں پہنچی جہاں باقی کے بچے سو رہے تھے۔ پھوپھی نے ایک ایک کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر چھت کی طرف آنکھیں اٹھا کر منہ میں کچھ بولی اور پھر نڈھال سی ہو کر منی کے پاس لیٹ گئی —— اوندھی —— اس کے پھڑکتے ہوئے شانوں سے پتہ چل رہا تھا جیسے رو رہی ہے۔ مدن حیران ہوا!

...... پھوپھی تو کئی زچگیوں سے گزر چکی ہے، پھر کیوں اس کی رُوح کانپ اُٹھی ہے —
پھر ادھر کے کمرے سے ہرمل کی بُو باہر نکلی۔ دھوئیں کا ایک غبار سا آیا جس نے مدن کا احاطہ کر لیا۔ اس کا سر جھک گیا۔ تبھی بیگم دایہ کپڑے میں کچھ لپیٹے ہوئے باہر نکلی۔ کپڑے پر خون ہی خون تھا۔ جس میں سے کچھ قطرے نکل کر فرش پر گر گئے۔ مدن کے ہوش اُڑ گئے۔ اسے معلوم نہ تھا وہ کہاں ہے۔ آنکھیں کھلی تھیں پر کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بیچ میں اندو کی ایک مریلی سی آواز —
"ہائے ..." اور پھر بچے کے رونے کی آواز۔

تین چار دن میں بہت کچھ ہُوا۔ مدن نے گھر کے ایک طرف گڑھا کھود کر آنول کو دبایا۔ کتّوں کو اندر آنے سے روکا۔ لیکن اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ہرمل کی بو دماغ میں بس جانے کے بعد آج ہی اسے ہوش آیا ہے۔ کمرے میں وہ اکیلا ہی تھا اور اندو — نند اور جسودھا — اور دوسری طرف نندلال ...... اندو نے بچے کی طرف دیکھا اور کچھ ٹوہ لینے کے سے انداز میں بولی — "بالکل تم ہی پر گیا ہے۔"

"ہوگا۔" مدن نے ایک اچٹتی سی نظر بچے پر ڈالتے ہوئے کہا — "میں تو کہتا ہوں شکر ہے بھگوان کا کہ تم بچ گئیں۔"

"ہاں!" اندو بولی۔ "میں تو سمجھتی تھی —"

"شبھ شبھ بولو۔" مدن نے ایک دم اندو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو جو کچھ ہوا ہے ...... میں تو اب تمہارے پاس بھی نہیں پھٹکوں گا۔" اور مدن نے زبان دانتوں تلے دبا لی۔

"توبہ کرو۔" اندو بولی۔

مدن نے اسی دم کان اپنے ہاتھوں سے پکڑ لئے ...... اور اندو خفیف سی آواز میں ہنسنے لگی۔

بچہ پیدا ہونے کے بعد کئی روز تک اندو کی ناف ٹھکانے پر نہ آئی۔ وہ گھوم گھوم کر اس

بچے کی تلاش کر رہی تھی جواب اِس سے پرے باہر کی دُنیا میں جا کر اپنی اصلی ماں کو بھول گیا تھا۔ اب سب کچھ ٹھیک تھا اور اندو شانتی سے اِس دُنیا کو تک رہی تھی ——— معلوم ہوتا تھا اس نے مدن ہی کے نہیں دُنیا بھر کے گنا ہگاروں کے گناہ معاف کر دیئے ہیں اور اب دیوی بن کر دیا اور کرنا کے پرساد بانٹ رہی ہے .... مدن نے اِندو کے مُنہ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا —— اِس سارے خون خرابے کے بعد کچھ دبلی ہو کر اِندو اور بھی اچھی لگنے لگی ہے .... جبھی ایکا ایکی اِندو نے دونوں ہاتھ اپنی چھاتیوں پر رکھ لئے۔

"کیا ہُوا؟" مدن نے پُوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اِندو تھوڑا سا اُٹھنے کی کوشش کر کے بولی۔ "اِسے بھوک لگی ہے۔" اور اس نے بچے کی طرف اِشارہ کیا۔

"اِسے؟ ——— بھوک؟ ——" مدن نے پہلے بچے کی طرف اور پھر اِندو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"دیکھتے نہیں؟" اندو نیچے کی طرف نِگاہ کرتے ہوئے بولی "سب گیلا ہو گیا ہے۔"

مدن نے غور سے اِندو کے ڈھیلے ڈھالے دگلے کی طرف دیکھا۔ جھر جھر دُودھ بہہ رہا تھا اور ایک خاص قسم کی بُو آ رہی تھی۔ پھر اِندو نے بچے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے مجھے دے دو۔"

مدن نے ہاتھ پنگھوڑے کی طرف بڑھایا اور اسی دم کھینچ لیا۔ پھر کچھ ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے بچے کو یُوں اُٹھایا جیسے وہ کوئی مرا ہوا چُوہا ہو۔ آخر اس نے بچے کو اندو کی گود میں دے دیا۔ اِندو مدن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم جاؤ .... باہر۔"

"کیوں؟ .... باہر کیوں جاؤں؟" مدن نے پُوچھا۔

"جاؤ نا ——" اِندو نے کچھ مچلتے، کچھ شرماتے ہوئے کہا۔ "تمہارے سامنے میں دُودھ نہیں پلا سکوں گی۔"

"ارے؟" مدن حیرت سے بولا۔ "میرے سامنے؟..... نہیں پلا سکیگی؟ اور پھر نا سمجھی کے انداز میں سر کو جھٹکا دیکر باہر کی طرف چل نکلا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر مڑتے ہوئے اس نے اندو پر ایک نگاہ ڈالی ——— اتنی خوبصورت اندو آج تک نہیں لگی تھی۔

بابو دھنی رام چھٹی پر گھر لوٹے تو وہ پہلے سے آدھے دکھائی پڑتے تھے۔ جب اندو نے پوتا ان کی گود میں دیا تو وہ کھل اٹھے۔ ان کے پیٹ کے اندر کوئی پھوڑا نکل آیا تھا۔ جو چوبیس گھنٹے انہیں سولی پر لٹکائے رکھتا۔ اگر منّا نہ ہوتا تو بابو جی کی اس سے دس گنا بری حالت ہوتی۔

کئی علاج کئے گئے۔ بابو جی کے آخری علاج میں ڈاکٹر نے ادھنّی کے برابر پندرہ بیس گولیاں روز کھانے کو دیں۔ پہلے ہی دن انہیں اتنا پسینہ آیا کہ دن میں تین تین چار چار بار کپڑے بدلنے پڑے۔ ہر بار مدن کپڑے اتار کر بالٹی میں نچوڑتا۔ صرف پسینے ہی سے بالٹی ایک چوتھائی ہو گئی تھی۔ رات انہیں متلی سی محسوس ہونے لگی اور انہوں نے پکارا ——— "بہو ذرا داتن تو دینا ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے۔" بہو بھاگی ہوئی گئی اور داتن لے آئی۔ بابو جی اٹھ کر داتن چبا ہی رہے تھے کہ ایک ابکائی کیا آئی ساتھ ہی خون کا پرنالہ لے آئی۔ بیٹے نے واپس سرہانے کی طرف لٹایا تو ان کی پتلیاں پھر چکی تھیں اور کوئی ہی دم میں وہ اوپر آسمان کے گلزار میں پہنچ چکے تھے جہاں انہوں نے اپنا پھول پہچان لیا تھا۔

منے کو پیدا ہوئے کل بیس پچیس روز ہوئے تھے۔ اندو نے منہ نوچ کر، سر اور چھاتی پیٹ پیٹ کر خود کو نیلا کر دیا۔ مدن کے سامنے وہی منظر تھا جو اس نے تصور میں اپنے مرنے پر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اندو نے چوڑیاں توڑنے کی بجائے اتار کے رکھ دی تھیں۔ سر پر راکھ نہیں ڈالی تھی لیکن زمین پر سے مٹی لگ جانے اور بالوں کے بکھر جانے سے چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ "لوگو! میں لٹ گئی۔" کی جگہ اس نے ایک دلدوز آواز میں چلانا شروع کر دیا تھا۔

"لوگو! ہم لُٹ گئے۔"

گھر بار کا کتنا بوجھ مدن پر آ پڑا تھا اس کا ابھی مدن کو پُوری طرح اندازہ نہ تھا۔ صبح ہونے تک اس کا دل لپک کر مُنہ میں آ گیا۔ وہ شاید بچ نہ پاتا اگر وہ گھر کے باہر بدررو کے کنارے سیل چڑھی مٹی پر اوندھا لیٹ کر، اپنے دل کو ٹھکانے پر نہ لاتا...... دھرتی ماں نے چھاتی سے لگا کر اپنے بچے کو بچا لیا تھا۔ چھوٹے بچے کُندن، دلاری، مُنی اور پاشی یُوں چلاّ رہے تھے جیسے گھونسلے پر شکرے کے حملے پر چڑیا کے بوٹ چونچیں اُٹھا اُٹھا کر چیں چیں کرتے ہیں۔ انہیں اگر کوئی پروں کے نیچے سمیٹتی تھی تو اندو ———

نالی کے کنارے پڑے پڑے مدن نے سوچا اب تو یہ دُنیا میرے لئے ختم ہو گئی۔ کیا مَیں جی سکوں گا؟ زندگی میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟ وہ اُٹھا اور اُٹھ کر گھر کے اندر چلا گیا۔

سیڑھیوں کے نیچے غسلخانہ تھا جس میں گھس کر اندر سے کواڑ بند کرتے ہوئے مدن نے ایک بار پھر اس سوال کو دہرایا ——— مَیں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟ ——— اور وہ کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ حالانکہ اس کے باپ کی لاش ابھی پاس ہی بیٹھک میں پڑی تھی۔

باپ کو آگ کے حوالے کرنے سے پہلے مدن، ارتھی پر پڑے ہوئے جسم کے سامنے ڈنڈوت کے انداز میں لیٹ گیا۔ یہ اس کا اپنے جنم داتا کو آخری پرنام تھا۔ تس پر بھی وہ رو نہ رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ماتم میں شریک ہونے والے رشتے دار۔ محلے والے سَن سے رہ گئے۔ پھر ہندو رواج کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے مدن کو چتا جلانی پڑتی۔ جلتی ہوئی کھوپڑی میں کپال کریا کی لاٹھی مارنی پڑی..... عورتیں باہر ہی سے شمشان کے کنوئیں پر نہا کر گھر لوٹ چکی تھیں۔ جب مدن گھر پہنچا تو وہ کانپ رہا تھا۔ دھرتی ماں نے تھوڑی دیر کے لئے جو طاقت اپنے بیٹے کو دی تھی، رات کے گھر آنے پر پھر سے ہول میں ڈھل گئی..... اسے کوئی سہارا چاہیئے تھا، کسی ایسے جذبے کا سہارا جو موت سے بھی بڑا ہو۔ اس وقت دھرتی ماں کی بیٹی جنک دلاری اندو نے کسی گھڑے میں سے پیدا ہو کر اس رام کو اپنی باہوں میں لے

لیا.... اِس رات اگر اندو اپنا آپ یُوں مدن پر نثار نہ کر دیتی تو اِتنا بڑا دُکھ مدن کو لے ڈُوبتا۔

دس ہی مہینے کے اندر اندر اندو کا دُوسرا بچہ چلا آیا۔ بیوی کو دوزخ کی آگ میں دھکیل کر مدن خود اپنا دُکھ بھُول گیا تھا۔ کبھی کبھی اِسے خیال آتا اگر میں شادی کے بعد بابُوجی کے پاس گئی ہوئی اندو کو نہ بُلا لیتا تو شائد وُہ اِتنی جلدی نہ چل دیتے۔ لیکن پھر وُہ باپ کی موت سے پیدا ہونے والے خسارے کو پُورا کرنے میں لگ جاتا...... کاروبار جو پہلے بے توجہی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا ــــ مجبوراً چل نِکلا ــــ

اِن دنوں بڑے بچے کو مدن کے پاس چھوڑ کر، چھوٹے کو چھاتی سے لگائے اِندو میکے چلی گئی تھی۔ پیچھے مُنّا طرح طرح کی ضد کرتا تھا جو کبھی مانی جاتی تھی اور کبھی نہیں بھی ــــ میکے سے اِندو کا خط آیا ــــ مجھے یہاں اپنے بیٹے کے رونے کی آواز آ رہی ہے، اِسے کوئی مارتا تو نہیں؟ ...... مدن کو بڑی حیرت ہوئی ــــ ایک جاہل اَن پڑھ عورت .... ایسی باتیں کیسے لکھ سکتی ہے؟ پھر اس نے اپنے آپ سے پُوچھا ــــ کیا یہ بھی کوئی رٹا ہُوا فقرہ ہے ــــ؟

سال گُذر گئے۔ پیسے کبھی اِتنے نہ آئے کہ اِن سے کچھ عیش ہو سکے۔ لیکن گذارے کے مطابق آمدنی ضرور ہو جاتی تھی۔ دِقّت اس وقت ہوتی جب کوئی بڑا خرچ سامنے آ جاتا.... کُندن کا داخلہ دینا ہے، دُلاری مُنّی کا شگن بھجوانا ہے۔ اس وقت مدن مُنہ لٹکا کر بیٹھ جاتا اور پھر اِندو ایک طرف سے آتی، مُسکراتی ہوئی اور کہتی۔ "کیوں دُکھی ہو رہے ہو؟" مدن اُمّید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا۔ "دُکھی نہ ہوں؟ کُندن کا بی اے کا داخلہ دینا ہے..... مُنی....." اندو پھر ہنستی اور کہتی۔ "چلو میرے ساتھ۔" اور مدن بھیڑ کے بچّے کی طرح اِندو

کے پیچھے چل دیتا۔ اندو صندل کے صندوق کے پاس پہنچتی جسے کسی کو، مدن سمیت ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اِس بات پر خفا ہو کر مدن کہتا "مردگی تو اسے بھی چھاتی پر ڈال کر لے جانا!" اور اندو کہتی "ہاں! لے جاؤں گی۔" پھر اندو وہاں سے مطلوبہ رقم نکال کر سامنے رکھ دیتی۔

"یہ کہاں سے آ گئے؟"

"کہیں سے بھی آئے..... تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے؟"

"پھر بھی؟"

"تم جاؤ، اپنا کام چلاؤ۔"

اور جب مدن زیادہ اصرار کرتا تو اندو کہتی۔ "میں نے ایک سیٹھ دوست بنایا ہے نا!" اور پھر ہنسنے لگتی۔ جھوٹ جانتے ہوئے بھی مدن کو یہ مذاق اچھا نہ لگتا۔ پھر اندو کہتی —— "میں چور لٹیرا ہوں —— تم نہیں جانتے؟ —— سخی لٹیرا —— جو ایک ہاتھ سے لوٹتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے غریب غربا کو دے دیتا ہے"..... اسی طرح مُنّی کی شادی ہوئی۔ جس پر ایسی ہی لوٹ کے زیور تھے —— قرضہ چڑھا اور پھر اُتر بھی گیا۔

ایسے ہی کندن بھی بیاہا گیا۔ اِن شادیوں میں اندو ہی "ہاتھ بھرا" کرتی تھی اور ماں کی جگہ کھڑی ہو جاتی۔ آسمان سے بابوجی اور ماں دیکھا کرتے اور پھول برساتے جو کسی کو نظر نہ آتے۔ پھر ایسا ہوا اُدپر ماں جی اور بابوجی میں جھگڑا چل گیا۔ ماں نے بابوجی سے کہا۔ "تم تو بہو کے ہاتھ کی پکّی کھا آئے ہو، اس کا سکھ بھی دیکھا ہے پر میں نصیبوں جلی نے کچھ بھی نہیں دیکھا" —— اور یہ جھگڑا وشنو، مہیش اور شو تک پہنچا۔ انہوں نے ماں کے حق میں فیصلہ دیا —— اور یوں ماں، مات لوک میں آ کر بہو کی کوکھ میں پڑی —— اور اندو کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی......

پھر اندو ایسی دیوی بھی نہ تھی جب کوئی اصول کی بات ہوتی تو نند دیور تو کیا خود مدن سے بھی لڑ پڑتی —— مدن راستبازی کی اِس پتلی کو خفا ہو کر ہرشِ چندر کی بیٹی کہا کرتا تھا۔ چونکہ اندو کی باتوں میں اُلجھاؤ ہونے کے باوجود سچائی اور دھرم قائم رہتے

تھے۔ اِس لئے مدن اور کُندن کے باقی سب لوگوں کی آنکھیں اِندو کے سامنے نیچی ہی رہتی تھیں۔ جھگڑا کتنا بھی بڑھ جائے مدن اپنے شوہری زعم میں کتنا بھی اِندو کی بات کو رّد کر دے لیکن آخر سبھی سر جھکائے ہوئے اِندو ہی کی شرن میں آتے تھے اور اِسی سے چھما مانگتے تھے۔

نئی بھابی آئی۔ کہنے کو تو وہ بھی بیوی تھی لیکن اِندو ایک عورت تھی جسے بیوی کہتے ہیں۔ اِس کے اُلٹ چھوٹی بھابی رانی ایک بیوی تھی جسے عورت کہتے ہیں۔ رانی کے کارن بھائیوں میں جھگڑا ہوا۔ اور جے پی چاچا کی معرفت جائیداد تقسیم ہوئی۔ جس میں ماں باپ کی جائیداد تو ایک طرف اِندو کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں بھی تقسیم کی زد میں آگئیں اور اِندو کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔

جہاں سب کچھ مل جانے کے بعد اور الگ ہو کر بھی کُندن اور رانی ٹھیک سے نہیں بس سکے تھے وہاں اِندو کا نیا گھر دِنوں ہی میں جگمگ جگمگ کرنے لگا۔

بچی کی پیدائش کے بعد اِندو کی صحت وہ نہ رہی۔ بچی ہر وقت اِندو کی چھاتیوں سے چمٹی رہتی تھی۔ جہاں سبھی گوشت کے اِس لوتھڑے پر تھُو تھُو کرتے تھے وہاں ایک اِندو تھی جو اِسے کلیجے سے لگائے پھرتی۔ لیکن کبھی خود بھی پریشان ہو اُٹھتی اور بچی کو سامنے جھولنگے میں پھینکتے ہوئے کہہ اُٹھتی "تو مجھے بھی جینے دے گی — ماں —؟"

اور بچی چِلّا چِلّا کر رونے لگتی۔

مدن اِندو سے کٹنے لگا۔ شادی سے لے کر اِس وقت تک اِسے وہ عورت نہ ملی تھی جس کا وہ متلاشی تھا۔ گندہ بروزہ بکنے لگا اور مدن نے بہت سا روپیہ اِندو سے بالا بالا خرچ کرنا شروع کر دیا۔ بابو جی کے چلے جانے پر کوئی پوچھنے والا بھی تو نہ تھا۔ پوری آزادی تھی۔

گویا پڑوسی سیٹھے کی بھینس پھر مدن کے مُنہ کے پاس پھنکارنے لگی، بلکہ بار بار پھنکارنے

گی - شادی کی رات والی بھینس تو بک چکی تھی - لیکن اس کا مالک زندہ تھا - مدن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگا جہاں روشنی اور سائے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے ہیں - نکڑ پر کبھی اندھیرے کی تکون بنتی ہے کہ اُوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چوکور لہر آکر اسے کاٹ دیتی ہے - کوئی تصویر پوری نہیں بنتی - معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پاجامہ نکلا اور آسمان کی طرف اُڑ گیا یا کسی کرٹ نے دیکھنے والے کا مُنہ پوری طرح سے ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لئے تڑپنے لگا - جبھی روشنی کی چوکور لہر ایک چوکھٹا سی بن گئی اور اسمیں ایک صُورت آکر کھڑی ہو گئی - دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وُہ آرپار چلا گیا جیسے وہاں کچھ بھی نہ تھا - پیچھے کوئی کُتّا رونے لگا، اوپر طبل نے اس کی آواز ڈبودی -

مدن کو اس کے تصوّر کے خدّوخال ملے لیکن ہر جگہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آرٹسٹ سے ایک غلط خط لگ گیا، یا ہنسی کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند تھی اور مدن بے داغ صنّاعی اور متوازن ہنسی کی تلاش میں کھو گیا -

سبطے نے اس وقت اپنی بیوی سے بات کی جب اس کی بیگم نے مدن کو شالی شوہر کی حیثیت سے سبطے کے سامنے پیش کیا، پیش ہی نہیں کیا بلکہ مُنہ پر سامارا - اس کو اُٹھا کر سبطے نے بیگم کے مُنہ پر دے مارا - معلوم ہوتا تھا کسی خونین تربُوز کا گُودا ہے جس کے رگ و ریشے بیگم کی ناک اسکی آنکھوں اور کانوں پر لگے ہوئے ہیں - کروڑ کروڑ گالی بکتی ہوئی بیگم نے حافظے کی ٹوکری میں سے گُودا اور بیج اُٹھائے اور اِندو کے صاف ستھرے صحن میں بکھیر دیئے -

ایک اندو کی بجائے دو اندو ہو گئیں - ایک تو اِندو خود تھی اور دوسری ایک کانپتا ہُوا خط جو اندو کے پُورے جسم کا احاطہ کئے ہوئے تھا اور جو نظر نہیں آرہا تھا -

مدن کہیں جاتا بھی تھا تو گھر سے ہو کر ..... نہا دھو، اچھے کپڑے پہن، مگھئی کی ایک چوڑی جسمیں خوشبودار قوام لگا ہو، مُنہ میں رکھ کر ..... لیکن اس دن جو مدن گھر آیا تو اندو کی شکل ہی دُوسری تھی، اس نے چہرے پر پوڈر تھوپ رکھا تھا - گالوں پر روج لگا رکھی تھی - لپ اسٹک

کے نہ ہونے پر ہونٹ ماتھے کی بندی سے رنگ لئے تھے ——— اور بال کچھ اس طریقے سے بنائے تھے کہ مدن کی نظریں ان میں اُلجھ کے رہ گئیں۔

"کیا بات ہے آج ؟" مدن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اندو نے مدن سے نظریں بچاتے ہوئے کہا۔ "آج فرصت ملی ہے۔"

شادی کے پندرہ برس گذر جانے کے بعد اندو کو آج فرصت ملی تھی اور وہ بھی اس وقت جبکہ چہرے پر پرچھائیاں چلی آئی تھیں۔ ناک پر ایک سیاہ سی کاٹھی بن گئی تھی اور بلاؤز کے نیچے، ننگے پیٹ کے پاس کمر پر چربی کی دو تین تہیں سی دکھائی دینے لگی تھیں...... آج اندو نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ اِن عیوب میں سے ایک بھی چیز نظر نہ آتی تھی۔ یوں بنی ٹھنی کسی کسائی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی ——— "یہ نہیں ہو سکتا۔" مدن نے سوچا اور اسے ایک دھچکا سا لگا۔ اِس نے پھر ایک بار مُڑ کر اندو کی طرف دیکھا ——— جیسے گھوڑوں کے بیوپاری کسی نامی گھوڑی کی طرف دیکھتے ہیں ——— وہاں گھوڑی بھی تھی اور لال لگام بھی.... یہاں جو غلط خط لگے تھے شرابی کی آنکھوں کو نہ دکھ سکے.... اندو سچ مچ خوبصورت تھی۔ آج بھی پندرہ سال کے بعد [illegible]، رشیدہ، مسز رابرٹ اور ان کی بہنیں اس کے سامنے پانی بھرتی تھیں.... پھر مدن کو رحم آنے لگا اور ایک ڈر!

آسمان پر کوئی خاص بادل بھی نہ تھے لیکن پانی پڑنا شروع ہو گیا۔ ادھر گھر کی گنگا طغیانی پر تھی اور اس کا پانی کناروں سے نکل نکل کر پوری ترائی اور اس کے آس پاس بسنے والے گاؤں اور قصبوں کو اپنی لپیٹ میں لے چلا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اسی رفتار سے پانی بہتا رہا تو اسمیں کیلاش پربت بھی ڈوب جائے گا.... ادھر بچی رونے لگی۔ ایسا رونا جو آج تک نہ روئی تھی مدن نے اسکی آواز سُنکر آنکھیں بند کر لیں۔ کھولیں تو وہ سامنے کھڑی تھی جوان عورت بن کر ——— نہیں نہیں، وہ اندو تھی۔ اپنی [illegible] بیٹی، اپنی ماں کی بیٹی جو اپنی آنکھوں کے دنبالے سے مُسکرائی اور ہونٹوں کے کونے سے دیکھنے لگی۔

اسی کمرے میں جہاں ایک دن مہرل کی دھونی نے مدن کو چکرا دیا تھا، آج خس کی خوشبو نے بوکھلا دیا تھا۔ ہلکی بارش تیز بارش سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس لئے باہر کا پانی اوپر کسی کڑی میں سے رِستا ہُوا اندو اور مدن کے بیچ ٹپکنے لگا۔۔۔۔ لیکن مدن تو شرابی ہو رہا تھا۔ اس نشے میں اسکی آنکھیں سمٹنے لگیں اور تنفس تیز ہو کر انسان کا تنفس نہ رہا۔

"اندو۔۔۔" مدن نے کہا۔۔۔۔ اور اس کی شادی کی رات والی پکار سے دو تُرادپر تھی — اور اندو نے پرے دیکھتے ہوئے کہا — "جی"— اور اس کی آواز دور سے پہنچی تھی۔۔۔۔ پھر آج چاندنی کی بجائے اماوس تھی۔۔۔۔۔

اس سے پہلے کہ مدن اندو کی طرف ہاتھ بڑھاتا، اندو خود ہی مدن سے لپٹ گئی۔ پھر مدن نے ہاتھ سے اندو کی ٹھوڑی اوپر اُٹھائی اور دیکھنے لگا، اس نے کیا کھویا، کیا پایا ہے؟ اندو نے ایک نظر مدن کے سیاہ ہوتے ہوئے چہرے کی طرف پھینکی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"یہ کیا؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا "تمہاری آنکھیں سُوجی ہوئی ہیں۔"

"یُونہی!" اندو نے کہا اور بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "رات بھر جگایا ہے اس چڑیل میّا نے۔"

بچی اب تک خاموش ہو چکی تھی۔ گویا وہ دم سادھے دیکھ رہی تھی، اب کیا ہونے والا ہے؟ آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا۔ واقعی آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا؟ مدن نے پھر غور سے اندو کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں مگر — یہ آنسو؟"

"خوشی کے ہیں۔" اندو نے جواب دیا۔ "آج کی رات بھری ہے۔" اور پھر ایک عجیب سی ہنسی ہنستی ہوئی وہ مدن سے چمٹ گئی۔ ایک تلذذ کے احساس سے مدن نے کہا "آج برسوں کے بعد میرے من کی مراد پُوری ہوئی ہے اندو! مَیں نے ہمیشہ چاہا تھا —"

"لیکن تم نے کہا نہیں۔" اندو بولی۔ "یاد ہے شادی کی رات مَیں نے تم سے کچھ مانگا تھا؟"

"ہاں!" مدن بولا۔ "اپنے دُکھ مجھے دے دو۔"

"تم نے تو کچھ نہیں مانگا مجھ سے۔"

"مَیں نے؟" مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "مَیں کیا مانگتا؟ مَیں تو جو کچھ مانگ سکتا تھا وہ سب تم نے دے دیا۔ میرے عزیزوں سے پیار —— ان کی تعلیم، بیاہ شادیاں، یہ پیارے پیارے بچّے —— یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا۔"

"مَیں بھی یہی سمجھتی تھی"، اندو بولی۔ "لیکن اب جا کر پتہ چلا، ایسا نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں۔" پھر اندو نے رُک کر کہا۔ "مَیں نے بھی ایک چیز رکھ لی۔"

"کیا چیز رکھ لی؟"

اندو کچھ دیر چپ رہی اور پھر اپنا مُنہ پرے کرتی ہوئی بولی۔ "اپنی لاج —— اپنی خوشی .... اس وقت تم بھی کہہ دیتے —— اپنے سُکھ مجھے دے دو —— تو مَیں ......" اور اندو کا گلا رُندھ گیا۔

اور کچھ دیر بعد وہ بولی۔ "اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔"

مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ زمین میں گڑ گیا۔ یہ اَن پڑھ عورت؟ .... کوئی رٹا ہوا فقرہ —— ! نہیں تو ...... یہ تو ابھی سامنے ہی زندگی کی بھٹی سے نکلا ہے ابھی تو اس پر برابر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں اور آتشیں برادہ چاروں طرف اُڑ رہا ہے .....

کچھ دیر کے بعد مدن کے ہوش ٹھکانے آئے اور بولا۔ "مَیں سمجھ گیا اندو۔"

پھر روتے ہوئے مدن اور اندو ایک دوسرے سے لپٹ گئے —— اندو نے مدن کا ہاتھ پکڑا اور اُسے ایسی دنیاؤں میں لے گئی جہاں انسان مر کر ہی پہنچ سکتا ہے .....

کرشن چندر

تائی اسیری

میں گرانٹ میڈیکل کالج کلکتہ میں ڈاکٹری کا فائنل کورس کر رہا تھا اور اپنے بڑے بھائی کی شادی پر چند روز کے لئے لاہور آگیا تھا۔ یہیں شاہی محلے کے قریب کوچہ ٹھاکر داس میں جہاں ہمارا آبائی گھر تھا میری مُلاقات پہلی بار تائی اسیری سے ہوئی ———

تائی اسیری ہماری سگی تائی تو نہ تھیں۔ لیکن ایسی تھیں کہ اُنہیں دیکھ کر ہر ایک کا جی اُنہیں تائی کہنے کے لئے بے قرار ہو جاتا تھا۔ محلّے کے باہر جب اُن کا تانگہ آ کے رُکا اور کسی نے کہا "لو تائی اسیری آگئیں۔" تو بہت سے بُڈھے جوان مرد اور عورتیں اُنہیں لینے کے لئے دوڑے۔ دو تین نے سہارا دے کر تائی اسیری کو تانگے سے نیچے اُتارا۔ کیونکہ تائی اسیری فربہ اندام تھی اور چلنے سے یا باتیں کرنے سے یا محض کسی کو دیکھنے ہی سے اُن کی سانس پھُولنے لگتی تھی۔ دو تین رشتے داروں نے یکبارگی اپنی جیب سے تانگے کے کرائے کے پیسے نکالے۔ مگر تائی اسیری نے اپنی پھُولی ہوئی سانسوں میں ہنس کر سب سے کہہ دیا کہ وُہ تو پہلے ہی تانگے والے کو کرائے کے پیسے دے چُکی ہے اور جب وُہ یُوں اپنی پھُولی ہوئی سانسوں کے درمیان باتیں کرتے کرتے ہنسیں تو مجھے بہت اچھی معلُوم ہوئیں دو تین رشتے داروں کا چہرہ اُتر گیا اور اُنہوں نے اپنے پیسے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا "یہ تم نے کیا کیا تائی؟ ہمیں اتنی سی خدمت کا موقع بھی نہیں دیتی ہو!" اس پر تائی نے کچھ جواب نہیں دیا

اُنھوں نے اپنے قریب کھڑی ہوئی ایک نوجوان عورت سے پنکھی لے لی اور اُسے جھلتے ہوئے مُسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

تائی اسیری کی عُمر ساٹھ سال سے کم نہ ہوگی۔ اُن کے سر کے بال کھچڑی ہو چُکے تھے اور اُن کے بھرے بھرے گول مٹول گندمی چہرے پر بہت اچھے لگتے تھے۔ اُن کا پھُولی پھُولی سانسوں میں معصوم باتیں کرنا تو سب کو اچھا لگتا ہی تھا لیکن مجھے اُن کے چہرے میں اُن کی آنکھیں بڑی غیر معمولی نظر آئیں۔ اُن کی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ دھرتی کا خیال آیا ہے۔ میلوں دُور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کا خیال آیا ہے۔ کسی بڑی اور گہری دریائی بسیط چادرِ آب کا خیال آیا ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آیا ہے کہ اِن آنکھوں کے اندر جو محبت ہے اُس کا کوئی کنارہ نہیں۔ جو معصومیت ہے، اُس کی کوئی تھاہ نہیں۔ جو درد ہے اُس کا کوئی وساں نہیں۔

مَیں نے آج تک ایسی آنکھیں کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھیں۔ جو اس قدر وسیع اور بے کنار ہوں، کہ زندگی کو بڑے سے بڑا اور تلخ سے تلخ تجربہ بھی اُن کے لئے ایک تنکے سے زیادہ حیثیت نہ رکھے۔ ایسی آنکھیں جو اپنی پہنائیوں میں سب کچھ بہا لے جائیں۔ ایسی اُوکھی دان کر دینے والی، درگزر کر دینے والی آنکھیں مَیں نے آج تک نہیں دیکھیں۔

تائی اسیری نے کاسنی شاہی کا گھاگھرا پہن رکھا تھا جس پر سنہری گوٹے کا لہریہ چمک رہا تھا۔ اُن کی قمیض بسنتی ریشم کی تھی جس پر زری کے پھُول کڑھے ہوئے تھے۔ سر پر دوہری ململ کا قرمزی دوپٹہ تھا۔ ہاتھوں میں سونے کے گوکھرو تھے۔ جب وُہ گھر کے دالان میں داخل ہُوئیں تو چاروں طرف شور مچ گیا۔ بہوئیں اور خالائیں اور نندیں اور بھاوجیں، موسیاں اور چچیاں سب تائی اسیری کے پاؤں چھُونے کو دوڑیں۔ ایک عورت نے جلدی سے ایک رنگین پیڑھی کھینچ کر تائی اسیری کے لئے رکھ دی اور تائی اسیری ہنستے ہوئے اُس پر بیٹھ گئیں اور باری باری سے سب کو گلے لگا کر سب کے سر پر ہاتھ پھیر کر سب کو دعا دینے لگیں۔

اور اُن کے قریب ہیر دیہی کی بیٹی سوتری خوشی سے اپنی باچھیں کھلائے زور زور سے

پنکھا جھل رہی تھی۔ تائی اسیری گھر سے رنگین پھچّی کی ایک ٹوکری لے کر آئی تھی۔ جو اُن کے قدموں میں اُن کی پیڑھی کے پاس ہی پڑی تھی۔ وہ باری باری سے سب کو دُعائیں دیتی جاتیں اور پھچّی والی ٹوکری کھول کر اُس میں سے ایک چوّنی نکال کر دیتی جاتیں۔ کوئی ایک سو چوّنیاں اُنہوں نے اگلے بیس منٹ میں بانٹ دی ہوں گی۔ جب سب عورتیں اور مرد۔ لڑکے اور بچے بالے اُن کے پاؤں چھُو کر اپنی اپنی چوّنی لے چکے تو اُنہوں نے اپنی ٹھوڑی اُونچی کر کے پنکھا جھلنے والی لڑکی کی طرف دیکھا اور اس سے پُوچھا۔

"تُو کون ہے؟"

"مَیں سوتری ہُوں۔" بچّی نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

"ہائے ہائے تُو جے کرشن کی لڑکی ہے؟ مَیں تو بھُول ہی گئی تھی تجھے۔ آ جا گلے سے لگ جا۔۔۔۔"

تائی اسیری نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ بلکہ اُس کا مُنہ بھی چُوم لیا اور جب اُنہوں نے اُسے اپنی پھچّی والی ٹوکری سے نکال کر چوّنی دی تو گھر کی ساری عورتیں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں اور موسی کرتارو اپنی نیلم کی انگوٹھی والی اُنگلی نچا کر بولی۔

"تائی یہ تو جے کشن کی بیٹی سوتری نہیں ہے۔ یہ تو ہیرو مہری کی بیٹی سوتری ہے!"

"ہائے مَیں مر گئی!" تائی اسیری اِکدم گھبرا کر بولیں اور اُن کی سانس پھُول گئی۔ "ہائے اب تو مجھے نہانا پڑے گا۔ مَیں نے تو اس کا مُنہ بھی چُوم لیا۔ اب کیا کروں؟"

تائی اسیری نے بڑی بڑی حیران نگاہوں سے مہری کی بیٹی سوتری کی طرف دیکھا جو اب اس طرح دُھتکارے جانے پر سسکنے لگی تھی۔ یکایک تائی کو اُس پر رحم آ گیا۔ اُنہوں نے پھر اُسے باہنہ سے پکڑ کر چمٹا لیا ـــــ "ناں! ناں! تو کیوں روتی ہے۔ تُو تو انجان ہے۔ تُو تو دیوی ہے۔ تُو تو کنواری ہے۔ تیرے من میں تو پرمیسر بستے ہیں۔ تو کیوں روتی ہے۔ مجھے تو اپنے دھرم کے کارن نہانا پڑے گا۔ پر تُو کیوں روتی ہے۔ لے ایک چوّنی اور لے۔۔۔۔"

تائی اسیری نے اُسے دُوسری چوّنی دی ۔ دُوسری چوّنی پاکر بھری کی بیٹی سوتری اپنے آنسو پونچھ کر مُسکرانے لگی ۔ تائی اسیری نے ایک بازو اُٹھا کر پرے دالان میں گزرتی ہوئی ہیرو بھری کو دیکھ کر بلند آواز میں کہا ۔

"نی ہیرو ۔ میرے اشنان کے لئے بھی پانی رکھ دے ۔ تجھے بھی ایک چوّنی دوں گی !"

اس پر ساری محفل پھر لوٹ پوٹ ہو گئی ۔

تائی اسیری کو کئی لوگ چوّنی والی تائی کہتے تھے ۔ کئی لوگ کنواری تائی کہتے تھے ۔ کیونکہ یہ بھی مشہور تھا کہ جس دن سے تایا یودھ راج نے تائی اسیری سے شادی کی تھی اُس دن سے آج تک وُہ کنواری کی کنواری چلی آ رہی تھیں ۔ کیونکہ سُنانے والے تو یہ بھی سُناتے ہیں کہ تایا یودھراج نے اپنی شادی سے پہلے جوانی میں اتنی خوبصورت عورتیں دیکھ ڈالی تھیں کہ جب اُن کی شادی گاؤں کی اس سیدھی سادی لڑکی سے ہُوئی تو شادی کے پہلے روز ہی وہ اُنہیں بالکل پسند نہ آئیں ۔ جب سے اُنہوں نے شادی کر کے اُنہیں بالکل اکیلا چھوڑ دیا تھا مگر کسی طرح کی سختی نہیں کرتے تھے ۔ تایا یودھراج ہر ماہ پچھتر روپے اُسے بھیجتے تھے ۔ وہ گاؤں میں رہتی تھیں ۔ اپنے سُسرال کے ہاں ـــ اور سب کی خدمت کرتی تھیں اور تایا یودھراج جالندھر میں لوہے کا بیوپار کرتے تھے اور کئی کئی سال اپنے گاؤں میں نہیں جاتے تھے ۔ میکے والوں نے کئی بار آ کر تائی کو لے جانا چاہا مگر اُنہوں نے اِنکار کر دیا ۔ میکے والوں نے یہ بھی چاہا کہ اُن کی شادی پھر سے کر دی جائے ۔ مگر تائی اِس کے لئے بھی راضی نہ ہوئیں ۔ وُہ ایسے انہماک سے اپنے سُسرال کے لوگوں کی خدمت کرتی رہیں کہ سُسرال والے خود اسے اپنی بیٹی اور بہو سے زیادہ چاہنے لگے ۔ تایا یودھراج کے باپ مالک چند نے تو اپنے گھر کی ساری چابیاں تائی اسیری کے سپُرد کر دی تھیں اور ساس بھی اِس حد تک چاہنے لگی تھیں کہ اُنہوں نے اپنے سارے گہنے پاتے نکال کر تائی اسیری کی تحویل میں دے دیئے تھے ۔ ویسے بہت سی عورتوں کو دیکھ کر یہ خیال بھی آتا ہے کہ جوانی میں یہ کیسی رہی ہوں گی ؟ مگر تائی اسیری کو دیکھ کر کبھی یہ خیال نہ آیا ۔ ہمیشہ یہی خیال آتا کہ تائی اسیری شائد بچپن سے ، بلکہ جنم ہی سے ایسی پیدا

ہوتی ہوں گی۔ پیدا ہوتے ہی اُنہوں نے اپنی ماں کو ہاتھ پھیلا کر آشیرواد دی ہوگی اور شاید بڑے میٹھے مہربان لہجے میں یہ بھی کہا ہو ——— تجھے میرے لئے بہت دُکھ اُٹھانے پڑے اس لئے یہ لیجئے ایک چونّی!

شاید اسی لئے اپنے شوہر سے بھی اُن کے تعلقات بے حد خوشگوار تھے۔ تایا بُدھ راج ہمارے رشتے داروں کی نظر میں شرابی کبابی اور رنڈی باز تھے۔ وُہ لوہے کے بڑے بیوپاری تھے تو کیا ہُوا، اُنہیں اس طرح سے تائی ایسری کی زندگی برباد کرنا نہ چاہیئے۔ مگر جانے کیا بات تھی تائی ایسری کو قطعاً اپنی زندگی برباد ہونے کا کوئی غم نہ تھا۔ اُن کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں اس بات کا بھی علم نہیں ہے کہ کسی نے اُن کی زندگی برباد کی ہے۔...... ہر وقت ہنستی کھیلتی باتیں کرتی۔ ہر ایک کے سُکھ اور دُکھ میں شامل ہونے اور مدد کرنے کے لئے تیار نظر آتیں۔ یہ تو بالکل ناممکن تھا کہ پڑوس میں کسی کے ہاں خوشی ہو اور وُہ اُسمیں شریک نہ ہو۔ کسی کے ہاں کوئی غم ہو اور وُہ اُسمیں حصّہ نہ بٹائیں۔ تائی ایسری کے شوہر امیر تھے مگر وُہ خود تو امیر نہ تھیں۔ پچھتّر روپے جو اُنہیں ماہوار ملتے تھے وُہ اُنہیں ہمیشہ دُوسروں پر خرچ کر دیتی تھیں۔ مگر وُہ سستے زمانے کے پچھتّر روپے تھے۔ اِسی لئے بہت سے لوگوں کے دُکھ درد دُور ہو جاتے تھے۔ مگر لوگ اُن سے اُن کی وقت بے وقت کی مدد کی وجہ سے پیار نہیں کرتے تھے۔ ایسے ہی بہت سے موقعے آتے تھے جب تائی ایسری کی جیب میں ایک چھدام تک نہ ہوتا تھا۔ اُس وقت بھی لوگ بے مزہ نہ ہوئے بلکہ یہی کہتے سُنے گئے کہ تائی ایسری کے تو چرن چھُو لیتے ہی سے دِل کو شانتی مل جاتی ہے۔

مگر جتنی اچھی تائی ایسری تھیں، تایا بُدھ راج اتنے ہی بُرے تھے۔ تیس برس تک تو اُنہوں نے تائی ایسری کو اپنے ماں باپ کے گھر گاؤں ہی میں رکھا اور جب اُن کے ماں اور باپ دونوں ہی مر گئے اور گھر خالی ہو گیا، گھر کے دُوسرے افراد بڑے ہو گئے اور شادیاں کر کے اور اپنے گھر بسا کے دوسری جگہوں پہ چلے گئے تو اُنہیں بادلِ ناخواستہ تائی ایسری کو بھی جالندھر بلوانا پڑا۔ مگر یہاں تائی ایسری چند دنوں سے زیادہ نہ رہ سکیں کیونکہ پکّا باغ کے معزّز پٹھانوں

کی ایک لڑکی سے تایا یودھ راج نے یارانہ گانٹھنے کی کوشش کی تھی۔ نتیجے میں انہیں جالندھر سے بھاگ کر لاہور آنا پڑا۔ کیونکہ لچّہ باغ کے پٹھانوں نے آکر تائی اسیری سے کہہ دیا تھا کہ صرف تمہاری وجہ سے ہم نے اُسے زندہ چھوڑ دیا ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم اپنے گھر والے کو لے کر کہیں چلی جاؤ۔ ورنہ ہم اُسے زندہ نہ چھوڑیں گے اور تائی اسیری اس واقعہ کے چند روز بعد ہی تایا کو لے کر لاہور آگئیں محلہ بچاراں۔ یہاں انہوں نے ایک چھوٹا سا مکان لے لیا تھا۔ خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے یہاں بھی تایا یودھ راج کا بیوپار چند مہینوں ہی میں چمک گیا۔ اِسی اثناء میں اُنہوں نے شاہی محلّے کی ایک طوائف لچھمی سے دوستی کر لی اور ہوتے ہوتے یہ قصّہ یہاں تک بڑھا کہ اب اُنہوں نے مستقل طور پر اُسی لچھمی کے گھر رہنا شروع کر دیا تھا اور محلہ بچاراں میں قدم تک نہ دھرتے تھے۔ لیکن تائی اسیری کو دیکھ کر کبھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُنہیں اس امر کا اتنا سا بھی ملال ہُوا ہوگا۔

یہی وُہ زمانہ تھا جب تایا یودھ راج اور اُسی طوائف کا قصّہ زوروں پر تھا۔ اُنہی دنوں ہمارے بڑے بھائی صاحب کی شادی ہوئی۔ شادی میں تایا یودھ راج تو شریک نہ ہوئے۔ لیکن تائی نے رشتے داروں۔ مہمانوں اور برات کی خدمت گزاری میں دن رات ایک کر دیا۔ اُن کی خُوش مزاجی سے پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیاں سُلجھ گئیں۔ چہرے پر چڑھی ہوئی تیوریاں اُتر گئیں اور جبینیں شکنوں سے صاف اور منوّر ہو گئیں۔ اِسمیں تائی کی کاوش کو کوئی دخل نہ تھا۔ سکُون کی شعاعیں گویا خود بخود اُن کے جسم سے پُھوٹتی تھیں۔ اُنہیں دیکھتے ہی ہر ایک کا غُصّہ اُتر جاتا۔ پیچیدہ سے پیچیدہ اُلجھنیں خُود بخود سُلجھ جاتیں۔ گھر بھر میں بشاشت بکھر جاتی۔ ایسی تھیں تائی اسیری!

مَیں نے تائی اسیری کو کبھی کسی کی بُرائی کرتے نہیں دیکھا۔ کبھی قسمت کا گلہ کرتے نہیں دیکھا۔ کبھی رنجُور یا اُداس نہیں دیکھا۔ ہاں ایک بار اُن کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دیکھی تھی اور وہ واقعہ بھی اسی شادی سے متعلق ہے۔

بڑے بھائی صاحب تو رات بھر شادی کی بیدی پر بیٹھے رہے۔ صُبح کے پانچ بجے شادی کے بعد لڑکی والوں نے اپنے گھر کے ہال کو جہیز کا سامان دکھانے کے لئے سجا دیا۔ پُرانے زمانے

تھے وہ۔ اُس زمانے میں صوفوں کے بجائے رنگین پیڑھیاں دی جاتی تھیں اور منقش پایوں والے پلنگ دیئے جاتے تھے۔ اُس زمانے میں ڈرائنگ روم کو بیٹھک یا دیوان خانہ کہا جاتا تھا۔ میرے بڑے بھائی کے سسر ملٹری میں ایگزیکٹو آفیسر تھے۔ چونکہ وہ پہلے ہندوستانی ایگزیکٹو آفیسر تھے اس لئے اُنہوں نے جہیز میں بہت کچھ دیا تھا اور ساری ہی نئے فیشن کی چیزیں دی تھیں۔ ہماری برادری میں پہلی بار جہیز میں صوفہ سیٹ دیا گیا۔ ساری برادری میں اس صوفہ سیٹ کی دھوم مچ گئی۔ دُور دُور کے محلوں سے بھی عورتیں "انگریجی پیڑھیوں" کو دیکھنے کے لئے آنے لگیں۔ تائی اسیری کے لئے بھی صوفہ سیٹ دیکھنے کا پہلا موقعہ تھا۔ پہلے تو بڑی حیرانی سے اسے دیکھتی رہیں۔ اُس پر ہاتھ پھیر کر بار بار من ہی من میں کچھ بڑبڑاتی رہیں۔ آخر اُن سے رہا نہ گیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھ ہی لیا

"وے کاکا۔ اِس کو صوفہ سیٹ کیوں بولتے ہیں؟"

اب مَیں اِس کا جواب کیا دیتا۔ سر ہلا کر کہنے لگا۔

"مجھے نہیں معلوم تائی!"

"اچھا تو اس کی دو کرسیاں چھوٹی کیوں ہیں اور وہ تیسری کرسی لمبی کیوں ہے؟"

مَیں پھر لاجواب ہو گیا۔ خاموشی سے اِنکار میں سر ہلا دیا۔

تائی دیر تک سوچتی رہیں۔ پھر یکا یک جیسے اُن کی سمجھ میں کچھ آ گیا۔ اُن کا چہرہ اُن کی معصوم سی مسکراہٹ سے روشن ہو اُٹھا۔ بولیں۔ "مَیں بتاؤں؟"

مَیں نے کہا ـــــ "بتاؤ تائی!"

وہ ہم سب کو بچوں کی طرح سمجھاتے ہوئے بولیں ـــــ "دیکھو۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ لمبا صوفہ تو اس لئے بنا ہے کہ جب دونوں میاں بیوی میں صلح ہو تو وہ دونوں اِس لمبے صوفے پر بیٹھیں اور جب اُن دونوں میں لڑائی ہو تو الگ الگ اِن دو چھوٹے چھوٹے صوفوں پر بیٹھیں۔ سچ مچ یہ انگریج بڑے عقلمند ہوتے ہیں۔ جبھی تو ہم پہ حکومت کرتے ہیں!"

تائی کی دلیل سن کر محفل میں ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ مگر مَیں نے دیکھا کہ تائی یہ سوچ

کر اور بات کہہ کر کچھ چُپ سی رہ گئیں۔ کیا اس وقت انہیں اپنا اور اپنے خاوند کا جھگڑا یاد آ رہا تھا؟ یہ تو مَیں نہیں کہہ سکتا۔

مَیں نے جب غور سے اُن کی آنکھوں میں دیکھا تو ایک پل کے لئے مجھے اُن کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نظر آئی۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہو گیا ہو!

کلکتے سے ایم۔بی۔بی۔ایس کرنے کے بعد مَیں نے وہیں ایک بنگالی لڑکی سے شادی کر لی اور دھرم تلے میں پریکٹس کرنے لگا۔ کئی سال کوشش کرتا رہا مگر پریکٹس نہ چلی۔ چنانچہ اپنے بڑے بھائی صاحب کے اصرار پر لاہور چلا آیا۔ بھائی صاحب نے کوچہ ٹھاکر داس کے نکڑ پر مجھے دوکان کھول دی اور مَیں اپنے گھر میں یعنی اپنے محلے میں، اپنی برادری ہی کے سہارے پریکٹس چلانے لگا۔ کلکتے میں مَیں بالکل اناڑی تھا، نوجوان تھا اور زندگی کا تجربہ بھی نہ تھا۔ یہاں آ کر جب آٹھ دس برسوں میں گاہک کو پھانسنے کی ترکیب سمجھ میں آئی تو پریکٹس خود بخود چل نکلی۔ اب دن رات مصروف رہتا تھا۔ بچے بھی ہو گئے تھے۔ اس لئے زندگی سُوت کی انٹی کی طرح ایک ہی مدار پر چکر کھانے لگی۔ اِدھر اُدھر جانے کا موقعہ کم ملتا تھا۔ اب تو کئی برس سے تائی ایسری کا مُنہ نہ دیکھا تھا، مگر اتنا سُن رکھا تھا کہ تائی ایسری اُسی مکان میں محلہ نجاراں میں رہتی ہیں اور تایا پوڈہ رام شاہی محلے میں اُسی لچھمی کے مکان میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی دوسرے تیسرے مہینے تائی ایسری کی خبر لینے آ جاتے ہیں۔

ایک روز مَیں صبح کے وقت مریضوں کی بھیڑ میں بیٹھا نسخے تجویز کر رہا تھا کہ محلہ نجاراں کے ایک آدمی نے آ کر کہا "جلدی چلیے ڈاکٹر صاحب۔ تائی ایسری مر رہی ہیں۔"

بس اُسی وقت سب کام چھوڑ چھاڑ کر اُس آدمی کے ساتھ ہو لیا۔ محلہ نجاراں کے بالکل اُس آخری سِرے پر تائی کا مکان تھا۔ پہلی منزل کی سیڑھیاں چڑھ کر جب مَیں آنگن سے لاکھوں والے

موکھے سے گزر کر اُن کے نیم تاریک کمرے میں داخل ہوا تو وہ بڑے بڑے تکیوں کا سہارا لئے پلنگ سے لگی بیٹھی تھیں۔ اُن کی سانس زور زور سے چل رہی تھی اور اُنہوں نے بڑے زور سے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں طرف گویا اپنے دِل کو پکڑ رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر ہی وہ پھولے پھولے سانسوں میں مسکرانے لگیں۔ بولیں۔ "تو آ گیا پتر! اب میں بچ جاؤں گی!"

"کیا تکلیف ہو گئی ہے تائی؟"

"ہوتا کیا موت کا بُلاوا آ گیا تھا۔ دو دِن مجھے سخت کس رہی (بخار) پھر ایکا ایکی جسم ٹھنڈا ہونے لگا۔" (بیان کرتے کرتے تائی کی آنکھوں کی پُتلیاں پھیلنے لگیں) پہلے ٹانگوں سے جان گئی۔ ٹانگوں کو ہاتھ لگاؤں تو ٹھنڈی یخ۔ چٹکی بھروں تو کچھ محسوس نہ ہو۔ پھر دھیرے دھیرے میری جان کمر سے بھی نکل گئی اور جب میری جان اُوپر سے بھی نکلنے لگی تو میں نے زور سے اپنے کلیجے کو پکڑ لیا۔" تائی اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں طرف اپنے دِل والے حصّے کو اور زور سے پکڑ کر بولیں۔ "تو میں نے زور سے اپنے کلیجے کو پکڑ لیا اور چلّائی۔ ارے کوئی ہے۔ کوئی ہے تو جائے اور جے کشن کے بیٹے رادھا کشن کو بُلا کر لائے۔ وہی مجھے ٹھیک کر سکتا ہے! —— اب تم آ گئے ہو اب —— اب میں بچ جاؤں گی!" —— تائی ایسری نے مکمل طمانیت سے کہا۔

میں نے اپنا ہاتھ تائی کے دائیں ہاتھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تائی ذرا اپنا یہ ہاتھ اِدھر کرو۔ تمہاری نبض تو دیکھوں؟"

اکدم تائی دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ جھٹک کر بولیں۔ "ہائے وے! تم کیسے ڈاکٹر ہو؟ تجھے اِتنا معلوم نہیں کہ اس ہاتھ سے تو میں نے اپنی جان پکڑ رکھی ہے۔ اِس ہاتھ کی نبض تجھ کو کیسے دِکھا سکتی ہوں!!"

تائی چند ہفتوں میں اچھی ہو گئیں۔ اُنہیں تو بلڈ پریشر کی شکائت تھی۔ جب وہ جاتی رہی تو پھر اُٹھ کر گھومنے لگیں اور اپنے پرائے سب کے سُکھ دُکھ میں بدستور شریک ہونے لگیں

لیکن جب وہ اچھی ہوئیں تو اس کے چند ماہ بعد ہمارے تایا یودھ راج کا انتقال ہُوا۔ وہیں لچھمی کے گھر شاہی محلے میں اُن کا ہارٹ فیل ہُوا۔ وہیں سے اُن کی ارتھی اُٹھی۔ کیونکہ تائی نے اُن کی لاش کو گھر لانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ تائی نہ ارتھی کے ساتھ گئیں نہ اُنہوں نے شمشان گھاٹ کا رُخ کیا۔ نہ اُن کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ تک نکلا تھا۔ اُنہوں نے خاموشی سے اپنے سہاگ کی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ رنگین کپڑے اُتار کر سپید دھوتی پہن لی اور اپنے ماتھے کا سیندور پونچھ کر چولھے کی راکھ اپنے ماتھے پر لگالی مگر اُن کے دھرم کرم میں اور کسی طرح کا فرق نہ آیا۔ بلکہ اپنے سفید بالوں سے وہ اب اس سفید دھوتی میں اور بھی اچھی لگ رہی تھیں تائی کی اس حرکت پر برادری میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔ سب کو اچنبھا ہُوا۔ کچھ لوگوں نے بُرا بھی مانا۔ مگر تائی کی عزت اِس قدر زیادہ تھی کہ اُن کے سامنے زبان کھولنے کی کسی کو ہمت نہ پڑی!

چند برس اور گذر گئے۔ اب میری پریکٹس اِس قدر چمک اُٹھی تھی کہ میں نے محلہ ٹھاکر داس کے علاوہ شاہ عالمی گیٹ کے اندر کوچہ کوماں اور وچھو والی کے چوک میں بھی پریکٹس شروع کر دی تھی۔ صبح میں محلہ ٹھاکر داس میں بیٹھتا تھا شام کو وچھو والی میں۔ زندگی کچھ اِس نہج سے گزر رہی تھی کہ تائی اسیری کو دیکھے ہوئے ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو برس گزر جاتے تھے۔ مگر گھر کی عورتوں سے تائی اسیری کی خیریت کی خبر ملتی رہتی تھی۔ تایا یودھ راج نے اپنے بینک کا سارا روپیہ تو لچھمی کو سونپ دیا تھا مگر جالندھر کی دُکان اور مکان تائی اسیری کے نام لکھ گئے تھے۔ اُن سے ہر ماہ تائی اسیری کو ڈیڑھ سو روپیہ کا کرایہ آجاتا تھا۔ وہ بدستور اسی طرح محلہ دنیاراں میں رہتی تھیں اور دن رات اپنے دھرم کرم میں ڈوبی رہتی تھیں۔

ایک روز اتفاق سے جب میں شاہی محلے میں ایک مریض کو دیکھ کر لوٹ رہا تھا تو مجھے تایا یودھ راج کی یاد آگئی اور اُن کی یاد سے لچھمی کی یاد آگئی۔ کیونکہ لچھمی بھی تو اسی شاہی محلے میں کہیں رہتی تھی اور جب لچھمی کی یاد آئی تو میرا ذہن فوراً تائی اسیری کی طرف منتقل ہو گیا

اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔ غالباً بارہ پندرہ مہینوں سے میں تائی اسیری کو دیکھنے نہ گیا تھا۔ میں نے سوچا میں کل یا پرسوں پہلی فرصت ہی میں تائی اسیری کو دیکھنے جاؤں گا۔

ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ شاہی محلے کی ایک گلی سے میں نے تائی اسیری کو نکلتے دیکھا قرمزی شامی کے بجائے اب وہ سیاہ ساٹن کا گھاگرا پہنے تھیں۔ جس پر نہ گوٹا تھا نہ لچکا قمیص بھی سفید رنگ کی تھی اور سر پر انہوں نے سفید ململ کا دوہرا دوپٹہ لے رکھا تھا۔ جس میں اُن کا گول سڈول چہرہ بالکل میڈونا کی طرح معصوم اور پُراسرار نظر آ رہا تھا۔

جس لمحے میں نے انہیں دیکھا۔ اسی لمحے انہوں نے بھی مجھے دیکھا اور مجھے دیکھتے ہی شرما سی گئیں اور فوراً مجھ سے کترا کر واپس گلی میں جانے لگیں۔ کہ میں نے انہیں فوراً آواز دے دی۔ میری آواز میں ایک ایسی حیرت تھی جو ایک چیخ سے مشابہ تھی۔ یہ تائی اسیری یہاں طوائفوں کے محلے میں کیا کر رہی تھیں ؟

"تائی اسیری" میں نے چلا کر کہا۔ "تائی اسیری!" میں نے پھر آواز دی۔

میری آواز سُن کر وہ پلٹ آئیں۔ سامنے آ کر ایک گناہ گار مجرم کی طرح کھڑی ہو گئیں۔ اُن کی نگاہیں اوپر نہ اُٹھتی تھیں۔

"تائی اسیری تم یہاں کیا کرنے آئی ہو ؟" میں نے کچھ حیرت سے کچھ غصے سے اُن سے کہا۔ وہ اسی طرح سر نیچا کئے آہستہ آہستہ جھجکتے جھجکتے بولیں۔ "وے پُتر! کیا بتاؤں، وہ ..... وہ ..... میں نے سُنا تھا کہ لچھی بیمار ہے۔ بہت سخت بیمار ہے۔ میں نے سوچا اُسے دیکھ آؤں ..... !"

"تم یہاں لچھی کو دیکھنے آئی تھیں ؟" میں نے غم اور غصے سے تقریباً چیخ کر کہا۔ "لچھی کو ..... لچھی کو ..... اس بدذات چھنال کو ؟ ..... جس نے ..... جس نے ..... !"

تائی اسیری نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اوپر اُٹھایا اور میں کہتے کہتے رُک گیا ـــــ

"نہ، نا کا کا! اس کو کچھ نہ کہو ..... کچھ نہ کہو ....." تائی اسیری نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی

آنکھیں اُوپر اُٹھائیں اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔ "مرنے والے کی یہی ایک نشانی رہ گئی تھی۔ آج وُہ بھی چل بسی !!"

سن ۴۷ء کے فسادات میں ہم لوگ لاہور چھوڑ کر جالندھر میں پناہ گزین ہوئے۔ کیونکہ یہاں پر تائی اسیری کا گھر تھا۔ خاصہ کھُلا دو منزلہ گھر تھا۔ اوپر کی منزل اُنہوں نے اپنے رشتے دار پناہ گزینوں کو دے ڈالی تھی۔ نچلی منزل میں وُہ خود رہتی تھیں۔ ہر روز وُہ ریفیوجی کیمپوں میں سیوا کرنے جاتیں اور کبھی کبھار دو ایک یتیم بچے اُٹھا لاتیں۔ چار پانچ ماہ ہی میں اُنہوں نے چار لڑکے اور تین لڑکیاں اپنے پاس رکھ لیں۔ کیونکہ اُن کے ماں باپ کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ نچلے کے آنگن اور سامنے کے دالان میں بھی اُنہوں نے مختلف پناہ گزینوں کو سونے اور کھانا پکانے کی اجازت دے دی تھی۔ ہوتے ہوتے اچھا خاصا گھر ایک سرائے میں تبدیل ہو گیا مگر مَیں نے تائی اسیری کے ماتھے پر کبھی ایک شکن نہیں دیکھی۔ وہ اپنے گھر میں بھی باہر سے اِس طرح آتی تھیں جیسے وُہ گھر اُن کا نہ ہو۔ اُن پناہ گزینوں کا ہو جنہیں اُنہوں نے اپنے گھر میں رہنے کی خود اجازت دی تھی۔ عورتوں میں شخصی جائیداد کی حِس بہت تیز ہوتی ہے مگر مَیں نے عورتوں میں تو کیا مردوں میں بھی ایسا کوئی فرد مشکل ہی سے دیکھا ہوگا جسے تائی اسیری کی طرح شخصی جائیداد کا اِس قدر کم احساس ہو۔ قدرت نے اُن کے دماغ میں شائد یہ خانہ ہی خالی رکھا تھا۔ اُن کے پاس جو کچھ تھا دُوسروں کے لئے وقف تھا۔ جالندھر آ کر وُہ صِرف ایک وقت کھانا کھانے لگی تھیں۔ مَیں اُن کی اِن حرکتوں سے بہت چڑتا تھا کیونکہ مَیں نے اپنی قیمتی پریکٹس لاہور میں کھو دی تھی۔ میری ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی بھی وہیں رہ گئی تھی اور اب میرے پاس سر چھپانے کو کہیں جگہ نہ تھی۔ میرے پاس نہ ڈھنگ کے کپڑے تھے نہ روپیہ پیسہ تھا۔ نہ کھانا پینا ٹھیک کا ہو سکتا تھا۔ جو مِلا کھا لیا۔ جب مِلا کھا لیا۔ نہ مِلا تو بھُوکے رہ گئے۔ اِنہی دِنوں مجھے خُونی بواسیر لاحق ہو گئی۔ دوائیں تو مَیں نے طرح طرح کی اِستعمال کیں کیونکہ مَیں خُود ڈاکٹر تھا۔ مگر اِس بے سروسامانی میں علاج کے ساتھ پرہیز ضروری ہے، وہ کہاں سے ہوتا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ مَیں دِن بدن کمزور

ہوتا چلا گیا۔ کچھ روز تک تو مَیں نے تائی سے اپنی حالت کو چھپائے رکھا مگر ایک دن انہیں پتہ چل ہی گیا۔ فوراً گھبرائی گھبرائی میرے پاس پہنچیں اور مجھ سے کہنے لگیں —— کاکا میں تم سے کہتی ہوں یہ خونی بواسیر ہے۔ یہ ڈاکٹری علاج سے ٹھیک نہ ہوگی۔ تم ایسا کرو کرایہ مجھ سے لے لو اور سیدھے گوجرانوالہ چلے جاؤ۔ وہاں محلہ سنیاریاں میں چاچا کریم بخش جرّاح رہتا ہے۔ اس کے پاس ایک ایسی دوائی ہے جس سے خونی سے خونی بواسیر ٹھیک ہو جاتی ہے تیرے تایا کو آج سے بیس سال پہلے یہ تکلیف ہو گئی تھی اور اُسے چاچا کریم بخش ہی نے ٹھیک کر دیا تھا۔ دس دن میں وہ ٹھیک ہو کر گوجرانوالے سے واپس جالندھر آ گئے تھے۔"

یہ سُنکر مجھے بے حد غصّہ آیا۔ مَیں نے کہا۔ "تائی تجھے معلوم ہے اب مَیں گوجرانوالہ نہیں جا سکتا۔"

"کیوں نہیں جا سکتا، ٹکٹ کے پیسے مَیں دیتی ہوں!"

"ٹکٹ کا سوال نہیں ہے۔ گوجرانوالہ اب پاکستان میں ہے۔"

"پاکستان میں ہے تو کیا ہوا۔ کیا ہم دوا دارو کے لئے بھی وہاں نہیں جا سکتے! وہاں اپنا چاچا کریم بخش ......"

مَیں نے تائی کی بات کاٹ کر کہا۔ "تائی تجھے کچھ معلوم تو ہے نہیں۔ خواہ مخواہ اُلٹی سیدھی باتیں کرتی ہو۔ مسلمانوں نے اب اپنا دیس الگ کر لیا ہے۔ اُس کا نام پاکستان ہے۔ ہمارے دیس کا نام ہندوستان ہے۔ اب نہ ہندوستان والے پاکستان جا سکتے ہیں نہ پاکستان والے یہاں آ سکتے ہیں۔ اِس کے لئے پاسپورٹ کی ضرورت ہوگی۔"

تائی کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ بولیں "پاس کورٹ؟ —— کیا اس کے لئے کچہری جانا پڑتا ہے؟"

"ہاں ہاں اِس کے لئے کچہری ہی جانا پڑتا ہے!" مَیں نے جلدی سے ٹالنے کے لئے کہہ دیا۔ اب اُس بڈھی کو کون سمجھائے۔

نہ بیٹا کورٹ جانا تو اچھا نہیں ہے۔ شریفوں کے بیٹے کبھی کچہری نہیں جاتے۔ مگر وہ چاچا کریم بخش۔۔۔۔۔۔!"

"بھاڑ میں جائے چاچا کریم بخش"۔ مَیں نے چلّا کر کہا۔

"بیس برس پہلے کی بات کرتی ہو۔ جانے وُہ تمہارا چاچا کریم بخش آج زندہ بھی ہے کہ مر گیا۔ مگر تُم وہی اپنا چاچا چاکریم بخش رٹے جا رہی ہو۔"

تائی روتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔ اُن کے جانے کے بعد مجھے اپنی تنک مزاجی پر بےحد افسوس ہُوا۔ کیوں مَیں نے اِس معصوم عورت کا دِل دُکھایا۔ اگر تائی آج کی زندگی کی بہت سی دشواریوں کو نہیں سمجھ سکتی ہیں تو اِس میں اُن کا کیا قصُور ہے؟

مَیں دراصل اِن دِنوں بہت ہی تلخ مزاج ہو چلا تھا۔ کالج کے دِنوں میں مَیں اکثر اِنقلاب کی باتیں کِیا کرتا تھا۔ پھر جب زندگی نے مجھے کامرانی بخشی اور میری پریکٹس چل نکلی تو اِنقلاب کا جوش سرد پڑ گیا اور ہوتے ہوتے یہ لفظ ہی میرے ذہن سے محو ہو گیا۔ اب جالندھر آ کر جو یہ اُفتاد پڑی تو میرے دِل میں پھر سے اِنقلاب کے خیال نے کروٹ لی اور مَیں اپنی طرح کے چند جوشیلے اور لُٹے پُٹے لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر پھر سے اُسی تلخی۔ تیزی اور تندی سے انقلاب کی باتیں کرنے لگا۔

یہ سب لوگ اکثر تائی اسیری کی دُوسری منزل میں میرے کمرے میں مِلتے۔ چائے کا دور چلتا اور دُنیا جہان کی باتیں ہوتیں اور مَیں جوش سے اپنا مُکا ہوا میں لہرا کر کہتا۔ "ہم سے اِنصاف نہیں ہو رہا ہے اور ان لوگوں سے اِنصاف کی توقع بھی نہیں ہے۔ یقیناً اِس مُلک میں پھر ایک اِنقلاب آئے گا اور ضرور آ کے رہے گا وُہ اِنقلاب!"

ایک دِن تائی اسیری نے ہماری باتیں سُن لیں۔ تو گھبرائی گھبرائی اندر آئیں۔ بولیں۔

"بیٹا۔ کیا مُسلمان یہاں پھر آئیں گے؟"

"نہیں تائی۔ تُم سے یہ کِس نے کہا؟"

"تو تم یہاں کس "انقلاب" کا ذکر کر رہے تھے جو یہاں آئے گا؟"

تائی نے انقلاب کو مسلمان سمجھا تھا! جب یہ بات ہماری سمجھ میں آئی تو ہم سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

"کتنی بھولی ہے ہماری تائی۔ اری تائی جی ہم تو اس انقلاب کا ذکر کر رہے ہیں جو نہ ہندو ہے نہ مسلمان ہے۔ جو سب کا انقلاب ہے ہم تو اس انقلاب کو لانا چاہتے ہیں!"

مگر تائی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ ہولے سے سر ہلا کر بولیں۔

"اچھا تم لوگ باتیں کرو۔ میں تمہارے لئے چائے بنا کے لاتی ہوں!"

تائی نے میری مدد کرنے کے لئے اپنا سولہ تولے کا ایک گوکھرو بیچ دیا اُس رقم کو لے کر میں اپنی فیملی کے ساتھ دہلی آ گیا۔ کیونکہ جالندھر میں بے حد افراتفری تھی اور غیر یقینی سی حالت ہر وقت چھائی رہتی تھی۔ دہلی آ کر میں نے پھر پریکٹس شروع کر دی۔ چند سالوں ہی میں میری پریکٹس پھر چمک اُٹھی۔ میں قرول باغ میں پریکٹس کرتا تھا، اور قرول باغ لاہور کے بہت سے ریفیوجیوں سے بھرا پڑا تھا جو مجھے جانتے تھے۔ ہولے ہولے میں نے اپنا اڈہ ٹھیک سے جما لیا۔ پریکٹس چمک اُٹھی۔ دس سال میں میں نے قرول باغ میں اپنی کوٹھی کھڑی کر لی۔ گاڑی بھی خرید لی۔ اب قرول باغ کے سرکردہ افراد میں میرا شمار ہوتا تھا۔ اب میں پھر انقلاب کی باتیں بھول گیا۔ میری خونی بواسیر بھی ٹھیک ہو گئی، اور تلخی کے بجائے مزاج میں شگفتگی عود کر آئی۔ جو ایک ڈاکٹر کے مزاج کے لئے بیحد ضروری ہے۔

تیرہ سال کے بعد گذشتہ مارچ میں مجھے ایک عزیز کی شادی میں جالندھر جانا پڑا۔ اس تیرہ سال کے عرصے میں میں تائی ایسری کو بالکل بھول بھال گیا تھا۔ رشتے دار تو اُس وقت یاد آتے ہیں، جب مریض نہ ہوں۔ لیکن جالندھر پہنچتے ہی مجھے تائی ایسری کی یاد آ گئی۔ ان کے

احسانات یاد آئے۔ وہ سونے کا گوکھرو یاد آیا جسے بیچ کر میری پریکٹس چلانے کی رقم بہم پہنچائی گئی تھی۔ وہ رقم مَیں نے آج تک تائی اسیری کو ادا نہیں کی تھی۔ جالندھر اسٹیشن پر اُترتے ہی مَیں سیدھا تائی اسیری کے گھر چلا گیا.....

شام کا جھٹپٹا تھا۔ ہوا ایندھن کے دھوئیں، تیل کی بُو اور گھر واپس آتے ہوئے بچّوں کی آوازوں سے معمور تھی۔ جب مَیں تائی اسیری کے مکان کی نچلی منزل میں داخل ہُوا۔
گھر میں اس وقت تائی کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بھگوان کی مُورتی کے سامنے گھی کا دِیا جلائے، پھول چڑھا کر ہاتھ جوڑ کر واپس گھوم رہی تھیں۔ جب کہ اُنہوں نے میری آہٹ پا کر پُوچھا۔

"کون ہے؟"

"مَیں ہُوں!" مَیں نے کمرے میں دو قدم آگے بڑھ کر مُسکراتے ہوئے کہا۔

تائی دو قدم آگے بڑھیں مگر مجھے پہچان نہ سکیں۔ تیرہ برس کا عرصہ بھی ایک عرصہ ہوتا ہے اس عرصے میں وہ بیحد نحیف و نزار ہو گئی تھیں۔ اُن کا چہرہ بھی دُبلا ہو گیا تھا اور وہ ہولے ہولے قدم اُٹھاتی تھیں۔

"مَیں رادھا کشن ہُوں۔"

"جے کشن والا کا؟" تائی کی آواز بھرّا گئی۔ ممکن تھا وہ جلدی سے آگے بڑھنے کی کوشش میں گر پڑتیں مگر مَیں نے اُنہیں جلدی سے تھام لیا اور وہ میرے بازوؤں سے لگ کر رونے لگیں۔ اُنہوں نے میری بلائیں لیں۔ میرا مُنہ چوما۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولیں۔

"اتنے دِن کہاں رہے بیٹا؟ اپنی تائی کو بھی بھُول گئے؟"

انتہائی شرمندگی سے میرا سر جھک گیا۔ مَیں نے کچھ کہنا چاہا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ تائی نے میری پریشانی کو فوراً بھانپ لیا۔ جلدی سے پھُولے پھُولے سانسوں میں اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں بولیں۔ "بہر حال راضی خوشی ہے نا۔"

"ہاں تائی۔"

"اور وڈا کاکا؟"

"ڈاکٹری میں پڑھتا ہے۔"

"اور نکا؟"

"کالج میں پڑھتا ہے۔"

"اور شانو اور ڈبو؟"

"وہ دونوں بھی کالج میں پڑھتی ہیں۔ کملا کی مَیں نے شادی کر دی ہے!"

"مَیں نے بھی سوتری کی شادی کر دی ہے۔ موہن اب رُڑکی میں پڑھتا ہے۔ رتی اور بنی کے ماں باپ مل گئے تھے وہ آکر ان کو چھ سال کے بعد لے گئے تھے۔ کبھی کبھی اُن کی چٹھی پتری آ جاتی ہے۔ میرے پاس صرف گوپی رہ گیا ہے۔ اگلے سال وہ بھی ریلوے ورکشاپ میں کام سیکھنے کے لئے چلا جائے گا۔"

یہ تائی کے اُن یتیم بچّوں کی داستان تھی جو اُنہوں نے فساد میں لے کر پالے تھے۔

مَیں نے ناخن سے اپنی ٹھوڑی کھجاتے کھجاتے کہا "تائی۔ وہ تیرا قرضہ مجھ پر باقی ہے۔ کیسے بتاؤں۔ کتنا شرمندہ ہوں اب تک نہ بھیج سکا۔ اب دِلّی جاتے ہی بھیج دُوں گا۔"

"کیسا قرضہ بیٹا؟" تائی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہی گوگھرو والا۔"

"اچھا وہ؟" ——— یکایک تائی کو یاد آیا اور وہ بڑے میٹھے انداز میں مسکرانے لگیں پھر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔

"وہ تو تیرا قرضہ تھا بیٹا۔ جو مَیں نے چکا دیا!"

"میرا قرضہ کیسا تھا تائی؟" مَیں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ زندگی دوسروں کا قرضہ ہے بیٹا!" تائی سنجیدہ رُو ہو کر بولیں۔ "اسے چکاتے رہنا

چاہیئے۔ تُو کیا اس سنسار میں خود پیدا ہُوا تھا؟ نہیں۔ تجھے تیرے ماں باپ نے زندگی دی تھی۔ تو پھر تیری زندگی کسی دُوسرے کا قرضہ ہوئی کہ نہیں؟ پھر یہ قرضہ ہم نہیں چُکائیں گے تو یہ دُنیا آگے کیسے چلیگی۔ ایک دِن پرلے آجائیگی..... بیٹا۔ اسی لئے تو کہتی ہُوں۔ مَیں نے تیرا قرضہ چُکایا ہے۔ تُو کسی دُوسرے کا قرضہ چُکا دے...... ہردم چُکاتے رہنا جیون کا دھرم ہے۔" تائی اِتنی لمبی بات کر کے ہانپنے لگیں۔

مَیں کیا کہتا۔ روشنی سے سایہ کبھی کیا سکتا ہے؟ اسی لئے مَیں سب کچھ سُن کر چُپ ہو گیا۔ وُہ بھی چُپ ہو گئیں۔ پھر آہستہ سے بولیں۔ "اب میرے ہاتھ پاؤں کام نہیں کرتے ورنہ تیرے لئے کھانا پکاتی۔ اب گوپی آئے گا تو کھانا بنائے گا تیرے لئے۔ کھانا کھا کر جانا...... ہیں؟

"نہیں تائی۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ وہاں بھی تیرا ہی دِیا کھاتے ہیں۔" مَیں نے آہستہ سے کہا۔ "مَیں یہاں تیج پال کی شادی پر آیا تھا۔ سٹیشن سے سیدھا تمہارے گھر آ رہا ہُوں۔ اب شادی والے گھر جاؤں گا۔"

"بُلاوا تو مجھے بھی آیا ہے۔ مگر دو دِن سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے مَیں نہیں جا سکتی۔ شگن مَیں نے بھیج دیا تھا۔ تم میری طرف سے تیج پال کے سر پہ پیار دینا۔"

بہُت اچھا تائی ——— کہہ کر مَیں تائی کے چرنوں میں جُھکا۔ اُنھوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے گلے لگا لیا۔ میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر سو سو دُعائیں دے کر بولیں۔ "بیٹا میرا ایک کام کرو گے؟"

"حکم کرو تائی؟"

"کیا کل تم صُبح یہاں آ سکتے ہو؟"

تائی جھجکتے جھجکتے بولیں۔ "میری آنکھیں کمزور ہو چُکی ہیں۔ رات میں مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ ویسا جسم جلا اندھیرا سا چھایا ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر تُم صُبح کسی وقت دِن میں آ جاؤ تو مَیں تمھیں اچھی طرح دیکھ لُوں گی۔ تیرہ سال سے تجھے نہیں دیکھا ہے کاکا!"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مَیں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔
"آجاؤں گا تائی!"

دُوسرے دن بارات کے کچھ لوگ آنے والے تھے۔ صبح ہی ہم لوگوں کو پیشوائی کے لئے سٹیشن پر جانا پڑا۔ وہاں سے لوٹتے وقت مجھے یاد آیا تو مَیں اُن لوگوں سے معذرت کرکے تائی اسیری کے گھر کی طرف ہو لیا۔ گلی کے موڑ پر مجھے دو دو چار چار کی ٹولیوں میں لوگ سر جھکائے ملے۔ مگر مَیں جلدی جلدی سے قدم بڑھاتا ہُوا آگے چلا گیا۔ مکان کی نچلی منزل پر مجھے اور بہت سے لوگ روتے ہوئے ملے۔ معلوم ہُوا آج صبح تائی اسیری کی موت واقع ہو گئی اور جب ہم لوگ سٹیشن گئے ہوئے تھے وہ چل بسیں۔

اندر کمرے میں اُن کی لاش پڑی تھی۔ ایک سفید چادر میں ملبوس۔ چہرہ کھُلا رہنے دیا تھا۔ کمرے میں کافور اور لوبان کی خوشبو تھی اور ایک پنڈت ہولے ہولے وید منتر پڑھ رہا تھا۔

تائی اسیری کی آنکھیں بند تھیں اور اُن کا معصوم بھُورا بھُورا چہرہ پُرسکون۔ خاموش اور گہرے خوابوں میں کھویا ہُوا ایسا معلوم ہُوا تھا جیسے وہ تائی اسیری کا چہرہ نہ ہو دھرتی کا پھیلا ہُوا لامتناہی چہرہ ہو جس کی آنکھوں سے ندیاں بہتی ہیں۔ جس کے ہر شکن میں لاکھوں وادیاں انسانی بستیوں کو اپنی آغوش میں لئے مسکراتی ہیں۔ جس کے انگ انگ سے بے غرض پیار کی مہک پھُوٹتی ہے۔ جسکی معصُومیّت میں تخلیق کی پاکیزگی جھلکتی ہے۔ جس کے دِل میں دو مردوں کے لئے وہ بے پناہ مامتا جاگتی ہے جس کا مزہ کوئی کوکھ رکھنے والی ہستی ہی پہچان سکتی ہے!

مَیں اُن کے پاؤں کے قریب کھڑا اُن کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یکایک کسی نے آہستہ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ مَیں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے سامنے بائیس تیئیس

پر سرکا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ابھی روئی ہیں اور ابھی پھر رو دیں گی۔

اُس نے آہستہ سے کہا۔ "مَیں گوپی ناتھ ہُوں۔"

مَیں سمجھ تو گیا۔ مگر خاموش رہا۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آتا تھا کہ کیا کہوں۔ کیا نہ کہوں۔

"مَیں تیج پال کے گھر آپکو ڈھونڈنے گیا تھا مگر آپ سٹیشن پر گئے ہوئے تھے۔" وہ پھر بولا۔

مَیں پھر بھی چُپ رہا۔

گوپی ناتھ دھیرے سے بولا۔ "صبح تائی نے آپکو بہت یاد کیا۔ اُنہیں معلوم تھا کہ آپ آنے والے ہیں۔ اِس لئے وُہ مرتے مرتے بھی آپ کا انتظار کرتی رہیں۔ آخر جب اُنہیں یقین ہوگیا کہ مرنے کا وقت آن پہنچا ہے اور آپ نہیں آئیں گے تو اُنہوں نے مجھ سے کہا۔

"جب میرا بیٹا رامعاکش آئے تو اُسے یہ دے دینا!"

یہ کہہ کر گوپی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور میری ہتھیلی پر ایک چّنی رکھ دی!

چّنی دیکھ کر مَیں رونے لگا۔

مجھے معلوم نہیں ہے آج تائی اسیری کہاں ہیں؟ لیکن اگر وُہ سورگ میں ہیں تو وُہ اس وقت بھی یقیناً ایک رنگین پیڑھی پر بیٹھی، اپنی پچھی سامنے کھول کر، بڑے اطمینان سے دیوتاؤں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں چّنیاں ہی بانٹ رہی ہوں گی!

احمد ندیم قاسمی

شیش محل

”شرم کرو بشکو۔“

یہ الفاظ ملک الٰہی کا تکیہ کلام بن چکے تھے۔ سرِ راہ ہے یا چوپال پر، جنازے میں یا شادی پر، جہاں بھی ان کی مڈبھیڑ اللہ بخش موچی سے ہوتی۔ ان کی بھوئیں سکڑ جاتیں اور وہ کہتے۔ ”شرم کرو بشکو، علاقے کے اتنے بڑے کاریگر ہو۔ ہر سال ڈھائی تین سو روپے کما لیتے ہو مگر ستر چھپانے کو پھونس کا ایک چھپر بھی نہیں تنوا سکتے۔ کبھی ایک کے گھر میں کبھی دوسرے کی چوکھٹ پر۔ شرم کرو۔“

”شرم تو بہت آتی ہے ملک جی۔“ اللہ بخش نے ہاتھ مروڑتے ہوئے ایک روز کہہ ہی ڈالا۔ ”پر کیا کروں سال نہیں گزرتا کہ بچہ ہو جاتا ہے۔ گنتی بھول جاتا ہوں پیر دستگیر کی قسم۔“

ملک کرم الٰہی پوچھنا تو یہ چاہتے تھے کہ پھر تم اتنے بڑھیا کپڑے کیوں پہنتے ہو۔ مگر جب بھی یہ خیال ان کے ذہن میں آیا، ساتھ ہی یہ خیال بھی آگیا کہ اگر اللہ بخش کو اس کے اچھے لباس پر ٹوکا گیا، تو وہ سمجھے گا ملک جل گیا ہے۔ اسی لئے انہوں نے اللہ بخش پر ایک اور رُخ سے حملہ کیا۔ ”اچھا بتا کتنے بچے ہیں تیرے؟“

اللہ بخش انگلیوں کی پوروں کو انگوٹھے سے چھوتے ہوئے گننے لگا۔ ”پھلاّ۔ لطو، مہرائی

ستاں زبیدہ۔"

"زبیدہ؟" ملک کرم الٰہی کے تیور کچھ ایسے ہو گئے جیسے دُودھ میں مکھی پڑ گئی ہو۔ "اوئے تیری ایک بیٹی کا نام زبیدہ بھی ہے؟"

اللہ بخش کھسیا کر مسکرا دیا۔ "آپ کی سوچن جانے کہاں سے اچھے اچھے شہری نام سُن آئی۔ یہ لڑکی ہوئی تو میں نے اس کا نام بانو رکھا۔ پر اس نے زبیدہ پکارنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا زبیدہ ہے تو زبیدہ ہی سہی۔ اپنا کیا بگڑتا ہے۔ تو وہ میں پانچ گن چکا تھا۔ چھٹا حفیظ اور ساتواں الطاف۔"

"حفیظ اور الطاف؟" ملک کرم الٰہی اب کے تو ہکا بکا رہ گئے۔ "کیا یہ نام بھی بھاگی نے رکھے؟"

"جی نہیں۔ یہ تو میں نے رکھے۔" اللہ بخش بچوں کی طرح شرما گیا۔ "حفیظ پٹواری اور الطاف تھانیدار کے نام پر۔"

"بڑا شوق ہے بڑا آدمی بننے کا۔" ملک صاحب بولے۔ "پر بڑے آدمیوں کے اپنے مکان بھی ہوتے ہیں نا۔" یکایک انہیں جیسے کچھ یاد آگیا۔ "اچھا بتا، تیری شادی کو کتنے سال ہوئے؟"

اللہ بخش نے اُنگلیوں کی پوروں پر پھیر سے انگوٹھا چلایا اور بولا۔ "یہی کوئی دس ایک سال ہوئے ہوں گے۔"

ملک کرم الٰہی نے جیسے اللہ بخش کو پکڑ لیا۔ "دس سال میں سات بچے بھی کوئی بچے ہیں؟"

"دو مر بھی چکے ہیں۔" اللہ بخش نے اطلاعاً کہا۔ پھر جیسے وہ اُداس سا ہو گیا۔ بولا۔

"اکٹھے پیدا ہوئے اور ایسے پکے دوست نکلے کہ اکٹھے مر گئے۔"

"حساب ان کا کیا جاتا ہے جو جی رہے ہیں۔" ملک کرم الٰہی بولے۔ "کُل سات ہوئے اور گنّے موچی کے کتنے ہیں؟"

"کل تیرھواں ہُوا۔"

"کیا وہ تم سے بڑا کاریگر ہے؟"

"اسے تو ملک جی اب تک جوتا گانٹھنا بھی نہ آیا۔"

پھر کیا وہ مانگے کے مکان میں رہتا ہے؟"

اللہ بخش، ملک کرم الٰہی کو خالی خالی آنکھوں سے گھورتا رہ گیا۔

ملک صاحب بولے۔ "اس کے تیرہ بچے ہیں۔ بڑی لڑکی کی شادی بھی کر چکا ہے۔ راس سے چھوٹی کا کام بھی تیا ہے۔ اس کی موچن بھی آئے دِن بیمار رہتی ہے اور کماتا ہوگا مہینے میں یہی کوئی پانچ چھ روپے۔ سال کے ساٹھ ستر کرلو۔ مگر اس کا اپنا مکان ہے۔ اپنی دکان ہے اور کوٹھے ہیں جن کے دروازوں پر پکی اینٹوں کی ڈاٹ ہے۔ ہے نا؟"

"جی۔" اللہ بخش نے جواب دیا۔

"شرم کرو بشکو۔" ملک صاحب نے بھویں سمیٹ کر کہا۔ "اس کا اپنا مکان اور اپنی دکان ہے اور تم اِس تاک میں رہتے ہو کہ کوئی کسان باہر کھیتوں میں اٹھ جائے اور تم مہینے دو مہینے کے لئے اُس کے کوٹھے میں اپنا سر چھپا سکو۔ آج کل فصلیں کٹ رہی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد فصلیں اٹھیں گی اور کسان واپس گاؤں میں آجائیں گے تو تم اپنے اوزار سر پر رکھ کر اور اپنے بچوں کا ریوڑ ہانک کر بھکاریوں کی طرح گھر گھر میں جھانکتے پھرو گے۔ شرم کرو۔"

اللہ بخش چھوٹا سا تھا جب اِس کا باپ مر گیا۔ ماں اِس سے پہلے مر چکی تھی۔ ایک بیاہتا بہن گامی تھی جو اِسے سینے سے لگا کر اپنے ہاں لے گئی۔ اِس کے شوہر نے ناک بھوں چڑھائی مگر جب اللہ بخش دکان میں بیٹھ کر پرانے جوتے گانٹھنے کا کام کرنے لگا تو اس نے سوچا کہ دو وقت کی روٹی اور سال دو سال کی اُترن پر یہ سودا کچھ ایسا مہنگا نہیں۔ پھر ایک ساون میں اللہ بخش کے مکان کی چھت گر پڑی تو گامی یوں روئی پیٹی جیسے اس کے ماں باپ کے جنازے جاتے جاتے اُلٹ پڑے ہیں۔ گامی کے شوہر نے اِسے سمجھایا کہ اللہ بخش ہونہار کاریگر ہے جوان ہوگا تو نئی چھت ڈلوالے گا۔ "اور گامی اِسمیں رونے کی کون سی بات ہے؟" دو تین سال بعد ایک اور ساون میں چھت سے محروم ننگی دیوار بھی بیٹھ گئی اور گامی نے دو ہتڑوں سے اپنا سینہ پیٹ ڈالا۔ شوہر نے اُسے سمجھایا کہ اگر چھتیں دیواروں کے سہارے کھڑی رہتی ہیں تو دیواروں کو بھی چھتیں ڈھانے

رکھتی ہیں۔ چھت گرگئی تو دیوار بھی ڈھے جائیگی۔ اِس لئے گامی اِسمیں رہنے بیٹھنے کی کون سی بات ہے؟"

اللہ بخش کبھی کبھار اپنے گھروندے کے کھنڈر کا بھی چکر لگا آتا۔ وُہ صحن جو کسی زمانے میں چمڑے کی کترنوں سے اٹا رہتا تھا اب خودرَو جھاڑیوں سے بھر گیا تھا۔ چھت کا صرف ایک حِصّہ دیوار سے اٹکا رہ گیا تھا ورنہ پوری چھت اندر کوٹھے میں ڈھیر پڑی تھی۔ اللہ بخش نے جب بھی یہ کھنڈر دیکھا اسے ایسا لگا جیسے وُہ اپنے ماں باپ کی دھنسی ہوئی قبروں کے پاس کھڑا ہے۔ ایک دن وُہ اِس کھنڈر کے بند دروازے سے لٹکے ہوئے کالے بھجنگ تالے کو مٹھی میں پکڑے جھاڑیوں بھرے صحن کو گھور رہا تھا۔ جب اُوپر سے ملک کرم الٰہی آ گئے۔ اِسے چیتھڑوں میں لپٹا ہُوا اور یُوں اُداس اُداس کھڑا دیکھ کر ملک صاحب نے اسے کہیں شادی کرنے اور اپنا گھروندہ آباد کرنے کا مشورہ دیا۔ جب سے اللہ بخش کی کاریگری کی دھوم مچی تھی۔ ملک کرم الٰہی اپنے گھر کے جُوتے اِسی سے بنواتے تھے اور اسے اچھی منصفانہ قیمت ادا کرتے تھے۔ مگر یہ رقم اللہ بخش کے بہنوئی کی جیب میں اُتر جاتی تھی اور اللہ بخش کی صرف اتنی مدارات ہوتی تھی کہ بہنوئی گامی سے کہہ دیتا تھا۔ "اِسے کسی دِن بیٹھ کر بشکو کے کُرتے کی مرمّت کر دے۔ دیکھ تو جگہ جگہ سے کُھل گیا ہے۔" گامی اپنے بھائی کا کُرتا مرمّت کرتی اور روتی اور کبھی کبھی چُپکے سے اس کے کان میں کہہ دیتی "میرے ویر تیری جلدی جلدی سے کہیں شادی ہو جائے اور تو اپنا مکان کھڑا کر لے تو دیکھ میں تیرے بہنوئی کو کیسے جلاتی ہُوں۔" اُس نے کئی بار اپنے شوہر سے بھی اللہ بخش کی شادی کا ذِکر کیا مگر اُس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ایسوں کو رِشتے نہیں مِلتے۔ اب ملک کرم الٰہی نے اللہ بخش سے یہی بات کی تو وُہ بولا۔ "مَیں کیا کر سکتا ہُوں ملک جی۔ میری کمائی تو بہنوئی لے جاتا ہے۔" ملک کرم الٰہی اسے ہاتھ سے پکڑ کر گامی کے گھر لے آئے۔ انہیں خُوب بُرا بھلا کہا اور سمجھایا۔ بیوی تو مرد کی منہ زور جوانی کے مُنہ میں لگام ہوتی ہے اور تم نے بشکو کا جلدی سے کہیں رشتہ نہ کر دیا تو یہاں تمہارے پاس جوتیاں بناتے بناتے کہیں جُوتیاں کھا بیٹھے گا۔" پھر اُنہوں نے ایک موچی کی لڑکی

کا نام بھی لے دیا اور یہ حامی بھی بھر لی کہ وہ خود جا کر اس سے بات کریں گے۔

اللہ بخش کی شادی پر نہ ڈھول بجے نہ شہنائی گونجی۔ گامی شور مچاتی اور ناچتی پھری اور یوں پانچ دن رونق میں گزر گئے۔ چھٹے روز صبح کو جب گامی دلہن کے ہاتھ منہ دھلا کر مہندی کا رنگ چمکانے کے لئے اس کے ہاتھوں کو گھی سے چپڑ رہی تھی تو اوپر سے اس کا شوہر آ گیا۔ بات گھی کو پانی کی طرح بہانے سے چلی اور اللہ بخش کو گھر سے نکال دینے پر ختم ہوئی۔ جب اللہ بخش سر پر بکس اور بستر رکھے اور اس کی نئی نویلی دلہن گٹھڑی اٹھائے اس گھر سے نکلے تو گامی اپنے دروازے پر کھڑے ہو کر دوہتڑوں سے اپنے شوہر کا ماتم کیا اور "میرے ویر، میرے ویر" چلاتی ہوئی بیہوش ہو گئی۔

پہلے روز اللہ بخش اپنی دلہن سمیت ملک کرم الٰہی کے مہمان خانے میں رہا۔ دوسرے دن ایک کسان کے گھر جا بسا۔ جب سے اب تک وہ پندرہ بیس مکان بدل چکا تھا۔ اس کے سات بچے بھی ہو گئے تھے۔ اس کی کنپٹیوں پر بھی ایک آدھ سفید بال نظر آنے لگا تھا مگر وہ اس تمام دوران میں اپنا مکان نہ بنوا سکا۔ وہ علاقے کا مشہور موچی تھا۔ پنے پر کلہ چڑھاتا تھا تو یقین نہیں آتا تھا کہ انسان کی انگلیاں اتنا باریک کام بھی کر سکتی ہیں۔ پھر اس نے جوتے کی ویتر بھی بڑی مناسب رکھی تھی اور آس پاس کے گاؤں کے سب کھاتے پیتے لوگ اس کے ہاتھوں کا بنا ہوا جوتا بڑے فخر سے پہنتے تھے۔ یوں اس کی آمدنی خاصی معقول تھی مگر ادھر رقم آتی تو ادھر وہ بزاز کی دکان میں گھس جاتا اور بیوی بچوں اور خود اپنے لئے ایسے ایسے کپڑے خریدتا کہ ملک کرم الٰہی تک کو سارے گھر کے لئے ایسا کپڑا خریدنے سے پہلے دس بار سوچنا پڑتا ہوگا۔ اچھا لباس اللہ بخش کی کمزوری تھی۔ وہ جب بیلی ململ کا تہمد باندھ کر، بوسکی کی قمیص پہن کر اور سر پر ریشمی شہدی لنگی سجا کر منگلی سے چمڑے کو کوٹتا یا گھٹنے پہ پھار رکھ کر کلہ چڑھاتا تو اسے دیکھ کر لوگ کہتے "اسے مزا آتا ہے اتنا قیمتی لباس پہن کر سارا دن تو ایک جگہ بیٹھا رہتا ہے!" مگر اللہ بخش یہ باتیں سن کر جی ہی جی میں ہنستا تھا اور شام کو بھائی سے باتیں کرتے ہوئے کہتا تھا۔ "جیسے موچی کو دکان میں کام کرنا ہو تو اسے کپڑے اتار دینے چاہئیں۔"

اپنے مکان کی تعمیر سے وہ غافل نہیں تھا۔ کتنی بار میاں بیوی نے اس مسئلے پر باتیں کی تھیں اور ملک کرم الہی کے مشورے کے مطابق تہیہ کیا تھا کہ اب کے وہ کوڑی کوڑی بچائیں گے اور اپنے بزرگوں کے کھوڑ کو آباد کریں گے۔ مگر جونہی اللہ بخش کے پاس رقم آتی اکی انگلیوں میں کُھجل سی ہونے لگتی۔ وہ کہتا۔ "یترے نے چکن کی پینی تو ضرور آنی چاہیئے۔" اور بھاگی بھی کہتی۔ "لے آ تیری مرضی اب مَیں تجھ سے کیا کہوں۔" یُوں مکان بنانے کی نوبت کبھی نہ آئی اور ملک کرم الہی نے تو مایُوسی کے عالم میں چوپال پر اعلان کر دیا تھا کہ "جس دن بشکو اپنا مکان بنائے گا اس دن قیامت آئے گی دیکھ لینا۔"

"شرم کرو بشکو۔" وہ اللہ بخش کے ہاں جا کر بھی کہہ آئے، علاقے کے اتنے بڑے کاریگر ہو۔ ہر سال ڈھائی تین سو کما لیتے ہو مگر سر چھپانے کے لئے پھُونس کا ایک چھپّر بھی نہیں بنوا سکتے۔ کبھی ایک کے گھر میں کبھی دُوسرے کی چوکھٹ پر۔ شرم کرو۔" اُنہوں نے لباس کے سلسلے میں اللہ بخش کی فضول خرچی کا ذکر کبھی نہ کیا۔ اِن کے ذہن میں یہی ڈر تھا کہ اگر وہ انہیں اس بات پر ٹوک بیٹھے تو میاں بیوی ہنسیں گے اور کہیں گے۔ "ملک بیچارہ جل گیا ہے۔"

برس دو برس بعد کی بات ہے۔ ایک شام اللہ بخش چوپال پر گیا اور ملک کرم الہی کے پلنگ کے پائے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس کے انداز کچھ ایسے تھے جیسے قرض لینے آیا ہے۔ وہ ملک صاحب سے کبھی کبھار قرض لے لیتا تھا اور رقم ملتے ہی ادا بھی کر دیتا تھا۔ مگر قرض آخر قرض ہے۔ ملک صاحب نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ پھر جب دیکھا کہ وہ وہاں سے ٹلتا ہی نہیں تو بولے۔ "آج کل کس کے گھر میں پڑے ہو بشکو؟"

"جی خدایار تین مہینے کے لئے تھل چلا گیا ہے۔" اللہ بخش بولا۔ "وہیں پڑا ہوں۔"

"اور اگر وہ کل ہی واپس آگیا؟" ملک صاحب نے پُوچھا۔ "تو؟"

اللہ بخش خاموش رہا تو ملک صاحب بولے۔ "شرم کرو بشکو، شرم کرو——"

وُہ اسے حسبِ عادت بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ جب اللہ بخش نے ان کے گھٹنے کو چھُوا

اور بولا "الگ سے ایک بات کرنی ہے۔"

"یہیں مانگ لو کتنے روپے چاہئیں؟" ملک کرم الٰہی بولے۔ "لیکن شرم کرو بشکو۔"

"جی نہیں"۔ وہ بولا "ایک اور کام ہے۔"

"اچھا!" ملک صاحب نے پاؤں لٹکا کر جوتا پہنا اور اندر چوپال کے کوٹھے میں چلے گئے۔ اللہ بخش نے ریشمی تہمد کا ایک "لڑ" کھول کر اس میں سے نوٹوں کا ایک پلندہ نکالا اور بولا "یہ تین سو روپے اپنے پاس امانت رکھ لو۔ اگلے سال ڈھیری والے ملک نورنگ کے بیٹے کی شادی ہے۔ اکٹھے بیس "طلے پنج" جوڑوں کے لئے کہا ہے۔ یہ تین سو روپے پیشگی دی ہے۔ میں نے کہا آپ کے پاس رکھ دوں کچھ اور جمع ہو جائے تو مکان بنوا لوں گا۔"

"بسم اللہ" ملک کرم الٰہی نے روپے لے لئے۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بولے۔ وہ اتنے خوش تھے کہ اس سے زیادہ بول بھی نہ سکتے تھے۔ ملک کرم الٰہی کے پاس یہ تین سو روپے تین سال تک جمع رہے مگر ان میں ایک روپے کا بھی اضافہ نہ ہو سکا۔ اللہ بخش مکان بدلتا رہا۔ ریشم پہنتا رہا اور اولاد میں اضافہ کرتا رہا۔ ملک صاحب کو ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے اللہ بخش ان کے پاس تین سو روپے جمع کر کے ان کی زبان کاٹ لے گیا ہے۔ وہ پچھلے تین سال میں ایک بار بھی اپنا تکیہ کلام استعمال نہیں کر پائے تھے۔ بس اتنا کیا کہ جب اپنے بیٹے اور بیٹی کی شادی پر انہوں نے اللہ بخش سے جوڑے بنوائے اور اللہ بخش ان سے اجرت وصول کرنے آیا تو انہوں نے کہہ دیا۔ "جاہیں دتے" پھر وہ بولے۔ "دو سو کی یہ رقم میں نے تمہارے تین سو میں جمع کر دی ہے۔ اب تمہارے پانچ سو ہو گئے چار پانچ سو اور جمع کر لو تو اکٹھے دے دوں گا مگر اس شرط پر کہ تم فوراً مکان بنوانا شروع کر دو گے۔ جاؤ۔"

کوئی ہفتہ بھر بعد اللہ بخش ملک کرم الٰہی کے پاس پانچ سو روپے لے آیا اور اپنے پانچ سو واپس مانگتے ہوئے اس نے بتایا کہ اس نے مکان کی تیاری شروع کر دی ہے اور کل ہی سے اینٹوں کی ڈھوائی ہونے لگیگی۔

"اینٹوں کی ڈھوائی؟" ملک کرم الٰہی حیران رہ گئے۔ "دروازوں، کھڑکیوں کی پکی ڈاٹ کے

لئے تو یہی کوئی سو دو سو اینٹ چاہیئے۔"

"جی میں پکّا مکان بنواؤں گا۔" اللہ بخش بولا۔ "چار دن کی زندگی ہے پھر عمر بھر ٹھیک ٹھاک کر یہ ٹھکانہ بناؤں گا تو پکّا کیوں نہ ہو۔ سو دو سو تین سو زیادہ لگ گئے تو کوئی حرج نہیں۔ ملک فتح علی کے دونوں بیٹوں کی اکٹھی شادی ہو رہی ہے اگلے کاتک میں۔ سارے کام ہو جائیں گے۔"

ملک صاحب نے زبیدہ، حفیظ اور الطاف کے ناموں سے لیکر اللہ بخش کے ریشمی کپڑوں تک اپنے اندر جو لاوا جمع کر رکھا تھا وہ بہانے بہانے سے اُگل دیا۔ بولے۔ "بڑا اُلٹا دماغ ہے تمہارا موچی ہو کر اولاد کے نام لاہوریوں کے سے رکھتے ہو۔ موچی ہو کر ریشم پہنتے ہو۔ اب موچی ہو کر پکّا مکان بنواتے ہو۔ میں پوچھتا ہوں علاقے بھر میں کسی بڑے سے بڑے موچی کا بھی مکان پکّا ہے؟ پھر کیا تم نے اتنے روپے جمع کر لئے ہیں؟ یہ ایک ہزار تو بنیادوں کی اُساری پر اُٹھ جائیں گے۔"

"بسم اللہ تو کر دوں ملک جی۔" اللہ بخش بولا۔ "خدا برکت دے گا۔"

"مگر اپنے باپ دادا کی طرح تم کچّے کوٹھے میں رہو گے تو کیا تمہارا دم گھٹ جائے گا۔" ملک صاحب کا لہجہ خاصا سخت ہو گیا۔

اللہ بخش بولا۔ "صرف بڑے لوگ تو پکّے مکان اپنے نام لکھوا کر نہیں آئے ملک جی۔" یکایک وہ اپنے لہجے سے چونکا اور ہاتھ ملنے لگا۔

"وہ میں نے عرض کیا ہے نا کہ چار دن کی زندگی ہے موچی ہوں پر کما ناکھا تا ہوں۔ اب بھلا اور لطفو بھی ہاتھ بٹانے لگے ہیں۔ بھلا تو ملک جی، بنّے پر ایسے ایسے بیل بوٹے کاڑھتا ہے کہ موتی پرو دیتا ہے۔ اللہ کرے گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پھر ذرا سا مسکرا کر بولا۔ "آپ کی نوجی تو کہہ رہی تھی کہ مکان کی چھت پر چمنی بھی رکھیں گے، جس میں بڑے لوگوں کے گھروں کی طرح دھوآں بھی نکلے گا۔" ذرا سا رک کر بچوں کی طرح یوں بولا جیسے ملک صاحب پر کوئی انکشاف کر رہا ہے۔ "کچے گھروں کا دھوآں تو دروازوں میں سے نکلتا ہے۔"

ملک کرم الٰہی نے اسے پانچ سو روپے تو لا کر دے دیئے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ "یہ کچہری

سُن۔ کچّا مکان بنوا لے۔ پکّے کے لئے پکّی آمدنی چاہیئے اور اب تو بُوٹوں گرگابیوں کا زمانہ شروع ہو چُکا ہے۔ یہ نہ ہو کہ آدھی آدھی دیواریں اُٹھا کر بیٹھے رہ جاؤ۔"

"نہیں ملک جی۔" اللہ بخش بولا۔ "آپ دیکھیئے تو سہی۔ درزوں پر سیمنٹ لگیگا چھت پر شہتیر کی جگہ گاڈر چڑھاؤں گا۔ سلاخوں والی باریاں ہوں گی۔ روغن والے دروازے ہوں گے، آپ دیکھیئے تو سہی ملک جی۔ اِدھر گلی کی طرف کونے میں دُکان بنے گی۔ وُہ بھی پکّی ہوگی۔"

"دوکان بھی پکّی ہوگی؟"

"جی ہاں۔ سب پکّا ہوگا۔ پھر مَیں لائلپور، لاہور جا کر نئے نئے اوزار لاؤں گا۔ ہاتھی دانت کے دستوں والے اوزار اور جس دِن یہ سب کچھ ہو جائے گا اس دن آپ کو بلاؤں گا کہ میرے گھر میں آکر میرے سر میں ہاتھ پھیر دیجئے۔"

"خُدا تجھے برکت دے بشکو۔" ملک کرم الٰہی جیسے ٹُوٹتے ہوئے نشّے کے عالم میں بولے۔ "مگر اس تیرے شیش محل سے کچّا مکان کیا بُرا تھا؟ اُوپر سے تو کچّا ہوتا ہے پھر مَیں نے دیکھا ہے کہ پکّے سے زیادہ ٹکتا ہے۔"

"نہیں ملک جی۔" اللہ بخش نے کہنا چاہا مگر زبان کو بند دانتوں کے پیچھے دبا کر رہ گیا۔ وُہ کہنا چاہتا تھا کہ "ملک جی لٹھا کھدر سے زیادہ ٹکتا ہے۔ ریشم لیٹھے سے زیادہ ٹکتا ہے۔ زیادہ روپیہ کم روپے سے زیادہ ٹکتا ہے۔ اِسی طرح پکّا مکان کچے سے کہیں زیادہ ٹکتا ہے۔ اپنے ابّا کا مکان دیکھ لیجئے اور میرے ابّا کا مکان دیکھ لیجئے۔" وہ بس اتنا کہہ پایا کہ "بس جی چاہتا ہے بچے کیا یاد کریں گے۔"

"تیری مرضی"۔ ملک صاحب نے کہا۔ جیسے وُہ اللہ بخش کو خُودکشی سے روکنے میں ناکام رہے ہوں۔

اللہ بخش کا مکان بننا شروع ہُوا تو گاؤں کے اِس حصّے میں ایسی چہل پہل نظر آنے لگی کہ بڑے بڑوں کی حویلیوں کی تعمیر میں بھی نظر نہیں آئی ہوگی۔ لکڑی کی گیلیوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں

جن سے دروازے اور کھڑکیاں اور پرچھتیاں اور الماریاں تک بنائی جا رہی ہیں۔ لوہے کے اکٹھے چار گارڈر آ رہے ہیں۔ سیمنٹ کے کٹے اُتارے جا رہے ہیں۔ چھت کے لئے رنگین ٹائلیں اور گول اور چوکور آئینے لائے جا رہے ہیں۔ دروازوں، کھڑکیوں اور الماریوں کے لئے تانبے اور چینی کی دستیاں خریدی جا رہی ہیں۔ تینوں کوٹھوں کے سامنے ایک لمبا برآمدہ بن رہا ہے۔ تیسرے کوٹھے میں آتش دان تیار ہو رہا ہے جس کی چمنی اتنی اونچی ہے جیسے فرش پر اللہ بخش کھڑا ہے۔ پھر ادھر دکان کے فرش کو سیمنٹ سے پختہ کیا جا رہا ہے اور اسکی الماریوں میں رنگین شیشے لگ رہے ہیں۔ سلیٹی سیمنٹ کی درزوں میں نیلے رنگ کے حاشیے کھینچے جا رہے ہیں۔ ایک طرف "کھرا" بن رہا ہے کہ کبھی کبھی گھر میں بھی نہا لینے کو جی چاہتا ہے۔ حد یہ ہے کہ پردہ دار گھروں کی سی پختہ چاردیواری بن رہی ہے اور ایک جگہ نقش و نگار اور شیشمی رنگ کے روغن والا اتنا بڑا دروازہ لگایا جا رہا ہے کہ اونٹ بھی چاہے تو ذرا سا جھک کر گزر جائے۔

اللہ بخش کا مکان صرف اس گاؤں ہی کا نہیں سارے علاقے کا موضوعِ گفتگو بن گیا تھا۔ اس کے دو سبب تھے۔ ایک تو یہ کہ دھرتی کے "منہ" پر یہ پہلا پکّا مکان تھا۔ جیسے ایک موچی بنوا رہا تھا۔ اور دوسرا یہ کہ اللہ بخش اب تک گیارہ بارہ ہزار روپے خرچ کر چکا تھا۔ ملک کرم الٰہی جانتا تھا کہ جس روز اللہ بخش نے ان سے پانچ سو کی امانت واپس لی تھی اس روز سے اس نے ایک جوتا بھی نہیں بنایا تھا۔ وہ دن بھر تعمیر کی نگرانی کرتا۔ مستریوں اور مزدوروں کی "بچھائیں" کے لئے گھر سے تازہ تازہ مرنڈے بنوا لاتا۔ سامان کی حفاظت کے لئے رات وہیں صحن میں گزارتا اور صبح کو نماز سے فارغ ہوتے ہی مستریوں مزدوروں کو جمع کرنے میں لگ جاتا۔

ملک کرم الٰہی نے ایک دو مستریوں سے بھی پوچھا۔ معلوم ہوا کہ انہیں اپنے کام کی اجرت باقاعدہ ہر شام کو مل جاتی ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اللہ بخش کو یکایک اتنی بہت سی دولت کیسے ہاتھ لگ گئی ہے۔ ان کا یہ بھی جی چاہا کہ اللہ بخش سے پوچھ لیں۔ مگر اللہ بخش کا یہ فقرہ ان کے ذہن میں کھونٹے کی طرح گڑا ہوا تھا کہ "صرف بڑے لگ ہی تو پکے مکان اپنے نام لکھوا کر

نہیں لائے ملک جی۔" کئی دفعہ چوپال پر بھی اللہ بخش کے مکان کی بات چلی مگر بڑھ نہ سکی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے لوگوں کو اس مسئلے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور اگر ایک موچی پکا مکان بنا رہا ہے تو بنوانا پھرے۔ آخر کوئی کیا کر سکتا ہے۔

جس روز مکان کی آخری درز پر بھی سیمنٹ لگ گئی اور اسمیں نیلا حاشیہ کھنچ گیا تو مستریوں، مزدوروں اور تماشائیوں نے اللہ بخش کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور اس پر "مبارک ہو۔" کا مینہ برسا دیا۔ اللہ بخش اس وقت کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اچانک وہ وہیں بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور کچھ دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔ اس دوران میں بھاگی گڑ اور بتاشے بانٹی پھری اور اللہ بخش اور بھاگی کے بچے بڑے دروازے پر یوں بے تاب کھڑے نظر آئے جیسے بس نہیں چل رہا ورنہ مکان کو سر پر اٹھا کر گلی گلی لیئے پھرتے۔ اسی دوران میں ملک کرم الٰہی آنکلے اور اس کے پاس آکر بولے "مبارک ہو بشکو۔" اللہ بخش نے ہاتھ چہرے پر سے ہٹائے تو لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ رو رہا ہے۔

"رو کیوں رہے ہو؟" ملک کرم الٰہی نے پوچھا۔ پھر لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے مسکرائے اور بولے، "اتنا خوش ہوا ہے کہ رو رہا ہے۔" پھر وہ چلے گئے۔ آہستہ آہستہ سب لوگ چلے گئے پھر اللہ بخش بھی بیوی بچوں سمیت چلا گیا اور شام سے کچھ دیر پہلے سب سروں پر سامان لادے اپنے "پکے" مکان میں واپس آگئے۔

بچے صحن میں اینٹوں کے فرش پر ناچنے، کودنے، گرنے اور رونے لگے اور اللہ بخش بیوی اور بڑے بچوں کو مکان کی حفاظت کرنے اور اسکی خوبصورتی کو قائم رکھنے کے گر سمجھاتا رہا اس نے انہیں بتایا کہ اتنے اچھے مکان میں پچکے ہوئے صندوق۔ چھوٹے ہوئے کھٹولے اور بھونڈے نکلے لحاف بھلے نہیں لگتے۔ اس لئے یہ سب کچھ بدلا جائے گا۔ ساتھ ہی مٹی اور تام چینی کے برتنوں نے آتش دان والے کمرے کے فرش کا ناس مار دیا تھا۔ مگر سب ٹھیک ہو جائے گا آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے دو گبرو بچے، میرے یہ بازو سلامت رہیں۔ سب

ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔"

"ہائے میں تو سوچتی ہوں مجھے نیند کیسے آ جائے گی اِس شیش محل میں۔" بھاگی نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دُوسرے میں گاڑ کر اور انگوٹھوں سے اپنی ٹھوڑی کو پکڑتے ہوئے کہا۔ پھر وُہ ہنسنے لگی۔ مگر ایک دم چپ ہو گئی۔ اللہ بخش رو رہا تھا۔

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ایکا ایک چاردیواری کا بڑا دروازہ کھُلا اور گامی مٹی کے جلتے ہوئے ایک چراغ کی لو کو اپنے ایک ہاتھ کی حصار میں لئے داخل ہوئی۔ بچوں نے "پھوپھی پھوپھی" کا شور مچا دیا بھاگی نے آگے بڑھ کر گامی سے چراغ لینا چاہا مگر وُہ بولی "نہیں میں تو اپنے ویر کے شیش محل میں اپنے ہاتھ سے چراغ سجاؤں گی۔" وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر اندر گئی۔ ایک کھُلی کھڑکی میں چراغ رکھ دیا اور پھر چاروں دیواروں کو چوم کر باہر آئی تو بھرائی ہوئی آواز میں بولی "ہائے آج میری ماں ہوتی۔ ہائے آج میرا باپ ہوتا۔ دُنیا آج جل رہی ہے۔ وہ کتنے خوش ہوتے۔ ہائے وہ کتنے خوش ہوتے۔" وُہ زار زار رونے لگی۔ پھر آنسو پُونچھتے ہوئے بولی۔ "میرا ویر کہاں ہے؟"

اللہ بخش دیوار سے لگ کر کھڑا تھا۔ چراغ کی روشنی میں آگیا تو گامی اس سے لپٹ گئی اور بولی۔ "میرے ویر۔ میں تو اپنے چراغ کے سو روپے لُوں گی اور ابھی اسی ہاتھ پہ لُوں گی۔ میں نے جب اپنے گھر والے سے کہا کہ میں اپنے ویر کے شیش محل میں چراغ جلانے کے سو روپے لینے جا رہی ہُوں تو وُہ کتیا کا جنا ہنسنے لگا۔ کہنے لگا سو آنے ہی لے آؤ مانوں۔ ان کے بھی سوا چھ روپے بنتے ہیں وہ سب کو اپنے جیسا ہی سمجھتا ہے کنجوس مکھی چوُس۔ لا میرے ویر اپنی بہن کا حصّہ۔"

"میں اپنی بہن کو سو روپے دُوں گا۔" اللہ بخش بولا۔ "کیوں نہیں دوں گا۔"

"تو پھر لا جلدی سے۔" گامی اب خوشی سے رو رہی تھی۔ "میں تو یہ سو روپے گاؤں کی گلی گلی میں نچاتی ہوئی جاؤں گی اور کہوں گی کہ ایسے ہوتے ہیں بہنوں کے ویر۔ جو شیش محل بنا سکتے ہیں وہ سو روپیہ بھی دے سکتے ہیں۔ لا میرے ویر۔"

اللہ بخش چپ چاپ کھڑا اپنی بہن کی پھیلی ہوئی ہتھیلی کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "ذرا بیٹھ جا گامی

میں ابھی لاتا ہوں۔ میں نے روپے ایک اور جگہ رکھے ہوئے ہیں۔"

"میں تو یہ تیرے انتظار میں قیامت تک بیٹھی رہوں گی۔" گامی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔
"مجھے خالی ہاتھ گھر جاکر کیا جوتے کھانے ہیں۔ تو لے آ۔ جب تک میں بھرجائی سے باتیں کروں گی۔"
اللہ بخش جانے لگا۔ پھر پلٹ کر آیا اور بولا۔ "گامی اگر تو بُرا نہ مانے تو چراغ کھڑکی سے ہٹا لوں۔ اس کی لو کھڑکی کی ڈاٹ کو کالا کر دیگی۔"

"ہائے میں غریب کیا جانوں۔" گامی ہڑبڑا کر اٹھی اور اندر بھاگی۔ پھر چراغ اٹھاتے ہوئے جھک کر ڈاٹ کو دیکھا اور بولی۔ "ہائے سچ مچ کچھ نشان پڑ بھی گیا ہے۔ ہائے میری آنکھیں پھوٹیں مجھے کیا پتہ کہ پکّے مکانوں میں چراغ کہاں جلتا ہے۔" اس نے چراغ کو مکان کے وسط میں فرش پر رکھ دیا۔ "یہاں تو ٹھیک ہے نا۔" اس نے اللہ بخش سے پوچھا۔ "میں اسے بجھاؤں گی نہیں تیل ختم ہوگا تو خود بخود بجھ جائے گا اور تیل پوری رات ختم نہیں ہوگا۔ میں تو پانچ پیسے کے تیل سے بھروا کے لائی ہوں۔ جا میرے ویر جلدی سے میرے روپے لے آ۔"

اللہ بخش چلا گیا۔

گامی نے آدھی رات تک اس کا انتظار کیا اور پھر روتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔

اللہ بخش کی بیوی نے صبح تک اپنے شوہر کا انتظار کیا اور پھر پیٹنے بیٹھ گئی۔

اللہ بخش آج چھ سال سے گاؤں میں نہیں آیا۔

اس کے شیش محل میں تالا لٹک رہا ہے چھتوں پر ہاتھ ہاتھ بھر گھاس اُگ آئی ہے صحن میں اینٹوں کے فرش میں سے بھی پودے نکل آئے ہیں اور درزوں کا نیلا حاشیہ روئی ہوئی آنکھوں کے کاجل کی طرح بہہ کر پھیل گیا ہے۔

اللہ بخش ان دنوں لاہور میں ہے وہ کچہری روڈ پر چلنے اور بطور میت یونیورسٹی کے طلبا کے جوتے گانٹھتا اور پالش کرتا ہے اور اس کی بیوی مصری شاہ میں ایک پکّے مکان سے ملحق نوکروں کی کچی کوٹھڑی میں بیٹھی بچے پالتی رہتی ہے۔ اللہ بخش اور اس کے بیٹے دن میں چھ سات

روپے کما لیتے ہیں مگر وہ ہر روز پانچ روپے الگ رکھ دیتا ہے اور ہر مہینے ڈیڑھ سو کا منی آرڈر اپنے گاؤں کے کسی نہ کسی کھاتے پیتے آدمی کے نام بھجوا دیتا ہے - جب منی آرڈر بھجوا کر آتا ہے تو بھاگی کو ایک ہی بات سمجھاتا ہے - ابھی پچھلے دنوں سمجھا رہا تھا "رحمت بھاگی - یہ روپیہ ان لوگوں کو جا رہا ہے جن سے میں اپنے پکّے مکان کے لئے قرض لیتا تھا اور انہیں رسول پاک کی قسم دیتا تھا کہ میری ناک کا معاملہ ہے - کسی کو بتائیں نہیں - وہ رسول پاک کی قسم پر قائم رہے تو میں موچی ہی پر اتنا کمینہ نہیں ہوں کہ مروں تو رسول پاک کے دربار میں آنکھیں بھی نہ اٹھا سکوں - اگر اس دن ملک کرم الٰہی مجھے گامی کے لئے سو روپے دے دیتا تو میں دس ہزار کا قرض یوں چٹکیوں میں اتار دیتا - میں سیدھا اس کے پاس چلا گیا کہ اس سے میں نے مکان کے لئے قرض نہیں مانگا تھا - اس نے قرض بھی نہ دیا اور پھر چوپال میں آکر یہ بھی کہہ دیا کہ "اب راز کھلا ہے بشکو کے پکّے مکان کا - یہ کمبخت تو ادھر اُدھر سے قرض لیتا رہا ہے - تم میں سے اسے کس کس نے قرض دیا ہے بھئی لوگو؟" اور بھاگی آفریں ہے لوگوں پر کہ ان میں سے ایک بھی نہ بولا - میرے پسینے نکل گئے پر کوئی ایک بھی نہ بولا - سب اپنے رسولِ پاک کی قسم پر قائم رہے - ملک ان سے بار بار پوچھتا رہا اور میں اس کی چوپال سے چلا گیا - میں گاؤں ہی سے چلا آیا - میں لاہور چلا آیا - پھر تم لوگوں کو بھی بلوا بھیجا - اب بس کل سات سو باقی ہیں - دو سو میری گامی ہرن کے اور پانچ سو ملک گل باز کے - ملک گل باز کو میں نے چٹھی لکھی تھی - اس نے جواب دیا تھا کہ بشکو - مجھے سب سے آخر میں دینا اور لکھا تھا کہ اپنا مکان تو دیکھ جاؤ - پانچ چھ سال سے بند پڑا ہے - میں نے چٹھی لکھی کہ اب اکٹھے ہی آئیں گے - قرض پورا ہو جائے تو سیدھی گاؤں کی راہ لیں گے اور اپنے مکان کی چھت پر چڑھ کر دیوار پکار کر ملک کرم الٰہی سے کہیں گے کہ "ملک جی یوں بنتے ہیں پکّے مکان اور یوں رہتے ہیں پکّے مکانوں میں -"

بھاگی نے کہا "ملک تو کہے گا کہ شرم کرو بشکو، شرم کرو -"

"تو میں کہوں گا" اللہ بخش بولا - "میں کہوں گا - ملک جی اب شرم کاہے کی کروں - اب تو میرا سینہ تنا، میرا اپنا شیش محل ہے -"

خواجہ احمد عباس

دانے کی کہانی

یہ چوتھا دانہ جو سب سے چھوٹا تھا اور جس کے بھورے بدن پر ہلکا ہلکا سبز رنگ جھلک رہا تھا اور جس کے بولنے کے ڈھنگ میں نوجوانی کا جوش بھی تھا اور لڑکپن کی ضد بھی۔ وہ بولا۔

بھائیو۔ میری کہانی آپ تینوں کے لئے شائد نئی ہو مگر اِس ملک کے رہنے والوں کے لئے نئی نہیں ہے۔ جیسا میں نے پہلے بھی آپ سے کہا۔ میرے لئے یہ سرزمین اجنبی نہیں ہے۔ میرا خاندان یہیں پیدا ہُوا تھا۔ کن حالات میں اسے یہاں سے نِکلنا پڑا اور کیوں میں یہاں آج واپس آیا ہُوں۔ یہ انوکھی مگر سچی کہانی اب میں آپکو سناتا ہُوں۔

آج سے بہت دِنوں پہلے کی بات ہے۔ شائد صرف تیس برس ہی گزرے ہیں مگر ایسا لگتا ہے تیس صدیاں بیت گئیں، تیس ہزار برس گزر چکے۔ اب تو وُہ زمانہ خواب جیسا لگتا ہے۔ مشرقی پنجاب میں پانی پت کے قصبے کے قریب سڑک اعظم کے کنارے جو دہلی سے امرتسر اور لاہور ہوتی ہوئی پشاور کو جاتی ہے (یا اُن دِنوں جاتی تھی) دو گاؤں تھے۔ ایک کا نام تھا گھرونڈہ۔ دُوسرے کا بابر پور۔ اُن کے درمیان مُشکل سے سوا ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہوگا اور ان میں رہنے والے مزارعوں کی زمینیں تو ایک دوسرے سے بالکل ملی ہوئی ہیں۔ یا ملی ہوئی تھیں تیس ہزار برس پہلے کے زمانے میں کیونکہ اب تو زمین سے زمین، مکان سے مکان اور دِل سے دِل جُدا ہو چُکے ہیں۔ انسان انسان سے بات

کرنے کو تیار نہیں۔ ایسا لگتا ہے ساری کائنات میں صرف ہم اناج کے دانے ہی محبت کے رشتے قائم رکھے ہوئے ہیں۔

ہاں تو اسی سرزمین پر جہاں پانی پت کی تین تاریخی جنگیں لڑی گئی تھیں یہ دو گاؤں آباد تھے اور ان کی کاشت کی زمینیں تھیں۔ گھرونڈہ بہت پرانا گاؤں ہے۔ مہابھارت میں اس کا ذکر ہے ارجن کی فوجوں نے اسی کے قریب پڑاؤ کیا تھا۔ بابر پور اتنا پرانا تو نہیں پھر بھی تاریخی اہمیت رکھتا ہے کہتے ہیں کہ بابر کی فوجوں نے وہاں قیام کیا تھا اور جب ابراہیم لودھی کو شکست ہوئی اور فاتح مغل فوجیں دلی کی طرف روانہ ہوئیں تو بابر کے سپاہیوں میں سے کتنے ہی جو وسط ایشیا سے لے کر ہندوستان تک جنگ و جدال کرتے کرتے تھک گئے تھے اور اب امن کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے وہ وہیں رہ پڑے اور انہوں نے اپنے لئے جو گاؤں تعمیر کیا اس کا نام انہوں نے اپنے شہنشاہ کے نام پر رکھا۔ بابر پور۔

گھرونڈہ اور بابر پور دونوں کی الگ الگ تاریخی اہمیت تھی۔ گھرونڈے کے آس پاس جو کھدائی ہوئی ہے اسمیں موہنجوداڑو کے زمانے کی قدیم تہذیب کے آثار ملتے ہیں اور بابر پور کے بارے میں تو مشہور تھا کہ کہیں بھی زمین میں ہل چلایا جائے تو مٹی میں سے مغل بادشاہوں کے زمانے کے سکے نکلتے ہیں۔ گھرونڈے میں زیادہ تر ہندو جاٹ کسان آباد تھے اور بابر پور میں مسلمان ارائیں رہتے تھے۔ گھرونڈے میں پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک چھوٹا سا شوالہ تھا۔ جس میں سورج ڈھلے آرتی کے گھنٹے بجتے تھے۔ بابر پور میں لوگوں کے گھر تو کچی مٹی کے تھے مگر پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس میں شام کو ملا اذان دیتا تھا۔ ویسے گھرونڈے کی سہاگنیں بڑے امام صاحب کے مزار پر اولاد کی منتیں مانتی تھیں اور بابر پور میں چیچک پھیلتی تو بڑی بوڑھیاں فوراً سیتلا مائی کے مندر میں چڑھاوا چڑھاتیں۔ گھرونڈے کے جاٹ سر پہ چوٹی رکھتے تھے اور بابر پور کے ارائیں داڑھیاں رکھتے تھے۔ لیکن دونوں کی زمینیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ دونوں کھیتی کرتے تھے۔ گیہوں اگاتے تھے۔ ان کی زمینیں بہت زرخیز تھیں

کیونکہ کہتے ہیں اِس علاقے میں کبھی جمنا جی بہتی تھیں۔ لیکن کوئی ہزار برس پہلے نہ جانے کس بات پر یہاں والوں سے ناراض ہو کر انھوں نے اپنے بہاؤ کا رُخ بدل لیا اور یہاں سے پندرہ میل دُور کیرانے چلی گئیں جو اُتّر پردیش کے ضلع مظفّر نگر میں ہے۔ ہاں تو اس زرخیز زمین میں بابرپور کے ارائیں اور گھرونڈے کے جاٹ ہل چلاتے، بیج بوتے، رہٹ چلا چلا کر پانی دیتے، نلائی کرتے، جب فصل پکنے کے قریب ہوتی تو رات رات بھر کھیتوں میں پہرہ دیتے، پھر کٹائی شروع ہوتی، ہر کاشتکار کے سب گھر والے کام کرتے۔ عورتیں اور چھوٹے چھوٹے بچّے بھی درانتیاں چلاتے، کٹائی کر کے چھٹائی کرتے، اناج کو بھوسے سے علیحدہ کرتے۔ کھیتوں میں سونے کی طرح چمکتے ہوئے گیہوں کے دانوں کے پہاڑ کھڑے ہو جاتے۔ پھر اس اناج کو بوروں میں بھرا جاتا۔ بوروں کو گدھوں پر لادا جاتا اور جاٹ اور ارائیں سب کاشتکار پانی پت کا رُخ کرتے اور اپنے خون پسینے سے اُگائی ہوئی فصل کو خان صاحب لطیف اللہ رئیس اعظم اور چودھری چھوٹو رام آنریری مجسٹریٹ اور لالہ امول چند آڑھتی اور ایسے ہی دوسرے لوگوں کے ہاں پہنچا آتے۔ خان صاحب لطیف اللہ اس اناج کو بیچ کر اپنے بیٹے کو روپیہ بھیجتے جو علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد اب آکسفورڈ میں پڑھ رہا تھا، چودھری چھوٹو رام اپنی سپتری کا بیاہ اس شان و شوکت سے کرتے کہ سارے علاقے میں دھوم مچ جاتی اور لالہ مول چند آڑھتی اپنے بینک کے فکسڈ ڈپازٹ میں ہر سال پندرہ بیس ہزار کا اضافہ کرتے اور ہاپڑ کی اناج کی منڈی میں آڑھت شروع کرنے کا پروگرام بناتے۔

بابر پور کے فضل محمد عرف فضلو اور گھرونڈے کے رام دین کی زمینیں برابر برابر تھیں دونوں کھیت دراصل پانی پت کے خان صاحب لطیف اللہ کی ملکیت تھے مگر کئی پیڑھیوں سے فضلو اور رام دین کے خاندان ہی ان زمینوں پر کاشت کرتے تھے۔ خان صاحب تو کبھی اپنی زمینداری کا دورہ بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کے مزارعے خود ہی ہر فصل پر اناج ان کے گھر پر پہنچا آتے۔ پٹواری کے رجسٹر کے مطابق زمین اُن کی تھی مگر زمین سے اُن کا صرف وہی

رشتہ تھا جو قصائی اور گائے کا ہوتا ہے یا تجبہ خانے کے مالک اور اغوا کی ہوئی لڑکی کا ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے فضلو اور رام دین کو اپنی اپنی زمین سے ایسا لگاؤ تھا جیسا عاشق کو اپنی محبوبہ سے ہوتا ہے اور کیونکہ ان کے کھیتوں کی مٹی ایک ہی تھی، اُن کا مزاج ایک سا ہی تھا، اُن کے کنوؤں کا پانی ایک جیسا تھا، ان دونوں اور ان کی زمینوں کا رشتہ ایسا تھا جیسا اُنہوں نے دو سگی بہنوں سے شادی کی ہوئی ہو۔ وہ آپس میں کھیتوں کے بارے میں بات بھی کچھ ایسی ہی طرح کرتے تھے کہ سننے والا سمجھے اپنی عورتوں کی بات کر رہے ہیں۔

"کیوں فضلو، تیری والی کا کیا حال ہے؟"

"ویسے تو اللہ کا فضل ہے، رام دین۔ پر سوری کی پیاس بجھاتے بجھاتے ہلکان ہو گیا ہوں۔ ہر وقت پانی مانگے ہے۔ اللہ جانے اب آگے جاکر سوری سوڈا لیمنڈ نہ مانگنے لگ جائے۔ تو بول تیری والی کا مجاز کیسا ہے؟"

"بس جو تیری والی کا ہے وہی میری والی کا ہے۔ دونوں ایک ہی ماں کی جائی ہیں نا۔ بڑی نکھرے والیاں ہیں۔ جتنا پریم کرو اتنا ہی سر پے چڑھی آویں ہیں۔"

"تو پھر سُن لے۔ عورت اور جمین کی کھاسیت، ایک ہی جیسی ہو ہے۔ ان سے پیار کرو بیک پران کو کھُس کرنا ہے تو ہل چلاؤ جور سے۔ تب ہی تمہارا بیج پھل لاوے گا۔"

"لے اب تو تو گندی باتیں کرنے لگا۔ تیری گھر والی سُنے گی تو کیا کہے گی۔"

اور پھر دونوں ہنس پڑتے اور ان کے ہلوں میں جُتے ہوئے بیل بھی خوشی سے گردنیں ہلا ہلا کر اپنی اپنی گھنٹیاں بجانے لگتے، اور ان کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں گیہوں کی بالیں ہوا میں جھوم اُٹھتیں، نیم کے پیڑوں کے نیچے مور ناچنے لگتے اور پیپل کی ڈالیوں میں بیٹھے ہوئے طوطوں کے جوڑے محبت سے چُور ہو کر ایک دوسرے کو ٹھونگیں مارنے لگتے۔

تو بھائیو یہ وہ زمین تھی اور یہ وہ ماحول تھا جس میں میرے باپ، دادا نے جنم لیا تھا۔ ایک برس کا ذکر ہے کہ دونوں کھیتوں میں ہل چل چکے تھے۔ اب بیج بویا جا رہا تھا۔

آسمان پر بھورے بھورے بادل چھائے ہوئے تھے - آم کے باغوں میں کوئلیں کوُ کوُ کر رہی تھیں۔ فضلو اور رام دین دونوں اپنے اپنے کھیت میں بیج ڈال رہے تھے - رام دین جو کئی برس انگریزی سرکار کی فوج میں بھی کاٹ آیا تھا پہلی جنگِ عظیم کے زمانے کا ایک گیت گنگنا رہا تھا "تیرے باہر کھڑے رنگروٹ تینوں بھرتی ہوے نا۔" اور ان دنوں کی یاد کر رہا تھا جب وُہ خاکی وردی پہنے جہاز میں چڑھ کر تُرکوں اور عربوں سے لڑنے کے لئے عراق بھیجا گیا تھا - حالانکہ اُسے بالکل یہ نہیں معلوم تھا کہ ان لوگوں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے کہ ان کے خلاف لشکر کشی ہو رہی ہے اور پھر اُسے ولائت کی سردی یاد آکر ایک جھرجھری سی آگئی - جرمنی کی وُہ برف اور بارش اور کیچڑ جس میں وُہ جرمنوں سے لڑے تھے - اس لئے کہ جرمن کا بادشاہ اپنے بادشاہ جارج پنجم کا دُشمن تھا اور سو جرمنوں کو ہار ہوئی تھی اور اتحادی فوجوں کی فتح ہوئی تھی - جنگی مورچے پر بہادری دکھانے کے صلے میں رام دین کو ایک جرمن تلوار انعام میں ملی تھی - مگر رام دین کو تو صرف یہ یاد تھا کہ اس کے دوست صوبیدار محمد خاں اور جمعدار جسونت سنگھ لڑائی میں کام آئے تھے - اب نہ کبھی اُسے محمد خاں وُہ لطیفے سُنائے گا جن کو سُنکر سب لوگ ٹرنچ میں بھی لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے اور نہ اب کبھی جسونت سنگھ ماہیا گائے گا جس کو سُننے کے لئے دُشمن بھی اپنی خندقوں سے نکل پڑتے تھے -

جب وُہ تمغوں سے لدا ہُوا اپنے گاؤں واپس آیا تھا تو نمبردار رام سنگھ کی لڑکی لاجو کی شادی نوبلدار ہربنس لال سے ہو چکی تھی، اب تو اُسکی گود میں ایک بچہ کھیل رہا تھا اور رام دین کے لئے یہ یاد کرنا بالکل بیکار تھا کہ سرسوں کے کھیت میں لاکھوں پھولوں کے بیچ میں پوتّر دھرتی کو ہاتھ لگا کر اور بھگوان کو ساکشی مان کر لاجو نے اپنے پیار کی سوگند کھائی تھی - کہتے ہیں وقت سب کچھ بُھلا دیتا ہے - گاؤں میں پھر کسی نے رام دین کی زبان سے لاجو کا نام نہ سُنا - کسی نے اُس کی آنکھ سے کبھی ایک آنسو گرتے نہ دیکھا - لیکن یہ بھی واقعہ تھا کہ اس دن سے رام دین نے اپنے کھیت میں کبھی سرسوں نہیں بوئی -

ہاں تو رام دین گنگنا رہا تھا "تیرے باہر کھڑے رنگروٹ تینوں بھرتی ہوے نا" وہ گیت

جیسیں اُس کی جوانی کی میٹھی اور کڑوی یادیں گھُلی ہُوئی تھیں اور برابر والے کھیت میں فضلو بیج پھینکتا جا رہا تھا اور اپنی بے سُری بھاری آواز میں لہک لہک کر گاتا جا رہا تھا۔ "میرے مولا بُلا لو مدینے مجھے" یہ نعت اُس نے ایک بار پانی پت کے بازار میں مینا شربت والے کی دکان پر سُنی تھی جہاں وہ خان صاحب لطیف اللہ کے ہاں اناج پہنچا کر لوٹتے ہوئے فالُودہ پینے رُک گیا تھا۔ اس دُکان پر ہمیشہ بھیڑ رہتی تھی۔ کیونکہ کیوڑے والے شربت۔ فالُودہ قلفی ملائی کے علاوہ وہاں ایک بھونپو والا گراموفون باجہ بھی لگا ہُوا تھا جس پر کوئی نہ کوئی ریکارڈ چلتا ہی رہتا تھا۔ اُسے یہ دُھن بڑی اچھی لگی تھی اور اس نے مینا سے کہا تھا کہ پہلوان ایک بار پھر یہی ریکارڈ لگا دے تو فالُودے کا ایک کٹورہ اور پیتا ہُوں۔

"اُسی دن سے جب کبھی فضلو خوش ہوتا یا کسی سوچ میں ہوتا اُس کی زبان سے بے اختیار اس نعت کے الفاظ نکل آتے۔ "میرے مولا بُلا لو مدینے مجھے" آج وُہ بہت خوش بھی تھا اور ساتھ ہی گہری سوچ میں بھی تھا۔ خُوشی اس لئے تھا کہ اس کے بیٹے محمدے نے پٹوار کا امتحان پاس کر لیا تھا اور اب اُس کی نوکری پکّی ہو گئی تو نہ صرف گھر میں کھانے پینے کی تنگی نہ رہے گی بلکہ ویسے بھی گاؤں میں ان کے گھرانے کی عزّت اُونچی ہو جائے گی۔ مگر سوچ اس بات کی تھی کہ اسی محمدے کے بارے میں بُندے حجام نے ایسی خبر سُنائی تھی کہ سُنتے ہی فضلو جیسا شریف آدمی جس کے چال چلن پر آج تک کسی گاؤں والے نے اُنگلی نہ اُٹھائی تھی حیران اور پریشان رہ گیا تھا۔ ملّاجی سچ ہی کہتے ہیں۔ اُس نے سوچا یہ چودھویں صدی ہے۔ قیامت قریب ہے۔ جو نہ ہو تھوڑا ہے۔ ورنہ کون سوچ سکتا تھا کہ فضلو کا بیٹا محمدا پٹواری کا امتحان پاس کرنے کے بعد یہ گُل کھلائے گا۔ بُندے حجام کا کہنا تھا کہ گھرونڈے میں جو دو تین گھر جُلاہوں والے مسلمان جلاہوں کے ہیں اُدھر آج کل محمدا روز چکر لگاتا ہے اور شرفو جلاہے کی بیٹی شریفن سے چھپ چھُپ کے ملتا ہے۔ پہلے تو فضلو کا جی چاہا فوراً بیٹے کو بلا کے دو چھتّر رسید کرے تاکہ بیٹے کا راسک ہوا سکہ سب ہرن ہو جائے۔ پھر اُس نے سوچا۔ برابر کا بیٹا ہے وُہ بھی پٹوار کا امتحان

کئے ہوئے اگر کہیں مقابلہ کر بیٹھا تو گاؤں میں برادری کے سامنے ناک کٹ جائیگی۔ تب سے وہ اِسی سوچ میں تھا کہ اِس معاملے میں کیا کرے کیا نہ کرے اور اِسی لئے وہ بیج بکھیرتا جا رہا تھا اور بے اختیار گاتا جا رہا تھا۔ "میرے مولا بُلا لو مدینے مجھے۔" اور اِس بار تو یہ بالکل حسبِ حال بھی تھا کیونکہ اگر گاؤں میں یہ بات پھیل گئی تو وہ کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اِس کے بعد تو مولا اسے مدینے ہی بُلالیں تو بہتر ہے۔

"کیوں فضلو۔ آج کس سوچ میں ہے؟ نجر اُٹھا کے دیکھتا ہی نہیں۔"
رام دین کی آواز نے فضلو کو چونکا دیا۔ بیج بکھیرتے بکھیرتے اب وہ کھیت کی مینڈھ تک آگیا تھا۔ جس کے دُوسری طرف رام دین بھی اپنی جھولی میں بیج بھرے ہوئے کھڑا کہہ رہا تھا۔ "آج تو دھرتی میں بیج دینے کا دن ہے رے اور جب بیج پڑے ہے تو دھرتی بھی کُھس ہو کے ایسے ہی مجے کی کروٹ لے ہے جیسے دُلہن سُہاگ رات کو۔"

یہ اُن دونوں کا آپس کا پُرانا مذاق تھا۔ پر آج فضلو رام دین کی بات پر ہنسا نہیں۔ دھیرے دھیرے مُٹھی میں سے بیج گراتے ہوئے بولا۔ "بھیّا آج میں بڑی سوچ میں ہوں۔ راجت کا معاملہ ہے۔"

اور پھر اس نے ممدے اور جلاہے کی چھوکری شریفن کی ساری بات رام دین کو سُنا دی۔ "تُم ہی چھوکرے کو سمجھاؤ، بھیّا۔ مجھے تو بات کرتے سرم لگے ہے۔ سُنا ہے روز تمہارے گاؤں میں آوے ہے۔ شام کو سُورج ڈھلے۔ دونوں مندر کے پچھواڑے جو بڑ کا درخت ہے اس کی آڑ میں ملیں ہیں۔"

رام دین نے کہا۔ "اچھا فضلو۔ میں ممدے کو سمجھا دُوں گا۔ ہمارے گاؤں کی اِجت کا بھی تو سوال ہے۔ یہ جمنا پار والوں کی چھوکریاں ہیں ہی بے شرم۔ جرور اُس شریفن ہی نے اپنے ممدے کو پھنسایا ہوگا۔" مگر دل ہی دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ لونڈا جوان ہے اور جب لونڈے جوان ہوتے ہیں تو "اِسک موداسکے" کرتے ہی ہیں۔ میرا اپنا گووندا بھی ایسے ہی کسی چکر میں

ہوگا - اُس کا باپ بھی جب پچیس عُمر کا تھا تو کون سا ڈھور بیچاری تھا - پھر اس نے کہا۔" اور سُنا
بھئی نضلو۔ نئی پرانی خبر کیا ہے ؟"

نضلو نے کہا ۔" خبر تو ہے ایک پر اس محمدے کی سوچ میں میں تمہیں بتانی ہی بھول گیا ۔ مُلّا
جی نے کل ہم سبکو مسجد میں بلایا تھا ۔ کہتے تھے پاکستان ضرور بنے گا ۔ سُنا ہے کھان صاحب
لطیف اللہ نے دس ہزار چندہ دیا ہے ۔"

رام دین بولا ۔" خبریں تو بے ڈھب ادھر بھی آ رہی ہیں ۔ چوہدری چھوٹو رام اور مُول چند دونوں
گھونڈے آئے تھے - کہتے تھے سب کو تیار رہنا چاہیئے ۔"

نضلو نے کہا ۔" بھیّا بُرا نہ ماننا ۔ ایک بات کہوں ۔ رات برات کو اُدھر باہر پور نہ آنا ۔ بڑی
اُتھل پتھل ہونے والی ہے ۔"

رام دین نے کہا ۔" ہاں نضلو ۔ اُتھل پتھل تو ہوتی ہی رہتی ہے اور شائد پھر ہوگی ۔ پر ہمیں
تمہیں اس سے کیا ۔ میں تو ایک بات جانتا ہوں کہ لوگوں کو زندہ رہنا ہے تو اناج اُگانا پڑے گا ۔
جھین میں ہل چلانا ہوگا ۔ بیج ڈالنا ہوگا ۔ نلائی کٹائی کرنی ہوگی اور یہ کام نہ کھان صاحب کریں گے نہ
چودھری جی نہ لالہ جی ۔ یہ تو نضلو اور رام دین ہی کریں گے ۔ اب چاہے تیرے والے کھیت کا نام
پاکستان رکھ دیں اور میرے والے کا ہندوستان ۔"

اور نضلو بولا ۔" ہاں بھیّا نام جو بھی ہو محنت مجدوری کریں گے ہم ۔ کھون پسینہ بہائیں گے
ہم اور اناج جاوے گا کھان صاحب لطیف اللہ کے گھر ۔"

"اور چوہدری چھوٹو رام کے گھر اور لالہ مُول چند کے گوداموں میں ۔"

"تو پھر لڑنے دو اُنہیں بھیّا ۔ ہمیں ان کے جھگڑوں سے کیا ۔"

"ٹھیک کہتا ہے رے نضلو ۔ تو یہ لے تیرے پاکستان میں آج میں اپنا بیج بوتا ہوں ۔"
اور یہ کہہ کر وہ اپنی جھولی میں سے مٹھیاں بھر بھر کر نضلو کے کھیت میں پھینکنے لگا ۔ یہ دیکھ کر
نضلو کو بھی جوش آ گیا ۔" اور میں اپنا بیج بوتا ہوں تمہارے ہندوستان میں ۔" اور اُس نے بھی مٹھیاں

بھر بھر کے رام دین کے کھیت میں دانہ بکھیر دیا۔" جب فصل تیار ہوگئی تو کھان صاحب، لطیف اللہ سے کہیں گے سواب پہچان لو پاکستانی گیہوں کونسا ہے اور ہندوستانی گیہوں کون سا ہے۔"

"ہاں فضلو پوچھیں گے کھان صاحب سے بھی اور چودھری چھوٹو رام سے بھی اور لالہ مولچند سے بھی۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کے کھیت میں دانے بکھیر رہے تھے اور اس وقت نیلے آسمان میں بھورے بھورے بادل تیر رہے تھے، اور آم کے باغ میں کوئل کوک رہی تھی اور پیپل کے پیڑ کے نیچے مور ناچ رہے تھے اور برگد کی شاخوں میں طوطوں کے جوڑے ایک دوسرے کو پیار بھری ٹھونگیں مار رہے تھے۔

بھائیو مجھے وہ پیار بھرا لمحہ اچھی طرح یاد ہے۔ کیونکہ وہ میری پیدائش کا لمحہ تھا۔

عام طور سے رام دین دن بھر کھیت میں کام کر کے جب تھکا ہارا گھر لوٹتا تھا تو اس میں اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اشنان کر کے پوجا کے لئے مندر جائے۔ اس لئے ایک دن گھر پہنچتے ہی جب اس نے اپنی بیوی سے نہانے کے لئے پانی مانگا تو وہ اچنبھے میں رہ گئی۔ "کیوں بات کیا ہے۔" وہ بولی "جو آج پوجا پاٹھ کا دھیان آیا ہے۔"

"اری دھرم کے کام میں تو اپنی جبان بند رکھا کر۔" رام دین نے ہنس کر کہا اور جلدی جلدی سر پر لوٹے لنڈھانے لگا۔

سیدھا مندر تو وہ گیا۔ آرتی میں بھی شریک ہوا۔ لیکن ابھی پوجا ختم نہیں ہوئی تھی کہ وہ وہاں سے کھسک آیا اور بجائے سیدھے راستے سے لوٹنے کے وہ مندر کے پچھواڑے کی طرف ہو لیا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی جو وہ شام کو گھر سے نکلتے ہوئے ضرور ساتھ رکھتا تھا۔ سانپ بچھو کے خیال سے لوہے کی پھلی لگی لاٹھی کو زمین پر ٹھک ٹھک کر کے چلتا تھا۔ مندر کے آس پاس اونچی اونچی گھاس اگی ہوئی تھی مگر آج اس نے لاٹھی کو کندھے پر رکھ لیا تاکہ کوئی

آہٹ نہ ہو اور خود بھی دبے پاؤں بڑ کے پیڑ کی طرف چلا جس کے نیچے دُور ہی سے دو سائے حرکت کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اُس نے چوروں کی طرح آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے سوچا۔ وہ جلاہے کی چھوکری شریفن تو مجھے دیکھ کر فوراً ہی بھاگ جائے گی۔ عورت ذات کے مُنہ کیا لگنا۔ پھر مَیں آرام سے ممدے کو سمجھاؤں گا۔ "دیکھو بیٹے اپنے کاکا کی بات یاد رکھو۔ جوانی میں اِسک وِسک کا روگ تو سبکو لگتا ہی ہے لیکن اپنے ماں باپ کی عزّت کا بھی خیال کرو۔ ..... " اب وہ اتنے قریب آ گیا تھا کہ وہ ممدے کی آواز سُن سکتا تھا۔ لڑکا کہہ رہا تھا۔

"روز دِل کو سمجھاتا ہُوں کہ یہ سب پاگل پن ہے۔ میرا تیرا مِلاپ نہیں ہو سکتا۔ پھر شام ہوتے ہی نہ جانے کیا ہو جاتا ہے کہ آپ سے آپ پیر اِدھر ہی اُٹھتے ہیں۔"

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف سِسکیاں بھرنے کی آواز آئی۔

پیڑ کی آڑ سے کرم دین اب اِن کے بہُت قریب آ گیا تھا۔ اب وہ دھُندلکے میں بھی ممدے کا چہرہ پہچان سکتا تھا۔ لیکن وہ لڑکی جو چپکی کھڑی سِسکیاں لے رہی تھی وہ جلاہے کی چھوکری شریفن نہیں ہو سکتی۔ جلاہوں کی چھوکریاں تو تنگ پائجامے، لمبی قمیض اور اوڑھنیاں پہنتی ہیں اور یہ لڑکی تو ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔

اور پھر سِسکیاں لیتے ہوئے وہ لڑکی بول پڑی "مَیں بھی جانتی ہُوں یہ پاگل پن ہے۔ پر کیا کروں تم سے مِلے بنا من نہیں مانتا۔"

رام دین پر جیسے ایکدم بجلی گر پڑی ہو۔ یہ شریفن نہیں تھی۔ یہ کوئی مُسلمان جلاہے کی چھوکری نہیں تھی۔ یہ ایک ہندو جاٹ کی بیٹی تھی۔ یہ خُود اُس کی اپنی رادھا تھی۔

لوہے کی پھُلّیاں لگی لاٹھی پر اُس کی پکڑ سخت ہوتی گئی۔ اِس لاٹھی کی مار کی دُور دُور دھاک تھی۔ ایک سانپ پہ پڑی تھی تو ایک وار میں اس کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک مرکھنے بیل کی کمر پہ پڑی تھی تو اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی تھی۔ آہستہ آہستہ لاٹھی اُوپر اُٹھاتے ہوئے اُس نے سوچا بس دو ہی وار میں دونوں پاپیوں کا کام تمام کر دُوں گا۔

پر اس [illegible] اندھیرے میں اُٹھی کی اُٹھی رہ گئی۔ اُسی لمحے میں مندر میں کیرتن شروع ہو گیا۔ "جے جے کرشن ہرے......"

دفعتاً رام دین کو یاد آیا کہ یہ جگہ مندر کے اِتنے قریب ہے کہ اگر کوئی مار پیٹ یہاں ہوئی تو فوراً گاؤں کا گاؤں اکٹھا ہو جائے گا۔ اِس کی بیٹی نے یہ کلنک جو اس کے ماتھے پر لگایا تھا وہ ساری دُنیا دیکھے گی۔ نہیں۔ اِن پاپیوں کو سزا دینے کے لئے اِسے خاموشی سے کام کرنا ہوگا لاٹھی پر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑی تھی کہ کھٹاک سے ساتھ لاٹھی زمین پر گر پڑی۔

"ہائے رام!" رادھا کی آواز آئی اور وہ دونوں پرچھائیاں چھلاووں کی طرح اندھیرے میں غائب ہو گئیں۔

رام دین گھر لوٹ کر آیا تو پہلا سوال اس نے بیوی سے کیا۔ "کیوں رادھا کہاں ہے؟"

"تمہارے پیچھے پیچھے ہی تو مندر گئی تھی۔ تم نے وہاں دیکھا نہیں۔"

دفعتاً اُسے خیال آیا کہ اِس طرح تو سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور پاپیوں کو سزا ملنے کی بجائے بدنامی ہی بدنامی ہوگی اور اس نے اپنے غصّے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں ملی تھی۔ کیرتن میں رہ گئی ہوگی۔"

اور پھر وہ چراغ لے کر اپنے کوٹھے پر گیا جہاں اناج کی ٹوکریاں، ہل اور کھیتی کے دوسرے اوزار اور ایسی ہی دوسری متفرق چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہیں ایک دیوار پر کپڑے میں لپٹی ہوئی وہ جرمن تلوار لٹکی ہوئی تھی جو اِسے جرمنوں کو مارنے کے لئے انعام میں ملی تھی۔ اُس نے تلوار کو اپنے کُرتے کے اندر چھپایا اور چُپکے سے اپنے جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔ آج اِسے مجھرے کا خون کرنا ہی تھا۔

گھرونڈے سے باہر پور تک پکّی سڑک کے علاوہ کھیتوں میں سے ہو کر ایک پگڈنڈی بھی جاتی تھی۔ وہ اِسی راستے ہو لیا۔ چاندنی رات تھی مگر آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ مدّھم روشنی میں گاؤں کے جھونپڑے کالے کالے دھبّے دکھائی دیتے تھے مگر

سفیدی کی ہوئی مسجد جھلملا رہی تھی۔ اس کی پچھلی دیوار کے پاس اس نے دو پرچھائیاں سی ہلتی ہوئی دیکھیں، ایک مرد تھا اور ایک عورت۔ عورت تنگ پاجامہ اور لمبا قمیض پہنے ہوئے تھی اور کہہ رہی تھی "خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔ یہاں تمہاری جان کا خطرہ ہے۔ اگر کسی نے تمہارا بال بھی بیکا کیا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔"

اور شریفن کی آواز پہچان کر رام دین نے سوچا اچھا تو یہ بدمعاش محمدا ایک ساتھ دو دو لڑکیوں کو خراب کر رہا ہے۔ ایسی بدچلنی کی سزا موت ہی ہو سکتی ہے مگر ابھی وہ تلوار نکال ہی رہا تھا کہ "محمدا" بول پڑا۔ اور دوسری بار رام دین پر بجلی گری۔ کیونکہ وہ محمدا نہیں تھا۔ رام دین کا اپنا بیٹا گوندا تھا اور وہ کہہ رہا تھا "شریفن" سچ سچ بتا کیا تو میری وجہ سے گاؤں چھوڑ کر بابرپور چلی آئی؟"

"نہیں جی۔ میرے ماں باپ تو زبردستی مجھے یہاں لے آئے ہیں۔ کہتے ہیں جھگڑے فساد کا ڈر ہے۔ تب ہی تو میں کہتی ہوں تمہارے یہاں آنے میں بھی خطرہ ہے۔ گاؤں میں بہت جوش پھیلا ہوا ہے۔ دو چار دن تو بالکل ادھر نہ آنا۔ تمہیں میری قسم ہے۔"

"قسم کیوں دیتی ہے رے! نہیں آؤں گا۔ پر کوئی بات ہو تو محمدے سے کہہ دیجیو۔ وہ سب جانتا ہے۔ اپنا سچا یار ہے۔"

"پر اسے بھی مت بھیجا کرو۔ میری وجہ سے وہ بیچارا بھی بدنام ہو رہا ہے بابرپور والے کہتے ہیں کہ میں اور محمدا ......"

مگر رام دین اب واپس چلا جا رہا تھا۔ اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا ساری دنیا اُلٹ پلٹ ہو گئی ہے۔ ہزاروں برس پرانے قاعدے قانون رسم ورواج آناً فاناً مٹی میں رل گئے تھے۔ کوئی کرے تو کیا کرے جائے تو کدھر جائے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا مگر نہ جانے کیوں ہل چلائے ہوئے کھیتوں میں سے اسے سرسوں کے پھولوں کی دھیمی دھیمی خوشبو آ رہی تھی جیسے اس کی یاد کے کسی کونے میں سلا بہار سرسوں

پھُولی ہوئی ہو۔

اِسی طرح اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا اپنے جھونپڑے تک پہنچا تھا کہ بجلی زور سے چمکی اور اس نے دیکھا کہ دروازے کے پاس فضلو کھڑا ہُوا ہے۔

”فضلو! تُو یہاں کیا کر رہا ہے۔ رات کے اندھیرے میں؟ پتہ نہیں تیری جان کا خطرہ ہے۔“

”جان کا خطرہ تو سب جگہ ہے، رام دین۔ تب ہی تو سب بار پُور والے گاؤں چھوڑ کر پانی پت جا رہے ہیں۔ کون جانتا ہے وہاں بھی ٹھکانا مِلتا ہے کہ آگے جانا پڑتا ہے۔ پر اِس وقت مجھے جان کی فکر نہیں ہے۔ ایمان کی فکر ہے۔“

”ایمان کی فکر۔ فضلو؟“

”ہاں رام دین۔ عمر بھر مَیں نے نماز کی ٹکریں ماری ہیں۔ زمین پر ماتھا رگڑا ہے ہر برس رمضان میں تیس تیس روزے رکھے ہیں۔ پر آج میری ہی اولاد نے میرے سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیا ہے۔“

”تیری اولاد نے؟“ تو کیا فضلو محمدے کی طرف سے وکالت کرنے آیا تھا؟“

”ہاں۔ مَیں نے تجھ سے کہا تھا محمدا جلاہے کی چھوکری کے چکّر میں پڑ گیا ہے پر وُہ سب جھوٹ تھا۔ اصلی بات مجھے اب پتہ چلی ہے۔ اب مَیں تجھے کیسے کہوں کہ محمدے نے تیری آبرو پر ہاتھ ڈالا ہے، رام دین۔ ہماری چالیس برس کی دوستی کو اِس پاپی نے ایک پل میں ملیا میٹ کر دیا ہے۔“

”پھر تُو اب کیا کہنے آیا ہے؟“

”مَیں تیرے پاپی کو تیرے سامنے پکڑ کے لایا ہوں، رام دین“۔ یہ کہہ کر فضلو نے پیڑ کے پیچھے سے محمدے کو گھسیٹ کر نکالا۔ ”اب تُو اپنی جرمن تلوار نکال اور اپنے ہاتھ سے اِس پاپی کا کام تمام کر دے۔

ایک پل کے لئے بجلی چمکی اور رام دین نے دیکھا کہ سامنے کھڑے ہوئے چھوکرے کا

چہرہ بالکل سفید ہے ۔ پر اس وقت اُسے وُہ محمدُ انظر نہیں آیا گووندا دکھائی دیا اور اُس کے نتھنوں میں سرسوں کی خوشبو تیز ہوتی گئی ۔

کچُھ دیر مکمل خاموشی رہی ۔ دُور کہیں گاؤں کے باہر گیدڑ چلا رہے تھے اور رام دین کو محسوس ہُوا کہ وُہ محمدے کے دِل کی دھڑکن کو سُن سکتا ہے ۔ اُس نے فضلو سے کہا ۔" فضلو بھیّا ۔ بھگوان ہی جانتا ہے کون پاپی ہے اور پاپ کیا ہے ۔ ہم تُم اَن پڑھ کسان تو بس گیہوں اُگانا جانتے ہیں اب تُم جاؤ اور اِسے بھی لے جاؤ مگر سنبھل کے جانا ۔ گاؤں کے پچھواڑے سے ۔"

اور پھر وُہ اپنے جھونپڑے کے اندر چلا گیا ۔ دیوار پر تلوار کو اُس کی جگہ ٹانک رہا تھا کہ چراغ کی روشنی میں دیکھا کہ رادھا اپنی کھاٹ پر پڑی سسکیاں لے رہی ہے اور دُوسرے کونے میں گووندا بیٹھا ہے اور اس کا چہرہ بھی خوف اور دہشت سے سفید ہے ۔ بالکل محمدے کی طرح اور اِتنے میں بارش شروع ہو گئی اور رم جھم کی آواز سُن کر کسان پاپ اور پُن ۔ دھرم ادھرم کی باتیں بھول گیا اور سوچنے لگا کہ بڑے وقت پر بارش ہوئی ہے اب ہمارے بوئے بیج ضرور اُگیں گے ۔

رات بھر بارش ہوتی رہی ۔ اُس سے اگلے دن بھی مُوسلا دھار مینہ برستا رہا ۔ تیسرے دِن برسات کا زور کم ہُوا تو رام دین نے گووندا سے کہا ۔" چل رے ۔ اُٹھ ۔ دیکھ کے آویں کھیت کا کیا حال ہے ۔"

اپنے اور فضلو کے کھیتوں کے بیچ کی مینڈھ پر کھڑے ہو کر رام دین نے نظر دوڑائی تو دونوں طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آئی ۔ پانی میں سے ننھی ننھی کونپلیں جھانک رہی تھیں ۔ اُس نے سوچا اِس برس فصل اچھی ہو گی ۔ فضلو بھی ابھی آ کر دیکھے گا تو کتنا خوش ہو گا ۔

پر فضلو اُس دن اپنے کھیت پر نہیں آیا ۔

اگلے دن بھی نہیں ۔ اِس سے اگلے دن بھی نہیں ۔

پھر کبھی فضلو اپنے کھیت پر نہیں آیا ۔

معلوم ہُوا کہ بار پور والے سب گاؤں خالی کر کے پانی پت چلے گئے ہیں۔ فضلو بھی۔ محمد الہٰی شریف اور اس کے گھر والے بھی۔

پھر خبر آئی کہ مغربی پنجاب سے لُٹے کھُٹے شرنارتھیوں کا ایک قافلہ بار پُور کے خالی گاؤں میں ٹھہرا دیا گیا ہے۔

سارے علاقے میں خُون خرابے ہو رہے تھے۔ موت کا بازار گرم تھا۔

مگر سُورج اب بھی چمک رہا تھا۔ اس کی کرنیں مٹی اور پانی میں سے نکلی ہوئی کونپلوں کو چُوم رہی تھیں اور ان کے پیار کے اعجاز سے گیہوں کی فصل اُونچی ہوتی جا رہی تھی۔ رام دین کے کھیت میں بھی اور فضلو کے کھیت میں بھی مگر فضلو اپنی کھیتی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وُہ پانی پت کی ایک تنگ گلی میں چھوٹی سی کوٹھری میں اپنے گھر والوں سمیت کرفیو کی قید میں تھا اور مسجد سے آئی ہوئی خیرات کی روٹیاں کھانے پر مجبور تھا۔

گو دندا نے باپ سے کہا۔ "فضلو کاکا کے کھیت میں پانی کون دے گا؟ بابا۔"

اور رام دین نے جواب دیا۔ "ہم پانی دیں گے، اور کون دے گا؟ تو اُن کا رہٹ چلایا کر۔"

رہٹ گھُومتے گئے جیسا دُنیا کا چکر چلتا ہے۔ گہرے کنوؤں سے ٹھنڈا میٹھا چمکتا ہُوا پانی نکلتا رہا۔ نالیوں میں سے بہتا ہُوا کھیتوں میں جاتا رہا۔ رام دین کے کھیت میں اور فضلو کے کھیت میں ــــ سُوکھی دھرتی کی پیاس بجھاتا رہا اور دھرتی اپنی کوکھ سے فصل کو جنم دیتی رہی، اپنی گود میں پروان چڑھاتی رہی۔

ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ پاکستان بن گیا۔ جلسے ہوئے جلوس نکلے، جھنڈے لہرائے گئے گیت گائے گئے۔ نئی حکومتیں بنیں، نئے وزیر مقرّر ہوئے۔ تقسیم اور آبادی کے تبادلے کے نئے معاہدے ہوئے۔ شرنارتھیوں اور مہاجروں کے قافلے سرحد پار کرتے رہے۔

پر سُورج اسی طرح چمکتا رہا۔ ہندوستان پر بھی اور پاکستان پر بھی۔ لائلپور کے کھیتوں پر بھی بار پُور اور گھرونڈے کے کھیتوں پر بھی۔ دھُوپ تیز ہوتی گئی۔ سُورج کو دیکھ کر گیہوں کی بالیاں خوشی سے ہوا میں جھُومتی رہیں۔ سُورج کی کرنیں پیار سے ہری ہری نالیوں کو چُومتی رہیں تھیں ان کے پیار

کی گرمی سے بالیوں میں دانے پڑتے گئے۔ پکتے گئے۔ یہاں تک کہ فصل تیار ہو گئی۔ رام دین کے کھیت میں بھی فضلو کے کھیت میں بھی۔

گوندا نے پوچھا۔ "بابا کاکا کے کھیت میں کٹائی کون کرے گا؟"

اور رام دین نے کہا۔ "ہم کریں گے اور کون کرے گا۔"

پھر خبر آئی کہ مغربی پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کے لئے پانی پت کو خالی کرایا جا رہا ہے۔ اب پانی پت اور بابر پور کے سب مسلمان پاکستان جائیں گے ان کے لئے سپیشل ٹرینیں آ رہی ہیں۔

چپ چاپ ویران آنکھوں سے تکتا ہوا گوندا فضلو کاکا کے کھیت میں کٹائی کرتا رہا۔

جھونپڑے کے ایک کونے میں بیٹھی بیٹھی رادھا آنسو بہاتی رہی۔ ماں نے کہا۔ "اری کھیت پر جا کر باپ بھائی کا ہاتھ کیوں نہیں بٹاتی۔"

فضلو اور محمے اور اس کے گھر والوں کو پانی پت کی کوٹھڑی میں قید ہوئے نہ جانے کتنے دن ہو گئے تھے۔ اب تو انہوں نے گنتی ہی چھوڑ دی تھی۔ ایک دن فضلو نے بیٹے سے کہا۔ "اب تو اپنے کھیت میں کٹائی ہو رہی ہوگی۔"

کٹائی ہو چکی تھی اب چھٹائی ہو رہی تھی۔ رادھا ایک تپائی پر کھڑی ہاتھ میں چھاج لئے چھٹائی کر رہی تھی۔ ہوا سے بھوسہ اڑ کر ایک طرف جا رہا تھا۔ گیہوں کے دانے نیچے گرتے جا رہے تھے اور ان میں ٹپ ٹپ گرتے ہوئے رادھا کے آنسو جذب ہوتے جا رہے تھے۔

سنا ہے سپیشل ٹرینیں آگئی ہیں۔ ان میں لاہور اور لائلپور اور منٹگمری سے لاکھوں شرنارتھی آئے ہیں اور اب انہیں خالی کر کے ان ہی ٹرینوں میں پانی پت اور بابر پور والوں کو پاکستان بھیجا جا رہا ہے۔

رام دین نے کہا۔ "چل رے گوندا۔ چل ری رادھا۔ فضلو اور اس کے گھر والوں کو مل آئیں پھر کون جانے اس جیون میں کبھی ملاقات ہو یا نہ ہو۔"

سٹیشن پر کئی ٹرینیں کھڑی ہوئی تھیں۔ فوج کے پہرے میں مسافروں کو سوار کرایا جا رہا تھا۔ ہر

طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح اُنہوں نے بابر پُور والوں کو ڈھونڈ ہی نکالا۔ شریفن کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ گوندا کو دیکھتے ہی اس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ماں نے پُوچھا "اری کیا ہُوا؟" اور باپ نے کہا "یہ تو اپنے گھرونڈے والے ہیں۔ سلام بھائی رام دین۔ سلام گوندا۔ اب تو جاتے ہیں، بیٹا۔ ہم جلا وطنوں کو بُھولنا نہیں بھائی۔" گوندا نے بس ایک نظر شریفن کی طرف دیکھا اور پھر اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے شریفن نے اوڑھنی کا گھونگھٹ کر لیا۔

"رادھا۔" رام دین نے بیٹی سے کہا "فضلو کاکا کے پاؤں چھوری۔" وُہ جُھکی اور باپ کے پیر چھُوتے ہوئے بیٹے کے پیروں کی دھُول بھی اُٹھا کر آنکھوں کو اور سر کو لگائی اور اُسے ایسا محسوس ہُوا کہ دھول کا یہ سیندور مانگ میں لگا کر وُہ سدا سُہاگن بن گئی ہے۔

ریل نے سیٹی دی اور فضلو نے کہا "اچھا بھیّا رام دین۔ اب رُخصت ہو گیا۔"

رام دین بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف اتنا کہا "ہاں فضلو بھیّا۔" اور دونوں بُڈھے ایک دُوسرے سے لپٹ گئے اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر ایک کی مُونچھوں کو اور دوسرے کی داڑھی کو بھگونے لگے۔

فضلو ڈبے میں چڑھ ہی رہا تھا کہ رام نے اسے ایک تھیلا پکڑاتے ہوئے کہا "یہ لو بھیّا۔ یہ ساتھ لیتے جاؤ۔"

تھیلا لیتے ہوئے فضلو نے کہا "کیا ہے اسمیں؟ فوج والے نہ کچھ کہیں۔"

"اناج کے دانے ہیں۔" رام دین نے چلتی ریل کے ساتھ دوڑتے ہوئے کہا "یاد ہے ہم نے ایک دُوسرے کے کھیت میں بیج ڈالا تھا۔ بس اُسی فصل میں سے یہ دانے ہیں۔ جہاں بھی جاؤ انہیں بو دینا۔"

اور سو بابر پُور اور گھرونڈے کے بیچ کی زمین میں اُگائے ہوئے یہ دانے منٹگمری کے پاس کے گاؤں سُلطان پُور میں پہنچے جہاں فضلو کو زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا الاٹ ہُوا تھا اور جب وہ۔۔ے

سب مہاجر کسان حکومت سے بیج ملنے کا انتظار کر رہے تھے، فضلو اور محمدے نے رام دین کا دبا ہوا تھیلا نکالا اور وہ دانے جن میں راجھاکے آنسو اور گوبندا کا پسینہ جذب تھا پاکستان کی زمین میں بو دیئے۔

کتنے ہی برس گزر چکے ہیں اور سارے منٹگمری کے ضلع میں مشہور ہے کہ بابر پور والے فضلو کے کھیت میں گیہوں کی فصل جتنی اچھی ہوتی ہے وہ سارے پاکستان میں کہیں نہیں ہوتی۔ پچھلے سال تو بہت ہی اچھی فصل ہوئی تھی۔ اناج کے دام بھی بڑھ گئے تھے۔ منڈی سے واپس آکر فضلو نے بیٹے سے کہا۔ "اے محمدے۔ اس برس خدا کا فضل ہے۔ اپنے پاس چار پیسے ہیں سوچتا ہوں تیرا بیاہ کر دوں۔"

محمدے نے کہا۔ "بابا میں بیاہ نہیں کروں گا۔" اور پھر فضلو نے بیٹے سے اس بارے میں اصرار نہیں کیا۔ نہ جانے کیا سوچ کر صرف اتنا کہا۔ "ارے اس شریفن کا کیا حال ہے؟"

"وہی حال ہے بابا۔ کر گھے پر بیٹھی رہتی ہے اور روتی رہتی ہے۔ بال سفید ہوتے جا رہے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں پاگل ہو گئی ہے۔"

"بیاہ نہیں کیا نا؟"

"نہ بابا۔ پر نہ جانے کیا ہوا ہے اس کو۔ اپنی مانگ میں سیندور بھرتی ہے۔ دماغ پھر گیا ہے نا۔"

اور پھر اگلے برس جب فصل پکی اور کٹائی کا وقت آیا تو اپنا لہلہاتا ہوا کھیت دیکھ کر فضلو نے کہا۔ "کیوں رے محمدے یہ دیکھ کر تجھے اپنی بابر پور گھرونڈے والی زمین نہیں یاد آتی۔ وہی سورج ہے۔ وہی ہوا ہے۔ مٹی بھی ویسی ہی ہے۔ وہی ہمارا خون پسینہ ہے۔ پر نہ جانے کیا بدل گیا ہے؟" پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے بیٹے سے پوچھا۔ "کیوں رے۔ کچھ ہندوستان کی بھی خبر ہے۔"

"خبر اچھی نہیں ہے بابا۔ اس برس وہاں بارش اچھی نہیں ہوئی۔ کتنے ہی علاقوں میں سوکھا پڑا ہے۔ کہیں کہیں تو کال جیسی حالت ہے۔ دنیا کے کتنے ہی ملکوں سے اناج بھیجا جا رہا ہے۔"

"اپنے بابر پور گھرونڈے کی طرف کا کیا حال ہے؟ وہاں تو سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"نہیں بابا اِدھر بھی کچھ اچھی حالت نہیں ہے۔"

اور کئی دن تک فضلو کسی گہری سوچ میں کھویا رہا۔ کٹائی چھٹائی کرتا رہا۔ پر کسی سے بات نہ کرتا۔ آپ ہی آپ کچھ بڑبڑاتا رہتا۔ تین وقت تک کھانا نہ کھایا۔ ممدے کی ماں نے کہا "کیا فاقہ کرکے جان دینے کا ارادہ ہے؟ جو ہونا تھا ہو چکا بہت ہے اب تو کچھ کھا لو۔"

"اری وہ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں اور تو کہتی ہے میں کھانا کھاؤں۔"

"کون لوگ؟" بیوی نے حیرت سے پوچھا۔ "کن کی بات کر رہے ہو۔"

"رام دین اور اس کی بیوی اور ان کے بچے گوندا اور رادھا۔"

"اب ان کی فکر کیا کرو ہو؟ ملک بٹ گیا، ہم کہاں سے کہاں آ گئے۔ کتنے برسوں خون پسینہ ایک کرکے اب دو وقت روٹی نصیب ہوئی ہے تو تم ان کی فکر میں مرے جا رہے ہو۔"

اور فضلو گرج کر بولا۔ "چپ رہ ممدے کی ماں۔" اور پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی اور دھیمے لہجے میں بولا۔ جیسے اپنے آپ سے ہی بات کر رہا ہو۔ "ملک بٹ گیا ہے۔ پر دل نہیں بٹے۔ خدا کا بنایا ہوا سورج جو زمین میں جان ڈالتا ہے وہ نہیں بٹا۔" اور پھر سامنے پڑی ہوئی چنگیر میں سے ایک روٹی اٹھا کر بیوی سے بولا۔

"اری یہ روٹی جو ہم کھاتے ہیں یہ اناج انہیں دانوں سے پیدا ہوا ہے جو میں نے رام دین کے کھیت میں بوئے تھے اور اس نے میرے کھیت میں۔ جب تک اناج سے بیج اور بیج سے اناج پیدا ہوتا رہے گا اس رشتے کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔"

اور سو کئی دن بعد ایک رات کو لائلپور کی منڈی میں جن اناج کے گوداموں میں ہندوستان بھیجنے کے لئے گیہوں رکھا گیا تھا وہاں کے پہرے دار نے دور سے دیکھا کہ کوئی گودام کا دروازہ کھول کر چپکے سے اندر جا رہا ہے۔ اس نے سوچا ضرور اناج چور ہوگا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ چور کوئی بوجھ اٹھا کر اندر کیوں لے جا رہا ہے۔ دبے پاؤں پیچھے پیچھے گیا اور ٹارچ کی روشنی ڈالی تو دیکھا کہ

ایک بُوڑھا اناج سے بھری بوری اُلٹ کر اسے ڈھیر میں ملا رہا ہے۔ پاس ہی کئی اور بوریاں بھی اناج سے بھری پڑی ہیں اور بُوڑھا ساری دُنیا سے بے خبر مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بُڑ بڑا رہا ہے۔

جب فضلو اپنے اناج کی بوریاں اِس ڈھیر میں ملا رہا تھا تو وُہ کہنا چاہتا تھا "تم نے جو اناج کے دانے مجھے دیئے تھے، رام دین، اِن میں ہماری تمہاری عمر بھر کی دوستی ہی نہیں تھی گووند اور رادھا کا پیار بھی تھا۔ یہ دانے جو اب مَیں تمہیں بھیج رہا ہُوں اور شریفن جو اب دیوانی ہو گئی ہے اس کی پاک محبّت بھی ہے۔ تم ٹھیک کہتے تھے بھیّا کہ خُدا ہی بہتر جانتا ہے کیا گُناہ ہے کیا ثواب ہے۔ کیا نیکی ہے کیا بدی ہے۔ ہم اَن پڑھ کسان تو بس گیہوں اُگانا جانتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ گیہوں کا ایک دانہ بھی پیار کے بنا پروان نہیں چڑھتا۔" مگر اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ نہ پہرے دار کی کوئی آواز سُنائی دی۔ یہ پیغام صرف مَیں نے سُنا۔ اِس لئے جیسا آپ سب بھی جانتے ہیں۔ اناج کا دانہ جو پیار سے پیدا ہوتا ہے دِل کی اَن کہی بات سمجھ سکتا ہے۔

سو دوستو اب میری کہانی بھی ختم ہوئی۔

خدیجہ مستور

ہینڈ پمپ

شام ڈھلنے کے قریب تھی۔ ہینڈ پمپ کے قریب منڈیروں والا فرش کیا جا رہا تھا۔ سیمنٹ پر ایک دو کرنیاں پھیرنے کی کسر رہ گئی تھی۔ احاطے کی ساری عورتیں کام کاج چھوڑے ٹھٹ لگائے کھڑی تھیں۔ لونڈے ہما۔ ہماک کر ہینڈ پمپ کی ہتی پکڑنا چاہتے تھے مگر چینی بیگم ہین ہاین کر کے روک دیتیں۔

"خبردار جو ابھی ہاتھ لگایا، ابھی کچّا ہے، اُکھڑ جائے گا ہاں۔"

لونڈے اپنے ہاتھوں کی چل بل مل کر رہ جاتے۔

"اے مائی کوئی بازو ہے جو اُکھڑ جائے گا۔ ہینڈ پمپ ہے، ہینڈ پمپ" مستری نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"تم اپنا کام کرو جی۔ منڈیر کچّی ہے کہ نہیں۔ پاؤں دھرنے سے اُکھڑے گی کہ نہیں"؟ چینی بیگم نے مستری کو قائل کر دیا اور مائیں اپنے بے قابو بچّوں کو روکنے کے لئے چیخنے لگیں۔

"ارے کمبختو ذرا دیر الگ رہو ایک تو بیچاری نے پانی کا آرام دیا ہے۔ اُوپر سے نقصان بھی جھیلیں، موت آئے ہاتھ توڑ دوں گی کمبختوں کے۔"

لڑکوں سے نمٹ کر عورتیں چینی بیگم کی شان میں قصیدے پڑھنے لگیں۔ "چینی بیگم تو سچ مچ

فرشتہ ہیں ۔"

"دیکھ لینا یہ مریں گی تو شہید ہوں گی۔" ایک عورت نے چپکے سے کہا اور مارے خلوص کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اصیل خاندان کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، ورنہ کون اپنی محنت کا پیسہ دوسروں کے آرام پر خرچ کرتا ہے ۔"

"م احاطے کا مالک تو ایسا کنجوس ہے کہ ایک ہینڈ پمپ لگوا کر نہ دیا۔ کہہ کہہ کر زبان تھک گئی ہمیشہ یہی ٹکا سا جواب دیا کہ سارے لوگ چندہ کر کے لگوالو ___"

"میں نے کہا ______ ایک عورت کچھ کہتے کہتے رُک گئی کیونکہ مستری اپنا تہمد جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔

چینی بیگم نے جھک جھک کر مستری کے کام کو دیکھا اور پھر نیفے میں کسے ہوئے بٹوے کو نکال کر دام گننے لگیں۔

"لو میاں یہ چار روپے گن لو۔" چینی بیگم نے انتہائی سنجیدہ والے انداز سے روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔"

"پانچ روپیہ سے ایک پیسہ کم نہ ہوگا۔" مستری نے چاروں روپے چینی بیگم کی مٹھی میں ٹھونس دیئے۔

بڑی دیر تک روپوں کی ہیر پھیری ہوتی رہی۔ احاطے کی ساری عورتیں چینی بیگم کی حمایت میں مستری کو جلی کٹی سناتی رہیں۔

"لو جی ہم ہینڈ پمپ اکھیڑے دیتے ہیں۔ ہمیں ایک پیسہ نہیں چاہیئے۔" مستری عورتوں سے ہار مانتے ہوئے بڑی بیدردی سے ہینڈ پمپ کی طرف بڑھا۔ دیے کچی منڈیر پر اس طرح پھینکے کہ نشان پڑ گئے۔

"اے ظالم لے اپنا روپیہ۔" چینی بیگم نے بوکھلا کر بٹوے سے آخری روپیہ بھی نکال دیا اور

اور پھر ٹوا جھاڑ کر نیفے میں اڑیس لیا۔

مستری کے جاتے ہی چنی بیگم دھپ سے ہینڈ پمپ کے پاس بیٹھ گئیں۔ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا دیئے۔

"چنی بیگم کی تو نے ہی عزت رکھی ہے۔ کسی کی محتاجی نہ دی۔ قربان جاؤں تیری ذات کے"
چنی بیگم نے پھیلے ہوئے ہاتھ سمیٹ کر آنسو پونچھ لئے۔ اس وقت پرندے بسیرے کی تلاش میں سرپٹ اُڑے چلے جا رہے تھے۔

چنی بیگم اللہ تم کو جنت میں جگہ دیگا کیسے تیری میری کوٹھیوں کے چکر کاٹنے پھروں، خانساموں کے دھکے کھاتے جب کہیں ایک گھونٹ پانی نصیب ہوتا۔ اتنی اتنی دور سے پانی لاتے میں شانے ٹوٹ جاتے۔"

عورتیں پھر قصیدے شروع کر رہی تھیں مگر ڈراتی ہوئی رات نے انہیں خاموش کر دیا۔ وہ سب ڈھنڈیا چولہے کی فکریں بھاگیں۔ مگر بچے اسی طرح منڈلاتے رہے۔ چنی بیگم نے بچوں کو ڈرانے کے لئے ایک پتلی سی چھڑی اُٹھالی اور ہینڈ پمپ کے پاس کھاٹ ڈال کر لیٹ گئیں۔ لڑکے تو ویسے ہی کسی کا رعب نہ مانتے اس کمزور سی چھڑی سے کیا ڈرتے۔ پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ اس وقت وہ اس عجیب وغریب چیز میں ہاتھ نہ لگا رہے تھے۔ یوں ہی ہینڈ پمپ کے پاس کھڑے آپس میں دھکم پیل کرتے رہے۔ چنی بیگم برابر چھڑی ہلاتی رہیں۔ مگر لڑکے بھی اس وقت سرکے جب بھوک بری طرح ستانے لگی۔

چنی بیگم نے ساری رات آنکھوں میں گزاری۔ خوشی اور خطرے دونوں ہی نے نیند تھیالی تھی۔ کتا بھی پاس سے گزرتا تو اُچھل کر چھڑی والا ہاتھ اونچا کر دیتیں۔ کتے پر بھی شریر لڑکے کا شبہ ہوتا، ارے ہاں کہیں چپکے سے نہانے نہ آگیا ہو۔ ہے ناس جائے کمبخت کا کہیں منڈیر پر چڑھ کر پیشاب نہ کر دے۔

چھڑی ہاتھ میں لے کر وہ کتے کو احاطے سے باہر نکال آتیں۔ مگر ذرا ہی دیر بعد

ایک چھوڑ کئی کئی کُتے گشت کرنے آجاتے۔ اس پر غضب یہ کہ ادھر چاند اُبھرا اور ان کمبختوں نے مُنہ اُٹھا اُٹھا کر رونا شروع کر دیا۔ چنی بیگم یہ سوچ کر تڑپ اُٹھیں کہ ابھی نیا نیا ہینڈ پمپ لگا ہے اور یہ کُتے رو رو کر نحوست پھیلا رہے ہیں۔

وہ بڑے جوش سے اُٹھیں اور کتوں کی اس قسط کو بھی احاطے سے باہر نکال آئیں تھوڑی دیر تک تو وہ کُتوں کی واپسی کا انتظار کرتی رہیں۔ پھر مطمئن ہو کر اپنی دانائی پر عش عش کرنے لگیں۔ لو بھلا یہ روپیہ بھی بیٹھے بیٹھے کھا جاتے تو پھر کیا ہوتا۔ اس کُٹھیا نے تو کہیں کا نہیں رکھا۔ کچھ دن محلہ لوگ اپاہج سمجھ کر ٹکڑا روٹی ڈالنے لگتے۔ اب عزّت تو رہ گئی۔ کوئی محتاج تو نہ کہے گا —— اُنہوں نے بڑے فخر سے آسمان کی طرف دیکھا —— "صدقے جاؤں تیرے مولا، چنی بیگم نے ہمیشہ اپنی محنت کی کمائی کھائی ہے ——"

چنی بیگم نے تو اس وقت سے اپنی محنت سے پیٹ بھرنا سیکھا تھا جب وہ دس گیارہ سال کی تھیں۔

بیوہ اماں حویلی میں کھانا پکاتیں تو چنی بیگم جھوٹن جُوٹھے برتن مانجھ دھو کر رکھ دیتیں۔ ان کی اماں کو چنی بیگم سے عشق تھا۔ وہ بڑے فخر سے کہتیں کہ اگر چنی بیگم نہ ہوتی تو وہ اس بڑھاپے اور گٹھیا کے مرض میں بھوکی مر جاتیں۔

چنی بیگم یُوں ہی محنت کرتے کرتے ایک دن چونک پڑیں۔ پتہ چلا کہ سُہانے خواب دیکھنے کا زمانہ دل کے آس پاس دھڑک رہا ہے۔ انہیں دنوں حویلی میں بٹیا بیگم کی شادی ہوئی تھی ایک دن وہ چائے لے کر کمرے میں گئیں تو بٹیا بیگم اپنے میاں کے زانو پر سر رکھے ٹھنک رہی تھیں۔ چنی بیگم کو دیکھ کر ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ اس دن چنی بیگم کا جی چاہا کہ وہ کسی کا سہارا لے کر پڑی رہیں کیسی تھک گئی تھیں۔

ان کی اماں نے کنکھیوں سے دیکھ کر تاڑ لیا کہ چنی بیگم کا جی کام کاج سے اچاٹ ہو رہا ہے اُنہوں نے دو چار دن بھاگ دوڑ کی اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کر دیا۔

سسرال جاکر چنی بیگم کا دل ٹوٹ گیا۔ زانو پر سر رکھنے کی تمنّا ایک طرف رہی وہاں تو
بھس بھرا تکیہ بھی نہ ملا۔ میاں چنڈو کا شیدائی ملا۔ سارا دن اونگھتا اور پھر اپنی اماں کے پلّو کی
اوٹ میں چھپ کر مفت کی روٹیاں توڑتا۔

میاں کے نکھٹّو پن کے طعنے چنی بیگم کو برداشت کرنے پڑتے۔ وہ سارا دن محنت کرتی سب
کی خدمت ہوتی پھر بھی جب دو نوالے اُٹھانے بیٹھتیں تو ساس نندوں کا کلیجہ جل جاتا۔
ایسے بڑے بڑے نوالے نگل رہی ہے جیسے اپنے خصم کی کمائی ہو۔

چنی بیگم سب کچھ سُنتیں اور گھٹنوں میں سر دیئے کھانا زہر مار کرتی رہتیں۔ چالیس (۴۰) سال
کے مرد کی تمام بُرائیاں چنی بیگم کے سر تھوپ دی گئیں۔ اِن پر کسی کو رحم نہ آتا۔

اماں باوا نے تو کس لاڈ سے چنی بیگم نام رکھا تھا۔ مگر سُسرال میں ساس۔ نندوں اور
جٹھانی نے چنیا کر دیا۔ جٹھانی اپنے تین سال کے ہٹے کٹے لونڈے کو گود میں لئے دودھ پلاتی
رہتی۔ پیاس لگتی تو چنی بیگم پر حکم چلاتی۔ کماؤ میاں کی بیوی تھی اِس لئے ساس نندوں کی بھی
چہیتی تھی۔ چنی بیگم نے کیا کیا چاہا کہ اِن کا میاں نشہ کرنا چھوڑ دے۔ اپنے بڑے بھائی کی طرح
کام سے لگ جائے مگر میاں ایسی باتیں سُنتا تو انتہائی بیزاری سے اُونگھنے لگتا۔

چنی بیگم نے ایک بار بہت واسطے دیئے تو اِس نے دو وقت چنڈو کا ناغہ کر دیا۔ مگر
حالت یہ رہی کہ آنکھیں بند کئے فراق جاناں میں پڑا رہا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ساس
نے جو اپنے بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو چنی بیگم کے پیچھے پڑ گئیں۔

اری منحوس میرے لال کو کھا لیگی یا اسے جیتا نہ چھوڑیگی۔ اماں نے کمربند سے چوّنی کھول
کر اپنے لال کو پکڑا دی اور دھکے دیکر باہر بھیج دیا کہ کچھ کھا پی آئے۔

اُس دِن چنی بیگم آپے سے باہر ہو گئیں۔ ایسی ایسی سُنائیں کہ لوگوں نے کانوں پر ہاتھ
دھر لئے۔ وہ فریاد کی کہ سُننے والوں کے دِل دہل گئے

ساس نندوں نے جب دیکھا کہ چنی بیگم تو ہاتھوں سے نکل گئیں تو اس وقت انہیں

چوٹی سے پکڑ کر گلی میں پھینک دیا اور چینی بیگم زبردستی پھر سے گھر میں جا گھسیں اور گھنے گھنے کوسنے دیتی اپنے جہیز کا لوٹا کٹورا اور صندوقچہ اُٹھا باہر آ گئیں۔ جب وہ روتی پیٹتی چلیں تو قدم خود بخود اسی حویلی کی طرف اُٹھنے لگے جہاں آٹھ سال تک اِن کی اماں کھانا پکاتی رہی تھیں۔

زار و قطار روتی دھوتی چینی بیگم حویلی کی دہلیز پر جا بیٹھیں۔ بڑی بیگم نے جو انہیں اس حال میں دیکھا تو مارے وضع داری کے تخت سے اُتر کر خود ہی دوڑیں۔

ہے یہ تو اپنی شبراتن کی لونڈیا ہے۔ آخر ہوا کیا؟ بڑی بیگم نے بلک کر پوچھا اور چینی بیگم نے شروع سے آخر تک سارا حال کہہ سُنایا۔

بس اس وقت سے چینی بیگم نے اپنی ماں کی جگہ سنبھال لی۔ باورچی خانے کی الماری میں اپنے جہیز کا لوٹا کٹورا وغیرہ رکھ کر کام میں جُٹ گئیں۔

رات کھانا پکا کر جب چینی بیگم صحن میں آکر بیٹھیں تو ٹھنڈی ہوا اور کھلی ہوئی چاندنی میں میاں یاد آ گیا۔ ادھر پیٹ میں بھی کوئی ننھی سی جان پھڑکتی ہوئی معلوم ہوئی۔

"لے پلنگ ڈال کر لیٹ رہو چینی بیگم۔ بھوک لگی ہو تو پہلے ہی کھالو۔ اِس حالت میں بھوک بہت لگتی ہے۔" خاندانی بیگم نے جب پیار سے ذرا یوں کہے تو چینی بیگم خوشی سے نڈھال ہو گئیں انہیں پہلی بار احساس ہوا کہ محنت کر کے پیٹ بھرنے میں کیا سُکھ نصیب ہوتا ہے۔ میاں کی یاد کو اُنہوں نے کُتے کی طرح دھتکارنے کی کوشش کی۔

"ارے اِس رشتے کا کیا بس مُنہ دیکھنے کی محبت ہوتی ہے۔"

چینی بیگم نے حویلی میں دس سال گذار دیئے۔ لڑکا پونے دس سال کا ہو گیا۔ بیگم نے مارے باندھے دس۔ پارے بھی پڑھا دیئے۔ چینی بیگم کی اماں کب کی مر گئیں۔ میاں نے دوسری شادی کر لی تھی ۔ اس کے مرنے کی خبر بھی ملی تھی۔ ایک بار میاں کو سڑک پر بھی دیکھا تھا جھوم جھامتے کہیں چلے جا رہے تھے۔ چینی بیگم قریب ہی کسی دکان پر کھڑی ترکاریاں

خرید رہی تھیں۔ کلیجے میں ہُوک اُٹھی مگر جلد ہی قابو پا لیا۔ پھر بھی گھر آئیں تو لڑکے کو سینے سے لگا کر دیر تک روتی رہیں۔ بیگم صاحبہ نے بڑی مشکل سے تسلّی دے کر چُپ کرایا۔

زمانہ کتنی تیزی سے گزر رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کے دانت ٹوٹنے لگے۔ چنی بیگم کا لڑکا جوان ہو گیا تھا۔ بڑے سرکار نے اسے اپنی دکان پر نوکر رکھ لیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے ایک اچھے نان نقشے کی یتیم لڑکی تلاش کر کے لڑکے کا نکاح بھی کرا دیا تھا اور چنی بیگم کا صاف ستھرا چہرہ باورچی خانے کی دھوائی ہوئی دیواروں کا ایک ٹکڑا معلوم ہونے لگا تھا ——

بہو کے آتے ہی جانے کیوں چنی بیگم کا دل اچاٹ ہو گیا۔ بہو سے کلیوں نفرت ہو گئی۔ بیگم صاحبہ کو جو کام ہوتا بہو کو آواز دیتیں۔ اِدھر بہو تھی کہ گھونگھٹ اُلٹ کر ساس کے کاموں پر پل پڑتی۔ چنی کو نفرت بس اِس وجہ سے تھی۔ بہو اُن کا حق چھین رہی تھی۔ بیگم صاحبہ اسے شہ دے رہی تھیں۔

چنی بیگم کو ہر وقت یہ خیال ستاتا کہ بہو ذرا ہاتھ بٹا لیتی ہے تو یہی سمجھے گی کہ اپنی محنت کی کمائی کھلا رہی ہے۔

شروع شروع میں تو وہ اسے صرف جھڑکتی رہیں۔ پھر زبان گالیوں پر کھل گئی۔ بہو کٹورا سی آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے دیکھتی اور کونوں میں مُنہ چھپا چھپا کر روتی۔ اِدھر بیگم صاحبہ کا یہ حال کہ ساری توجہ کا مرکز جوان جہان بہو تھی۔ بس منٹوں میں بیگم صاحبہ کے سارے کام کر ڈالتی۔ بیگم صاحبہ کو تو جیسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ گھر میں چنی بیگم بھی ہیں۔ کبھی بھولے سے چنی بیگم کو آواز دے لی تو جلدی سے کہتیں کہ تم نہیں بہو کو بھیجو۔ چنی بیگم انگاروں پر لوٹنے لگتیں۔

انہیں دِنوں اُنہوں نے سنا کہ میاں مر گئے۔ چنی بیگم نے اپنے ہاتھوں میں پڑی ہوئی دو نوں موٹی موٹی چوڑیوں کو بٹّے سے توڑ دیا۔ اس دِن اُنہوں نے کوئی کام نہ کیا۔ سارا دن کوٹھری میں پڑی رہیں۔ جانے کون کون سی حسرت ناک باتیں یاد آتی رہیں۔

بہو کھانا لے کر آئی تو اپنی حسرتوں کی ساری پھٹکار بہو پر برسا دی۔ اتنی گالیاں دیں،

کہ بہو کو بیگم صاحبہ کے پاس بھاگتے بن پڑی۔

بیگم صاحبہ نے سمجھا کہ چینی بیگم کا دماغ چل گیا ہے۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے سمجھا بجھا کر صلاح دی کہ اب چینی بیگم اللہ اللہ کریں اور بہو کو خدمت کرنے دیں۔

چینی بیگم کے دل کو دھکا سا لگا مگر انہوں نے سوچا کہ چلو اچھا ہوا جو بات صاف ہو گئی۔

"اللہ کسی کا محتاج نہ کرے بیگم صاحب"۔۔۔ چینی بیگم نے بھی دو ٹوک بات شروع کر دی۔

"کھائیں گے تو اپنی محنت کا، نہ بہو کے بھلے۔ میں آپ کے کام کی نہیں رہی تو بیشک بہو سے خدمت لیں۔ میں کہیں اور کما کھاؤں گی۔

"ابھی تو ہڈیوں میں اتنی طاقت ہے کہ دس کو کھلا کر کھاؤں۔ لیجئے، اب اجازت دیجئے، چینی بیگم آپکو یاد رکھیگی۔"

چینی بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بیگم صاحبہ ہائیں ہائیں کرتی رہیں مگر وہ اپنے جہیز کا لوٹا کٹورا اور صندوقچہ بغل میں داب باہر نکل کھڑی ہوئیں۔

بہو ننگے پاؤں گلی تک بھاگی۔ بیٹا اسٹیشن تک ساتھ ساتھ گیا مگر چینی بیگم کا دل نہ پسیجا انہیں تو اس شہر تک سے نفرت ہو گئی تھی۔ لاہور جانیوالی گاڑی تیار تھی وہ ٹکٹ لے کر بیٹھ گئیں۔

لڑکا برابر منتیں کرتا رہا۔ واسطے دیتا رہا مگر چینی بیگم نے ایک نہ سنی۔ نیفے میں کسے ہوئے بٹوے کو نکال کر دس کا ایک نوٹ لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"ارے چل بڑا آیا میری فکر کرنے والا۔ بیگم کے کام کی نہیں رہی۔ چار دن میں تیری عورت محتاجی کے طعنے دیکر جوتیاں لگائیگی۔ ان روپوں سے کپڑے بنوا لیجیو۔ لتے لگائے پھر رہا ہے۔ بھلا تیری کمائی میں ایسی برکت کہاں جو تن بھی ڈھک سکے"۔ لڑکے کے صاف ستھرے ثابت کپڑے انہیں لتے معلوم ہو رہے تھے مگر لڑکا تو جیسے کچھ دیکھنے اور سوچنے کے موڈ ہی میں نہ تھا۔ بس چینی بیگم کو گاڑی سے اتارنے کی دھن سوار تھی۔

گاڑی چلی تب بھی لڑکا ساتھ ساتھ دوڑتا رہا۔ ایک ذرا دیر کے لئے چینی بیگم کو ایسا

محسوس ہوا کہ گاڑی کے سارے پہیے اِن کے کلیجے پر سے گزر گئے ہیں۔

گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ گئی تو لڑکا وہیں سرے پر کھڑا پسینہ پونچھتا رہا۔ چنی بیگم کھڑکی سے سر نکالے راستے دیکھتی رہیں۔ کئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے مگر وہ اس طرح پلیٹ فارم کے سرے کو تکتی رہیں۔

لاہور آکر کئی دن تک شہر کے اندرونی حصے میں دھکے کھاتے پھریں۔ گھر گھر جھانکیں مگر کوئی نوکری کی بات نہ کرتا جس گھر میں جاتیں وہاں بیویاں کاموں میں جُتی نظر آتیں۔

چنی بیگم کا جی جل کر خاک ہو جاتا تو بھلا جب بیویاں نوکروں کے کام کرنے لگیں تو پھر اس دُنیا میں کیا رہ گیا۔ نقیرنیوں جیسے مزاج ہیں یہاں کی بیگموں کے۔ اپنی دِلی کی کیا بات ہے۔

چنی بیگم کئی دن تک اپنی دِلی کی یاد میں پھڑکتی رہیں اور پھر گھومتی گھامتی شہر کے اس حصے میں آ گئیں جہاں ہر طرف ر..ن اور خاموشی کا ڈیرا پڑا ہوا تھا۔ کوٹھیوں کے پھاٹک کھلے ہوئے تھے اور کہیں کہیں آیائیں بچوں کو لئے ٹہل رہی تھیں۔ چنی بیگم نے آخر بڑی احتیاط کے ساتھ ایک کوٹھی کے پھاٹک میں قدم رکھ ہی دیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے آیا سے گاڑھی چھنانے لگیں۔ ذرا ہی دیر میں انہیں سب حال چال معلوم ہو گیا، تنخواہیں اچھی ہیں کام زیادہ نہیں بالائی آمدنی بھی ہو جاتی ہے، خانساماں سے دوستی گانٹھ لو تو اپنے گھر جیسا کھانے پینے کا مزہ آجاتا ہے۔

چنی بیگم اِن باتوں کو سُن سُن کر دِل ہی دِل میں گناہوں کی معافی مانگتی رہیں۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ کسی سے جان پہچان کے بغیر نوکری ملنی بھی تو مشکل تھی۔ آیا نے ان سے وعدہ کر لیا کہ جلد ہی اچھی سی کوٹھی دلا دیگی۔ مگر یہ وعدہ کرتے ہوئے گود کے ننھے سے بچے کو ایک زور کا تھپڑ لگا بیٹھی۔ بچے نے خواہ مخواہ رونا شروع کر دیا تھا۔

چنی بیگم نے آیا کی گود سے بچے کو چھین لیا۔

"موئی آیا ہو کر بیگموں کے بچے پر ہاتھ اُٹھاتی ہے۔ نمک کھا کر یہ نمک حرامی —"

چینی بیگم بچے کو پٹائے کوٹھی کے اندر داخل ہو گئیں۔ بیگم صاحبہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی آرائش میں مصروف تھیں۔ چینی بیگم نے بچے کو ان کی گود میں بٹھا دیا۔

"ایسے زور سے تھپڑ مارا ہے کہ اب تک کلیجہ کانپ رہا ہے میرا۔ کیا اس بانجھ کے آگے اولاد نہیں؟" چینی بیگم غصے سے بپھری ہوئی تھیں۔ بیگم نے انہیں اچھی طرح بٹھا کر حال پوچھا اور پرانی آیا کو اسی وقت جواب دیکر چینی بیگم کو رکھ لیا۔ چینی بیگم نے لاکھ کہا کہ یہ نوکری نہ کروں گی کسی کی روزی پر ڈاکہ نہیں ڈالنا ہے۔ مگر بیگم نے ایک نہ سنی۔ چند ہی دن میں چینی بیگم گھر کی مالکن بن گئیں۔ بیگم صاحبہ ہر بات میں ان سے مشورہ کرتیں۔ بچے اس طرح ہل گئے کہ ایک منٹ کو جان نہ چھوڑتے۔ باورچی خانے کی خبر لئے رہتیں۔ ہر ہفتہ نیا خانساماں رکھا جاتا۔ چوری اور بے ایمانی سے تو چینی بیگم کو دلّی بغض تھا۔ جب انسان اپنی محنت سے کما سکتا ہے تو پھر چوری کیوں کرے۔

بے ایمان آدمی کا مرتے وقت سور جیسا منہ ہو جاتا ہے۔ ہاں یہ بات بڑی بڑی کتابوں میں لکھی ہے۔ یہ چینی بیگم کے اقوالِ زرّیں تھے جو ہمیشہ بڑی بڑی کتابوں میں لکھے ہوتے۔

چینی بیگم مہینے کے مہینے اپنے لڑکے کو پانچ روپے کا منی آرڈر کراتیں اور ہر خط میں لکھاتیں کہ کلموہے لتے لگا کر نہ پھرنا۔ تیری کمائی میں ایسی کہاں کی برکت جتنے کی ضرورت ہو تو لکھ بھیجو۔ جواب میں لڑکا ایک ہی رٹ لگائے رکھتا کہ بس تم واپس آ جاؤ میں خدمت کروں گا۔ چینی بیگم خط پڑھوا کر ہنستیں ——

"کبھی کچھ بھیج نہ دیا یوں ہی محتاج بنا کر ایک کونے میں ڈالے دیتا رہا ہے۔ دھت تیری کی سسرے ——"

چینی بیگم یہاں بہت خوش تھیں۔ گھر سنبھالنے میں انہیں ذرا بھی دقّت نہ ہوتی۔ ہاں شروع شروع میں کوٹھی کے لان کی حفاظت میں بڑے جتن کرنے پڑے تھے۔ بات یہ تھی کہ اس جگہ کارپوریشن کے نل نہ لگے تھے۔ کوٹھیوں میں یا تو ہینڈ پمپ لگے تھے یا پھر ٹیوب ویل سے

پانی کا انتظام تھا۔ کمبخت۔ اِدھر اُدھر کے لوگ سنسان دوپہروں میں لان میں لگے ہوئے ہینڈ پمپوں سے پانی بھر لے جایا کرتے۔ چینی بیگم پھاٹک بند کر دیتیں تو لوگ باہر کھڑے گھگیایا کرتے۔ دو ایک بار تو پانی لے جانے والوں سے کُشتی تک کی نوبت آ گئی تھی۔

تو کیا کوئی سبیل لگی ہے۔ بیگم کی اجازت نہیں۔ کسی نے ہاتھ لگایا تو خیر نہیں۔

وُہ لوگ جو بغیر کسی مزاحمت کے پانی بھر لے جایا کرتے تھے اب انہیں اور دُور جانا پڑتا تو چینی بیگم کی صُورت سے نفرت ہو گئی تھی۔ انہیں ادھر سے گذرتے ہوئے چینی بیگم کو گھٹی گھٹی گالیاں دیتے۔

"ہُنھ۔ چینی بیگم مُنہ پھیر لیتیں۔ اپنی ماں بہنوں کو یاد کر رہے ہیں۔ ہمیں کیا۔ بیگم صاحبہ ان سے اس قدر خوش رہتیں کہ بس وہ تھی ان کی ایمانداری کی داد نہ دیتے بن پڑتی۔ چینی بیگم کے آنے سے پہلے تو یہ حال تھا کہ اِدھر دوپہر ہوئی اور لوگوں نے آ کر پانی بھرنا شروع کر دیا۔ نوکرانی سے دو چار مانگ لے کر مزے سے تماشہ دیکھتے۔ بچّے لان سے سارے پھُول توڑ لے جاتے۔ پودوں کو روند ڈالتے بیگم صاحبہ شام کو لان میں آتیں تو چیخ چیخ کر بُرا حال کر لیتیں۔ نوکر گھنے بن کر بیٹھ جاتے۔

کچھ دنوں سے چینی بیگم پیروں کی ہڈیوں میں ہلکا ہلکا درد محسوس کر رہی تھیں۔ کام کرنے کو جی نہ چاہتا۔ گھڑی بھر کپڑے دھونے بیٹھتیں تو گھٹنے جواب دے جاتے۔ بچے کو گود میں لے کر کھڑی ہوتیں تو بس یہی جی چاہتا کہ بیٹھ جاؤ۔ مگر وُہ ٹہلے جاتیں۔ ہر کام اس تندہی سے کرتیں بغیر کام کے تنخواہ لینا تو انہیں سُور کھانے کے برابر معلُوم ہوتا۔

درد جب ذرا زیادہ بڑھتا تو مارے دُکھ کے بھپر اُٹھتیں

"ارے کُتّے تُو ماں کی گود سے اُٹھ کر کہاں آ گیا۔ ناس جائے تیرا۔"

کوس کوس کر تھک گئیں مگر درد کا ناسور نہ گیا۔ ہاں درد نے گھٹنوں کا ناس مار دیا۔ کام تو یونہی پڑا رہتا مگر چینی بیگم سے کچھُ نہ ہوتا۔ بچے ان کی گود میں چڑھنے کو ہلکتے مگر ان سے اُٹھائے نہ جاتے۔ بیگم صاحبہ نے یہ حال دیکھا تو ان کا کلیجہ بھی پھٹ گیا۔ اُنہوں نے سمجھا کہ اب کاہلی سوار ہو رہی ہے۔ حرام کی روٹیاں کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ اُنہوں نے کچھ کہا تو نہیں مگر چینی بیگم سے

بے اعتنائی برتنی شروع کر دی۔

بے اعتنائی کے بعد بھی جب چنی بیگم کام سے جی چراتی رہیں تو بیگم صاحبہ کو بولنا ہی۔۔۔ "میں تو پہلے سے سوچ رہی تھی کہ اب کام چھوڑ دوں بیگم صاحبہ یہ گھٹنوں کا درد ایسا آن لگا ہے کہ کچھ نہیں کر پاتی۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ چنی بیگم مفت کی کھا کھا کر خوش ہوتی ہے۔ اس نے تو ہمیشہ اپنی محنت کی کمائی کھائی ہے"۔ چنی بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے " اب تک بچوں کی محبت نے روکے رکھا تھا۔ لیجئے اب رخصت کی اجازت دیجئے۔ میں دوسری عورت کا انتظام کر دوں گی"

بیگم صاحبہ ہائیں ہائیں کرتی رہیں۔ نوکرانی کا تو علاج کرانے کو بھی تیار تھیں مگر چنی بیگم نے ایک نہ سنی۔ دوسری عورت کا انتظام کر دیا۔ خود ہی گھر دکھایا کام سمجھایا۔ ڈانٹ ڈانٹ کر ہدایتیں دیں خبردار جو مسٹنڈے پانی بھرنے آئے۔ خیال رکھیو میرے ہوتے یہ باغیچہ پھولوں سے لدا ہے۔ میرے راج میں کسی نے ایک کٹورا پانی نہیں کھینچا۔

چنی بیگم اپنے جہیزی لٹا کٹورا اور صندوقچیا اٹھا آنسو پونچھتی گھر سے باہر نکل گئیں۔ ذرا دیر تک تو ایک گھنے درخت کی چھاؤں تلے بیٹھی ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی رہیں۔ پھر اٹھ کر احاطے کے مالک کی کوٹھی پہ چلی گئیں۔ مالک سے بات کر کے دو روپے پیشگی کرائے کے تھمائے اور کوٹھری کا تالا کھول کر سامان رکھ دیا۔ دو اڑھائی سو روپے ان کے پاس تھے۔ وہ برابر سوچ رہی تھیں کہ کسی سیانے سے علاج کرا کے مہینہ پندرہ دن میں ٹھیک ہو جائیں گی ——

احاطہ والے تو وہی جانے پہچانے لوگ تھے جو بیگم صاحبہ کی کوٹھی پر پانی بھرنے آتے۔ چنی بیگم کو دیکھ کر سب نے منہ پھیر لیا۔ چنی بیگم آپ ہی سب کی خیر خیریت پوچھتی پھریں تو سب کے دل صاف ہو گئے۔ ان بیچاری کا کیا قصور تھا یہ تو نوکر تھیں۔

چنی بیگم نے احاطے کے ایک حکیم کا علاج شروع کر دیا۔ بیس پچیس روپے خرچ ہو گئے مگر فائدہ خاک نہ ہوا۔ شہر میں جا کر کسی اچھے سے ڈاکٹر کا علاج کرنے کے لئے نہ تو روپیہ تھا نہ کوئی سہارا۔ ادھر کمبخت مرض چنی بیگم کو نیچا دکھانے پر تلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا تھا کہ لونڈی

کو خط لکھ کر بلالیں پھر فوراً اس خیال کو دھتکار دیتیں۔ بہو کمبخت جوتیاں لگائیگی۔ محتاجی کی زندگی سے خدا بچائے۔

زیادہ اداس ہوتیں تو کوٹھری سے نکل کر گھنے درخت کی چھاؤں تلے آ پڑتیں۔ احاطے کی عورتیں جمع ہو جاتیں اور ان کے دانشمندانہ اقوال پر سر ہلاتی رہتیں۔ چنی بیگم کو تو دنیا بھر کے معاملات میں دخل تھا۔

دن گذرتے گئے اور چنی بیگم کے مرض میں فائدہ نہ ہوا۔ ان کے گھٹنے سوج گئے تھے۔ اب تو ان سے اپنی روٹی بھی نہ پکائی جاتی۔ احاطے کی بیوہ شبراتن سے بڑا یارانہ تھا۔ شبراتن کو چار چھ آنے مہینہ دیکر اپنی روٹی پکوالیتیں۔ وہی چنی بیگم کے لئے ایک بالٹی پانی لا دیتیں جسمیں کئی کئی دن گذارہ کرتیں۔

بیکاری نے جمع جتھا میں سیند لگا دی تھی مگر چنی بیگم کو اُمید تھی کہ وہ اچھی ہو کر اس سے زیادہ کمالیں گی۔ وہ ضرور اچھی ہوں گی۔ آرام کرنے کی خاطر وہ سارا سارا دن دھوپ میں پڑی سوجے ہوئے گھٹنے سینکتی رہتیں۔ مرض کو دور کرنے کے لئے ساری دعائیں پڑھتی رہتیں۔

ان ہی دنوں انہوں نے سنا کہ پاکستان بن گیا ہے۔ ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں مسلمان پاکستان آ رہے ہیں۔ دلی لٹ گئی وہاں کے دو چار آدمی بھی کیمپ سے سیدھے احاطے میں آ پڑے۔ لڑکے کے لئے پوچھا تو سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ چنی بیگم کا دل ٹوٹ گیا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ بہو نے لڑکے کو پاکستان آنے سے روک لیا ہوگا۔ ڈرتی ہوگی کہ ساس کو ٹکڑا روٹی نہ دینا پڑ جائے۔ اس خیال کے آتے ہی انہوں نے بہو کو جی بھر کر گالیاں دیں اور گھنٹوں روتی رہیں۔ ایک نامعلوم سا سہارا تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ محتاجی کا بھوت ان کے سامنے طرح طرح سے ناچ رہا تھا اور چنی بیگم بڑی بے بسی سے اس خونی رقص کو دیکھنے سے انکار کر رہی تھیں۔ اب تو انہوں نے علاج کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ باقی ماندہ روپوں کے بٹوے کو سینے سے لگائے پھرتیں۔

انہیں دنوں احاطے کی آبادی بڑھ گئی۔ کوئی کوٹھری خالی نہ دکھائی دیتی۔ لوگ پانی کیلئے دھکے

کھاتے پھرتے۔ ایک ایک بالٹی پانی کے لئے دُور دُور تک جانا پڑتا۔ ایک دن چینی بیگم کئی گھنٹے پیاسی پڑی رہیں۔ مئی کا مہینہ تھا۔ لوگ پانی کی قلت سے بلبلائے پھرتے۔ انہی دنوں چینی بیگم کی سمجھ میں یہ ترکیب آئی۔

اپنے ایک معتبر دلی والے سے مشورہ کر کے تیس روپے اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے کہ پرانا ہی ہینڈ پمپ خرید کر لگوا دے۔ اس کام کے بعد چینی بیگم سجدے میں گر گئیں اور رو رو کر خدا سے دُعا کرتی رہیں کہ انہیں ساتھ عزّت کے دُنیا سے اُٹھائیو ——

صُبح چھاؤنی کی طرف سے کوچ کا بگل بجنے کی آواز آ رہی تھی اور کہیں قریب کی مسجد میں موذّن آذان دے رہا تھا۔ چینیا بیگم بڑی سرشاری کے عالم میں اُٹھیں اور ہینڈ پمپ کی دستی گھمائی۔ سفید سوٹی سی دھار پکّے فرش پر بہ گئی۔ اُنہوں نے بڑے چاؤ سے کُلّی کی۔ مُنہ ہاتھ دھویا اور خالی پیٹ میں دو گھونٹ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پی لیا۔

بیگم کے ہینڈ پمپ کا پانی بھی اتنا ٹھنڈا نہ تھا — اُنہوں نے بحد مسرت سے سوچنا شروع کیا اور شبراتن جو پانی لاتی تھی وہ تو بالکل اوشا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ پانی تو اسے کہتے ہیں —— چینی بیگم نے بڑے غرور سے ہر طرف دیکھا۔ کوٹھڑیوں کے آگے بچھے ہوئے پلنگوں پر لوگ اب تک سوئے پڑے تھے۔

کمبختوں کی روزی میں اس لئے برکت نہیں ہوتی۔ اذان کے وقت موت کی نیند سوئے رہتے ہیں چینی بیگم اپنے بستر پر بیٹھ گئیں۔ صُبح آج بھی ہمیشہ کی طرح تھی مگر انہیں تو آج اللہ کا نُور برستا ہُوا دکھائی دے رہا تھا۔

ذرا دیر بعد احاطے والے جاگ پڑے۔ پہلا کام یہی تھا کہ سب بالٹیاں اور گھڑے اُٹھائے ہینڈ پمپ کی طرف بھاگے۔ مردوں کو جلدی تھی کہ آج تو وہ نہا دھو کر ہی مزدوری پر جائیں گے۔ ادھر عورتوں کو ہانڈی چُولھے کی فکر سب ایک دُوسرے سے آگے آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گھر وہی چینی بیگم نے پہلی ہی بالٹی کو پکڑ لیا — یہ عمر آگئی۔ نہ کبھی کسی کا مُفت کھایا پیا نہ

کھلایا۔ روپیہ مہینہ لگالو۔ جتنا پانی چاہو بھرو۔ مگر یہ خیال رہے کہ لونڈے نہیں نہائیں گے ادھر منڈیر ٹوٹ جائیگی ہاں۔

قطار سے آگے بڑھی ہوئی بالٹیاں آپس میں ٹکرا کر جہاں کی تہاں رہ گئیں۔

کیا کہا چینی بیگم ؟ ارے کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ ایک روپیہ مہینہ کدھر سے لائیں مزدور آدمی بھلا کوئی پانی بھی بیچتا ہے۔

لو پانی تو اپنی حکومت تک بیچتی ہے۔ شہر کے اندر سب پانی کا کرایہ دیتے ہیں کہ نہیں یہاں مفت کی بات نہیں چلیگی۔ لگوا لیتے نہ تم لوگ اپنا ہینڈ پمپ۔ ایک ایک روپیہ پیشگی جمع کرادو سب لوگ۔

چینی بیگم نے مستری کو روپے دینے کے بعد بٹوا جھاڑ کر رکھا تھا۔ صبح صبح پانی پیا تھا جو خالی معدے کو جیسے کاٹ رہا تھا۔ مگر چینی بیگم محسوس نہ کر رہی تھیں اپنے ہینڈ پمپ کا پانی جو تھا ویسے آج تو انہیں جوڑوں کا درد بھی نہ محسوس ہو رہا تھا۔

صرف چار روپے چینی بیگم کے بستر پر گرے اور چار بالٹیاں پانی سے بھرنے لگیں۔ باقی تمام لوگ احاطے سے باہر سڑک کی طرف چل دیئے۔ چینی بیگم نے چاروں روپے بٹوے میں رکھ لئے۔

ہاں ہاں جاؤ خوب بھرو پانی اللہ طاقت دے تو میل میل سے لے کر آؤ۔ کوئی خوشامد تھوڑی کر رہا ہے کہ ہمارے ہینڈ پمپ سے پانی بھرو۔ ارے دیکھو پانی میں خود بھروں گی۔ تم لوگ بالٹی زور سے رکھتے ہو۔ سیمنٹ اکھڑ جائیگی اور چینی بیگم بھی ہاتھ ہلائے بغیر روٹی کھانے کی نہیں۔

"آج کل دنیا میں کوئی فرشتہ نہیں۔ سب شیطان بستے ہیں۔ پانی بیچے گی۔ بڑی آئی بیگم بن کر"
—— عورتیں جب پانی لے کر احاطے میں واپس آرہی تھیں تو زور زور سے باتیں کر رہی تھیں تاکہ چینی بیگم بھی سن لیں۔

بچے سارا دن ہینڈ پمپ کے گرد منڈلاتے رہے۔ وہ چپچپاتے ہوئے جسموں کو کھجا کھجا کر للچائی نظروں سے ایک سان دیکھتے جاتے پر چینی بیگم کا پہرہ بڑا کڑا تھا۔

چینی بیگم سارا دن ہینڈ پمپ کے پاس بیٹھی رہتیں ۔ وہیں کھانا کھاتیں وہیں پلنگ ڈال کر سوتیں پھر بھی ہر وقت خطرہ رہتا کہ کہیں کوئی مفت میں پانی نہ بھر لے جائے۔ کہیں لڑکے نہانا نہ شروع کر دیں ۔ وہ تو کہو ہینڈ پمپ پر گھنے درخت کا سایہ تھا ورنہ مئی کی دھوپ میں پگھل کر ہینڈ پمپ کے پانی کی طرح بہہ جاتیں۔

چینی بیگم کو چار روپوں نے رنجیدہ کر دیا تھا ۔ بھلا اسمیں کیا کھائیں گی اور کیا پہنیں گی کس طرح اس موذی مرض کا علاج کریں گی۔ حکیم الگ لالچ دے رہا تھا کہ گٹھیا کی ایک بڑی اچھی دوا ایجاد کی ہے بس پندرہ روپوں کی ضرورت ہے۔

ہینڈ پمپ لگے بیس پچیس دن ہو گئے ۔ چاروں روپے ختم ہو گئے ۔ دوسرے دن کھانے کو آٹا بھی نہ تھا ۔ چینی بیگم پھر بھی مایوس نہ تھیں ان کا خیال تھا کہ لوگ ضد کر رہے ہیں ۔ کچھ دن بعد آپ ہی عقل آ جائیگی ۔ کہاں تک تیری میری کوٹھیوں کے دھکے کھائیں گے۔

آج چینی بیگم نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا ۔ جب بھوک زیادہ ستاتی تو پاس رکھے ہوئے المونیم کے کٹورے میں تازہ ٹھنڈا پانی بھر کر پی لیتیں۔

"آہ ہائے کیا ٹھنڈا پانی ہے" — وہ لمبی سی ڈکار لیتیں" اور یہ ہیں ناشکرے کہ ایک روپیہ مہینہ دیتے میں جان نکلتی ہے"

شام ہوتے ہوتے چینی بیگم بھوک سے نڈھال ہو گئیں پھر بھی چار روپوں کے بدلہ میں اُنہوں نے رات کے نو بجے تک آخری بالٹیاں بھریں۔

رات جیسے تیسے سو کر گذر گئی۔ صبح جب چاروں گھروں والے پانی بھرانے آئے تو چینی بیگم نے آنکھیں بھی نہ کھولیں ۔ اُنہوں نے اُٹھنا چاہا تو ہلا بھی نہ گیا۔

آج تم خود بھر لو میاں ۔ ایک دن کا پانی میں مفت بھر دوں گی ۔ اُنہوں نے مری سی آواز میں کہا۔

صرف شبراتن کو معلوم تھا کہ روٹی نہ ملنے سے یہ حال ہے ۔ اس نے لاکھ چاہا کہ چینی بیگم اس کے گھر کی روٹی کھالیں مگر وہ رحم کی یہ بھیک کس طرح قبول کرتیں۔

ذرا ہی دیر میں احاطے والوں کو معلوم ہو گیا کہ چینی بیگم بھوکی ہیں۔ وہ گھر محض اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہمدردی کا جامہ پہن کر آ گئے۔ چینی بیگم کو جیسے ہی دو روپے ان میں ایکدم جان آ گئی اٹھ کر جلدی جلدی پانی بھرنے لگیں۔

پانی بھر کر شبراتن کو روپے دیئے کہ آٹا وغیرہ لے آئے۔

سات روپوں سے آگے نہ بڑھے۔ چینی بیگم کے گھٹنے سوج کر چمکنے لگے تھے۔ جانے کتنی مدت سے علاج نہ ہوا تھا۔ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی تھیں۔ بس بیٹھے بیٹھے ہتھی چلاتی رہتیں۔

جون کا آخری مہینہ تھا۔ لونڈے گرمی سے بلبلا کر ہینڈ پمپ پر ہلّا بولتے مگر چینی بیگم کا پہرہ سخت تھا۔ مجال تھی جو ہل جاتیں۔ ایسا لگتا کہ مستری انہیں بھی وہیں گاڑ گیا ہے۔

اے مردودو اپنی اماں سے کہو کہ روپیہ مہینہ دیں۔ پھر خوب پانی بھر بھر کر نہلاؤں گی۔ ایسا ٹھنڈا مزیدار پانی ہے۔ کیسا میل بھرا ہے جسموں پر۔ چینی بیگم لڑکوں کو بھڑکاتیں مگر ان پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا۔ یوں ہی کھڑے منڈلایا کرتے۔

آج لڑکوں کا موڈ بہت خطرناک ہو رہا تھا۔ وہ سب لنگوٹیاں کس کر آئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ مائیں اونگھ رہی تھیں۔ لڑکے ہینڈ پمپ پر ٹوٹ پڑے۔ چینی بیگم انہیں دھکّے مار مار کر تھک گئیں۔ کشتی تک کی نوبت آ گئی۔ مائیں کوستے سُن کر دوڑیں۔ لڑکوں کو ڈانٹا مگر اس طرح جیسے شہ دے رہی ہوں۔ لڑکے ٹھاٹھ سے نہا رہے تھے۔ ایک ہتھی گھماتا اور چار چار پانی کی دھاریں پلے پڑتے۔

اب لاؤ آنہ آنہ دو۔ دور سے کھڑی تماشہ کیا دیکھ رہی ہو۔ چینی بیگم کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی تھیں۔

ہم کہاں سے لائیں۔ نہانے والوں سے لو۔ روک کیوں نہیں لیا۔ لڑکوں کے جسموں سے چکنائیں دھل رہا تھا ماؤں کے سینے سے غبار چھٹ رہا تھا۔ کب سے نہیں نہلایا تھا کمبختوں کو۔ اس کے بعد تو چینی بیگم کا پہرہ کمزور پڑ گیا۔ لڑکوں کو راہ سوجھ گئی تھی اور وہ مردوں کو بھی

راستہ مل گیا تھا۔ لڑکے دوپہر میں ٹھاٹ سے نہاتے اور عورتیں بغیر معاوضے کے زبردستی پانی بھر کر لے جاتیں۔

چنی بیگم چیختی۔ پیٹتی۔ کوستیں گالیاں بکتیں مگر کچھ نہ کر پاتیں۔ ماردوں کی صورت سے نفرت ہو گئی تھی۔ بس چلتا تو ان پانی حراموں کو زندہ گڑوا دیتیں۔ وہ سات گھر جو ایک روپیہ دیتے تھے انہوں نے بھی سرکشی کر دی۔ وہ بھی مفت میں پانی لے جاتے۔ جب چنی بیگم کی گالیاں خوفناک ہوتیں تو سب اس طرح ہنستے جیسے وہ پاگل ہو گئے ہوں۔

آخر چنی بیگم ہینڈ پمپ کے پاس سے سرک کر اپنی کوٹھری میں جا بیٹھیں۔ جوڑ ایسے سوج گئے تھے کہ ہینڈ پمپ کی حفاظت کی اجازت بھی نہ دیتے۔ بس وہ اپنی کوٹھری میں بیٹھی بیٹھی کوسنوں اور گالیوں کی بوچھاڑ کرتی رہتیں۔ ہائے کیسے بے دردی سے نہاتے کہ منوں پانی بہہ جاتا۔ ہینڈ پمپ کے آس پاس دلدل کی سی حالت ہو گئی تھی۔ دیکھتے دیکھتے وہ کوٹھری کا دروازہ بند کر لیتیں۔ آخر کن آنکھوں سے وہ یہ حالت دیکھتیں مگر یہ کیفیت زیادہ دیر نہ رہتی وہ پھر دروازہ کھول دیتیں اور کوسنے دینے شروع کر دیتیں۔

کل سے انہوں نے کچھ نہ کھایا تھا۔ مارے کمزوری کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ ہینڈ پمپ کی ہتھی چلانے کی آواز بھی نہ سنائی دیتی۔ شبراتن نے کئی چکر لگائے۔ اپنی روٹی کھلانے کی ضد کی مگر چنی بیگم نہ مانیں۔

اری شبراتن یوں محتاجی کی زندگی نہیں گزاروں گی۔ احاطے والوں سے روپے دلواؤ۔

شبراتن چلی گئی تو رینگتی ہوئی ہینڈ پمپ تک گئیں اور ایک کٹورا پانی بھر کر پی لیا پھر ایسا چکر آیا کہ وہیں گر پڑیں۔ ذرا دیر بعد ہوش آیا تو اپنی کوٹھری میں بیٹھی تھیں۔

رات کو احاطے والی دو عورتیں ایک ایک روٹی پر دال چٹنی رکھ کر لے آئیں تو چنی بیگم میں لڑنے کی جان آ گئی۔

اپنی اماں بہنوں کو دو مجھے محتاج سمجھا ہے۔ لاؤ دام ادا کرو۔ پانی کے۔ اللہ نے چاہا

تو دُنیا میں بدلہ ملیگا۔

عورتیں بکس پر رکھی ہوئی تام چینی کی پلیٹ میں روٹیاں رکھ کر چلی گئیں چینی بیگم بڑی دیر تک چیختی رہیں۔

"ارے کمبختو ․․․ جاؤ اپنی اماں بہنوں کو ڈال دو یہ روٹیاں۔

شام ہوگئی۔ کوٹھری میں مچھر بھنبھنانے لگے۔ چینی بیگم مارے نقاہت کے اندر ہی لیٹی رہیں چھاونی سے واپسی کے دردناک بگل کی آواز آرہی تھی۔ ساتھ ہی ہتھنی کے چلنے کی کھٹا کھٹ سُنائی دے رہی تھی۔ آج ذرا ایسا معلوم ہوتا جیسے ساری دُنیا کے لوگ ہینڈ پمپ پر ٹوٹ پڑے ہیں جانے چینی بیگم میں ایکدم کہاں کی طاقت آگئی۔ وہ بڑی پھرتی سے ہینڈ پمپ کی طرف جھپٹیں۔ پانی کا کرایہ دو۔ یوں کسی نے پانی بھرا تو ہاتھ توڑ دوں گی۔ پورے پورے مرد پانی بھر رہے تھے۔ چینی بیگم سے کسی کی ایک اُنگلی بھی نہ ٹوٹی۔

اے چینی بیگم تم کو کیا۔ ہم سب تمہاری اس وقت تک خدمت کریں گے جبتک جیوگی۔ اپنی امّاں بہنوں کی خدمت کرو۔ چینی بیگم نے اپنے حساب گالی دی۔ سب ہنسنے لگے تو وہ خود کو گرِتا ہوا محسوس کر کے کوٹھری میں آگئیں۔ کوٹھری میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ اُنہوں نے بڑی مُشکل سے چراغ جلایا۔ روٹی کی پلیٹ کو اُٹھا کر دیکھا اور پھر رکھ دیا۔ اپنی پتلی سی کھاٹ کو کھینچ کھینچ کر بڑی محنت سے باہر نکالا اور ہانپتی کانپتی لیٹ گئی۔

رات بھوک نے تڑپا تڑپا دیا۔ تڑکے تڑکے رینگتی ہوئی اپنی کوٹھری میں گئیں۔ اللہ مارے چوہے روٹیاں کھینچ لے گئے تھے۔ وہ وہیں بکس پر ٹک گئیں۔

ذرا دیر بعد اللہ رکھے کی بیوی پیتل کی لُٹیا میں گرم گرم چائے اور ایک روٹی لے آ گئی۔ چینی بیگم نے جلدی سے اپنا کٹورا بڑھا دیا۔

"ارے یہ دودھ اتنا ذرا سا ڈال کر لائی ہے اور روٹی میں گھی بھی نہیں چپڑا۔ نیک بخت پانی تو اتنا بھرتی ہے کہ حد نہیں۔ اب ذرا خیال رکھیو ہاں ــــــ"

قرۃ العین حیدر

پت جھڑ کی آواز

صبح میں گلی کے دروازے میں کھڑی سبزی والے سے گوبھی کی قیمت پر جھگڑ رہی تھی۔ اُدپر باورچی خانے میں دال چاول اُبالنے کے لئے چڑھا دیئے تھے۔ ملازم سودا لینے کے لئے بازار جا چکا تھا۔ غسلخانے میں وقار صاحب چینی کی چلمچی کے اُوپر لگے ہوئے مدھم آئینے میں اپنی صُورت دیکھتے ہوئے گنگنا رہے تھے اور شیو کرتے جاتے تھے۔ میں سبزی والے سے بحث کرنے کے ساتھ ساتھ سوچنے میں مصروف تھی کہ رات کے کھانے کے لئے کیا کیا تیار کیا جائے۔ اِتنے میں سامنے ایک کار آن کر رُکی۔ ایک لڑکی نے کھڑکی میں سے جھانکا اور دروازہ کھول کر باہر اُتر آئی۔ میں پیسے گن رہی تھی۔ اس لئے میں نے راسے نہ دیکھا۔ وہ ایکدم آگے بڑھی۔ اب میں نے سر اُٹھا کر اس پر نظر ڈالی۔

"ارے — تم — !" اس نے ہکّا بکّا ہو کر کہا اور ٹھٹھک کر رہ گئی۔ ایسا لگا جیسے وہ مدّتوں سے مجھے مُردہ تصوّر کر چکی ہے اور اب میرا بھوت اس کے سامنے کھڑا ہے۔

اس کی آنکھوں میں ایک لحظے کے لئے جو دہشت میں نے دیکھی اس کی یاد نے مجھے باؤلا کر دیا ہے۔ میں تو سوچ سوچ کے دیوانی ہو جاؤں گی۔

یہ لڑکی، اِس کا نام تک ذہن میں محفوظ نہیں، اور اس وقت میں نے جھینپ کے

مارے اِس سے پُوچھا بھی نہیں ۔ ورنہ وُہ کتنا بُرا مانتی ۔ میرے ساتھ دِلّی کے کوئین میری اسکول میں پڑھتی تھی ۔ یہ بیس سال پہلے کی بات ہے ۔ مَیں اُس وقت کوئی سترہ سال کی رہی ہوں گی ۔ مگر میری صحت اِتنی اچھی تھی کہ اپنی عُمر سے کہیں بڑی معلوم ہوتی تھی اور میری خوبصورتی کی دھُوم مچنی شروع ہو چُکی تھی ۔ دِلّی میں قاعدہ تھا کہ لڑکے والیاں اسکول اسکول گھُوم کے لڑکیاں پسند کرتی پھرتی تھیں اور جو لڑکی پسند آتی تھی اُس کے گھر "رُقعہ" بھجوا دیا جاتا تھا ۔ اِسی زمانے میں مجھے معلُوم ہُوا کہ اِس لڑکی کی اماں خالہ وغیرہ نے مجھے پسند کر لیا ہے ۔ (اسکول ڈے کے جلسے کے روز دیکھ کر) اور اب وُہ مجھے بہُو بنانے پر تُلی بیٹھی ہیں ۔ یہ لوگ نُور جہاں روڈ پر رہتے تھے اور لڑکا حال ہی میں ریزرو بنک آف انڈیا میں دو ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر نوکر ہُوا تھا ۔ چنانچہ "رقعہ" میرے گھر بھجوایا گیا ۔ مگر میری امّاں جان میرے لئے بڑے اُونچے خواب دیکھ رہی تھیں ۔ میرے والدین دِلّی سے باہر میرٹھ میں رہتے تھے اور ابھی میرے بیاہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ لہٰذا وہ پیغام فی الفور نامنظور کر دیا گیا ۔

اس کے بعد اِس لڑکی نے کچُھ عرصہ میرے ساتھ کالج میں بھی پڑھا ۔ پھر اسکی شادی ہو گئی اور کالج چھوڑ کر چلی گئی ۔ آج عرصے بعد لاہور کی مال روڈ کے پچھواڑے اس گلی میں میری اُس سے مڈبھیڑ ہوئی ۔ مَیں نے اِس سے کہا کہ اُوپر آؤ ۔ چائے وائے پیئو ۔ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے ۔ لیکن اِس نے کہا ۔ میں جلدی میں ہُوں ۔ کسی سسرالی رشتہ دار کا مکان تلاش کرتی ہوئی اِس گلی میں آ نکلی تھی ۔ انشاءاللہ مَیں پھر کبھی ضرور آؤں گی ۔ اِس کے بعد وہیں کھڑے کھڑے اِس نے جلدی جلدی نام بنام ساری پرانی دوستوں کے قصّے سُنائے ۔ کون کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے ۔ سلمہ بریگیڈیر فلاں کی بیوی ہے ۔ چار بچّے ہیں ۔ فرخندہ کا میاں فارن سروس میں ہے ۔ اس کی بڑی لڑکی لندن میں پڑھ رہی ہے ۔ ریحانہ فلاں کالج میں پرنسپل ہے ۔ سعیدہ امریکہ سے ڈھیروں ڈگریاں لے آئی ہے اور کراچی میں کسی اُونچی ملازمت پر براجمان ہے ۔ کالج کے ہندو ساتھیوں کے حالات سے بھی وُہ باخبر تھی ۔ پربھا کا میاں انڈین نیوی میں

کمانڈر ہے۔ وہ بمبئی میں رہتی ہے۔ سرلا آل انڈیا ریڈیو میں اسٹیشن ڈائریکٹر ہے اور جنوبی ہند میں کہیں تعینات ہے۔ نوتیکا بڑی مشہور آرٹسٹ بن چکی ہے اور نئی دہلی میں اس کا اسٹوڈیو ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ یہ سب باتیں کر رہی تھیں۔ مگر اس کی آنکھوں کی اس دہشت کو میں نہ بھول سکی

اس نے کہا "میں سعدیہ ریحانہ وغیرہ جب بھی کراچی میں اکٹھے ہوتے ہیں تمہیں برابر یاد کرتے ہیں۔"

"واقعی ___ ؟" میں نے کھوکھلی ہنسی ہنس کر پوچھا مجھے معلوم تھا مجھے کن الفاظ میں یاد کیا جاتا رہا ہوگا۔ پچھل پائیاں۔ ارے کیا یہ لوگ میری سہیلیاں تھیں۔ عورتیں دراصل ایک دوسرے کے حق میں چڑیلیں ہوتی ہیں۔ کٹنیاں۔ حرّافائیں، اس نے مجھ سے یہ بھی نہیں دریافت کیا کہ میں یہاں نیم تاریک سنسان گلی میں اس کھنڈر ایسے مکان کے شک رہنے پر کیا کر رہی ہوں۔ اسے معلوم تھا۔

عورتوں کی انٹیلیجنس سروس اتنی زبردست ہوتی ہے کہ انٹرپول بھی اس کے آگے پانی بھرے اور پھر میرا قصہ تو الم نشرح ہے۔ میری حیثیت کوئی قابلِ ذکر نہیں۔ گمنام ہستی ہوں اس لئے کسی کو میری پرواہ نہیں۔ خود مجھے بھی اپنی پرواہ نہیں۔

میں تنویر فاطمہ ہوں۔ میرے ابا میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ معمولی حیثیت کے زمیندار تھے۔ ہمارے یہاں بڑا سخت پردہ کیا جاتا ہے۔ خود میرا میرے چچا زاد پھوپھی زاد بھائیوں سے پردہ تھا۔ میں بے انتہا لاڈوں کی پلی چہیتی لڑکی تھی۔ جب میں نے اسکول میں بہت سے وظیفے حاصل کر لئے تو میٹرک کرنے کے لئے خاص طور پر میرا داخلہ کوئن میری اسکول میں کرایا گیا انٹر کے لئے علی گڑھ بھیج دی گئی۔ علی گڑھ گرلز کالج کا زمانہ میری زندگی کا بہترین دور تھا کیا خواب آگیں دور تھا۔ میں جذبات پرست نہیں لیکن اب بھی جب کالج کا صحن، روشیں، گھاس کے اونچے پودے درختوں پر جھکی بارش، نمائش کے میدان میں گھومتے ہوئے کالے برقعوں کے پرے، ہوسٹل کے پتلے پتلے برآمدوں چھوٹے چھوٹے کمروں کی وہ شدید گھریلو فضائیں یاد آتی ہیں تو جی ڈوب سا

جاتا ہے۔ ایم۔ ایس سی کے لئے پھر دلی آ گئی۔ یہاں کالج میں میرے ساتھ ہی سب لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ ریحانہ۔ سعیدہ، پربھا، فلانی، ڈھماکی، مجھے لڑکیاں کبھی پسند نہ آئیں۔ مجھے دنیا میں زیادہ تر لوگ پسند نہیں آئے۔ بیشتر لوگ محض تضیع اوقات ہیں۔ میں بہت مغرور تھی۔ حسن ایسی چیز ہے کہ انسان کا دماغ خراب ہوتے دیر نہیں لگتی۔ پھر میں تو بقول شخصے لاکھوں میں ایک تھی۔ شیشے کا ایک جھلکتا ہوا رنگ، سرخی مائل سنہرے بال۔ بے حد شاندار ڈیل ڈول بنارسی ساڑھی پہن لوں تو بالکل کہیں کی مہارانی معلوم ہوتی تھی۔

یہ جنگ کا زمانہ تھا یا جنگ شاید اسی سال ختم ہوئی تھی مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے بہر حال دلی پر بہار آئی ہوئی تھی۔ کروڑ پتی کاروباریوں اور حکومت ہند کے اعلیٰ افسروں کی لڑکیاں ہندو، سکھ، مسلمان — لمبی لمبی موٹروں میں اڑی اڑی پھرتیں۔ نت نئی پارٹیاں۔ جلسے۔ ہنگامے آج اندرپرستھ کالج میں ڈرامہ ہے۔ کل میرانڈا ہاؤس میں، پرسوں لیڈی ارون کالج میں کونسرٹ ہے۔ لیڈی ہارڈنگ اور سینٹ اسٹیفنز کالج — چیمسفرڈ کلب، روشن آرا، امپیریل جم خانہ غرض کہ ہر طرف الف لیلیٰ کے باب بکھرے پڑے تھے۔ ہر جگہ نوجوان فوجی افسروں اور سول سروس کے بن بیاہے عہدے داروں کے پرے ڈولتے نظر آتے۔ ایک ہنگامہ تھا۔

پربھا اور سرلا کے ہمراہ ایک روز میں دلجیت کور کے یہاں جو ایک کروڑ پتی سکھ کنٹریکٹر کی لڑکی تھی۔ کنگ ایڈورڈ روڈ کی ایک شاندار کوٹھی میں گارڈن پارٹی کے لئے مدعو تھی۔

یہاں میری ملاقات میجر خوشوقت سنگھ سے ہوئی۔ یہ جھانسی کی طرف کا چوہان راجپوت تھا۔ لمبا تڑنگا کالا بھجنگ۔ لانبی لانبی اوپر کو مڑی ہوئی نوکیلی مونچھیں، بے حد چمکیلے اور خوبصورت دانت ہنستا تو بہت اچھا لگتا۔ غالب کا پرستار تھا۔ بات بات پر شعر پڑھتا۔ قہقہے لگاتا اور جھک جھک کر بے حد اخلاق سے سب سے باتیں کرتا۔ اس نے ہم سب کو دوسرے روز سینما چلنے کی دعوت دی۔ سرلا، پربھا وغیرہ ایک بددماغ لڑکیاں تھیں اور خاصی قدامت پسند۔ وہ لڑکوں کے ساتھ باہر گھومنے بالکل نہیں جاتی تھیں۔ خوشوقت سنگھ دلجیت کے بھائی کا دوست تھا۔ میری

سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دُوں کہ اتنے میں سرلا نے چپکے سے کہا، "خوشوقت کے ساتھ ہرگز سینما مت جانا۔ سخت لوفر لڑکا ہے۔" میں چپ ہو گئی۔

اس زمانے میں نئی دِلّی کی دو ایک آوارہ لڑکیوں کے قصے بہت مشہور ہو رہے تھے اور میں سوچ سوچ کر ڈرا کرتی تھی۔ شریف گھرانوں کی لڑکیاں اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کس طرح لوگوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہیں۔ ہوسٹل میں ہم اکثر اس قسم کی لڑکیوں کے لئے قیاس آرائی کیا کرتے۔ یہ بڑی عجیب اور پُراسرار ہستیاں معلوم ہوتیں۔ حالانکہ دیکھنے میں وہ بھی ہماری ہی طرح کی لڑکیاں تھیں۔ ساریوں اور شلواروں میں ملبوس طرحدار خوبصورت پڑھی لکھی

"لوگ بدنام کر دیتے ہیں جی۔" یہ سعدہ دماغ پر بہت زور ڈال کر کہتی۔ "اب ایسا بھی کیا ہے۔"

"دراصل ہماری سوسائٹی اس قابل ہی نہیں ہوئی کہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ہضم کر سکے۔" سرلا کہتی۔

"ہوتا یہ ہے کہ لڑکیاں احساسِ توازن کھو بیٹھتی ہیں۔" ریحانہ رائے دیتی۔

بہرحال کسی طرح یقین نہ آتا کہ ہماری جیسی ہمارے ساتھ ہی کی چند لڑکیاں ایسی ایسی خوفناک حرکتیں کس طرح کرتی ہیں۔

دوسری شام میں لیبارٹری سے جا رہی تھی کہ نکلسن میموریل کے قریب ایک قرمزی رنگ کی لمبی سی کار آہستہ سے رُک گئی۔ اس میں سے خوشوقت سنگھ نے جھانکا اور اندھیرے میں اس کے خوبصورت دانت جھلملائے۔

"اجی حضرت۔ یُوں کہیئے کہ آپ اپنا اپوائنٹمنٹ بھول گئیں۔"

"جی۔۔؟" میں نے ہڑبڑا کر کہا۔

"حضور والا۔ چلئے میرے ساتھ فوراً۔ یہ شام کا وقت لیبارٹری میں گھس کر بیٹھنے کا نہیں ہے۔ اتنا پڑھ کر کیا کیجئے گا؟"

میں نے بالکل غیر ارادی طور پر چاروں طرف دیکھا اور کار میں دبک کر بیٹھ گئی۔

ہم نے کناٹ پلیس جا کر ایک انگریزی فلم دیکھا۔

اس کے اگلے روز بھی۔

اس کے بعد ایک ہفتے تک میں نے خوب خوب سیریں اس کے ساتھ کیں

وہ میڈنز میں ٹھہرا ہوا تھا۔

اس ہفتے کے آخر تک میں میجر خوشوقت سنگھ کی مسٹریس بن چکی تھی۔

میں لٹریری نہیں ہوں۔ میں نے چینی، جاپانی، روسی، انگریزی یا اردو شاعری کا مطالعہ نہیں کیا۔ ادب پڑھنا میرے نزدیک وقت ضائع کرنا ہے۔ پندرہ برس کی عمر سے سائنس میرا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ مابعد الطبیعاتی تصوّرات کیا ہوتے ہیں MYSTIC کشش کے کیا معنی ہیں۔ شاعری اور فلسفہ کے لئے نہ میرے پاس فرصت جب تھی نہ اب ہے۔ میں بڑے بڑے مبہم، غیر واضح اور پُراسرار الفاظ بھی استعمال نہیں کر سکتی۔

بہرحال پندرہ روز کے اندر اندر یہ واقع بھی کالج میں سب کو معلوم ہو چکا تھا لیکن مجھ میں اپنے اندر ہمیشہ سے بڑی عجیب سی خود اعتمادی تھی۔ میں نے اب پرواہ نہیں کی۔ پہلے بھی میں لوگوں سے بول چال بہت کم رکھتی تھی۔ سرلا وغیرہ کا گروہ اب مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا گویا میں مریخ سے اتر کر آئی ہوں یا میرے سر پر سینگ ہیں۔ ڈائننگ ہال میں میرے باہر جانے کے بعد گھنٹوں میرے قصّے دہرائے جاتے اپنی انٹیلیجنس سروس کے ذریعے میرے اور خوشوقت کے بارے میں ان کو پل پل خبر رہتی۔ ہم لوگ شام کو کہاں گئے۔ رات نئی دلّی کے کون سے بال رُوم میں ناچے (خوشوقت معرکے کا ڈانسر تھا اس نے مجھے ناچنا بھی سکھا دیا تھا) خوشوقت نے مجھے کیا کیا تحائف کون کون سی دوکانوں سے خرید کے دیئے۔

خوشوقت سنگھ مجھے مارتا بہت تھا اور مجھ سے اتنی محبّت کرتا تھا جو آج تک دنیا میں کسی مرد نے کسی عورت سے نہ کی ہوگی۔

کئی مہینے گذر گئے۔ میرے ایم۔ ایس سی پریویس کے امتحان سر پر آ گئے اور میں

پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ امتحانات کے بعد اِس نے کہا جانِ من، دلربا! چلو کسی خاموش سے پہاڑ پر چلیں۔ سولن۔ ڈلہوزی۔ لینڈ اَون۔ میں چند روز کے لئے میرٹھ گئی اور ابّا سے یہ کہہ کر (اماں جان کا جب میں تھرڈ ائیر میں تھی تو اِنتقال ہوگیا تھا) دِلّی واپس آگئی کہ فائنل ایر کے لئے بے حد پڑھائی کرنی ہے۔ شمالی ہند کے پہاڑی مقامات پر بہت سے شناساؤں کے ملنے کا امکان تھا۔ اِس لئے ہم دُور جنوب میں اوٹی چلے گئے۔ وہاں مہینہ بھر رہے۔ خوشوقت کی چھٹی ختم ہوگئی تو دِلّی واپس آکر تیمار پور کے ایک گاؤں میں ٹک گئے۔

کالج کھلنے سے ایک ہفتہ قبل خوشوقت کی اور میری زبردست لڑائی ہوئی اس نے مجھے خوب مارا۔ اِتنا مارا کہ میرا سارا چہرہ لہولہان ہوگیا اور میری باہوں اور پنڈلیوں پر نیل پڑ گئے۔ لڑائی کی وجہ اِس کی وہ مردار عیسائی منگیتر تھی جو جانے کہاں سے ٹپک پڑی تھی اور سارے شہر میں میرے خلاف زہر اُگلتی پھر رہی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو مجھے کچا چبا جاتی۔ یہ چار سو بیس لڑکی جنگ کے زمانے میں فوج میں تھی اور خوشوقت کو برما کے محاذ پر ملی تھی۔

خوشوقت نے جانے کس طرح اِس سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن مجھ سے ملنے کے بعد اب وہ اس کی انگوٹھی واپس کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔

اِس رات تیمار پور کے سنسان بنگلے میں اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑے اور رو رو کر مجھ سے کہا کہ میں اِس سے بیاہ کر لوں، ورنہ وہ مر جائے گا۔ میں نے کہا ہرگز نہیں قیامت تک نہیں۔ میں اعلیٰ خاندان سیّد زادی، بھلا اس کالے نمیاگو کے پنڈے ہندو جاٹ سے بیاہ کر کے خاندان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگاتی۔ میں تو اس حسین و جمیل، کسی بہت اُونچے مسلمان گھرانے کے چشم و چراغ کے خواب دیکھ رہی تھی جو ایک روز دیر یا سویر، بارات لے کر مجھے بیاہنے آئے گا۔ ہمارا آرسی مصحف ہوگا۔ میں سہرے جلوے سے رخصت ہو کر اس کے گھر جاؤں گی۔ بجلی بسنت نندیں دروازے پر دہلیز روک کر

اپنے بھائی سے نیگ کے لئے جھگڑیں گی۔ میراثنیں ڈھولک لئے کھڑی ہونگی۔ کیا کیا کچھ ہوگا۔ میں نے کیا ہندو مسلم شادیوں کا حشر دیکھا نہیں تھا۔ کتنیوں نے ترقی پسندی یا جذبۂ عشق کے جوش میں آ کر ہندوؤں سے بیاہ رچائے اور سال بھر کے اندر جوتیوں میں دال بٹی۔ بچوں کا جو حشر خراب ہوا وہ الگ۔ نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ میرے انکار پر خوشونت نے جوتے لات سے مار مار کر میرا بھرکس نکال دیا۔ اور تیسرے دن اس ڈائن کالی بلا کیتھرین دھرم داس کیساتھ آگرے چلا گیا۔ جہاں اس نے اس بدذات لڑکی سے سول میرج کر لی۔

جب مَیں نئی ٹرم کے آغاز پر ہوسٹل پہنچی تو اس حلیئے سے کہ میرے سر اور چہرے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ابّا کو میں نے لکھ بھیجا کہ لیبارٹری میں ایک تجربہ کر رہی تھی۔ ایک خطرناک مادہ بھاپ سے اُڑا اور اس سے میرا مُنہ تھوڑا سا جل گیا۔ اب بالکل ٹھیک ہوں بالکل فکر نہ کیجئے۔

لڑکیوں کو تو سارا قصہ پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا لہٰذا انہوں نے اخلاقاً میری خیریت بھی نہ پوچھی اتنے بڑے اسکینڈل کے بعد مجھے ہوسٹل میں رہنے کی اجازت نہ دیجاتی۔ مگر ہوسٹل کی وارڈن خوشونت سنگھ کی بہت دوست تھی۔ اس نے سب خاموش رہے۔ اس کے علاوہ کسی کے پاس کسی طرح کا ثبوت بھی نہ تھا۔ کالج کی لڑکیوں کو لوگ یُوں بھی خواہ مخواہ بدنام کرنے پر تُلے رہتے ہیں۔

مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ صبح کے گیارہ بجے ہوں گے۔ ریلوے اسٹیشن سے لڑکیوں کے تانگے آ آ کر پھاٹک میں داخل ہو رہے تھے۔ ہوسٹل کے لان پر برگد کے درخت کے نیچے لڑکیاں اپنا اپنا اسباب اتروا کر رکھوا رہی تھیں۔ بڑی سخت چل پول مچا رکھی تھی۔ جس وقت مَیں اپنے تانگے سے اُتری وہ میرا دھاٹے سے بندھا ہُوا سفید چہرہ دیکھ کر ایسی حیرت زدہ ہُوئیں جیسے سبکو سانپ سُونگھ گیا ہو۔ مَیں نے اپنا سامان چوکیدار کے سر پر رکھوایا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ دوپہر کو جب مَیں کھانے کی میز پر آن کر بیٹھی تو ان تربیّت یافتہ ماڈل نے مجھ سے اِس اخلاق سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں جن سے اچھی طرح یہ ظاہر ہو جائے کہ میرے حادثہ کی اصلیت جانتی ہیں اور مجھے ندامت سے بچانے کے لئے اس کا تذکرہ ہی نہیں کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک نے

جو اس چنڈال چوکڑی کی گرو اور ان سب کی اُستاد تھی رات کو کھانے کی میز پر فیصلہ صادر کیا کہ مَیں نفسیات کی اصلاح میں (NYMPHOMANIAC) ہُوں (مجھے میری جاسُوسوں کے ذریعے یہ اطلاع فوراً اُوپر پہنچ گئی جہاں مَیں اس وقت اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس ٹیبل لیمپ لگائے پڑھائی میں مصرُوف تھی) اور اس طرح کی باتیں تو اب عام تھیں کہ ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرتی ہے۔ اِسی لئے تو لڑکیوں کی بے پردگی آزادی خطرناک اور اعلیٰ تعلیم بدنام ہے وغیرہ وغیرہ۔

مَیں اپنی حد تک سَو فیصدی ان آراء سے متفق تھی۔ مَیں خُود سوچتی تھی کہ بعض اچھی خاصی بھلی چنگی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں آوارہ کیوں ہو جاتی ہیں۔ ایک تھیئوری تھی کہ وہی لڑکیاں آوارہ ہوتی ہیں جن کا "آئی کیو" بہت کم ہوتا ہے۔ ذہین انسان کبھی اپنی تباہی کی طرف جان بُوجھ کر قدم نہ اُٹھائے گا۔ مگر مَیں نے تو اچھی خاصی سمجھ دار تیز طرار لڑکیوں کو لوفری کرتے دیکھا تھا۔ دُوسری تھیوری تھی کہ —— روپے پیسے عیش و آرائش کی زندگی، قیمتی تحائف کا لالچ، رومان کی تلاش، ایڈونچر کی خواہش یا محض اکتاہٹ یا پردے کی قید و بند کے بعد آزادی کی فضا میں داخل ہو کر پرانی اقدار سے بغاوت اس صورتِ حال کی چند وجوہ ہیں۔ یہ سب باتیں ضرور ہوں گی ورنہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

مَیں فرسٹ ٹرمنل امتحان سے فارغ ہوئی تھی کہ خوشونت بھی آن پہنچا۔ اس نے مجھے لیبارٹری فون کیا کہ مَیں نرولا میں چھ بجے اس سے ملوں۔ مَیں نے ایسا ہی کیا۔ وہ کیتھرین کو اپنے ماں باپ کے یہاں چھوڑ کر سرکاری کام سے دِلّی آیا تھا۔ اس مرتبہ ہم ہوائی جہاز سے ایک ہفتہ کے لئے بمبئی چلے گئے۔ اس کے بعد ہر دُوسرے تیسرے مہینے ملنا ہوتا رہا۔ ایک سال نکل گیا۔ اب کے جب وہ دِلّی آیا تو اس نے اپنے ایک جگری دوست کو مجھے لینے کے لئے موٹر لے کر بھیجا۔ کیونکہ وہ لکھنؤ سے لاہور جاتے ہوئے پالم پر چند گھنٹے کے لئے ٹھہرا تھا۔ یہ دوست دِلّی کے ایک بہت بڑے مُسلمان تاجر کا لڑکا تھا۔ لڑکا تو خیر نہیں کہنا چاہیئے۔ اس وقت وہ چالیس کے پیٹے میں رہا ہوگا بیوی بچّوں والا۔ تاڑ سا قد۔ بے حد غلط انگریزی بولتا تھا۔ کالا۔ بدقطع۔ بالکل چڑی مار کی شکل۔ ہوش صفت۔

خوش وقت اب کی مرتبہ دلّی سے گیا تو پھر کبھی واپس نہ آیا کیونکہ اب مَیں فاروق کی مسٹریس بن چکی تھی۔

فاروق کے ساتھ اب مَیں اس کی "منگیتر" کی حیثیت سے باقاعدہ دلّی کی اُونچی سوسائٹی میں شامل ہو گئی۔ مسلمانوں میں تو چار شادیاں جائز ہیں لہٰذا یہ کوئی بہت بڑی بات نہ تھی۔ یعنی مذہب کے نقطۂ نگاہ سے گو وُہ اپنی اَن پڑھ، ادھیڑ عُمر کی پردے کی بیوی کی موجودگی میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو چار آدمیوں میں ڈھنگ سے بیٹھ سکے اور پھر دولت مند طبقے میں سب کچھ جائز ہے یہ تو تمہاری مڈل کلاس کے قوانین ہیں کہ یہ نہ کرو، وُہ نہ کرو۔ طویل چھٹیوں کے زمانے میں فاروق نے بھی مجھے خوب سیریں کرائیں۔ کلکتہ، لکھنؤ، اجمیر، کون جگہ تھی جو مَیں نے اس کے ساتھ نہ دیکھی۔ اس نے مجھے ہیرے جواہرات کے گہنوں سے لاد دیا۔ ابّا کو لکھ بھیجتی تھی کہ یونیورسٹی کے طالبعلموں کے ہمراہ ٹور پر جا رہی ہوں۔ یا فلاں جگہ سائنس کانفرنس میں شرکت کے لئے مجھے بُلایا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے اپنا تعلیمی ریکارڈ اُونچا رکھنے کی دُھن تھی۔ فائنل امتحان میں مَیں نے بہت ہی خراب پرچے کئے اور امتحان ختم ہوتے ہی گھر چلی گئی۔

اسی زمانے میں دلّی میں گڑبڑ شروع ہوئی اور فسادات کا بھونچال آ گیا۔ فاروق نے مجھے میرٹھ خط لکھا کہ تم فوراً پاکستان چلی جاؤ مَیں تم سے وہیں ملوں گا۔ میرا پہلے ہی سے یہ ارادہ تھا۔ ابّا بھی بےحد پریشان تھے اور یہی چاہتے تھے کہ ان حالات میں اب مَیں انڈیا میں نہ رہوں۔ وہاں شریف مسلمان لڑکیوں کی عزّتیں مستقل خطرے میں ہیں۔ پاکستان اپنا اسلامی مُلک تھا۔ اس کی بات ہی کیا تھی۔ ابّا جائیداد وغیرہ کی وجہ سے فی الحال ترکِ وطن نہ کر سکتے تھے۔ میرے بھائی دونوں بہت چھوٹے چھوٹے تھے اور امّاں جان کے انتقال کے بعد ابّا نے ان کو میری خالہ کے پاس حیدرآباد دکن بھیج دیا تھا۔ میرا رزلٹ نکل چکا تھا اور مَیں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئی تھی۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ جب بلوؤں کا زور ذرا کم ہوا تو مَیں ہوائی جہاز سے لاہور آ گئی۔ فاروق میرے ساتھ آیا۔ اس نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ اپنے کاروبار کی ایک شاخ پاکستان میں قائم کر کے لاہور اس کا

ہیڈ آفس رکھے گا - مجھے اس کا مالک بنائے گا اور دہیں مجھ سے شادی کرے گا - وُہ دِلّی سے ہجرت نہیں کر رہا تھا - کیونکہ اس کے باپ بڑے احراری خیال کے آدمی تھے - پلان یہ بنا کہ دلی سے وُہ ہر دُوسرے تیسرے مہینے دہلی سے لاہور آتا رہے گا - لاہور میں افراتفری تھی حالانکہ ایک سے ایک اعلیٰ کوٹھی الاٹ ہو سکتی تھی - مگر فاروق یہاں کسی کو جانتا نہ تھا - بہرحال سنت نگر میں ایک چھوٹا سا مکان میرے نام الاٹ کرا کے اس نے مجھے وہاں چھوڑ دیا اور میری دو سراتھ کے لئے اپنے ایک دُور کے رشتے دار کُنبے کو میرے پاس ٹھہرا دیا ، جو مہاجر ہو کے لاہور آئے تھے اور مارے مارے پھر رہے تھے -

مَیں زندگی کی اِس یک وقت تبدیلی سے اتنی ہکّا بکّا تھی کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا سے کیا ہو گیا ، کہاں غیر منقسم ہندوستان کی وہ دہ بھرپور دلچسپ رنگا رنگ دُنیا کہاں ۴۸ء کے لاہور کا وُہ تنگ و تاریک مکان - غریب الوطنی - اللہ اکبر - مَیں نے کیسے کیسے دِل ہلا دینے والے زمانے دیکھے ہیں -

مَیں اتنی خالی الذہن ہو چکی تھی کہ تلاشِ ملازمت کی بھی کوئی کوشش نہ کی - روپے کی طرف سے فکر نہ تھی کیونکہ فاروق میرے نام دس ہزار روپیہ جمع کرا گیا تھا - صرف دس ہزار - وُہ خود کروڑ والا کا آدمی تھا مگر اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا - اب بھی نہیں آتا -

دِن گذرتے گئے - مَیں صبح سے شام تک پلنگ پر پڑی فاروق کے رشتے خالہ یا نانی جو کچھ بھی وُہ بڑی بی تھیں ان سے ان کی ہجرت کے مصائب کی داستان اور ان کی سابقہ امارت کے قصے سُنا کرتی اور پان پہ پان کھاتی یا ان کی طالبعلم بیٹی کو الجبرا جیومیٹری سکھلایا کرتی - ان کا بیٹا فاروق کی برائے نام بزنس کی دیکھ بھال کر رہا تھا -

فاروق سال میں پانچ چھ چکر لگا لیتا - اب لاہور کی زندگی آہستہ آہستہ نارمل ہوتی جا رہی تھی - اس کی آمد سے میرے دِن کچھ رونق کے کٹتے - اُس کی خالہ بڑے اہتمام سے دِلّی کے کھانے تیار کرتیں - مَیں مال کے ہیئر ڈریسر کے یہاں جا کر اپنے بال سیٹ کرواتی - شام کو ہم

دونوں جم خانہ کلب چلے جاتے اور وہاں ایک کونے کی میز پر بیئر کے گلاس سامنے رکھے فاروق مجھے دِلّی کے واقعات سُناتا۔ وُہ بے تکان بولے جاتا یا پھر دفعتاً چُپ ہو کر کمرے میں آنیوالی اجنبی صُورتوں کو دیکھتا رہتا۔ اس نے شادی کا کبھی کوئی ذکر نہیں کیا میں نے بھی اس سے نہیں کہا میں ایک تنہا لڑکی تھی کسی چیز سے کوئی غرض نہیں پڑتا جب وُہ دِلّی واپس چلا جاتا تو میں ہر پندرھویں دن اپنی خیریت کا خط اور اس کے کاروبار کا حال لکھ بھیجتی اور لکھ دیتی کہ اب کی آئے تو کناٹ پلیس یا چاندنی چوک کی فلاں دوکان سے فلاں فلاں قسم کی ساریاں لیتا آئے کیونکہ پاکستان میں ایسی ساریاں ناپید ہیں۔

ایک روز میرٹھ سے چچا میاں کا خط آیا کہ ابّا جان کا انتقال ہو گیا۔

ع جب احمدِ مرسل نہ رہے کون رہیگا

میں جذبات سے واقف نہیں ہُوں مگر باپ مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ اِن کی موت کا مجھے سخت صدمہ ہُوا۔ فاروق نے مجھے بڑے پیار کے دلاسے بھرے خط لکھے تو ذرا ڈھارس بندھی۔ اس نے لکھا نماز پڑھا کرو بہت بُرا وقت ہے۔ دُنیا پر کالی آندھی چل رہی ہے۔ سُورج ڈیڑھ بلم پر آیا چاہتا ہے۔ پل کا بھروسہ نہیں۔ سارے کاروباریوں کی طرح وُہ بھی بڑا سخت مذہبی اور توہم پرست آدمی تھا۔ پابندی سے اجمیر شریف جاتا۔ نجُومیوں۔ رمّالوں۔ پنڈتوں۔ سیانوں۔ پیروں۔ فقیروں۔ اچھّے اور بُرے شگُونوں، خوابوں کی تعبیر، غرضیکہ ہر چیز کا قائل تھا۔ ایک آدھ مہینہ میں نے نماز بھی پڑھی۔ مگر جب میں سجدے میں جاتی تو دِل چاہتا خوب زور زور سے ہنسوں۔

مُلک میں سائینس کی خواتین لیکچراروں کی بڑی زبردست مانگ تھی۔ جب مجھے ایک مقامی کالج والوں نے بہت مجبور کیا تو میں نے پڑھانا شروع کر دیا۔ حالانکہ ٹیچری کرنے سے مجھے سخت نفرت ہے۔ کچھ عرصے بعد مجھے پنجاب کے ایک دُور افتادہ ضلع کے گرلز کالج میں بلا لیا گیا۔ کئی سال تک میں نے وہاں کام کیا۔ مجھ سے میری طالبعلم لڑکیاں اکثر پُوچھتیں۔ ہائے اللہ مس تبریز آپ اتنی پیاری سی ہیں آپ اپنے کروڑپتی منگیتر سے شادی کیوں نہیں کرتیں؟

اِس سوال کا خود میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

یہ نیا ملک تھا۔ نئے لوگ۔ نیا معاشرہ۔ یہاں کسی کو میرے ماضی کے متعلق علم نہ تھا۔ کوئی بھلا مانس مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو سکتا تھا۔ (لیکن بھلے مانس، خوش شکل، سیدھے سادے شریف زادے مجھے پسند ہی نہیں آتے تھے۔ میں کیا کرتی) دِلّی کے قِصّے دِلّی ہیں رہ گئے اور پھر میں نے یہ دیکھا ہے کہ ایک سے ایک حرّافہ لڑکیاں اب ایسی پارسا بنی ہوتی ہیں کہ دیکھا ہی کیجئے۔ خود ایڈتھ ہری رام اور رانی خان کی مثال میرے سامنے موجود ہے۔

اب فاروق بھی کبھی کبھی آتا۔ ہم لوگ اِس طرح مِلتے گویا بیسوں برس کے پرانے شادی شدہ میاں بیوی ہیں جن کے پاس سارے نئے موضوع ختم ہو چکے ہیں۔ اب سکون، آرام اور ٹھہراؤ کا وقت ہے۔ فاروق کی بیٹی کی حال ہی میں دِلّی میں شادی ہوئی ہے اس کا لڑکا آکسفورڈ جا چکا ہے بیوی کو مستقل دمہ رہتا ہے۔ فاروق نے اپنے کاروبار کی شاخیں باہر کے کئی ملکوں میں پھیلا دی ہیں۔ نینی تال میں نیا بنگلہ بنوا رہا ہے۔ فاروق اپنے خاندان کے قِصّے، کاروبار کے معاملات مجھے تفصیل سے سنایا کرتا اور میں اس کے لئے پان بناتی رہتی۔

ایک مرتبہ میں چھٹیوں میں کالج سے لاہور گئی تو فاروق کے ایک پرانے دوست سید وقار حسین خاں سے میری ملاقات ہوئی اور کچھ کم رُو ہتے تھے، دراز قد۔ موٹے تازے۔ سیاہ تانبا سا رنگ۔ عمر میں پینتالیس کے لگ بھگ اچھے خاصے دیو زاد معلوم ہوتے۔ اِن کو پہلی مرتبہ میں نے نئی دہلی میں دیکھا تھا جہاں ان کا ڈانسنگ اسکول تھا۔ یہ رام پور کے ایک شریف گھرانے کے اکلوتے فرزند تھے۔ بچپن میں گھر سے بھاگ گئے۔ سرکس، کارنیول اور تھیٹر کمپنیوں کے ساتھ ملکوں ملکوں گھومے۔ سنگاپور ہانگ کانگ۔ سنگھائی، لندن، جانے کہاں کہاں، اَن گنت قومیتوں اور نسلوں کی عورتوں سے شادیاں رچائیں۔ ان کی موجودہ بیوی اُڑیسہ کے ایک مارواڑی مہاجن کی لڑکی تھی جس کو یہ کلکتے سے اُڑا لائے تھے۔ بارہ پندرہ سال قبل میں نے اِسے دِلّی میں دیکھا تھا۔ سانولی سلونی سی پستہ قد لڑکی تھی۔ اس کی شکل پر عجیب طرح کا الم برستا مگر سنا تھا کہ بڑی پتی ورتا عورت

تھی۔ میاں کی بدسلوکیوں سے تنگ آکر ادھر اُدھر بھاگ جاتی۔ مگر چند روز بعد پھر واپس موجود۔ خاں صاحب نے کناٹ سرکس کی ایک بلڈنگ کی تیسری منزل میں انگریزی ناچ سکھانے کا اسکول کھول رکھا تھا جس میں وُہ، ان کی بیوی، دو اینگلو انڈین لڑکیاں گویا اسٹاف میں شامل تھیں۔ جنگ کے زمانے میں اسکول پر دھن برسا۔ اتوار کو صبح کے روز ——— "ان ہوا کرتے ایک مرتبہ میں بھی خوشونت کے ساتھ وہاں گئی تھی۔ سُنا تھا کہ وقار صاحب کی بیوی ایسی مہاستی انسویا کا اوتار ہیں کہ ان کے میاں حکم دیتے ہیں کہ فلاں فلاں لڑکی سے بہنا پا گانٹھو اور پھر اسے مجھ سے ملانے کے لئے آؤ اور وُہ نیک بخت ایسا ہی کرتی۔ ایک بار وُہ ہمارے ہوسٹل بھی آئی اور چند لڑکیوں کے سر ہوئی کہ اس کے ساتھ بارہ کھمبا روڈ چل کر چائے پئیں۔

تقسیم کے بعد وقار صاحب بقول شخصے لُٹ لٹا کر لاہور آ پہنچے تھے اور مال روڈ کے پچھواڑے ایک فلیٹ الاٹ کروا کے اسمیں اپنا اسکول کھول لیا تھا۔ شروع شروع میں کاروبار مندا رہا۔ دلوں پر مُردنی چھائی تھی۔ ناچنے گانے کا کسے ہوش تھا۔ اس فلیٹ میں تقسیم سے پہلے آریہ سماجی ہندوؤں کا میوزک اسکول تھا۔ لکڑی کے فرش کا ہال۔ پہلو میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے۔ غسل خانہ باورچی خانہ سامنے لکڑی کی بالکونی اور شکستہ ہلتا ہوا زینہ۔ "ہندوستانی سنگیت ودیالیہ" کا بورڈ بالکنی کے جنگلے پر اب تک ٹیڑھا ٹنگا ہوا تھا۔ اسے اُتار کر "دفارز اسکول آف بال روم اینڈ ٹیپ ڈانسنگ" کا بورڈ لگا دیا گیا۔ امریکی فلمی رسالوں سے تراش کر جین کیلی، فریڈ اسٹیر، فرینک سیناٹرا، دورس ڈے وغیرہ کی رنگین تصویریں ہال کی بوسیدہ دیواروں پر آویزاں کر دی گئیں اور اسکول چالو ہو گیا ریکارڈوں کا تھوڑا ذخیرہ خاں صاحب دلّی سے ساتھ لیتے آئے تھے۔ گراموفون اور سیکنڈ ہینڈ فرنیچر فاروق سے روپیہ قرض لیکر اُنہوں نے یہاں خرید لیا۔ کالج کے منچلے لونڈوں اور نئی دولت مند سوسائٹی کی تازہ فیشن ایبل بیگمات کو خُدا سلامت رکھے دو تین سال میں ان کا کاروبار خوب چمک گیا۔

فاروق کی دوستی کی وجہ سے میرا اوران کا کچھ بھاوج اور جیٹھ کا سا رشتہ ہو گیا۔ وُہ اکثر

میری خیر خبر لینے آجاتے۔ ان کی بیوی ساتھ گھنٹوں پکانے ریندھنے سینے پرونے کی باتیں کیا کرتیں بے چاری مجھ سے بالکل دیہاتی والا شفقت کا برتاؤ کرتیں۔ یہ میاں بیوی لاولد تھے۔ بڑا اُداس، بے رنگ بے تکا سا غیر دلچسپ جوڑا تھا۔ ایسے لوگ بھی دُنیا میں موجود ہیں۔

کالج میں نئی امریکہ پلٹ تک چڑھی۔ پرنسپل سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ اگر وہ سیر تو میں سوا سیر۔ میں خود ابوالحسن تانا شاہ سے کون کم تھی۔ میں نے استعفیٰ کالج کمیٹی کے سر پہ مارا، اور پھر سنت نگر لاہور واپس آگئی۔ میں پڑھاتے پڑھاتے اُکتا چکی تھی۔ میں کوئی لے کر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے باہر جا سکتی تھی مگر اس ارادے کو بھی کل پہ ٹالتی رہی۔ کل امریکنوں کے دفتر جاؤں گی جہاں وہ وظیفے باٹتے ہیں۔ کل برٹش کونسل جاؤں گی۔ کل ایجوکیشن منسٹری میں اسکالر شپ کی درخواست بھیجوں گی۔

مزید وقت گذر گیا۔ کیا کروں گی۔ کہیں باہر جا کر کون سے گڑھ جیت لوں گی۔ مجھے جانے کس چیز کا انتظار تھا مجھے معلوم نہیں۔

اِسی دوران میں ایک روز وقار بھائی، میرے پاس حواس باختہ آئے اور کہنے لگے۔ ”تمہاری بھابی کے دماغ میں پھر سودا اُٹھا۔ وہ ویزا بنوا کر انڈیا واپس چلی گئیں اور اب کبھی نہ آئیں گی۔“

”یہ کیسے؟“ میں نے ذرا بے پروائی سے پوچھا اور ان کے لئے چائے کا پانی اسٹوو پر رکھ دیا۔

”بات یہ ہوئی کہ میں نے انہیں طلاق دیدی۔ ان کی زبان بہت بڑھ گئی تھی۔ ہر وقت ٹر ٹر۔ ٹر ٹر۔“ پھر انہوں نے سامنے کے کھرے پلنگ پر بیٹھ کر خالص شوہروں والے انداز میں بیوی کی جلالت شکایات کا ایک دفتر کھول دیا اور خود کو بے قصور اور حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔

میں بے پروائی سے یہ ساری کتھا سُنا کی زندگی کی۔ ہر بات اِس قدر بے رنگ، غیر اہم، غیر ضروری اور بے معنی تھی۔

کچھ عرصے بعد وہ میرے ہاں آ کر بڑبڑائے

"نوکروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کبھی اتنا بھی تم سے نہیں ہوتا کہ آ کر ذرا بھائی کے گھر کی حالت ہی دُرست کر جاؤ نوکروں کے کان امیٹھو۔ میں اسکول بھی چلاؤں اور گھر بھی"۔ اُنہوں نے اِس انداز سے شکایتاً کہا گویا ان کے گھر کا اِنتظام کرنا میرا فرض تھا۔

چند روز بعد میں اپنا سامان باندھ کر وقار صاحب کے کمروں میں منتقل ہو گئی اور ناچ سکھانے کے لئے ان کی اسسٹنٹ بھی بن گئی۔

اِس کے مہینے بھر بعد پچھلے اتوار کو وقار صاحب نے ایک مولوی بلوا کر اپنے دو چپراسیوں کی گواہی میں مجھ سے نکاح پڑھوا لیا۔

اب میں دِن بھر کام کاج میں مصروف رہتی ہوں۔ میرا حسن و جمال ماضی کی داستانوں میں شامل ہو چکا ہے۔ مجھے شور و شغب۔ پارٹیاں۔ ہنگامے مُطلق پسند نہیں لیکن گھر میں ہر وقت "چاچا" اور "کلپسو" اور "راک اینڈ رول" کا شور مچا رہتا ہے۔ بہر حال یہی میرا گھر ہے۔

میرے پاس اِس وقت کئی کالجوں میں کیمسٹری پڑھانے کے آفر ہیں مگر بھلا کہیں خانہ داری کے دھندوں سے کہیں فرصت ملتی ہے۔ نوکروں کا یہ حال ہے کہ آج رکھو کل غائب۔ میں نے زیادہ کی تمنا کبھی نہیں کی۔ صرف اِتنا ہی چاہا کہ ایک اوسط درجہ کی کوٹھی ہو۔ سواری کے لئے موٹر تاکہ آرام سے ہر جگہ جا آسکیں ہمچشموں میں بے عزتی نہ ہو۔ چار ملنے والے آئیں تو بٹھانے کے لئے قرینے کا ٹھکانہ ہو اور بس!

اِس وقت ہماری ڈیڑھ دو ہزار کی آمدنی ہے۔ جو دو میاں بیوی کے لئے ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ اِنسان اپنی قسمت پر قانع ہو جائے تو سارے کے سارے دُکھ آپ سے آپ مِٹ جاتے ہیں۔

شادی ہو جانے کے بعد لڑکی کے سر کے اُوپر چھت سی پڑ جاتی ہے۔ آج کل کی لڑکیاں جانے کس رَو میں بہہ رہی ہیں۔ کِس طرح یہ لوگ ہاتھوں سے نکل جاتی ہیں۔ جتنا سوچو عجیب سا لگتا ہے اور حیرت ہوتی ہے۔

مَیں نے تو کبھی کسی سے فلرٹ تک نہ کیا۔ خوشوقت، فارُوق اور اس پچاس سالہ بدہیت بدقوارہ شخص کے علاوہ جو میرا شوہر ہے، مَیں کسی چوتھے آدمی سے واقف نہیں۔ مَیں شائد بدمعاش تو نہیں تھی۔ نہ معلوم مَیں کیا تھی اور کیا ہُوں۔ ریحانہ، سعیدہ، پربھا اور یہ لڑکی جس کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر دہشت پیدا ہوئی، شائد وُہ مجھ سے زیادہ اچھی طرح مجھ سے واقف ہوں۔

اب خوشوقت کو یاد کرنے کا فائدہ؟ وقت گذر چکا۔ جانے اب تک وُہ بریگیڈیر میجر جنرل ہو چکا ہو۔ آسام کی سرحد پر چینیوں کے خلاف مورچہ لگائے بیٹھا ہو یا ہندوستان کی کسی ہری بھری خوبصورت چھاؤنی کے میس میں مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہو۔ اور مسکراتا ہو۔ شاید وُہ کب کشمیر کے محاذ پر مارا جا چکا ہو۔ کیا معلُوم۔

اندھیری راتوں میں مَیں چُپ چاپ آنکھیں کھولے پڑی رہتی ہُوں۔ سائنس نے ہمیں عالمِ موجُودات کے بہُت سے رازوں سے واقف کر دیا ہے۔ مَیں نے کیمسٹری پر اَن گنت کتابیں پڑھی ہیں۔ پہروں سوچا ہے۔ پر مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ اندھیری راتوں میں مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔

خوشوقت سنگھ۔ خوشوقت سنگھ۔ تمہیں اب مجھ سے مطلب؟

انور

انتخاب

اور اب مسز جاودانی کی باری تھی۔

معاہدہ یہ تھا کہ ہر خاتون باری باری اپنی شادی اور شوہر کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کر یگی۔ اس سے پہلے بیگم پیارخان، بیگم محمد دین اور بیگم نور محمد اپنی اپنی کہانیاں سُنا چکی تھیں اب تک بیگم نور محمد کی کہانی سب سے دلچسپ تھی۔ اُس نے کہا تھا، ہماری شادی تو ہمارے ماں باپ نے کی تھی۔ بس جی ہماری شادی ہوگئی اور ہم راضی، ہمارا خدا راضی۔

اور اب جو مسز جاودانی کی باری آئی تو خواتین میں ایک نئی دلچسپی کی لہر دوڑ گئی۔ مُسلم گرلز کالج کی پرنسپل جاودانی اپنی جادُو بیانی کی وجہ سے سوشل حلقوں میں بہت مشہور تھی۔ خواتین اپنی کُرسیاں کھسکا کر مسز جاودانی کے نزدیک آگئیں۔

اور مسز جاودانی نے اپنی جادُو بیانی کا آغاز کیا۔

میرے ڈیڈی آئی سی ایس تھے۔ اِس لئے ہمارے گھر کے ماحول پر مغربی تہذیب کا سایہ تھا۔ (میرا اصل نام رضیہ تھا۔ لیکن میرے ڈیڈی روزی کہتے تھے) میری والدہ کا نام میمونہ تھا مگر ڈیڈی میمی کہتے تھے۔ میرے ڈیڈی ہمارے خاندان کے ہر فرد کو کوئی نہ کوئی انگریزی نِک نیم دے دیتے تھے۔ وُہ میرے بھائی ذوالفقار کو ذکی کہتے تھے۔ مختار کو مِکّی اور دلدار کو خواہ مخواہ ڈِکی

اور اسی طرح وہ میری بہن آمنہ کو ایمی، لالہ رُخ کو للی، نیلوفر کو نیلی اور مجھے روزی کہتے تھے۔

ایک دِن معلوم نہیں مجھے کیا ہُوا۔ مَیں نے بلند آواز سے کہا او دِگی، ڈِگی، کی ——
اے ایمی۔ للی، نیلی ہماری طرف دیکھو۔ ہم افسانہ نگار ہیں۔ ہمارے سامنے تعظیم سے جُھک جاؤ جینئس ہیں۔ میرے بھائی بہنیں اور دوست میری باتیں سُن کر میرا مذاق اُڑانے لگے اور مَیں سخت غُصّے میں بھاگ کر اپنے اسٹڈی رُوم میں گُھس گئی اور اُس وقت تک باہر نہ نکلی جب تک مَیں نے اپنے لئے ایک بے حد رُعب ڈالنے والا اور دُشمنوں کے دانت کھٹّے کرنے والا افسانوی نام نہ چُن لیا۔ بہت کاوش کے بعد آخر مَیں نے اپنے لئے ایک نہائت افسانہ پرور۔ جاذب توجہ اور رومانٹک نام تلاش کر لیا۔ "چشم آئینہ حیرت"۔

ایک خاتون جس نے "چشم آئینہ حیرت" کے افسانے پڑھے تھے لیکن اُس کو دیکھا نہیں تھا۔ بول اُٹھی۔

"اچھا تو آپ ہیں۔ "چشم آئینہ حیرت"؟"

ایک دُوسری خاتون نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

"جی بالکل۔ آپ نے کیا سمجھا تھا؟"

"مسز جاودانی۔"

خواتین اِس معمولی سے مذاق پر خواہ مخواہ ہنس پڑیں۔

کم عمر نوخیز لڑکیاں جنہوں نے "چشم آئینہ حیرت" کے افسانوں کا مطالعہ کیا تھا لیکن اُس کو دیکھا نہیں تھا۔ "چشم آئینہ حیرت" کا نام سُن کر چونک گئیں۔ اسکولوں اور کالجوں کی یہ لڑکیاں اپنی ممیوں اور آنٹیوں سے جُدا ہو کر لاؤنج کے ایک کونے میں اپنا الگ گرُوپ بنائے بیٹھی تھیں۔ جب انہیں معلوم ہُوا کہ یہ باتیں کرنے والی خاتون "چشم آئینہ حیرت" ہے تو وُہ خواتین کے اِس بڑے گرُوپ میں آکر شامل ہو گئیں۔

بیگم پہاڑ خاں نے چلّا کر کہا۔

"لڑکیو! بھاگو تم یہاں سے۔ تمہارے سُننے کی نہیں یہ باتیں۔"

مسز جاودانی نے بیگم پہاڑ خاں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"معاف کیجئے، شادیوں اور شوہروں کی باتیں تو ان ہی نوجوان لڑکیوں کے لئے ہیں۔ آپ کے اور ہمارے لئے تو قبرستان اور بہشتی زیور کی باتیں ہیں۔ لڑکیو! میری باتیں غور سے سنو۔"

کلب کا بیرا شربتوں کے گلاسوں کو ٹپائی پر رکھ کر اور خالی گلاس لے کر چلا گیا۔

مسز جاودانی نے رسٹو کا ایک گھونٹ لیا اور بولی۔

"چنانچہ میری ادبی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ مَیں نے اپنی ادبی زندگی کے دروازے پر ادب کی خدمت کا سلوگن نہیں لگایا — میرے دل میں ادب کی خدمت کا قطعاً کوئی جذبہ نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ ادب کی خدمت سے تو ماں باپ کی خدمت بہتر ہے۔ ماں باپ کی خدمت سے جنّت حاصل ہوتی ہے۔ ادب کی خدمت سے کیا ملتا ہے؟ ادب کی خدمت کرنے والا زیادہ سے زیادہ ادب چچا یا بابا بن جاتا ہے۔ مَیں ادب کی خالہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ مَیں ادب کی خادم نہیں بننا چاہتی تھی۔ مَیں تو ادب کی خالق بننا چاہتی تھی۔ چنانچہ مَیں نے اپنے اسٹڈی رُوم کا دروازہ کھولا تو رِکّی، مکّی، ڈکی اور للی، نیلی، ایلی میرے اِردگرد جمع ہو گئے اور دست بستہ ہو کر بولے۔

"اے نابغۂ روزگار! اے ادب کی رُوح! ارشاد!"

مَیں نے غرور سے تن کر کہا۔

"جناب والا، جب ہم پبلک کو اپنا افلاطونی نام بتائیں گے تو پبلک غش کھا کر گر پڑے گی۔"

ڈکّی شرارت آمیز لہجے میں بولا۔

"تو اے طبیبۂ ادب، مورفیا کا انجیکشن جلدی۔"

مَیں نے اس کی ہنسی کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارا افلاطونی نام 'چشمِ آئینہ حیرت' ہوگا۔"

وُہ سب ہنس پڑے۔

ڈکی نے کہا۔

"مجھے تو یہ کسی حیرت انگیز سُرمے کا نام معلوم ہوتا ہے۔ جس کا استعمال آنکھوں کی جلن، ورم، سُرخی، دُھند، جالا، پڑوال اور موتیا بند کو رفع کرتا ہے۔ نظر تیز کرتا ہے اور آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کرتا ہے۔"

وُہ قہقہے مارنے لگے۔

للی نے کہا

"مجھے تو یہ کسی کتاب کا نام معلوم ہوتا ہے۔ جیسے طلسم ہوشربا عرف چشمِ آئینہ حیرت۔"

مسز جادو دانی کی ان باتوں پر لڑکیاں قہقہے مارنے لگیں۔ مسز جادو دانی نے اپنا دمٹو کا گلاس اُٹھا لیا اور سِپ کرنے لگی۔ جب قہقہے بند ہو گئے تو وہ بولی۔

"مَیں یہ کہنا چاہتی ہُوں کہ مَیں نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز ادب کی خدمت کے جذبے سے مغلوب ہو کر نہیں کیا تھا۔ مَیں نے تو صرف ڈکی ٹکی۔ ڈکی اور للی، ببلی۔ ایمی کو چڑانے کے لئے افسانے لکھنے شروع کئے تھے۔ وُہ زندگی میں میرے ساتھ ایکٹوٹی کرتے تھے۔ مَیں افسانوں میں ان سے انتقام لیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب مَیں نے پہلی دفعہ ان کو اپنا افسانوی نام بتایا تو انہوں نے میرا خوب مذاق اُڑایا اور جب مَیں نے ان کو اپنا پہلا افسانہ سُنایا تو انہوں نے مجھے خوب پیٹا۔ وُہ مجھے پیٹتے رہے مَیں لکھتی رہی۔ مَیں صرف اپنے بہنوں بھائیوں اور دوستوں کے لئے لکھتی تھی۔ مَیں اردو نہیں جانتی تھی۔ مَیں تو کونونٹ اسکولوں کی اسٹوڈنٹ ہُوں۔ میری اردو تو اردو رسم الخط میں لکھی ہُوئی انگریزی ہوتی ہے اور یہ ضروری تھا۔ اگر مَیں ایسی اُردو نہ لکھتی تو میرے قارئین، میرے بہن، بھائی اور دوست میرے افسانے نہ پڑھتے۔ کیونکہ وُہ بھی اردو نہیں جانتے اور مَیں صرف اپنے بہنوں، بھائیوں اور دوستوں کے لئے لکھتی تھی۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ میرے بہنوں۔ بھائیوں اور دوستوں کے علاوہ کوئی اور

بھی میرے افسانوں کو پڑھتا ہوگا۔ اِس لئے میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ایک دِن دفعتاً مجھے تجمّل جاودانی کا خط مِلا۔

میں تجمّل جاودانی کی مدّاح تھی۔ کالج کے دِنوں میں جب مُلک کے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کا مطالعہ میری ہوبی تھا، تجمّل جاودانی اور میراجی کا کلام مجھے سب سے زیادہ پسند تھا اور جب ادیبوں کو خط لکھنے اور ان کے آٹوگراف لینے کا رواج عام ہوگیا تو سب سے پہلے جس ادیب کو میں نے لکھا، وُہ تجمّل جاودانی تھا۔ وُہ خط بڑا مُختصر ہے اور مجھے ابھی تک یاد ہے۔ میں نے لکھا تھا!

"جاودانی، میرے محبُوب شاعر!

اتنا مُشکل کلام کہ مُطلق سمجھ میں نہ آئے اور اِتنا دلکش کلام کہ دِل کی گہرائیوں میں اُتر جائے۔

(رضیہ قزلباش)

میرے دِماغ کی تعمیر عجیب وغریب اجزا سے ہوئی ہے۔ میں اِن اشیاء کی طرف جو میرے ادراک سے باہر ہوں بے پناہ جاذبیّت محسوس کرتی ہوں۔ میں سب شاعروں کا کلام سمجھ لیتی تھی لیکن دو شاعر میری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ میراجی اور تجمّل جاودانی۔ میں اپنے آپ میں میراجی سے خط وکتابت کرنے کی شدید تمنّا پاتی تھی۔ لیکن جُرأت نہ کرسکتی کیونکہ وُہ نارائن گنج کی ایک بنگالی لڑکی، میرا سین سے جو میری کلاس فیلو تھی والہانہ محبّت کرتا تھا اور کسی لڑکی کا کسی ادیب کو خط لکھنا اظہارِ محبّت کے بغیر اظہارِ مُحبّت ہے تو کیا میں نے تجمّل جاودانی سے اظہارِ محبّت کیا تھا۔ پھر اُس نے جواب کیوں نہیں دیا۔ تجمّل جاودانی نے میرے کسی خط کا جواب نہ دیا اور میں مایُوس ہوگئی۔

مسز جاودانی نے وِمٹو کے دو تین گھونٹ لئے۔ عورتیں اور لڑکیاں اِس طرح بے حس و حرکت بیٹھی ہیں جیسے کسی جادُو کے اثر میں ہوں۔ مسز جاودانی نے وِمٹو کا گلاس تپائی پر رکھ دیا۔

میں نے کہا تھا، چنانچہ میری ادبی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ اِس جملے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے بٹن دبایا اور افسانوں کا بلب جل گیا۔ یہ بات نہیں تھی۔ مجھے مہینوں یہ سوچنا پڑا تھا کہ ادب میں مجھے کون سا راستہ اور کون سا اسلوب اختیار کرنا ہے۔ بہت غور و خوض کے بعد آخر میں نے اپنے فیصلے کا اپنے آپ پر اعلان کیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا! بہت قسم کے اور ہر قسم کے افسانے لکھے جا چکے ہیں لیکن سمجھ میں نہ آنے والے افسانے ابھی تک نہیں لکھے گئے" اور نہ شاعری کی گئی اور نہ ہی ناقابلِ فہم تجریدی آرٹ پیش کیا لیکن اب تک ناقابلِ فہم افسانہ UNTOUCHED BY HAND پڑا ہے۔ ابہام سے لبریز شاعری اور حیران کر دینے والے ABSTRACT ART کی ہر دلعزیزی کے پیشِ نظر اِس وقت ادب میں ABSTRACT STORY کے مقبول ہونے کے بہت امکانات ہیں۔ میں نے ABSTRACT STORY ایجاد کی لیکن اِس ایجاد کے پیچھے ایک اور وجہ بھی تھی۔ افسانہ نگاری سے پہلے مدت تک پینٹنگ میری ہوبی رہی تھی۔ میں نے اپنی پینٹنگ کی اِبتدا ABSTRACT ART سے کی تھی کیونکہ ABSTRACT ART سے کی تھی۔ کیونکہ ABSTRACT ART ہر آرٹ سے آسان ہے ABSTRACT ART پر نکتہ چینی ناممکن ہے۔ مبتدیوں اور جاہلوں کے لئے یہ آرٹ بہت محفوظ ہے۔ اگر کسی دوشیزہ کا حسین چہرہ بناتے بناتے بھیڑ کا تھن بن جائے اور اس کے گداز بازو اور نازک انگلیاں بناتے بناتے بارہ سنگا بن جائے اور اس کا نوجوان سینہ بناتے بناتے شکر قندی بن جائے، اور اُس کے دلفریب پاؤں بناتے بناتے ہاتھی کے کان بن جائیں تو یہ ABCTRACT ART کا ایک شاہکار ہوگا۔ آپ اِس شاہکار کا نام دریائے راوی رکھ کر فریر ہال میں نمائش کے لئے لٹکا سکتے ہیں اور اگر نادان پبلک آپ سے دریائے راوی جیسے تجریدی شاہکار کے معنے پوچھنے بیٹھ جائے تو آپ اِس کی طرف حقارت سے دیکھیں اور کہیں، اگر میں آرٹ کا آرٹ کا مطلب الفاظ میں بیان کر سکتا تو میں آرٹسٹ نہ ہوتا، ادیب ہوتا۔ چنانچہ میں نے

اپنے تجریدی آرٹ کے بہت سے نادر نمونے اپنے بہنوں بھائیوں اور دوستوں کے سامنے پیش کئے۔ انہوں نے پہلے تو ان کا خوب مذاق اڑایا پھر ان کو زمین پر پٹخ پٹخ دیا اور میں ان کے سوالوں کے جواب میں یہ کہتی کہتی تھک گئی کہ اگر میں آرٹ کا مطلب الفاظ میں بیان کر سکتی تو میں آرٹسٹ نہ ہوتی ادیب ہوتی، آخر میں ایک دن اپنے تجریدی شاہکاروں کا مطلب الفاظ میں بیان کرنے بیٹھ گئی۔ میں آرٹسٹ سے ادیب بن گئی اور میں نے ABSTRACT STORY ایجاد کر دی۔ میرا افسانہ زندگی کا آئینہ نہیں۔ میری کہانیاں میرے بہنوں بھائیوں اور دوستوں کے BAD MANNERS کی حکایات ہیں۔ میرے افسانے شائع ہوئے تو ملک میں چاروں طرف سے میرے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ مجھے پوسٹ مین کو اپنے خطوط کے بنڈلوں کے لئے ایک جدا تھیلا خرید کر دینا پڑا۔ یہ خطوط میرے پاس مختلف شکلوں میں ایک ہی مضمون لیکر آتے تھے۔ اس مشترک مضمون کو میں اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کر سکتی ہوں، محترمہ چشم آئینہ حیرت صاحبہ آپ کا افسانہ پڑھا، ممنون ہوں گا اگر آپ اس افسانے کا ترجمہ سلیس اردو میں جیسیں انگریزی کے الفاظ قطعاً نہ ہوں روانہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ جواب کے لئے ٹکٹ ارسال کرتا ہوں، جواب کا منتظر وغیرہ وغیرہ۔ در اصل میرے خطوں کی تعداد میری شہرت کا استعارہ تھی۔ میری افسانہ نگاری کی شہرت NEGATIV شہرت تھی۔ کیونکہ میری افسانہ نگاری کی APPROACH بھی NEGATIV تھی۔ لیکن بجلی کا ایک ہی تار کہیں NEGATIV ہوتا ہے اور کہیں POSITIVE اس لئے NEGATIV شہرت اور POSITIV شہرت کا امتیاز فضول تھا۔ میں خوش تھی۔ میں نے اپنی چھوٹی سی ادبی زندگی میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اور جب میرے ادب نے بچپن چھوڑ کر لڑکپن میں قدم رکھا تو میرے ذہن میں اپنی NEGATIVE شہرت کیخلاف ردِ عمل شروع ہو گیا۔ مجھے یہ خیال ستانے لگا کہ لوگ میرے ادب کو پسند نہیں کرتے۔ پھر یکایک ملک کے تمام تنقید نگاروں نے بہ یک زبان میری افسانہ نگاری کو بری طرح کنڈم کر دیا۔ میں مایوس ہو گئی۔ میں اداس رہنے لگی۔ میرا دل چاہتا کہ میں اس ناقدر شناس دنیا سے اڑ کر کہیں دور چلی جاؤں۔ دور، ستاروں سے آگے۔ گمنام فضا ؤں میں ...

قریب تھا کہ میں اپنے خوفناک ارادے کو عملی شکل دیتی کہ مجھے "تجمل" جاودانی کا خط ملا۔"

تجمل جاودانی کا مختصر خط مجھے اب بھی یاد ہے۔ اس نے لکھا تھا، محترمہ! میں آپ کے افسانے سمجھ نہیں سکتا اور میں آپ کے افسانے کا دیوانہ ہوں۔ کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں ایسا کیوں ہے؟"

میں نے اپنے خطوں میں پہلی دفعہ نئی آواز سنی تھی۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جاودانی کا خط اور ایسا خط۔ لیکن اس خط کا دوسرا پیراگراف زیادہ چونکا دینے والا تھا۔ دوسرا پیراگراف یہ ہے ——

"بہت مدت ہوئی مجھے ایک خط ملا تھا جاودانی، میرے محبوب شاعر، اتنا مشکل کلام کہ مطلق سمجھ میں نہ آئے اور اتنا دلکش کلام کہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائے! رضیہ قزلباش —— میں نے اس خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ اگر آپ چاہیں تو آپ بھی مجھ سے ایسا سلوک کر سکتی ہیں ——

جاودانی —— اور اس طرح ہمارے درمیان خط و کتابت کا ایک بڑا خوشگوار سلسلہ شروع ہوا۔

ان دنوں ادب کے راج مزدور جو اپنے آپ کو تنقید نگار کہلانا پسند کرتے ہیں، تین ادیبوں کے خلاف بری طرح لکھ رہے تھے۔ میراجی کے خلاف، جاودانی کے خلاف اور میرے خلاف۔ ان تنقید نگاروں کی بد ذوقی سے متاثر ہو کر میں نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا۔ تین حسین، ان کے چیدہ چیدہ فقرے مجھے یاد ہیں۔ پہلے فقرے تھے۔ کربلا کے میدان میں صرف ایک حسین تھا۔ ادب کے میدان میں تین حسین ہیں۔ کربلا کے میدان میں ایک حسین کو یزید کی فوج نے شہید کر دیا۔ ادب کے میدان میں تین حسین اکیلے ادب کو شہید کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی کو کیا معلوم ہے کہ ادب کا پوسٹ مارٹم کرنے والے یہ لوگ یزید کی فوج کے سپاہی ہیں جو اپنے نام کے آگے حسین لگا کر پھر رہے ہیں۔ انہیں کوئی پہچان نہ لے۔ یہ لوگ اپنے نام کے ساتھ اس لئے حسین لگا لیتے ہیں کہ لوگ ان کو قاتل اور غارت گر نہ سمجھیں، بلکہ شہید ادب سمجھیں۔ اس کے بعد میں نے میراجی، جاودانی اور اپنے ادب پر ان نام نہاد تنقید نگاروں کے زہریلے اثر کا تذکرہ کیا اور اچھوا خر کے فقرے سننے والے ہیں، آخر میں میں نے لکھا: ——

اے خدا تیرے یزید کہاں ہیں؟ کربلا کے میدان میں دنیا کے عزیز ترین حسین کو تمام دنیا کی

تمنّاؤں اور دُعاؤں کے خلاف تو نے یزید کی فوج سے شہید کرا دیا اور اب ادب کے میدان میں ہزاروں حسین ہتھیار باندھے پھر رہے ہیں۔ یا خُدا تیرے یزید کہاں ہیں۔ یا خُدا تیرے یزید کہاں ہیں —"

اِس مضمون کے شائع ہونے کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ مجھے میراجی نے خط لکھا خط میں صرف ایک لفظ تھا "مُبارکباد!" اِس ایک لفظ میں میراجی کی شخصیت سمٹ کر میرے سامنے آگئی۔ گذرے ہوئے زمانے کی یاد بجلی کی طرح آنکھوں کے سامنے تڑپنے لگی۔ ثناء اللہ جو ابھی میراجی نہیں بنا تھا۔ میری مغرور کلاس فیلو میراسین جو خوبصورت نہیں تھی، دلکش تھی، اور وُہ ثناء اللہ جس نے میراسین سے جسمانی قرب نا ممکن پاکر اُس سے ایک ابدی رُوحانی قرب حاصل کرنے کے لئے اپنا نام بدل کر میراجی کر لیا اور پھر وہ سین جب میراجی نے میراسین سے پہلی دفعہ بات کرنے کی کوشش کی اور میراسین اُس کے پاس سے بالکل خاموش اس طرح گذر گئی جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہیں تھا اور پھر یہ خبر کہ میراجی کو چند غنڈوں نے مار مار کر ادھ موا کر دیا اور وُہ صبح تک سڑک پر بیہوش پڑا رہا۔ اِس کے بعد میں نے میراجی کو کبھی نہیں دیکھا اور نہ کچھ اُس کے بارے میں سُنا۔ میں نے اُس کے خط کا فوراً جواب دیا۔ پھر ایک اور جواب دیا۔ پھر ایک اور جواب دیا۔ لیکن میراجی نے اِس کے بعد مجھے کوئی خط نہ لکھا۔ میں شرمندہ ہوئی۔ اِس عرصے میں میں جاوداؔنی کو بھی بھول گئی۔ میں نے بٹر پیڈ پیڈ اُٹھایا اور لکھنا شروع کیا۔

"تجمل! میں نے سُنا ہے تم نے بڑی ترقی پسندیاں دکھانی شروع کر دی ہیں۔ گندے رہتے ہو کئی کئی دن شیو نہیں کرتے۔ آوارہ پھرتے ہو۔ شراب بھی پینے لگ گئے ہو اور خُدا اور سماج کے خلاف باغی ہو گئے ہو۔ اگر تم اِن حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے تو یاد رکھنا کہ میں تمہاری شادی کر دُوں گی۔"

ایک دن میں ممّی کے پاس ڈرائنگ رُوم میں بیٹھی تھی۔ ڈیڈی آئے اور حسبِ معمول ڈاک تقسیم کرنی شروع کر دی۔ اُنہوں نے میرا خط مجھے دے دیا۔ ممّی کا خط ممّی کو اور باقی خط اپنے پاس رکھ لئے اور صوفے پر بیٹھ اپنے خط کھولنے اور پڑھنے شروع کر دیئے۔ یکایک ممّی چلّا اُٹھیں۔

"ارے ہاں! یہ تو اختر کی فوٹو آئی ہے۔ دیکھوں تو کیا لکھا ہے،" اختر کی ماں نے۔"
وہ تھوڑی دیر تک خط پڑھتی رہیں، پھر خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں، اور وہ چلائیں۔
"ارے سنو! اختر نے آئی سی ایس کا امتحان پاس کر لیا ہے۔ وہ انگلستان جا رہا ہے ٹریننگ کے لئے۔ اختر کی ماں منگنی پر زور دے رہی ہیں۔"

میں نے اپنا خط کھولا اور پڑھنے لگی "روزی! میں نے فیصلہ کر لیا ہے، میں شادی کروں گا تم سے، صرف تم سے۔

تمہارا اجمل!

ممی نے تصویر میری طرف بڑھائی، میں نے تصویر تپائی پر رکھ دی۔ ممی پھر چلا اٹھیں۔
"ارے ہے، کیا کرتی ہو؟ میں نے دیکھنے کے لئے دی ہے تصویر تمہیں۔ دیکھو پسند کر لو اپنے ہونے والے دولہا کو۔"
میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔
"ممی، مجھے بڑی بری خبر ملی ہے۔ میری سہیلی سخت بیمار ہے۔ مجھے بلایا ہے۔ میں آج رات کی گاڑی سے دہلی جا رہی ہوں!
میں اپنے کمرے میں چلی گئی اور اپنے بستر پر دھڑام سے گری۔
دہلی کے ایک مشاعرے میں ہندوستان کے تمام شعراء شریک ہونے والے تھے۔ جاودانی کو دیکھنے کا بہترین موقع تھا۔ میں نے اپنی بے ادب سہیلی اور اس کی بے ادب ماں کو بڑی مشکل سے سینما کا پروگرام کینسل کرنے پر مجبور کیا۔ ہم مشاعرے میں دیر سے پہنچے۔ مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ میں نے ہال کے دروازے میں قدم رکھا، میں وہیں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اسٹیج پر میراجی کھڑا تھا۔
ہائے اللہ میراجی کو کیا ہو گیا ہے .... بھوری آنکھوں والا خوبصورت شاعر اللہ کہاں ہے اور یہ بڈھا، کھاؤتا، لمبی لمبی جٹوں والا، رودری منکوں کی مالا والا، لمبے گندے چغے والا جوگی کہاں سے آ گیا ہے اور اس کے ہاتھوں میں یہ لوہے کے گولے کیا ہیں؟

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔

میراجی کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اُس کی سُرخ انگارہ پھٹی پھٹی آنکھوں میں شراب سے لبریز جھیلیں جھانک رہی تھیں۔ اِس کا جسم خزاں کے زرد پتّے کی طرح کپکپا رہا تھا۔

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔

یکایک میراجی کے ہاتھ سے لوہے کے گولے چھوٹ کر اسٹیج پر گر پڑے۔ میراجی نے دونوں ہاتھوں سے ڈسک کا کنارہ پکڑ لیا اور ڈسک کی ڈھلوان سطح پر اپنا ماتھا رکھ دیا۔ اُس کا جسم دو تین دفعہ اِدھر اُدھر لہرایا اور پھر دھڑام سے اسٹیج پر گر پڑا۔

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔

شام کو میری جاودانی سے پہلی مُلاقات ہُوئی۔ مَیں نے پُوچھا۔

"تجمل، میراجی کو کیا ہوگیا ہے؟"

"میراسین کا غم۔"

"اور اِس کے اسٹیج پر اِس بُری طرح سے گرنے کی وجہ؟"

"میراسین کی شادی۔"

"میراسین کی شادی ہوگئی ہے۔"

"آج صبح میراجی نے اخبار میں پڑھا کہ مشہور لیڈی ڈاکٹر میراسین کی شادی مُرشد آباد کے کلکٹر مسٹر سریندر ناتھ مکرجی سے ہوگئی ہے۔ وُہ صُبح سے شراب پی رہا ہے۔"

"او میراسین! ظالم، سفاک لڑکی!"

"معلوم ہوتا ہے آپ پر اِس واقعے کا بہت گہرا اثر ہُوا ہے۔"

"اِس واقعے کا تمام دُنیا پر بہت گہرا اثر ہُوا ہوگا۔"

"پھر آپ نے میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔"

"تمہارے خط کا جواب نہیں آیا۔ مَیں آگئی ہوں۔"

"او میرے خدا! تم آگئی ہو روزی۔"

"تحمل، میں آگئی ہوں، میں ہمیشہ کے لئے آگئی ہوں۔"

اور ہماری شادی ہوگئی۔

اور تمام ہندوستان میں زلزلہ آگیا۔

اور اخباروں نے اعلان کیا — NAWAB QAZILBASH DIES HEART FAILURE

اور پھر ہندوستان کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

اور ہم پاکستان میں آ گئے۔

مسز جاودانی نے وسکی کا گلاس اُٹھایا اور سِپ کرنا شروع کر دیا۔

عورتوں اور لڑکیوں نے داد سے ہنگامہ برپا کر دیا اور آپس میں بیگم جاودانی کی جادو بیانی پر تبصرہ کرنے لگیں۔

"دیکھا میں نہ کہتی تھی ہمیں نے جان کے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی شادی اور شوہر کے بارے میں باتیں کریں۔"

"بھئی میں تو سارا وقت یہ محسوس کرتی رہی جیسے اسکرین پر کوئی فلم دیکھ رہی ہوں۔"

"لیکن اس پکچر کا بہترین حصّہ تو اب آنے والا ہے۔ یہ تو شادی کی باتیں تھیں اب شوہر کی باتیں ہوں گی۔"

ایک لڑکی نے کہا "جاودانی صاحب کو دیکھنے کا ہمیں بھی بہت اشتیاق ہے۔ کیا ہم مل سکتے ہیں اُن سے؟"

ایک عورت نے کہا "چپ جاؤ لڑکیو! بیچ میں مت کودو۔ ہاں مسز جاودانی۔"

یکا یک کلب کی لان کی طرف سے بڑے بڑے قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ چند عورتوں اور چند مردوں کا ایک گروپ لان میں کھڑا ہُوا بُری طرح سے ہنس رہا تھا۔

مسز جاودانی نے اِس گروپ کی طرف غور سے دیکھا۔

اسمیں شہر کا کمشنر ایس۔ ایم خان تھا۔ اُس کے کالج کے بورڈ آف گورنرز کا چیئرمین فرید احمد تھا۔ لوکل کالجوں کے کچھ پرنسپل اور پروفیسر تھے۔ کچھ اور مرد اور عورتیں تھیں۔ جن کو وہ نہیں جانتی تھی۔

مسز جاودانی نے وہسکی کا گلاس ٹرے میں رکھ دیا اور بولی۔

"اور اب میں ایسا محسوس کرتی ہوں جیسے میرے صحن میں خوشبودار پھولوں کا ایک نازک پودا اُگا ہوا ہے۔ میں اسمیں آبیاری کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اگر میں اُسکی آبیاری نہ کروں گی تو وہ مرجھا کر سوکھ جائے گا۔ میں یہ جانتی ہوں کہ اگر میں اُسکی آبیاری کرتی رہوں گی تو اسکے پھولوں کی خوشبو تمام دنیا میں۔"

یکایک مسز جاودانی کو حیرت سے تکنے لگیں۔ پھر سب کی نظریں اُس سمت میں چلی گئیں جدھر مسز جاودانی دیکھ رہی تھی۔ ایک عورت خواتین کے اس مجمع کی طرف آ رہی تھی۔ سنہری اور سرخ بورڈ والی سبز ساڑی، سانولی، سلونی، دلفریب عورت!

مسز جاودانی اُچھل پڑی۔

"ہیلو میرا!"

"ہیلو روزی!"

دونوں بغل گیر ہو گئیں اور پھر نہایت گرمجوشی سے باتیں کرنے لگیں۔

"ارے میرا کی بچی! کتنا بڑا سرپرائز! کدھر سے آ ٹپکیں تم؟"

"نرائن گنج جا رہی ہوں۔ لیلی کی شادی ہے۔"

"ارے لیلا! وہ گڑیا سی لیلا۔ اب اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اب اُس کی شادی ہے۔"

"آج شام کے پلین میں کلکتے سے آئی ہوں۔ کمشنر ایس۔ ایم۔ خاں کے ہاں ڈنر تھا۔ وہ یہاں نئے سال کی پارٹی میں مدعو تھے۔ ہمیں بھی ساتھ لے آئے۔"

"اور دولہا بھائی"

"ملاؤں گی۔"

"اور لیلا کی شادی کہاں ہو رہی ہے۔"

"نرائن گنج کاڈی۔ ایس۔ پی۔ دلاور خاں۔ یہ لوگ لاہور میں ہمارے پاس ہی پرانی انارکلی میں رہتے تھے۔"

"وہی میری پیاری سوشلسٹ میرا! ہندو مسلم شادی کی قائل۔"

"تم جانتی ہو مجھے اس مذہب سے نفرت ہے جو انسان کو ہندو اور مسلم بناتا ہے۔ میں اس مذہب کی قائل ہوں جو ہندو اور مسلم کو انسان بناتا ہے۔"

مسز جاودانی نے میرا کو کرسی پیش کی۔ میرا بیٹھ گئی۔ مسز جاودانی بھی بیٹھ گئی۔

کچھ دیر تکلیف دہ خاموشی چھائی رہی

پھر ایک شوخ سی لڑکی نے کہا۔

"اچھا تو یہ ہیں میرا سین"

ایک اور لڑکی طنز آمیز لہجے میں بولی۔

"میرا جی کی قائل!"

پھر ایک زہریلے لہجے والی نوجوان عورت بول اٹھی۔

"ظالم، سفاک لڑکی۔"

میرا سین نے طنز کرنے والی پہلی لڑکی کو غور سے دیکھا۔ پھر دوسری کو۔ پھر تیسری کو۔ پھر اس کی نظریں مجمع کی سب خواتین پر سے گذر کر مسز جاودانی پر ٹھہر گئیں اور اس نے اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"روزی، تم میرے خلاف باتیں کرتی رہی ہو؟"

"نہیں تو میرا"

ایک عورت نے جلدی سے روزی کی مدد کی۔

"یہ تو تجمل جاودانی کی باتیں کر رہی تھیں۔ ہم سب باری باری اپنے اپنے شوہروں اور شادیوں کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ان کی شادی تجمل صاحب سے کیسے ہوئی؟"

میرابین کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی کرسی کے پیچھے آگئی اور اس کی پیک پکڑ کے اس طرح کھڑی ہوگئی جیسے وہ کوئی لمبی تقریر کرنے والی ہو، اُس نے سب عورتوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"معزز خواتین یہ لڑکی، روزی، جو آپ کو اپنے تجمل جاودانی کے افسانے سُناتی رہی ہے تجمل جاودانی کی قاتل ہے۔"

روزی نے جلدی سے اپنی نظریں میرابین پر ڈالیں اور پھر مسکرا کر نیچے کر لیں۔ عورتوں اور لڑکیوں میں ایک تازہ دلچسپی جاگ اُٹھی۔ وہ متوحش نظروں سے میرابین کو دیکھنے لگیں۔

"اور میں میراجی کی قاتل ہوں۔ ہم دونوں نفرت کے قابل ہیں۔ آپ صرف مجھے نفرت کی نظر سے نہ دیکھیں۔ روزی کو بھی نفرت کی نظر سے دیکھیں۔"

ایک تیز طرار لڑکی بول اُٹھی۔

"واہ! ہم رضیہ آپا کو نفرت کی نگاہ سے کیوں دیکھیں، انہوں نے آرٹ کے لئے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔"

"لڑکی! کیا تجھے یقین ہے کہ روزی نے آرٹ اور تجمل جاودانی کو موت سے بچایا ہے؟ کیا تجھے یقین ہے کہ روزی اتنی بڑی قربانی دینے کے بعد پشیمان نہیں ہے؟"

"یقین ہے۔ بالکل یقین ہے۔"

میرابین چند لمحے لڑکی کی طرف چُپ چاپ دیکھتی رہی۔ پھر اُس کی نگاہیں لڑکی سے ہٹ کر سارے مجمع پر پھیل گئیں اور وہ ایک لمبی تقریر پر آمادہ ہوگئی۔

"معزز خواتین! مجبوراً مجھے ان چند واقعات کا اعادہ کرنا پڑے گا جو غالباً آپ پہلے ہی جانتی ہیں اور جن کے بارے میں مجھے آپ سے زیادہ علم ہے ___ روزی اور جاودانی کی شادی ایک بہت بڑا معجزہ تھا۔ اِس معجزہ کا احساس تمام مُلک کو تھا۔ لیکن جو شخص اِس معجزے سے سب سے زیادہ شدّت کیساتھ متاثر ہوا وہ تجمل جاودانی تھا۔ تجمل جاودانی جو روزی کے

ساتھ شادی سے پہلے مذہب سے متنفر تھا۔ جوا کھیلتا تھا، اُدھار مانگنے کا عادی تھا۔ کبھی کبھی مجبور ہو کر چوری بھی کر لیتا اور کثرت سے شراب پیتا تھا اور شاعری کرتا تھا واقعی یہ مُلک کے ایک بہت بڑے خاندان کی حسین و جمیل لڑکی کی بہت بڑی قربانی تھی۔ تجمل جاودانی نے اس قربانی کی قدر کی۔ اس نے قربانی کا جواب قربانی سے دیا۔ اس نے اپنے کردار کے عزیز ترین عنصروں کو روزی کی اداؤں پر قربان کر دیا۔ "خُدا اور مذہب کا قائل ہو گیا۔ اُس نے جُوا اور چوری چھوڑ دی۔ اُس نے اُدھار مانگنا ترک کر دیا۔ اس نے شراب چھوڑ دی۔ وہ چھ وقت نماز پڑھنے لگا۔ اُس نے ڈیڑھ فٹ لمبی داڑھی رکھ لی اور سر پہ اُسترا پھروا دیا۔"

کچھ کم عمر لڑکیاں دبی دبی آوازیں ہنسنے لگیں۔

میرا سین ایک لمحے کے لئے چپ ہو گئی تاکہ اس کے الفاظ کا اثر سامعین کے ذہنوں میں پُوری طرح اُتر جائے۔

پھر وہ اس لڑکی سے جو ابھی ابھی اس سے باتیں کر رہی تھی، بولی۔

"لڑکی، کیا میں تمہارا نام پُوچھ سکتی ہوں؟"

"پروین"

"پروین، ذرا اپنی رضیہ آپا سے پُوچھنا کہ جب ان کی تلقین کے مطابق تجمل زندگی کے ہموار راستے پر آ گیا تھا تو وہ اس کو جھڑکتی رہتی تھیں۔"

"توبہ، میرا، میں کب جھڑکتی تھی انہیں، البتہ داڑھی منڈانے کے لئے اکثر اصرار ہوتا تھا۔"

میرا سین نے پھر تقریر کا لہجہ اختیار کر لیا۔

"معزز خواتین، ایک کونونٹ اسکول کی پڑھی ہوئی ایم اے بی ٹی خوبصورت فیشن ایبل لڑکی اس دُنیا کی کسی چیز سے اتنی نفرت نہیں کرتی جتنی داڑھی سے اور میری پیاری نازک بدن روزی اپنے ڈیڑھ فٹ لمبی داڑھی والے اور چمکدار انڈے سر والے شوہر کو چاٹے بنا کر دے

رہی ہے ۔ چنانچہ داڑھی منڈانے کا اصرار بڑی بڑی خوں ریز جنگوں کی شکل میں سامنے آنے لگا اور ایک دن روزی نے غُصّے کی انتہا میں تجمل کی داڑھی پکڑ کے زور زور سے ہلائی اور کہا کہ اگر وُہ اِس کو منڈانے کا وعدہ نہیں کرے گا تو وُہ اس کو کھینچ کھینچ کر ابھی اُکھاڑ پھینکے گی۔ تجمل نے وعدہ کیا کہ اپنی اگلی سالگرہ پر جو پندرہ دِن کے بعد آنے والی تھی، کلین شیو زندگی کا آغاز کرے گا ۔ لیکن روزی اور تجمّل کی متحدہ کوششوں کے باوجُود داڑھی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ تجمل کی سالگرہ کے دِن داڑھی بدستُور روزی اور تجمّل کے درمیان لٹکتی رہی۔ ہُوا یہ کہ کلین شیونگ ڈے سے پہلے فریدملز لمیٹڈ کے مالک مسٹر فریداحمد نے اِس کی خزانچی کی جگہ کے درخواست کے جواب میں تجمل کو انٹرویُو کے لئے بُلا لیا۔ مسٹر فریداحمد نے تجمل کو جو مومن کی شکل اور داڑھی سے مزیّن تھا دوسرے تیس داڑھی مُنڈے اُمیدواروں کے مقابلے میں، خزانچی کی آسامی کے لئے چُن لیا ۔ اب داڑھی ایک ڈپلوما تھی ۔ ایک سائن بورڈ تھی ۔ اب اِسکو اپنی جگہ سے کون ہلا سکتا تھا۔ اس کے دو دِن بعد روزی کا مُسلم گرلز کالج کی پرنسپل کی آسامی کے لئے انٹرویو تھا۔ اِتفاق سے فریدملز لمیٹڈ کا مالک "مسٹر فریداحمد ہی مُسلم گرلز کالج کا مالک اور بورڈ آف گورنرز کا چیئرمین بھی تھا ۔ چنانچہ نوجوان ، خوُبصورت ، سمارٹ روزی نے انٹرویُو میں اپنی عالمانہ اور ادیبانہ باتوں سے مسٹر فریداحمد کو بے حد مُتاثر کیا اور جب ایک سوال کے جواب میں اسے معلوم ہُوا کہ روزی کا شوہر ڈیڑھ فٹ لمبی داڑھی والا لمبا، چمکدار اور بڑے والا تجمل ہے جو فریدملز لمیٹڈ کا خزانچی مقرّر ہُوا ہے تو اُس نے سولہ تجربہ کار پرانی اُمیدواروں کو چھوڑ کر روزی کو کالج کا پرنسپل مقرّر کر دیا۔ اب تجمل کی داڑھی روزی کے ہاتھوں سے نکل کر فریداحمد کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔ فریداحمد کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس کی فریدملز لمیٹڈ کا خزانچی ڈیڑھ فٹ داڑھی والا ہوتا اور فریداحمد کے لئے یہ اور بھی زیادہ ضروری تھا کہ اُس کے کالج کی پرنسپل کا شوہر ڈیڑھ فٹ داڑھی والا ہوتا اب داڑھی روزی اور تجمل کے درمیان نہیں لٹک رہی تھی۔ اب روزی اور تجمل داڑھی کے ساتھ لٹک رہے تھے ۔

ہنسی کی دبی دبی آوازیں آنے لگیں۔
روزی غصّے میں بولی۔
" STOP THAT NEUSENSE MIRA "
ایک نوجوان لڑکی نے کہا۔
"مت روکئے رضیہ آپا، لُطف آرہا ہے"
میراسین نے اُس لڑکی سے پُوچھا۔
"لڑکی تمہارا نام کیا ہے؟"
"جہاں آراء"
"کونسی کلاس کی اسٹوڈنٹ ہو؟"
"ایف۔ایس سی۔ سیکنڈایر۔ بائی اولوجی۔ فزکس۔"
"اور تم پروین؟"
"مَیں بھی ایف۔ایس سی سیکنڈائر میں ہُوں۔ یہی مضمون۔"
"جہاں آرا! پروین! کیا آپ بھی میری باتوں کو نون سنس سمجھتی ہیں؟"
جہاں آرا نے کہا۔
"جی نہیں ہمیں تو یہ باتیں پہلے سے معلوم ہیں۔ رضیہ آپا میری خالہ زاد بہن ہوتی ہیں۔ ہمارا سارا خاندان اِس شادی کےخلاف تھا۔"
پروین نے اور چند اور لڑکیوں نے جو ابھی تک ہنس رہی تھیں، کہا۔
"آپ اپنی باتیں جاری رکھیں۔"
میراسین نے کہا۔
"ایک دفعہ کا ذکر ہے روزی اور مسٹر فرید کار میں سینما سے واپس آرہے تھے جب ان کی کار مینا ہوٹل کے سامنے پہنچی تو اُنہوں نے ہوٹل کے سامنے لوگوں کا ہجوم دیکھا جو ہوٹل میں

اندر کسی کو دیکھ کر قہقہے لگا رہا تھا۔ لوگوں کے ہجوم نے سڑک روک دی تھی اِس لئے فرید احمد نے کار کو آہستہ کر لیا۔ کار لوگوں سے بچتی ہوئی ہورن بجاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک مسٹر فرید احمد کی نظر ہوٹل کے اندر چلی گئی۔ مسٹر فرید احمد نے بوکھلا کر کار کو بریک لگا دی اور روزی کو ساتھ لے کر ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ ایک میز پر بیئر کی اٹھارہ خالی بوتلیں پڑی تھیں اور بیئر کی اِن اٹھارہ خالی بوتلوں کے پاس بیئر کی ایک آدھی بوتل پڑی تھی اور بیئر کی ایک آدھی بوتل پڑی تھی اور بیئر کی اِس آدھی بوتل کے پاس بیئر سے بھرا ہُوا ایک گلاس پڑا تھا اور ان کے پیچھے ڈیڑھ فٹ لمبی داڑھی کے ساتھ اور ناریل کے تیل سے چمکتے ہوئے روڑے سر کے ساتھ، تجمل جاددانی نشے میں چُور چُور بیٹھا تھا اور لوگوں کا ہجوم اس کی طرف اُنگلیاں اُٹھا اُٹھا کر بے تحاشا ہنس رہا تھا۔ روزی نے تجمل کو کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑا اور چلائی۔

"تجمل! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے آج!"

تجمل نے لڑکھڑاتی آواز میں جواب دیا۔

"روزی آج کا دِن میری زندگی کا سب سے غمگین دن ہے۔"

روزی پھر چلائی۔

"کیوں؟ آخر کیوں؟"

تجمل نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"آج میرا عزیز ترین دوست "میراجی" اِس دُنیا سے رُخصت ہو گیا ہے۔"

روزی نے غضبناک ہو کر کہا۔

"تو پھر کیا قیامت آگئی۔ سبھی کو اِس دُنیا سے رُخصت ہونا ہے اِس نمائش کی کیا ضرورت تھی؟"

تجمل نے رقت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

"روزی! میرا غم ایک عظیم غم ہے۔ مرینا ہوٹل کی تمام شراب جمع ہو کر میرا غم غلط نہیں

نہیں کر سکتی۔"

مسٹر فرید احمد نے اور تماشائیوں کے ہجوم نے تجمل جاودانی کو ایک جلوس کی شکل میں کار تک پہنچایا اور فلک شگاف نعروں کے درمیان کار روزی کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

میراسین نے ایک بیرے سے جو شربتوں کی ٹرے لے کر خواتین کے اس مجمع میں آیا تھا آئس کریم سوڈے کا ایک گلاس لیا اور اس کے دو تین گھونٹ لے کر اپنی باتوں میں مشغول ہوگئی۔

"معزز خواتین، ایک دفعہ کا ذکر ہے تجمل جاودانی دفعتاً غائب ہوگیا۔ تین دن تک اسکو شہر میں ہر جگہ ڈھونڈا گیا۔ لیکن اس کا کہیں سراغ نہ ملا۔ آخر چوتھے روز رات کے تین بجے ٹیلیفون کی گھنٹی نے روزی کو گہری نیند سے جگایا اور مسٹر فرید احمد اور روزی میں یہ گفتگو ہوئی۔

فرید احمد۔ روزی تجمل مل گیا ہے۔

روزی ۔ کہاں؟

فرید احمد ۔ وہ اس وقت رومن کیتھلک کلب میں فلش کھیل رہا ہے اور وہ اب تک دو سو روپے ہار چکا ہے۔

روزی ۔ جوا کھیل رہا ہے؟ اس وقت؟ کیا ٹائم ہے؟

فرید احمد۔ تین بجے ہیں۔ تین دن سے ہار رہا ہے۔

روزی ۔ پھر جوا شروع ہوگیا ہے۔ او میرے خدا!

فرید احمد۔ روزی۔ اس لڑکی میٹی کو جانتی ہو تم؟

روزی ۔ کون میٹی؟

فرید احمد۔ اس کا پورا نام مس میٹیلڈا پریرا ہے۔ جو تجمل کی پرانی کلاس فیلو ہے اور رومن کیتھلک کلب میں اسٹینو ٹائپسٹ ہے۔ تجمل پچھلے تین دن سے میٹی کے پاس ہے

روزی - آپ فوراً کار لے آیئے - مَیں بھی جانا چاہتی ہوں وہاں -

چنانچہ روزی اور مسٹر فرید احمد رومن کیتھلک کلب میں گئے - سات عورتیں اور مرد فلش کھیل رہے تھے - پول میں روپوں اور نوٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا - تجمل میٹی کے پاس بیٹھا تھا اور اس کی ڈیڑھ فٹ لمبی داڑھی میز پر پڑی تھی - تجمل گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا -

"روزی یہ میٹی ہے ---- میٹی، مائی وائف"

میٹی نے حیران ہو کر مسز جادو لال کو دیکھا -

"اوہ مسز تجمل، آپ نے تجمل کی کیا حالت کر دی تھی - لمبی لمبی ڈراؤنی داڑھی اور مونچھیں - آج بڑے اصرار کے بعد اپنے ہاتھ سے شیو کیا ہے - وہ پڑی ہے میز پر داڑھی -"

روزی نے غضبناک ہو کر میٹی کی طرف دیکھا اور پھر تجمل کو گریبان سے پکڑ کر کار میں کھینچ لائی - اس کے بعد تجمل کا زیادہ وقت میٹی کے ساتھ گذرنے لگا - ان دونوں کو اکثر اکٹھے شراب پیتے ہوئے، جوا کھیلتے ہوئے، پکنک کرتے ہوئے اور ریس کورس میں دیکھا گیا - آخر یہ سب کچھ ایک خوفناک نتیجے کی شکل میں رونما ہوا - ایک دن روزی اور مسٹر فرید احمد کا سینما کا پروگرام تھا - شام کے وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور روزی اور مسٹر فرید احمد میں یہ باتیں ہوئیں :-

فرید احمد - روزی، سینما کا پروگرام کینسل

روزی - کیوں ؟

فرید احمد - میرے کارخانے میں بڑا بھاری غبن کا کیس پکڑا گیا ہے -

روزی - کیا ہوا ؟

فرید احمد - میرے خزانچی نے گیارہ ہزار روپے غائب کر دیئے ہیں -

روزی - تجمل نے -

فرید احمد - ہاں تجمل نے -

روزی۔ او میرے خدا! کہاں ہے تجمل ؟

فریداحمد۔ جیل میں۔

چنانچہ روزی کی منّت سماجت کے باوجود مسٹر فریداحمد نے تجمل کی کوئی مدد نہ کی اور اس کو ایک سال کی قید ہوگئی۔ جب تجمل جیل سے واپس آیا تو وہ بہت خوش وخرم تھا۔ اس کے پاس نظموں اور غزلوں کے تین مجموعے تھے۔ عظیم شاعروں کا تخیّل دو جگہوں میں بہت کام کرتا ہے قید خانے میں اور پاخانے میں۔

کم عمر لڑکیاں قہقہوں میں پھوٹ پڑیں۔

مسز پہاڑ خاں سخت طیش میں آگئیں اور چلّائیں

"معاف کیجئے، آپ مسز جاودانی کی توہین کر رہی ہیں۔"

میرا سین نے نہائت سنجیدہ ہوکر کہا۔

"مَیں آپکو بتانا چاہتی ہوں کہ میری دو بہنیں ہیں۔ ایک لیلا دُوسری روزی۔ لیکن روزی مجھے لیلا سے زیادہ عزیز ہے۔ مَیں روزی کی زندگی میں لیلا سے زیادہ دلچسپی لیتی رہی ہُوں اور مَیں آپکو یقین دلانا چاہتی ہُوں جب مجھے معلوم ہُوا کہ روزی نے تجمل سے شادی کرلی ہے تو مَیں تین دن تک روتی رہی۔ شادی اور شوہر کا موضوع نئے سال کی پارٹیوں میں تفریح کا سامان مہیّا کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک لڑکی کے لئے ایک نہائت اہم اور سنجیدہ سوال ہے۔ شادیوں کے فیصلے زندگی کے فیصلے ہیں۔ یہ اہم فیصلے جذبات کی موجوں پر سوار ہوکر نہیں ہوتے۔ اگر آپ جذبات کی موجوں پر سوار ہوکر اس قدر اہم فیصلے کرنے بیٹھ جائیں گی تو آپ کی قسمت میں میراجی یا تجمل آجائیں گے۔ تھوڑی دیر ہوئی کسی لڑکی نے مجھے میراجی کا قاتل کہا تھا۔ مَیں اس لڑکی کو بتانا چاہتی ہُوں کہ قتل کرنا خودکشی سے بہتر ہے۔ میراجی کا جسم زہر کا بھرا ہُوا لفافہ تھا اور مَیں خودکشی کرنے پہ آمادہ نہیں تھی۔ مجھے اپنے شوہر سے شعر نہیں چاہیئے۔ صوفہ سیٹ، قالین اور کار چاہیئے۔ لڑکی اپنے دُولہا سے آرٹ نہیں مانگتی روٹی

مانگتی ہے۔ مَیں نے یہ حقیقت اپنی عزیز بہن روزی کو آرٹ پر قربان کرکے حاصل کی ہے۔ جب میری بہن روزی آرٹ پر قربان ہو گئی تو میں نے اپنی بہن لیلا کو دوڑ کر اپنی حفاظت میں لے لیا اور میرے سامنے کتنی لیلا بیٹھی ہیں ـــ پمیہ بہن میری لیلا ہے۔ جہاں آرا میری لیلا ہے۔ یہ سب کنواری لڑکیاں میری لیلا ہیں۔ مَیں ان کو روزی نہیں بننے دوں گی۔ مَیں ان کو تحمل سے، میراجی سے، منٹو سے، مجاز سے، اختر شیرانی سے، ہر بلا سے بچاؤں گی۔

"دو تین عمر رسیدہ عورتیں جو اسکولوں، کالجوں کی ٹیچر یا پروفیسرز معلوم ہوتی تھیں، چلائیں۔

"یہ سراسر بکواس ہے۔"

"آپ ہمارے عظیم فنکاروں کی توہین کر رہی ہیں۔"

"کیا آپ ہمیں یہ بتانا چاہتی ہیں کہ ہمارے بڑے بڑے شاعر اور ادیب ایسے کرداروں کے مالک تھے جیسا آپ نے تحمل جادوانی کو پیش کیا ہے۔"

مسز حسین اسی پُر وقار انداز میں بولی۔

"معزز خواتین، مَیں سوسائٹی کو ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔ مَیں سائٹی کو بتانا چاہتی ہوں کہ قوموں کو تباہ اور برباد کرنے کے لئے قوموں میں دو چیزیں ابھرتی رہی ہیں۔ عورت اور شراب۔ مجھے اجازت دیجئے کہ مَیں اپنے الفاظ کو تھوڑے سے اضافہ کے ساتھ پھر دُہراؤں مَیں کہنا چاہتی ہوں کہ قوموں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے قوموں میں تین چیزیں ابھرتی ہیں۔ عورت، شراب اور شعر! آپ اپنی تہذیب کی نظر اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کی تہذیب کے علمبردار عیش و عشرت کی ٹھنڈی فضاؤں میں مدہوش پڑے ہیں۔ آسمان پہ شراب سے بھرے ہوئے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ شاعر شعر الاپ رہا ہے۔ رنڈی ناچ رہی ہے۔ رنڈی اور شاعر زندگی کو تفریح کا سامان مہیا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ رنڈی کے نغمے اور شاعر کے اشعار صرف زندگی میں نشاط اور جنسی جذبات پیدا کرنے کے کام آتے ہیں۔ پھر یکایک ایک گوشے سے ایک نئی آواز بلند ہوئی۔

کسی ادب نے زندگی کی بے مقصد یکسانیت سے اکتا کر پکارا۔ مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ۔ یہ ایک بڑا دلکش نیا ترانہ تھا۔ لیکن یہ ادب کی دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ تھا۔ شاعر امراء کے دربار سے نکل کر پبلک میں آگیا تھا۔ وہ پبلک میں کھڑا ہو کر کہتا تھا مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ اور پھر جب خلوت میں اپنی محبوب سے ملتا تھا تو اس سے گڑگڑا کر معافی مانگ لیتا تھا اور اس سے پہلی محبت سے بھی زیادہ گہری محبت کرتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی جھوٹ انسان کو اتنا ہی فائدہ پہنچاتا ہے جتنا سچ۔ چنانچہ اس ادبی جھوٹ نے شاعر کو ایک بہت بڑا فائدہ پہنچایا۔ اس نے اس کو لونڈی کے رتبے سے اٹھا کر ایک رہنما کا رتبہ دے دیا اور اب ادیب ارباب نشاط کے زمرے سے نکل کر لیڈروں کی صف میں داخل ہو گیا ہے اور اب جبکہ قوم نے ادیب کو ایک رہنما کا رتبہ عطا کر دیا۔ ادیب کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو قوم کے سامنے ایک مثالی کردار کی شکل میں پیش کرے۔"

میرا سین نے شربت کا ایک گھونٹ پیا اور اپنی تقریر جاری رکھی۔

"معزز خواتین میں ایک تحریک کی بانی ہوں۔ میری تحریک کا تعلق عام طور پر ادیبوں کے تمام سامعین اور قارئین سے ہے۔ لیکن اس کا تعلق خاص طور پر خواتین کے ساتھ ہے میری تحریک کا حلف نامہ یہ ہے: ۔ آؤ ہم مل کر عہد کریں کہ ہم اپنے ادیبوں میں اپنا عاشق یا ہونے والا خاوند دیکھنے کی بجائے قوم کا ایک درد مند رہنما دیکھیں گے۔ آؤ ہم سب مل کر اپنے ادیبوں سے تقاضا کریں کہ ہم پر عشقیہ اشعار لکھنے کی بجائے اپنی شاعری میں قوم کے لئے چراغ راہ بنیں۔ جن دنوں میں نے اس تحریک کی بنیاد رکھی تھی ان دنوں میں لاہور کے ایف۔ ایس۔ سی کالج میں پڑھتی تھی اور روزی میری کلاس فیلو تھی۔ میں سائنس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ روزی آرٹ کی۔ جب میں نے اپنی تحریک کا حلف نامہ اس کے سامنے رکھا تو وہ ہنس دی اور اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ میرا جی بچی، تیرے یہ فلسفے اب کسی کام نہ آئیں گے۔ میں نے کہا کیوں؟ وہ بولی، ہندوستان کا ایک بہت بڑا شاعر میرا جی تیرے عشق میں گرفتار ہو چکا ہے۔"

یکایک میرا سین چپ ہوگئی اور خواتین کے مجمع کو غور سے دیکھنے لگی جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو پھر اس کی نظریں جہاں آرا پر ٹھہر گئیں اور وہ بولی۔

"جہاں آرا، پروین، کیا تم نے کبھی میراجی کی نظمیں پڑھی ہیں۔ تم نے لب جو تیارے بڑھی ہے، دھوبی گھاٹ پڑھی ہے۔ لوہے کے گولوں والے میراجی کی محبت کا جواب محبت ہیں دے سکتی تھیں۔ کیا تم ایک آئی سی ایس کو چھوڑ کر ایک بے سروسامان مجنوں اور ایک ڈراؤنے سادھو سے شادی کرنا پسند کرتیں۔"

خواتین کے مجمع میں سنّاٹا چھا گیا۔

میرا سین نے تاثیر کے لئے کافی وقفہ دے کر کہا۔

"معزّز خواتین اور خصوصاً کمسن بہنو! آؤ ہم سب مل کر عہد کریں کہ ہم اپنے ادیبوں میں اپنا عاشق اور ہونے والا خاوند دیکھنے کی بجائے قوم کا ایک دردمند رہنما دیکھیں گے۔ آؤ ہم سب مل کر دنیا کو اس خطرے سے خبردار کریں کہ سوسائٹی کا سب سے بڑا دشمن ایک غیر ذمہ دار ادیب ہے۔ خواہ وہ میراجی ہو یا تجمل جادوانی۔

یکایک سب کی نظریں تجمل جادوانی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ شراب کے نشے میں چور لڑکھڑاتا ہوا خواتین کے مجمع کی طرف آرہا تھا۔ وہ روزی کے نزدیک آکر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"روزی! روزی! کیا یہ سچ ہے؟"

روزی نے پوچھا۔

"کیا سچ ہے؟ تجمل"

"وہ! وہ جو فرید احمد کہتا ہے۔"

"فرید احمد کیا کہتا ہے، تجمل!"

تجمل کی زبان بند ہوگئی۔ وہ پاگلوں کی طرح خواتین کے مجمع کو دیکھنے لگا۔ اس کی بھٹکتی ہوئی نظر عورتوں اور لڑکیوں کے اوپر سے ہوتی ہوئی میرا سین پر ٹھہر گئی۔ وہ دیر تک میرا سین

کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے مُنہ سے بے اختیار ایک شعر نکلا۔

بستی بستی پھرا مستانہ گھر کا رستہ بھُول گیا۔

اور اس کا جسم بُری طرح تھرتھرانے لگا۔ اس کی ٹانگیں کپکپائیں اور وُہ بیہوشی کی حالت میں دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔

امر سنگھ

تیوری

"ہیلو ٹبو"

(ٹبو مُسکرا رہا ہے اور حیران ہے کہ یہ اچھا انکل ہے جو کبھی زمانے ہیں اکثر آیا کرتا تھا اور کبھی کبھی تو ہر روز آیا کرتا تھا۔ اور مجھے پیار کیا کرتا تھا لیکن اب چھ چھ مہینے آٹھ آٹھ مہینے نظر ہی نہیں آتا۔)

"اوہ تم......!"

"ہاں کہو کیا حال ہے۔"

"......"

"یہ تیوری کیوں چڑھالی ہے تم نے۔"

"رستہ چھوڑو۔ سائیکل آگے بڑھاؤ تم تو گرادوگے مجھے۔"

"اوہ......"

(سائیکل آگے بڑھ جاتی ہے۔ تم جو میری بائیں جانب تھیں پیچھے سے ہو کر دائیں جانب میرے برابر آجاتی ہو۔ خاموشی گہری خاموشی چھا جاتی ہے جو مغرب کے "سُلگتے" ہوئے آسمان اور برسات کی گھٹی گھٹی اُمسی ہوئی فضا کو اور بھی حبس بنا دیتی ہے۔ اور نئی دلی کے اس پُر ہنگام شاپنگ سنٹر اس گنجان آبادی اور اس راہ گذر کا تمام شور شر اس خاموشی میں ڈوب جاتا ہے)

"سناؤ...... !"

(تیوری پگھلنے لگتی ہے)

"........"

(خاموش دو سائیکلیں پہلو بہ پہلو چلتی رہتی ہیں)

"کہاں جا رہے ہو؟"

"میری بہن آئی ہوئی ہے اُس کے ہاں جا رہا ہوں..... چلتی ہو؟ یہاں قریب ہی ہے!"

"ہوں؟ نہیں..... پھر کبھی سہی....."

"تم کدھر جا رہی ہو؟"

"گھر"

"ادھر سے؟"

"ہاں ذرا اُوپر سے گھوم کر جاؤں گی..... یہ راستہ ذرا اچھا ہے بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی

..... آؤ چلتے ہو۔"

"تم چاہتی ہو! میں چلوں؟"

"........"

"خاموش کیوں ہو گئی ہو۔"

"تم چلنا چاہتے ہو؟"

"......"

(سائیکلوں کی رفتار سُست بہت سُست ہو جاتی ہے)

"تم چپ ہو گئے ہو۔ سناؤ....."

"کیا سناؤں....."

مِنی! تمہیں شملے کی وہ حسین شام..... تعجّب ہے اس شام کے لئے

میرے ذہن میں لفظ حسین کیوں آ رہا ہے۔ شملہ مجھے کبھی پسند نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے کبھی حسین نہیں لگا تھا۔ میں حیران ہوں کہ اس بار میں شملہ کیوں چلا گیا تھا۔

شملے کی پہاڑیوں میں سولن سے لے کر چائل تک کا علاقہ حسین ترین علاقہ ہے۔ میں ہر سال پہاڑ پر جایا کرتا تھا۔ جب بھی شملے کے علاقے میں جاتا تو میرا مستقل قیام سولن، چائل یا سلوگڑھ میں ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھار خرید و فروخت کے سلسلے میں مجھے شملے جانا بھی پڑتا تو میں ایک دو روز سے زیادہ وہاں ہرگز نہ ٹھہرتا تھا۔ حالانکہ میرے کئی رشتہ دار گرمیاں شملہ ہی میں گذارتے تھے۔ اس مرتبہ بھی میں چار برس بعد شملہ گیا تھا۔ لیکن اس بار میں کیوں وہاں چلا گیا تھا؟ ہاں..... یاد آیا۔ خوشگوار یادیں بعض اوقات ناخوشگوار یادوں کو کس طرح فراموشی کے غار میں دھکیل دیتی ہیں۔ حالانکہ یہ ناخوشگوار —— بہتر ہے اگر میں کہوں کہ کم خوشگوار یاد اس حسین شام کی رنگین یاد کا موجب بنی تھی۔

مجھے پتہ چلا تھا کہ میرا ایک مصوّر دوست اِن دِنوں شملہ میں مقیم تھا۔ اسی سے ملنے کی خواہش مجھے شملہ کھینچ لے گئی تھی۔ کافی عرصہ سے مجھے کسی مصوّر دوست سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مصوّری ہی اس کے اور میرے درمیان ایک رشتۂ اشتراک تھی۔ چھ سات برس پیشتر جب میں کشمیر کا سفر کر رہا تھا تو سری نگر میں میرے کشمیری مصوّر دوستوں ترلوک کول اور سومناتھ بٹ نے اسے مجھ سے متعارف کروایا تھا۔ اُن دِنوں گوردیو سنگھ انڈین آرٹ پیش کیا کرتا تھا اور اس کے ساتھ ہی کشمیر کے رومان خیز محرابی پہاڑوں کو لکڑی کے ڈبوں کی شکل میں تبدیل کیا کرتا تھا۔ میں یہ قطعی نہ سمجھ سکا تھا کہ یہ دو مختلف انداز "مختلف تکنیک" اس کی شخصیت کے کن مختلف پہلوؤں کا پرتو تھیں۔

شملہ پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ گردیو سنگھ نے جو رقّاص بھی تھا شملہ میں مصوّری، رقص اور موسیقی کی تربیت گاہ کھول رکھی تھی اور ساتھ ہی ٹیوشن بھی کرتا تھا۔ یہاں اس نے بال اور داڑھی ٹیگور کی مانند کھلے چھوڑ دیے تھے اور اپنا نام بھی گردیو سنگھ

سے بدل کر گورو دیو رکھ لیا تھا۔ کہ اس نام کے خدوخال آسانی سے گورو دیو ٹیگور سے مشابہت رکھتے تھے۔

معلوم نہیں یہ اُس کے بدلے ہوئے حلیے کا اثر تھا یا اُس کی تبدیل شدہ ذہنی کیفیت کا کہ مجھے اُس کی تصویروں میں خاصی تبدیلی محسوس ہوئی۔ یہاں اُس کے مون سون کے پہاڑی نظارے راکھ کی ڈھیریوں کا تاثر دینے لگے تھے۔ اُس کی تصویروں میں پالٹ (PALLATE) کے تمام کے تمام رنگ لگے ہوتے اور ضرورت سے زیادہ مقدار میں لگے ہوتے مگر تصویر کا مجموعی تاثر ایک ٹھنڈی راکھ کی ڈھیری کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ ایک گھٹی گھٹی دبی دبی مدقوق سی فضا اُن میں ہوتی۔

میں نے جب اُس کی توجہ اس تاثر کی طرف مبذول کرائی تو اُس نے ایک جینیس کی سنجیدگی (THE GRIMNESS OF A GENIUS) کہہ کر میرا منہ بند کر دیا۔

اس کے بعد وہ مجھے اپنے تمام شاگردوں کے ہاں اُن کی تصویریں دکھانے کے لئے لے گیا اور اس طرح خود کو مختلف اسالیب کا ماہر ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

ایک شام وہ مجھے تمہارے ہاں لے آیا۔ اس نے تمہارا ذکر کئی بار کیا تھا اور تمہاری بہت تعریف کی تھی ۔۔۔ ایک بات وہ بڑے شد ومد سے کہتا۔ وہ یہ کہ تمہیں اُس سے درس لیتے ہوئے بمشکل چھ مہینے ہوئے ہیں لیکن ان چھ مہینوں میں تم نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ حقیقتاً اس میں تمہاری تعریف کا پہلو اس قدر نہیں نکلتا تھا جس قدر اُس کی خود ستائی کا۔

یہ ایک بعید معمولی شام تھی۔ شملے کی عام شاموں کی طرح جو دلی کی عام شاموں سے کچھ مختلف نہیں ہوتیں۔ تم اپنی تصویریں دکھا رہی تھیں۔ تمہاری توجہ زیادہ تر گورو دیو پر مرکوز تھی جو چہرے پر انتہائی نخوت آمیز سنجیدگی طاری کئے ہوئے الہامی انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ گورو دیو کچھ داخلی وجوہ کی بناء پر خود بے شک اچھا مصور نہ ہو مگر وہ ایک اچھا اُستاد ضرور ہے۔ نامعلوم وہ کتنے ہونہار فنکار ہمیں دینے کا باعث بنے گا۔ اس احساس کے ساتھ ہی

ساتھ میرے دل میں اُس کی عزّت اور بھی زیادہ ہو گئی۔

تم تصویریں دکھا رہی تھیں۔ میرا وجود تمہارے نزدیک محض ضمنی تھا۔ شروع شروع کی تصویریں مُبتدیانہ تھیں۔ کوئی خاص بات اُن میں نہ تھی۔ میں قریب قریب خاموش تھا۔ تم خوبصورت تھیں مگر بہت نہیں۔ تمہاری تصویروں میں بھی کوئی حیرت انگیز چیز مجھے نظر نہ آئی تھی۔

"خوب — بہت خوب!" میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ایک تصویر نے ایکدم میری نظریں کھینچ لی تھیں۔

تم یکلخت چونک کر میری طرف متوجہ ہو گئیں گوردیو جو تمہیں دیکھنے میں محو ہو چکا تھا۔ ایکدم چونک اُٹھا۔

"رامندر جی! یہ تصویر آپ نے کب بنائی؟" اس نے پوچھا۔

"جی، کل ہی بنائی تھی"

"اصلاح نہیں لی ابھی آپ نے؟"

"جی کئی دِنوں کے بعد آپ آج ہی تو آئے ہیں۔"

"ابھی کچھ فنشنگ چاہتی ہے یہ۔"

"لیکن یہ تصویر ہے خوب!" میں نے رائے دی۔ "کیا متوازن کمپوزیشن ہے۔ کیا تازگی ہے اس کے رنگوں میں۔"

اُس کے بعد تم بڑے شوق سے مجھے تصویریں دکھانے لگیں۔ تمہاری توجہ میری طرف مبذول ہو گئی۔ بعدازاں جو تصویریں تم نے دکھائیں اُن میں واقعی حیرت انگیز ارتقاء تھا۔ یہ تصویریں غیر ارادی طور پر مجھ سے داد و تحسین حاصل کرتی رہیں۔ جب تم تصویریں دکھا چکی تو میں خود تمہاری تصویریں دوبارہ دیکھنے لگا۔ اُن میں سے چار پانچ تصویریں مجھے بے حد پسند آئیں تھیں۔

تمہاری ڈرائنگ کیسی قدر خامکار تھی۔ (دو ڈھائی سال میں کس قدر پختہ کاری انسان حاصل کر سکتا ہے؟) لیکن تمہاری کمپوزیشن میں ایک ترنم تھا اور تمہارے رنگوں میں جوانی کی اُمنگ، تازگی اور زندگی کا رس نچوڑنے کی تمنا تھی۔ قدرت کی ہر چیز تمہاری تصویروں میں

پہنچ کر مسرت سے جھوم اٹھتی تھی اس قسم کی انبساط انگیز رنگینی میں نے بہت کم مصوّروں میں دیکھی تھی۔ یہ میری اُن پانچ چھ تصویروں کے متعلق رائے تھی جو میں نے تمہیں بتائی۔ تمہاری آنکھیں تمہاری تصویروں کی طرح ہی خوشی سے چمکنے لگیں۔

"ہاں ہاں۔ ٹھیک ہے۔" گوردیو نے منہ لٹکا کر کہا "مگر رامندرجی اب آپ کو اپنی تصویروں میں ——— کچھ سنجیدگی (GRIMNESS) پیدا کرنی چاہیئے۔"

تمہاری آنکھوں کی چمک کچھ مدھم پڑ گئی۔ تم نے نہایت عاجزی سے سعادت مند شاگردوں کی طرح سر جھکا کر کہا۔ "کوشش کروں گی۔"

"مگر کیوں؟" میں نے ذرا تلملا کر کہا۔ میں اس خدشے سے کانپ گیا تھا کہ اس کوشش میں ایک ابھرتا ہُوا فنکار فنا ہونے جا رہا ہے۔ "گوردیو! آپ ایسی رائے کیوں دیتے ہیں۔ جب ان کے اپنے خیالات میں حسن ہے۔ ان کے اپنے جذبات میں رنگینی ہے تو یہ گرم رنگ کہاں سے لائیں گی؟ آپ انہیں اپنے صحیح جذبات کا کھلم کھلا اظہار کرنے دیجیئے۔ GRIMNESS پیدا کرنے کی رائے دے کر تو آپ ان کی اپنی شخصیت کا گلا گھونٹ دیں گے۔"

"لیکن آرٹ میں سنجیدگی تو ہونی ہی چاہیئے۔" گوردیو نے کھسیانے ہو کر کہا۔

"یہ ہر ایک کے لئے ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔ "آخر آپ اپنی شخصیت کیوں ان پر لادنا چاہتے ہیں آپ کو چاہیئے کہ ان کی اپنی شخصیت کو ہی پھلنے پھولنے دیں۔

گوردیو خاموش ہو گیا۔ تمہاری آنکھیں پھر سے تابناک ہو گئیں اور تم میرے ساتھ باتیں کرنے لگیں اتنے میں تمہارے ڈیڈی آ گئے۔ اُن کے ساتھ ایک نوجوان تھا مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ جگجیت میرا دوست اور ہم جماعت تھا اور اسی وقت تمہارے ڈیڈی سے میرا تعارف کراتے ہوئے اُس نے یاد کرایا کہ وہ میرا دُور کا رشتہ دار بھی ہوتا تھا تمہارا تو وہ ماموں زاد بھائی تھا اور اس طرح ہماری کچھ رشتہ داری بھی نکل آئی تھی۔ عام حالات میں اس قسم کی رشتہ داری آج کل بے معنی سی ہو گئی ہے مگر نامعلوم اُس وقت کیوں میں تمہاری نیلی کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔

جب میں رُخصت ہونے لگا! اور تم باہر تک چھوڑنے آئیں تو میں نے کہا تھا بنھی ..... "
یہی نام تھا جس سے گھر کے تمام لوگ تمہیں مخاطب کرتے تھے۔۔ شملہ در اصل اس قدر خوبصورت نہیں
جس قدر آپ نے اسے بنا دیا ہے۔ میرا مطلب ہے اپنی تصویروں میں ۔۔۔"

اور تم نے اپنے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں ایک دُوسرے میں اُلجھا کر زور سے اپنے سینے پر کھینچ لی تھیں اور تم نے اپنی آنکھوں میں ستارے چمکا کر پُوچھا۔

"آپ اپنی تصویریں کب دکھائیں گے؟"

"کل ہی آجایئے۔"

اور تم نے کل آنے کا وعدہ کیا۔

تم نے کل آنے کا اقرار کیا واپس لوٹتے وقت شملے کی یہ تاروں بھری شفاف شام مجھے پہلی بار بیحد حسین معلوم ہوئی۔ میں نے حُسن نہیں حُسن کار کی رُوح میں جھانک کر دیکھا تھا۔

اگلے دِن میں تمہارا انتظار کرتا رہا۔

تم نہیں آئیں۔

تین چار روز گذر گئے۔

میں تمہیں بھول گیا۔

اور پھر ایک دِن تم اچانک آگئیں۔

میں اپنی بالکونی میں کھڑا اُس بادل کو دیکھ رہا تھا جس نے نیچے کی وادی کو مکمل طور پر ڈھانپ رکھا تھا اور جو ایک دُھند کی شکل میں اوپر کی طرف رینگ رہا تھا۔ اُس دھند کے ہراول دستے میری بالکونی کے سامنے کی سڑک پر قبضہ کرتے جا رہے تھے۔ یکایک سڑک کے موڑ پر تم نمودار ہوئیں۔ تمہاری نگاہ مجھ پر پڑی۔ میں نے تمہیں سلام کیا۔ تم نے سلام کا جواب دیا۔ میں نے تمہیں اوپر آنے کی دعوت دی۔ ایک لمحہ تم جھجکیں اور پھر جھجکتی ہوئی اُوپر آگئیں۔

تم میری تصویریں دیکھنے لگیں۔ تمہارا کِھلتا ہُوا چہرہ اور بھی کھِلتا جا رہا تھا۔ لیکن کبھی کبھی پھول

کی پنکھڑیاں سکڑنے لگتیں۔ تمہارے چہرے پر سنجیدگی چھا جاتی۔ کوئی اُداس سوچ تمہارے ذہن کو نامعلوم ماضی کے کون سے کھنڈر کو کریدنے کے لئے لے جاتی۔ مگر اس کے باوجود ہر نئی تصویر کے ساتھ تمہاری آنکھوں کی تابانی فزوں تر ہوتی جاتی۔

تصویریں ختم ہوئیں تم مسرور بھی تھیں اور مضطرب بھی اور ان دونوں احساسات نے ایک بے ڈھب سی خاموشی ماحول پر طاری کر دی تھی۔

"اوہ! کل تک آپ کے متعلق ـــــ" تم نے اس بے ڈھب خاموشی کو بے حد بیڈھب انداز سے توڑنا چاہا۔ "میری..... رائے ـــــ کچھ اچھی نہ تھی۔"

"میرے متعلق! کیوں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اوہ..... اُف! میرا مطلب ہے آپکی تصویروں کے متعلق۔" تم نے وضاحت کی۔

"بناد یکھے ہی!"

"میری یہ رائے گورودیو کی باتوں سے بنی تھی۔" تم نے کس قدر افسوس ناک ہو کر کہا۔ "اُن کی آپ کے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں۔"

"میرے متعلق؟"

"اوہ ساری۔ آپ کی تصویروں کے متعلق ـ۔" تم نے پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "اور آپ کے متعلق بھی۔"

"تعجب ہے! ایسا کیوں؟"

"خیر چھوڑیئے اُن کا ذکر۔" تم نے کہا اور پھر تم میری تصویروں کی باتیں کرنے لگیں اور میں تمہاری تصویروں کی مسرت اور رنگینی سے بھرپور تصویروں کی تعریفیں کرنے لگا اور تم نے مجھے بتایا کہ جو تصویریں مجھے سب سے زیادہ پسند آئی تھیں وہ کلی طور پر تمہاری بنائی ہوئی تھیں ان میں گورودیو نے اصلاح نہیں کی تھی اور میں نے تمہیں بتایا کہ اب مجھے پتہ چلا کہ تمہاری دوسری تصویریں کیوں دبی دبی سی تھیں۔

پھر جب میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑنے جا رہا تھا اور تم نے جاکُو کا ایک بڑا چکّر کاٹ کر جانے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ہم صنوبر اور چیل کے درختوں کے نیچے بل کھاتی ہوئی سڑک پر چلے جا رہے تھے تو بادلوں کی دُھند بنا برسے ہی جاکُو کی چوٹی سے کہیں اُوپر جا چڑھی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ پانی سے خالی تھی جبھی تو اس قدر بلندی تک پہنچ گئے چلے جانے کے باوجود اسمیں سے بارش کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا تھا۔ سامنے کا تمام منظر نکھرا ہوا تھا۔ شام کے خُنک سائے منڈلانے لگے تھے۔

اُس وقت مجھے محسوس ہوا کہ ایک گہری دوستی کا رشتہ ہمارے درمیان قائم ہو چکا تھا اور تم مجھے بتا رہی تھیں کہ آج تمہاری منگنی کی سالگرہ کا دن تھا۔ تمہارے منگیتر کپتان ولادر سنگھ کشمیر میں تھے۔ اُن کا خط آج ہی آیا تھا۔ وہ چند دنوں تک آنے والے تھے۔ تمہاری یہ منگنی محبّت کی بناء پر ہوئی تھی۔ تم اُن سے بے پناہ محبّت کرتی تھیں۔ وہ بہت ہی اچھے تھے۔ بہت ہی خوبصورت ——— وہ آئیں گے تو تم مجھے اُن سے مِلاؤ گی اور پھر مجھے معلوم ہو گا کہ وہ کتنے اچھے ہیں

اور میں نے پہلی بار غور کیا کہ تم نے گہرے سیاہی مائل کاسنی رنگ کا کبھی نیشن پہن رکھا تھا۔ تمہارے ڈوپٹے پر افشاں جڑی تھی۔ تم بجنسہٖ ایک حسین نکھری ہوئی تاروں بھری رات تھیں

اِس کے بعد علی الصبح کی لمبی سیر کے بعد میرے ہاں ہو کر جانا تمہارا معمول بن گیا اور شام تمہارے لورنج میں بیٹھ کر تمہاری نئی تصویر کے عِلاوہ دُنیا کے ہر موضوع پر گفتگو میں حصّہ لینا میرا معمول ———

وہ صُبح شائد تمہیں یاد ہو۔ مجھے تو یہ بہت اچھی طرح یاد ہے ——— میری کھڑکی میں ایک چینی گلدان عام طور پر خالی پڑا رہتا تھا۔ پھولوں کی بجائے میں اسمیں اپنے بُرش رکھ دیا کرتا تھا۔

اِس صبح بیدار ہو کر میں پھر سو گیا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو دیکھا تم اِس گلدان میں پھُول سجا رہی تھیں۔ بُرش نکال کر تم نے میز پر پڑے دوسرے گلدان میں رکھ دیئے تھے۔ دو اکہری لمبی شاخیں تھیں۔ ایک ذرا زیادہ لمبی تھی اور یہ دونوں مخالف سمتوں میں بھرپُور انداز میں جھکی ہوئی

تھیں۔ ہر ایک شاخ کے سرے پر ڈیزی کا ایک ایک پھول تھا۔ ایک پر قرمزی رنگ کا اور دوسری پر نارنجی رنگ کا۔ شفق کی تازگی بخش سرخی میرے کمرے کی فضا میں گھل گئی تھی۔

پھر ہر روز میری کھڑکی میں پھول سجانا تمہارا معمول بن گیا۔

ایک دن سیر سے واپسی کی بجائے سیر کو جاتے ہوئے ہی تم میرے ہاں آئیں۔ مجھے جگایا اور مجھے اپنے ساتھ سیر پر چلنے کے لئے

ہم بالکل خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ تمہاری خاموشی میں بھی ایک بے چینی چھپی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ رات کی سیاہی میں صبح کی سفیدی گھلنے لگی تھی۔

"کیا بات ہے منھاں؟" میں نے تمہاری خاموش بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا "اس قدر چپ چپ کیوں ہو؟"

تم نے میری طرف دیکھا۔ "کوئی — کوئی بات نہیں۔ یونہی —" اور تم اور بھی بے چین ہو گئیں۔ میں چپ ہو گیا۔

"تمہارا ——— تم اس خاموشی کا بوجھ خود ہی برداشت نہ کر سکیں "وہ تمہارا یہ استاد بہت کمینہ آدمی ہے۔"

"میرا استاد کون؟"

"یہی تمہارا گوردیو"

"گوردیو! میرا استاد؟"

"تو کیا تم اس کے شاگرد نہیں؟"

"تم سے کس نے کہا کہ میں اس کا شاگرد ہوں؟" — "وہ خود ہی ظاہر کرتا ہے کہ تم اس کے شاگرد ہو۔"

"خوب! میرے استاد تو جے جے اسکول آف آرٹس کے پروفیسر ہیں۔" یکلخت مجھے گوردیو کی عزت کا خیال آیا "ویسے ہر ایک آرٹسٹ میرا استاد ہے۔ میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔" میں نے بات ٹالنی چاہی مگر تمہاری بے چینی اور بھی بڑھ گئی۔

"بہت ذلیل آدمی ہے وہ۔"

"کیوں؟"

"اب کیا بتاؤں تمہیں؟"

اور تم نے انگریزی میں مجھے بتایا کہ گورودیو تمہارے ساتھ عشق بگھارنے جا رہا تھا۔ تم اسے بہت سی گالیاں دینا چاہتی تھیں مگر انگریزی کی تمہیں دو تین ہی گالیاں یاد تھیں۔ تم غصے سے تلملا رہی تھیں۔

"سنئیے! چلو چھوڑو اب۔" میں نے کہا۔ "آؤ کسی پیارے آدمی کی باتیں کریں۔"

اور پھر ہم دلاور سنگھ کی باتیں کرنے لگے۔ جس کا میں شائد تم سے کم اشتیاق کے ساتھ منتظر تھا۔ واپسی پر تم میرے کمرے میں نہیں آئیں۔ آج پھول توڑنا اور میرے گلدان میں سجانا بھی تمہیں یاد نہیں رہا۔ تمہاری طبیعت ہلکی ہو چکی تھی۔ تم بے حد بشاش تھیں۔ میرے گھر کے نیچے تم نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیا اور چہکتی ہوئی چلی گئیں۔

ہم سب دلاور سنگھ کو لینے سٹیشن پر گئے۔ تمہاری باتوں سے میں نے اپنے تخیل میں اسکا جو تصور بنایا تھا وہ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کے تھا۔ وہ ایک بانکا چھبیلا جوان تھا۔ بے حد خوش خلق۔ بے حد ملنسار اور جلد ہی ہم گہرے دوست بن گئے۔ شام کی بیٹھکیں اس کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی سے بے حد خوشگوار اور حیات افروز ہو گئی تھیں۔

تین چار روز تم میرے ہاں نہیں آئیں۔ میں بھی تمہارے ہاں نہیں گیا۔

ایک دو بار تم مال پر دلاور سنگھ کے ساتھ گھومتی ہوئی ملیں۔ چند قدم میں نے تم لوگوں کا ساتھ دیا۔ دو چار ادھر ادھر کی باتیں کیں اور پھر رخصت ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ تم دونوں محبوب زیادہ سے زیادہ وقت ایک دوسرے کی صحبت میں گذار سکو۔

ایک صبح تم دونوں میرے ہاں آئے۔ تم بتانے لگیں کہ آج تم زبردستی دلاور کو سیر پر لے گئی تھیں ورنہ وہ تو میری طرح بے حد سست ہیں۔ بس سوئے پڑے رہتے ہیں۔ نامعلوم

وہاں صبح کی پریڈ پر کیسے جاتے ہوں گے، اور دلاور سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔
"وہاں پریڈ کراتے کراتے جان ہلکان ہو جاتی ہے۔ سوچا تھا یہاں آکر کچھ آرام ملے گا مگر یہاں آپ ہیں کہ ہماری پریڈ کرا دیتی ہیں۔"
تمہارے ہاتھ میں پھول تھے جو شاید تم نے اپنے (REFLEX) ری فلکس کے ماتحت توڑ لیے تھے۔ تم نے میری تصویروں کا ذکر کرتے ہوئے دلاور سنگھ کو میری تصویریں دکھانے کا ارادہ کیا۔ تم نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پھولوں کو دیکھا۔ تمہاری نظر میرے گلدان پر پڑی جیسیں سوکھی ہوئی شاخیں پڑی تھیں۔ بجلی کی چمک کی طرح ایک سایہ تمہارے چہرے سے گذر گیا۔ تم نے وہ پھول دلاور سنگھ کو تھما دیئے اور خود میری تصویریں نکال نکال کر اسے دکھانے لگیں
اس کے بعد دلاور سنگھ نے پریڈ کرنے سے بغاوت کر دی اور تم مفتوح ہو گئیں۔
تمہیں وہ سنہری دھوپ والی سہ پہر تو یاد ہو گی.....!
جب ہم دلاور سنگھ کو رخصت کر کے لوٹے تھے۔ تمہارے ڈیڈی اور ماما رکشا میں سوار ہو کر چلے گئے تھے اور ہم پیدل ہی واپس لوٹ رہے تھے۔ تم بالکل خاموش تھیں۔ تیز دھوپ نے تمہارے چہرے کو تمتما دیا تھا مگر ایک گہری اداسی نے اس میں سیاہی گھول دی تھی۔ میرا خود یہی حال تھا عزیزوں سے بچھڑتے ہوئے عام طور پر میرا یہی حال ہو جایا کرتا ہے۔ تیز دھوپ اور تیکھی چڑھائی نے تمہیں بے حال کر دیا تھا۔ تم میرے ساتھ میرے ہاں چلی آئیں۔ میں دو گلاس آرنج سکواش کا انتظام کرنے چلا گیا۔ واپس آیا تو تم کھڑکی میں کھڑی تھیں میں تمہارے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں تم سے کیا کہوں۔ ایک عجیب سی بے چینی میں اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا جیسے میرا کچھ کھو گیا ہو۔
یک لخت نامعلوم کیا ہوا تم دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگیں۔
"منھاں.....!" میں نے تمہیں تسلی دینا چاہی اور تم میرے سینے سے لگ گئیں۔ سسکیوں سے تمہارا سارا جسم ہل رہا تھا اور تمہارے آنسو میری قمیض میں جذب ہو رہے تھے۔ "منھاں ـــــ

اُداس نہ ہو منیھاں . . . "میں نے نامعلوم کہاں سے توانائی اکٹھی کر کے اپنے بھرائے ہوئے گلے پر قابو پاتے ہوئے کہا "صرف تین مہینے ہی تو باقی رہ گئے ہیں جُدائی کے۔ نومبر میں تمہاری شادی ہو جائے گی اور پھر جُدائی تمہیں پریشان نہ کرے گی۔"

اور معمول کے مطابق تم پھر سے گلدان کو پھولوں سے سجانے لگیں۔

آرٹسٹوں کا ایک وفد یورپ اور جنوبی امریکہ فنِ مصوّری میں نئے رجحانات کا مطالعہ کرنے کے لئے بھیجا جا رہا تھا۔ مجھے اِس وفد کا رکن منتخب کر لیا گیا تھا۔ مجھے اِس دورے پر جانے کی بے حد خوشی تھی۔ مگر جب تم مجھے رُخصت کرنے کے لئے آئیں تو بیشک تم خوش خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ دِل کی گہرائی میں تم اُداس تھیں اور جب گاڑی بل کھا کر سُرنگ میں داخل ہو گئی تو میں اپنے دِل میں ایک گہری اُداسی لیے تصوّر ہی تصوّر میں تمہیں اِس سڑک کی چڑھائی سُست قدموں سے چڑھتے دیکھ رہا تھا — جس پر ہم دونوں اس دن چڑھ رہے تھے۔ جب ہم نے دلاور سنگھ کو رخصت کیا تھا۔

چار برس بعد میں دہلی لوٹا —

چین سے ایک کلچرل وفد آیا تھا۔ جو ڈے لائٹ میں شو دے رہا تھا۔ شو ابھی شروع نہیں ہوا تھا میں اپنی سیٹ پر بیٹھا ناپسس پڑھ رہا تھا۔ کوئی قطار میں آیا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ کوئی تماشائی ہوگا اور آگے اپنی سیٹ پر جانا چاہتا ہوگا۔ میں نے اپنی ٹانگیں ہلا اُوپر دیکھے ہی سمیٹ لیں لیکن وُہ وہیں جم کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے نظریں اُوپر اُٹھائیں یہ جگجیت تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اِشارے سے مجھے بتایا کہ تم اور دلاور سنگھ میرے پیچھے تیسری قطار میں بیٹھے تھے۔

مسکراہٹیں ایک دوسرے سے گلے ملیں اور پھر ملنے کے لئے میں تمہاری قطار میں آ گیا اور اِس اچانک ملاپ سے تم دونوں بہت خوش تھے ——— اِتنے ہی جس قدر کہ میں ——

چھوٹے چھوٹے سوالوں سے تم بہت کچھ جاننا چاہتے تھے۔ بہت جلدی اور بہت کچھ —— اور میرے مختصر جوابات تمہارے اشتیاق کی ذرّہ بھر بھی تسکین نہ کر پاتے تھے۔ دلاور سنگھ نے گلہ کیا کہ باہر جا کر میں نے کوئی اطلاع تک نہیں دی۔ اور یک لخت تمہیں احساس ہوا کہ تمہیں بھی مجھ سے گلہ کرنا چاہیئے اور ایک دم مجھ سے ناراض ہو کر روٹھ جانے کا بہانہ کرنے لگیں ——
اور یاد ہے نا تم نے کیا کہا تھا؟ تم نے کہا تھا۔ "چھوڑو جی۔ ایسے لوگوں سے بھی کیا بولنا ہوا جو آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی بالکل بھول جائیں۔"

میں بےحد شرمندہ سا ہو گیا اور لاجواب ہو کر تم دونوں کا منہ تکنے لگا۔ تم نے اور بھی منہ پھلا لیا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے کرتے میں اپنے جذبات کے اظہار پر بھی قادر ہو گیا میں نے کہا تھا "سندراں! خط نہ لکھنا میری کمزوری ہے مگر میں اپنے دوستوں عزیزوں کو بھولا نہیں کرتا۔"

تم نے میرے اس دعوے کا ثبوت مانگا تو میں نے تمہیں ان تمام تبصروں کا اقتدار پنایا جو تمہاری تصویروں کی نمائش پر ہندوستان بھر کے اخباروں نے کئے تھے۔ تم قبول گئیں کہ تم مجھ سے روٹھنے کا بہانہ کر رہی تھیں اور مسرت سے وجد میں آ کر بولیں۔

"سچ مچ چندر ادل! مجموعی طور پر پریس نے میرے آرٹ کے متعلق وہی باتیں کہی ہیں جو تم نے پہلے روز کہی تھیں۔"

اور پھر تم کمال احسان مندی کیسا تھ میری تعریف کرنے لگیں کہ یہ میں ہی تھا جس نے سب سے پہلے تمہاری روح کو سمجھا تھا۔ تمہارے اندر کے فنکار کو دریافت کیا تھا۔ اس کے کردار کا جائزہ لیا تھا اور اسی کردار کے مطابق اس کی نشوونما کرنے میں مدد دی تھی۔

اور میرا چہرہ سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ تمہاری ان باتوں نے مجھ سے میری گویائی چھین لی تھی۔

معلوم نہیں تم نے کیوں گورودیو کا ذکر چھیڑ دیا —— اب تم بھی اسے گورو دیو کی بجائے گورُدیو ہی کہنے لگی تھیں۔ اسے گورو یا اُستاد کے معنوں میں یاد کرتے سے تمہیں شاید کوئی جذباتی اذیت پہنچتی تھی۔ تم نے بتایا کہ وہ ابھی تک اپنی تصویروں کی نمائش نہیں کر سکا۔ دوسری نمائشوں میں اس نے

اپنی تصویریں بھیجیں۔ مگر ہر اچھی اور معیاری نمائش میں اُس کی تصویریں رَدّ کر دی گئیں۔ ایک آدھ معمولی سی نمائش میں جہاں اُس کی چیزیں ٹنگا بھی دی گئیں تو پریس نے اس کا ذکر تک نہ کیا تھا۔

تم نے یہ بھی بتایا کہ اپنی ایک شاگرد پہ نیت بد سے حملہ کرنے کے الزام میں اُس پر مقدمہ بھی چل رہا ہے۔ اُس کی تربیت گاہ بند ہو چکی ہے۔ بیوی کو پانچ بچوں سمیت اُس نے پہلے ہی گھر سے نکال رکھا تھا۔ اس خبر سے میرے دل کو صدمہ پہنچا۔ میرا دل اُداس ہو گیا۔ تمہیں بھی اس کی حالت پر افسوس ہو رہا تھا۔ تم نے کہا تھا "بناوٹ اور دکھاوا کسی فنکار کو کس طرح تباہ کر دیتے ہیں۔"

اس افسوس اور اُداسی کی رَو سے میں دلاور سنگھ نے نکالا اور جب تم نے اپنی خوشگوار باتیں پھر سے شروع کر دیں تو میں تمہاری خوشی کی رَو میں بہہ گیا۔

ہال کی بتیاں مدھم ہونے لگیں۔

میں اپنی سیٹ پر چلا آیا۔

واپسی پر ہم اکٹھے ہی باہر آئے۔ راستے میں تم نے میری غیر حاضری میں ہونے والی بہت سی باتیں مجھے بتائیں ـــ بہت سی ـــ جن میں سے اکثر میں بھول چکا ہوں۔ بس ایک دو باتوں کا ایک مختصر سا تاثر ذہن پر باقی ہے۔ تمہاری شادی پر جو رونق تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے تم بیحد خوش ہو گئی تھیں اور دلاور سنگھ کے ذکر کے ساتھ تو تم قریب قریب لپٹ سی گئی تھیں۔ مگر دلاور سنگھ کو خفیف سا ملال اس بات کا تھا کہ میں اس تقریب میں شامل نہ ہو سکا تھا۔ جب تم نے اپنے بچّہ کا ذکر کیا تو تمہاری آنکھیں نیم وا ہو گئیں اور ان میں سے ایک ایسی چمک پھوٹنے لگی جیسے لاڈ میں آئے ہوئے بچّے کی آنکھوں سے پھوٹتی ہے۔ تم باتیں کر رہی تھیں۔ اُس کی غیر معمولی ذہانت کی، ذکاوت کی، اُس کی چالاکی کی۔ اس کی معصوم شرارتوں کی اور نت نئی جگتوں کی جن کے ذریعے وہ تمہاری توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے، جو بالعموم سب بچوں کے مشترکہ خاصے ہوتے ہیں۔ مگر جن کی دریافت انسان صرف اپنے بچوں ہی میں کر پاتا ہے۔

تم لوگوں سے جدا ہو کر اپنے گھر کو جاتے ہوئے میرے دل میں تمہارے بچے کو دیکھنے کا اشتیاق موجزن تھا۔

اگلے روز جب میں تمہارے گھر پہنچا اور تمہارے ٹِٹو سے پیار کرنے اور کھیلنے لگا تو میں نے اُسمیں وہ تمام باتیں زیادہ گہرائی اور تفصیل کے ساتھ دریافت کریں جو کل تم نے اس کے متعلق بتائی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم تم نے میری آنکھوں کو مسکراتے ہوئے اور اُن میں لاڈ کرتے ہوئے بچے کی آنکھوں جیسی چمک پیدا ہوتے ہوئے دیکھی تھی یا نہیں —— لیکن میں نے دلاور سنگھ کی آنکھوں میں یہی کیفیت دیکھی تھی۔ جب ٹِٹو ہم دونوں کے ساتھ کھیل رہا تھا اور تم ہونٹوں پر نورسنتہ کلیوں کی مسکراہٹ لئے ہوئے ہم تینوں کو دیکھ رہی تھیں۔

یکلخت ٹِٹو کھیلتے کھیلتے تھک گیا۔ ایک طرف دلاور سنگھ اور دوسری طرف میں اُسے کھیلنے کے لئے بلا رہے تھے اور وہ درمیان میں کھڑا کبھی میری طرف دیکھتا اور کبھی دلاور سنگھ کی طرف۔ دلاور سنگھ اُسے اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا اور میں اپنی طرف۔ کچھ لمحے ٹِٹو کھڑا باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتا رہا اور پھر وہ بھاگ کر تمہارے پاس چلا گیا اور اُس نے اپنا منہ تمہاری گود میں چھپا لیا۔ تم اُس پر جھک گئیں اور اُس کے چھوٹے چھوٹے گچھے دار بالوں والے ننھے منے سر پر اپنا رُخسار رکھ دیا۔ تمہارے ہونٹوں کے کونے اُس کے بالوں کو چوم رہے تھے۔ ہم دونوں تمہیں اور تمہارے ٹِٹو کو دیکھ رہے تھے اور پھر ٹِٹو تمہاری گود میں منہ چھپائے چھپائے ہی سو گیا۔

کچھ دن تم خاموشی سے اسے اپنی گود میں دبائے بیٹھی رہیں تاکہ وہ گہری نیند میں چلا جائے پھر تم مدھم آواز میں مغربی فنِ مصوری کی باتیں چھیڑ دیں اور میں مختصر طور پر مغربی فنِ مصوری میں مختلف رجحانات اور اسالیب اظہار اور ان سے متعلق تحریکوں کی باتیں کرنے لگا۔ دلاور سنگھ غایت دلچسپی سے میری باتیں سن رہا تھا۔ بعض نکات پر وہ تشریح بھی طلب کرنے لگتا۔

اسی شام یہ پروگرام طے ہوا کہ تم ایک دو گھنٹے کے لئے میرے نگار خانے میں آ جاؤ گی جہاں تم میرے نوٹ اسکیچ اور نئی تصویریں دیکھو گی اور ساتھ ہی ساتھ میرے لیکچر بھی سنو گی۔

اور پھر قریب قریب ہر روز دوپہر کے بعد تم میرے نگار خانے میں آنے لگیں۔ ہم تصویریں بناتے۔ باتیں کرتے اور ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھتے رہتے۔ جب میں تمہارے ساتھ فن کی باتیں کرتا تو کئی بار مجھے محسوس ہوتا کہ تم سحرزدہ سی ہو کر میری باتیں سُن رہی ہو۔ گم سُم۔ تخیّل کی کسی دُنیا میں کھوئی کھوئی اور کئی بار فن کے موضوع کو چھوڑ کر تم اپنی باتیں کرنے لگتیں۔ اپنی، دلاور کی، اِس بے پناہ محبّت کی، جو تمہیں اُس کے ساتھ ہے اور اسے تمہارے ساتھ......

کئی بار میں شام کو تمہارے ساتھ ہی چلا آتا۔ خاص کر اُن دِنوں جب تم سائیکل پر نہیں آتیں، ہم پیدل ہی باتیں کرتے چلے آتے۔ تمہارے گھر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد دلاور سنگھ بھی آجاتے اور ہم سب مل کر ٹبّو سے کھیلنے لگتے۔ باتیں کرنے لگتے۔ لطیفے کہتے اور ہنستے رہتے۔

اِسی طرح کی ایک سہ پہر تھی۔ ہم دونوں تمہارے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ ہم اُس نیم ویران گھاٹی کو عبور کر رہے تھے جو تمہارے گھر سے کچھ اِدھر ہٹ کر تھی۔ ہر طرف خزاں کی ویرانیوں کا تسلّط تھا۔ خشتِ تپیدہ کے رنگ کی سنگلاخ چٹانیں عُریاں کھڑی تھیں۔ اِن کے درمیان کہیں کہیں دوب کے چھوٹے چھوٹے دھبّے تھے جن پر موت کی سی زردی بُری طرح چھائی ہوئی تھی پیڑ ٹُنڈ مُنڈ تھے۔ پہاڑی کیکر کی شاخوں پر محض لمبے لمبے سفید کانٹے ہی لگے رہ گئے تھے۔ ڈھاک کے پیڑوں سے پتّوں کا پیراہن چندی چندی تار تار ہو کر خزاں کی ہواؤں کے ساتھ دُور دُور تک بکھر چکا تھا اور اُن کی شاخوں پر اکّا دکّا کُسنبھے کے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔

تم ایک دم رُکیں۔ میرا بازو کھینچ کر مجھے بھی روک لیا اور سامنے کی طرف اشارہ کر کے بولیں — "وہ دیکھو! وہ درخت!"

ہماری آنکھوں کے سامنے اِس خزاں رسیدہ ماحول میں اِس موت کی زردی کے درمیان ڈھاک کا ایک پیڑ کسنبھے کے شوخ سُرخ پھولوں سے لدا اِس طرح کھڑا ہوتا تھا جیسے زندگی کا شعلہ لاتعداد زبانوں کے ساتھ بھڑک رہا ہو۔ ہم دونوں مسحور ہو کر اُسے دیکھنے لگے

آفاقیت کو بھول کر ہم حکایت میں کھو گئے تھے۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ سُرخ رنگ کی یہ خوشگوار گرمی زندگی کے شعلے کی حرارت میری آنکھوں کی راہ نہیں، میرے بازو کی راہ سے میری رُوح میں سمائی جا رہی ہے۔ میں نے اپنے بازو کی طرف دیکھا۔ تم میرے بازو کیساتھ اِس طرح لپٹ گئی تھیں جس طرح اِس دن دلاور سنگھ کے بازو کیساتھ، جب ہم ڈیلاٹ سے واپس آ رہے تھے میں نے تمہاری طرف دیکھا —— تم نے میری طرف —— اور پھر دونوں کی نگاہیں، چاروں آنکھیں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے بازوؤں پر منتقل ہو گئیں۔ تم گھبرا سی گئیں —— تمہارا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ تم نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ جیسے یہ سب کچھ لاشعوری طور پر وقوع پذیر ہو گیا تھا۔ تم نے میرا بازو چھوڑ دیا۔

"یہ درخت کس قدر خوبصورت ہے۔ میں کل ہی آ کر اسے پینٹ کروں گی۔" تم نے کہا۔ تمہاری آواز، مجھے یوں محسوس ہُوا، تمہاری نہیں کسی اجنبی کی آواز تھی۔

تم خاموش ہو کر چلنے لگیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اِس اعصاب شکن خاموشی کو توڑنے کے لئے میں کُنبھے کے درخت کی باتیں کرنے لگا۔

میں کہہ رہا تھا۔ یہ درخت کس قدر خوبصورت ہے۔ کس قدر زندگی سے لبریز، خوشگوار مسرّت افزا، خزاں میں بہار کا رنگ لئے ہوئے۔ مگر ہمارے کلاسیکی شاعروں نے اِسے موت ـنا اور آگ سے تشبیہ کیوں دی تھی؟

"ہتھ نہ لائیں، کُنبھیرڑے جل جاسی ڈھولا۔" کہہ کر اُس نے خوف زدہ کرنے اور اجتناب کرنے کے لئے کیوں کہا تھا۔ یہ یاسیت یہ قنوطیت کیوں؟

مگر تم خاموش تھیں۔

گھر پہنچ کر بھی تم خاموش رہیں۔ راستہ بھر میں کیا کیا باتیں کرتا آیا تھا۔ یہ مجھے قطعی یاد نہیں تمہاری خاموشی نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس موضوع پر اور

کیا بات کروں؟ تم دیوان پر بیٹھی تھیں۔ کمرے میں مکمل سکوت تھا اور یہ سکوت نامعلوم کیوں میرے لیئے ہیبت انگیز بنتا جا رہا تھا۔ اِس ہیبت سے چھٹکارا پانے کے لیئے مَیں نے نہایت بے تُکے پن سے سالویڈار ڈالی اور ڈیگوری ویرا کے فن پر باتیں شروع کر دیں۔

مَیں بولے جا رہا تھا مگر نہ معلوم آج کیا ہو رہا تھا۔ میری نگاہیں تم سے دُور دُور بھاگ جاتیں ایک لمحے سے زیادہ عرصے تک یہ تمہارے چہرے پر نہ ٹک پاتیں۔ گاہے گاہے اپنی ان لمحاتی نظروں سے مَیں نے دیکھا کہ تم میری باتیں سنتے سنتے اپنی ٹھوڑی کو بہت بُری طرح مسل رہی تھیں مَیں نے تمہاری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے تم کسی بھاری بوجھ کے نیچے دبی سانس لینے کے لیئے بے تاب ہو رہی ہو۔ تمہاری نظریں بے حد کرب ناک ہو گئی تھیں۔ تم نے میری نگاہوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مَیں دُوسری طرف دیکھنے لگا۔ نہ معلوم تمہیں کیا ہُوا ایک دم تم ہاتھوں میں مُنہ چھپا کر سُبکیاں لینے لگیں۔ مَیں خاموش ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مَیں کیا کروں؟ کیا کہوں؟ ——

روتے روتے تم اُٹھیں اور مُنہ موڑ کر دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔ طاق کے ساتھ اپنا بایاں کندھا لگا کر تم پھر منہ چھپا کر رونے لگیں۔ کچھ دیر میں بے حس بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کر مَیں تمہارے پیچھے آ کھڑا ہُوا۔ ہکا بکا چند ثانیے میں کھڑا رہا۔ میرا سانس تمہارے سر کی پشت کے بالوں میں ہلکی ہلکی لرزش پیدا کر رہا تھا اور پھر مجھے معلوم نہیں کیسے مَیں نے اپنے ہاتھ تمہارے کندھوں پر رکھ دیئے۔ کچھ دیر تک تم میرے ہاتھوں کا لمس محسوس کرتی رہیں اور جب مَیں نے بھرائی ہوئی آواز میں پُوچھا۔

"منھاں! کیا بات ہے؟"

ایک دم جھٹکے کے ساتھ تم مُڑیں اور اپنا سر میرے سینے پر ٹکا دیا۔ تمہاری سُبکیاں تیز ہو گئیں۔

"روتی کیوں ہو منی؟" میں نے آہستگی سے پُوچھا۔

تم نے تین چار سسکیاں بلند آواز کیساتھ لیں۔ تمہارے تمام جسم کے ساتھ ساتھ تمہارا سر بھی ہلا اور پھر تم خاموش ہوگئیں۔ میں نے اپنی ٹھوڑی تسلّی دینے کے انداز میں تمہارے سر پر پھیری اور پھر تمہیں لاکر دیوان پر بٹھا دیا۔ تم نے آنسو پونچھ لئے اور پُرسکون ہوکر بیٹھ گئیں۔

"کیا ہُوا تھا تمہیں؟" میں نے اِس اضطراب انگیز سکوت کو توڑتے ہوئے پُوچھا۔

تم نے میری آنکھوں میں دیکھا اور ہیجانی انداز میں بولیں۔

"تم کتنے فراڈ ہو — نہیں نہیں — میں کتنی فراڈ ہُوں..... دراصل ہم دونوں بڑے فراڈ ہیں۔ ہم دونوں ایک دُوسرے کو دھوکا دیتے ہیں۔ ہم دونوں اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں مگر ظاہر نہیں کرتے۔ ہم اپنے آپ کو بھی یقین دلاتے رہتے ہیں کہ محبّت نہیں کرتے مگر — مگر —"

اور یک لخت مجھے احساس ہُوا کہ تم ٹھیک کہہ رہی تھیں ——————

۔ اِس وقت مجھے پہلی بار احساس ہُوا کہ حقیقتاً میں تم سے محبت کرتا تھا۔ کب سے؟ — یہ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا — لیکن بہت عرصے سے — بہت مُدت سے — نامعلوم تم کون سے چور دروازے سے کس وقت میرے دل میں داخل ہوگئی تھیں کہ مجھے پتہ تک نہ چلا تھا۔ مجھے احساس تک نہ ہُوا تھا۔ مجھے اچانک اس وقت احساس ہُوا جب تم مکمّل طور پر میرے ذہن، میری رُوح پر قابض ہو چُکی تھیں اور میرا خیال ہے ایسی ہی کیفیت تمہاری بھی تھی۔

میں خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"کیا میں جھُوٹ کہہ رہی ہُوں؟"

میں نے اِنکار میں سر ہلایا۔

تم میرے کندھے کیساتھ جھک گئیں اور ہم محبت کے متعلق، اپنی محبت کے متعلق، بے حد افلاطونی قسم کی باتیں کرنے لگے اور یہ افلاطونی باتیں ہمارے موضوعاتِ گفتگو کا باقاعدہ

حصّہ بن گئیں۔

دوسرے کمرے میں ٹپّو جاگ پڑا۔ معمول کے برعکس تم آیا کو آواز دینے کی بجائے خود ہی اُٹھ کر چلی گئیں اور ٹپّو کو گود میں اُٹھائے ہوئے اُس کے رُخساروں، ہونٹوں، گردن اور پیشانی پر بوسوں کی پُرزور بارش کرتے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔ اپنے پُرجوش بوسوں سے تم نے اُس کے قدرتی گلابی رُخساروں کی رنگت کو اور بھی فروزاں کر دیا تھا۔

تمہاری اس گرمجوشی سے وہ کچھ پریشان ہو گیا تھا اور اسے بے چینی سے نجات دلانے کے لئے میں نے اسے اپنی گود میں لے لیا اور بڑی آہستگی کے ساتھ اسے اپنے سینے سے لگائے میں اس کے رُخساروں اور پیشانی پر پیار کرنے لگا اور وہ کمال سکون کے ساتھ میرے سینے سے لگ گیا۔

آیا دودھ لے آئی۔ تم ٹپّو کو دودھ پلانے لگیں اور میں تم دونوں کو دیکھنے لگا۔

دلاور سنگھ آیا اور ہم باتیں کرنے لگے۔ اچانک اُس نے تم سے مذاق کیا اور تمہیں چڑانے کے لئے جب میں نے اُس کے ساتھ مل کر اُس کے مذاق کو بڑھاوا دیا اور ہنستے ہنستے میں نے تمہاری طرف دیکھا تو نا معلوم تمہیں کیا ہوا خلافِ معمول تم بیحد سنجیدہ ہو گئیں۔ خاموش ہو کر تم نے نہایت شکایت آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں گھبرا گیا جیسے مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ ہم دونوں کو سنجیدہ ہوتے دیکھ کر دلاور سنگھ بھی خاموش ہو گیا۔ اُس نے متلاشی نگاہوں سے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ اُسکی ہنستی ہوئی چمکیلی آنکھوں میں ایک تاریکی منڈلائی۔ اُس کے چہرے کی لکیریں ایک اذیّت ناک تاثر میں بٹ گئیں اور پھر جیسے اُس نے تیزاب کا گھونٹ حلق کے نیچے اُتار لیا۔ سنبھل کر اُس نے اِن تمام تاثرات کو چہرے پر سے ہٹا ڈالا اور پہلے کی طرح ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے اُس نے ہمارے اس طرح خاموش ہونے کی وجہ دریافت کی ــــ

میں نے موقعہ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا کہ تم مجھ سے لڑ پڑی

ہوا اور جب اُس نے تم سے لڑنے کی وجہ دریافت کی تو تم نے بات بناتے ہوئے گلہ کیا کہ تم نے مجھ سے استدعا کی تھی کہ میں قریب قریب ہر روز تمہارے یہاں گھر تو آتا ہی ہوں۔ اِس لئے اگر میں ایک دو گھنٹے پہلے آجایا کروں تو تمہیں میرے اسٹوڈیو میں جانے کی کوفت نہ اُٹھانی پڑے اور اس طرح ٹمّو کو بھی زیادہ عرصے تک آیا کی سپردگی میں چھوڑنا نہ پڑے اور میں اپنا کام بھی تمہارے سٹوڈیو میں کر سکتا ہوں۔ مگر میں نے تمہاری یہ استدعا نہایت سرد مہری کے ساتھ رد کر دی تھی۔

اور تمہاری بات سے لقمہ لیتے ہوئے میں نے دلاور سنگھ کے آگے گلہ کیا کہ نادانستگی میں میرے مُنہ سے اِنکار نکل گیا ہے مگر اب میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میں آجایا کروں گا۔ مگر اب تم مانتی ہی نہیں ہو۔ تمہیں اِس بات پر اصرار ہے کہ میں نے پہلے اِنکار کیوں کیا اور میں نے کہا کہ تمہاری یہ ناراضگی بالکل بچوں ایسی اور ناواجب ہے۔

پھر دلاور سنگھ نے محبّت کے ساتھ فہمائش کرتے ہوئے تمہیں میری پیشکش مان لینے اور ضد چھوڑ دینے کی تلقین کی اور اس طرح اُس نے ہماری صُلح کرا دی۔ اس نے اِس ساری بات کو بالکل حقیقت پر محمول کیا اور شائد اُس نے اندر ہی اندر افسوس بھی کیا ہو کہ کیوں اُس کے دِل میں ایک لمحہ کے لئے شک پیدا ہوا تھا۔

مطلع صاف ہو گیا اور جب میں گھر واپس جا رہا تھا تو جہاں میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ دِن میری زندگی کا سب سے خوشگوار۔ سب سے لذّت آفریں دِن تھا وہاں میں اپنے سینے پر تمہارے لمس کا احساس لئے جا رہا تھا۔ ایک ناقابلِ بیان مسرّت کے احساس کے ساتھ یہ اِلفاظ میری زبان پر ناچ اُٹھے۔

(اِک یاد جہی مٹھی یاد جہی لگی رہ گئی کلیجے وے نال وے۔

لیکن میرے ذہن میں لفظ احساس ایک نئے تصوّر، ایک نئے (PERCEPTION) ایک نئے احساس کی تمثیل بن گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مسرّت کے بے پناہ احساس

کیساتھ ساتھ ایک مبہم سے درد کی لہریں بھی مجھے اپنے سینے میں کروٹیں لیتی ہوئی محسوس ہوئیں دلاور سنگھ کے چہرے پر ایک لمحے میں پیدا ہونے والے تاثرات بار بار میرے تصوّر پر چھا جاتے اور اُس کے ساتھ ہی ایک ٹیس سی دل میں اُٹھتی۔ مگر تمہارے آغوش کی مسرّت افزا رنگینی اِسے عمیق گہرائیوں میں دھکیل دیتی۔

اگلے روز سے ہم دونوں تمہارے نگار خانے میں کام کرنے لگے۔ ہم کام کرتے باتیں کرتے کئی بار تم نے مجھے ماڈل بنا کر میری اسٹڈی کی۔ میرے دل میں بھی کئی بار یہ خواہش پیدا ہوتی کہ میں تمہیں پوز کرنے کے لئے کہوں۔ مگر نا معلوم کیوں مجھے اِس خواہش سے خوف معلوم ہونے لگتا اور میں اِس خواہش کو دبا دیتا۔

ہم باتیں کرتے محبّت کی باتیں کرتے —— جب تک ہماری محبت تحت الشعور میں دبی رہی تھی یہ ایک مبہم خوشی، ایک ناقابلِ فہم مسرّت کا موجب تھی۔ اسمیں ایک سکون تھا۔ ایک ٹھہراؤ تھا۔ مگر جب سے یہ اُبھر کر ہمارے شعوری ذہن میں داخل ہوئی تھی اُس کے ساتھ ایک اضطراب۔ ایک خوف ہم آغوش ہو گیا تھا۔ اُس کی مسرّت اور خوشی تیز اور تیکھی ہو گئی تھی۔ مگر اُس کے ساتھ ہی ایک درد، ایک ٹیس اِسمیں تحلیل ہو گئی تھی۔ مجھے کبھی تاریکی نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن اب اپنی محبت کے بارے میں سوچتے سوچتے کئی بار ہمیں اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرے ناچتے نظر آتے اور یہ چیز ہمیں بے حد اُداس بنا دیتی ——

جب کبھی مجھے اپنی زندگی، اپنا مستقبل، اپنی محبت کا مستقبل تاریک نظر آتا اور میں اُداس ہو جاتا تو تم بے حد افلاطونی قسم کی باتیں کر کے مجھے تسلّی دیتیں اور جب تمہاری حالت ایسی ہوتی تو میں بھی افلاطونی باتیں کرنے لگتا اور اِس طرح ہم تاریکی میں سے روشنی تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔

ایک روز تم میرے اسٹوڈیو میں آئیں۔ تمہارے گھر کے لئے روانہ ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ میں کام کر رہا تھا۔ تم نے مجھے کام کرنے سے روک دیا۔ تم

بے حد خوش تھیں۔ لیکن تمہاری اس خوشی میں بھی ایک سیمابی کیفیت تھی۔ تم کبھی ایک جگہ بیٹھتیں اور کبھی دوسری جگہ اور پھر وہاں سے اٹھ کر کسی اور جگہ جا بیٹھتیں۔

آخر تم نے کہا کہ آج تمہارا موڈ گھر میں بیٹھنے کا نہیں باہر چلنے کا ہے اور ہم پیدل ہی تمہارے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جب ہم نیم ویران گھاٹی کو عبور کر رہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے کے تمام منظر میں تبدیلی آچکی تھی۔ ڈھاک کے پیڑ کسنبھی کے شگوفوں سے لدے کھڑے تھے۔ ببکر کے پیڑ پہلے سے بھی زیادہ گنجے ہو چکے تھے۔ تمام منظر میں پھول اور کانٹے ایک دوسرے میں اُلجھے پڑے تھے۔ سرخ سرخ پھولوں کے جھنڈ سپید سپید کانٹوں میں گھرے کھڑے تھے اور کانٹوں کے جھنڈ شگوفوں کے جھنڈ سے محصور تھے — مگر میرا رجحان آج کل پنارمک (PANORMIC) نظاروں کو پینٹ کرنے کا نہیں تھا اور نہ کبھی مکمل چیز کو آج کل میں اشیاء اور اجسام کے حصّوں کو ان حصّوں کے RYTHMIC FORM کو پینٹ کر رہا تھا۔ ان حصوں کے (TEXTURES) میں پنہاں موسیقی کو اُبھارنا میرا مقصود بنا ہوا تھا۔

ساتھ چلتے چلتے ہمارے کندھوں کے درمیان کا فاصلہ بالکل مٹ چکا تھا۔

تمہارے اسٹوڈیو میں پہنچے اور میں نے تمہیں کام شروع کرنے کے لئے کہا لیکن تم نے یہ کہا کر کہ آج تمہارا جی کام کرنے کو نہیں چاہتا چنانچہ ہم باتیں کرنے لگے۔ لیکن نچلا تم سے پھر بھی نہ بیٹھا جاتا تھا۔ ایک بار تم اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ تمہاری پیٹھ میری طرف ہوئی تو میرے دل میں تمہاری اسٹڈی کرنے کی خواہش شدّت سے موجزن ہو گئی۔ تمہاری پیٹھ تمہارے جسم کا سب سے خوبصورت حصّہ ہے اور میں نے کہا۔

"منھاں! تمہارا کام کرنے کا موڈ نہیں تو میرا ہی ایک کام کرو۔"

"کیا؟" تم نے پوچھا۔

"تم میرے لئے پوز کرو۔"

"کیسے؟"

"میں تمہارا ٹارسو اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا "بیک سائیڈ ٹارسو۔ کولہوں تک۔" تم بخوشی رضامند ہو گئیں۔ تم دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور چند منٹ کے بعد ایک اونی شال لپیٹے ہوئے اسٹوڈیو میں داخل ہوئیں۔ اسٹول پر بیٹھ کر پہلے تم نے اپنا دایاں ہاتھ باہر نکالا۔ شال کے پلو کو دائیں ہاتھ سے سینے پر دبا لیا اور پھر بایاں ہاتھ باہر نکال کر شال کندھوں سے نیچے کولہوں تک گرا دی۔

برش کی ڈنڈی کے ساتھ میں نے شال کے کناروں کو مناسب ترتیب میں رکھا۔ اب میرے سامنے تمہارے ٹارسو کی پیٹھ اپنی انتہائی جمالیاتی عظمت کے ساتھ ضوفشاں تھی۔ میں نے اسٹڈی شروع کر دی۔

میرا ارادہ محض سکیچ کرنے کا تھا۔ مگر میں اسے مکمل تصویر کی شکل میں پینٹ کرنے لگا۔ تمہارے کندھوں کے پھیلاؤ میں، تمہارے پہلوؤں کی لکیروں میں جو ترنم اور نغمگی خوابیدہ تھی میں اسے کینوس پر منتقل کرنا چاہتا تھا ——— مکمل اور بھرپور صورت میں ———

جب میں تصویر مکمل کر چکا تو پیچھے ہٹ کر میں تصویر کا اور تمہاری پیٹھ کا موازنہ کرنے لگا۔ کہ جو بھرپور زندگی لے اور راگ ماڈل میں موجود تھا وہ کیا میں تصویر میں بھی منتقل کر سکا ہوں یا نہیں۔

اور مجھے تسلی ہوئی کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تھا لیکن تسلی ہونے کے بعد بھی میں دونوں کو دیکھتا چلا جا رہا تھا اور پھر تصویر کو بھول کر تمہارے ٹارسو کو ہی دیکھنے لگا۔ تمہارے پہلوؤں کی لکیریں ان لکیروں کی گران جیسے بھیرویں کی اور دہی استھائی پر گر رہی ہو۔

بھیرویں کی اور دہی کو استھائی پہ گرتے سنکر ایک عجیب یاد بسی سی، کومل سی ڈبکی نما کیفیت میرے دل میں پیدا ہو جاتی ہے جیسے ایک سیمگوں مچھلی سرنگوں ہو کر

دُم ہلاتی ہوئی گہرے سبز سمندر کی عمیق ترین گہرائیوں میں تیزی سے اُترتی چلی جا رہی ہو۔ اِس کیفیت کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی ایک عجیب جھنجھنی سی میرے ہونٹوں میں بجلی کی رَو کی طرح دوڑنے لگتی ہے اور یہ کسی مبہم سے، انجانے سے لمس کی تلاش کرنے لگتے ہیں۔

ٹھیک اُسی قسم کی کیفیت میرے دل میں پیدا ہو گئی جب میں تمہاری پیٹھ پر سیپ کے اندرونی سطح کے ملائم رنگ کی پیٹھ پر نظریں جمائے تمہیں تک رہا تھا۔ اچانک نا معلوم کس قوّت سے تحریک پاکر مبہم اور اَن جانے لمس کی جستجو کرنے والے میرے ہونٹ تمہاری پیٹھ سے جا لگے۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ میرے ہونٹ سیپ کے اندر کی خُنک اور ملائم سطح کو چُوم رہے ہیں۔

ایک دم تم پیچھے گریں اور ایک کروٹ لی اور اسٹول سے پھسل کر میرے بازوؤں میں آ رُکیں۔ ہونٹوں کے دو جوڑے ایک دُوسرے سے پیوست ہو گئے اور مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے ہم دونوں کا جسمانی وجُود ختم ہو کر ایک انجانی، ان پہچانی، مبہم سی، لطیف سی خوشبُو میں تحلیل ہو چکا ہے۔

دُوسرے کمرے میں بٹّو کے رونے کی آواز آئی۔ بجلی کے ایک کوندے کے ساتھ دُنیا کا آفاقی وجُود ٹرائے سے سونے کی لنکا تک جوئے فرہاد سے چناب کی طوفانی لہروں تک میرے ذہن میں سے گزر گیا۔ اِس کوندے میں مجھے تمہارے گھر کی دیواریں گرتی نظر آئیں اور اِن دیواروں کے نیچے بٹّو اور دلاور سسکتے دکھائی دیے۔ بٹّو کا یہ کوندا میرے وجُود کو چیرتا ہُوا نکل گیا۔ ایک سرد یخ بستہ کپکپی میرے جسم میں دوڑی۔ اُسی لمحے تمہارے جسم میں بھی ایسی ہی کپکپی پیدا ہوئی اِن دونوں کپکپیوں نے ایک دُوسرے سے مِل کر ہمیں پتھر سا بنا ڈالا۔ دو پتھر کی مورتیاں ایک دُوسرے سے الگ ہو گئیں۔ تم جلدی سے اُٹھ کر بٹّو کے پاس چلی گئیں اور میں دونوں ہاتھوں میں سر تھامے اِس کوندے کی مکمل تصویر کو جزوی طور پر الگ الگ تصویروں کی شکل میں اپنے ذہن میں اُبھرتے ڈوبتے دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد تم بٹّو کو گود میں اُٹھائے ہوئے داخل ہوئیں۔ ایک کرب ناک زردی تمہارے چہرے

پر چھائی ہوئی تھی۔ ایک تیز بلیڈ جیسے میرے دل کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے نظریں جھکائے ہوئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے ذہن کو کسی بے پناہ بوجھ کے نیچے کچلا جاتا محسوس کر رہا تھا۔ ٹھیک۔ ایسا ہی کچھ تم بھی محسوس کرتی نظر آ رہی تھیں۔

"منی!" میں نے دل کو پھٹنے سے بچاتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہے ہم ایک دوسرے سے ملنا بند کر دیں۔"

تم نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ درد اور ہیبت کے تاریک سائے تمہارے چہرے پر چھا رہے تھے۔ تم نے ٹُو" کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں — ہاں — تم — یہاں نہ آیا کرو۔"

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر تمہاری طرف دیکھا۔ ایسی نظر سے جیسے میں آخری بار تمہیں دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر میں نے ٹُو کو گود میں لے لیا۔ میں نے گہری نظر کے ساتھ اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ جیسے میں ہمیشہ کیلئے اسے اپنے دل میں اُتار لینا چاہتا ہوں۔ میں نے اسے سینے سے بھینچ لیا۔ روتے ہوئے دل کے ساتھ میں نے اُس کا منہ چوما۔ ایک بار پھر تمہاری طرف دیکھا اور باہر آ گیا۔ ہولے ہولے قدموں کے ساتھ جب میں جا رہا تھا تو میں نے محسوس کیا تمہاری گرم گرم بھیگی بھیگی نظریں میری پیٹھ کو چھو رہی ہیں۔

چار روز میں تم سے نہیں ملا۔ میں نے خود کو کھلے دروازوں کے ساتھ اپنے گھر میں مقید کر لیا تھا۔ میرے دل کی کیفیت ایسی ہو رہی تھی جیسے کسی شیر کو نیا نیا زنجیروں میں کسا گیا ہو اور وہ آزادی کے لئے تڑپ رہا ہو۔ کئی بار میں نے خود کو لاشعوری طور پر تمہارے گھر کی راہ پر چلتے پایا۔ دوسری طرف جاتے جاتے نا معلوم کس طرح غیر ارادی طور پر میرے قدم تمہارے گھر کے موڑ مُڑ مُڑ جاتے اور میں کسی ناقابلِ بیان اذیت کے ساتھ زخموں سے غراتے ہوئے شیر کو ان راہوں سے واپس گھسیٹ کر لاتا۔

پانچویں روز میں اپنے اسٹوڈیو میں اس زخمی شیر سے گتھم گتھا ہو رہا تھا اور سر آن پہ شیر

اپنے تیز ناخنوں سے میرا چہرہ نوچ نوچ لیتا کہ اچانک تم میرے دروازے میں آکھڑی ہوئیں۔ زخموں سے چُور چُور میں نے تمہاری طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے زخموں کا درد جیسے تھم سا گیا۔ ایک خفیف مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آئی۔ خاموشی سے تم میری طرف دیکھتی رہیں اور میں تمہاری طرف۔ اور پھر اسی طرح چُپ چاپ تم اندر آکر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

میں تمہاری طرف دیکھتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے تمہارے قریب تمہارے سامنے آکھڑا ہوا۔ شیر نے پھر سے اپنے ناخن میرے پہلے سے لگے زخموں میں گاڑ دیئے۔ میں گھٹنوں کے بل فرش پر گر پڑا۔ ہم دونوں ایک دُوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔ درد کی ٹیس کی تاب نہ لاتے ہوئے میں نے اپنا مُنہ تمہاری گود میں چھپا لیا۔ "سنی! تم کیوں آئی ہو یہاں کیوں آئی ہو؟"

تم میرے اُوپر جُھک گئیں۔ اپنا رُخسار تم نے میرے سر پر رکھ دیا۔ ہلکی ہلکی ہچکیوں میں تم نے کہا — "کیوں؟ ہاں۔ کیوں آئی ہوں — کیوں آئی ہوں میں!" اور پھر ایک لمبی سسکی کا گلا گھونٹتے ہوئے تم نے کہا۔

"میں نہیں جانتی — مگر — مگر — مجھے آنا نہیں چاہئے تھا — مجھے نہیں آنا چاہیئے تھا۔"

تم نے اپنے ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیئے۔ آہستگی کے ساتھ مجھے پیچھے ہٹاتے ہوئے تم اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"اچھا — آ — آ — !"

"کچھ دیر تو ٹھہر جاؤ۔" نہ جانے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے التجا کی۔ تمہیں کندھوں سے پکڑ کر جیسے تم میری ہو — میری اپنی .....

"کیا کروں گی ٹھہر کر؟"

تم نے رُکتے ہوئے کرب ناک آنکھوں سے میری کرب ناک آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے تمہاری موجودگی میرے زخموں کو آہستہ آہستہ سہلا رہی ہے لیکن کب تک؟ ... اور پھر لادر سنگھ، ٹوٹا ہوا ساگر — تم میری ہوتے ہوئے بھی میری نہیں تھیں

([illegible])

بقیہ صفحہ ۳۰۰ سے آگے

جیسے تھے بزم میں نہ مخاطب کسی سے ہم ⁂ افسانہ اُن سے کہہ گئے اِس سادگی سے ہم
کس قدر بے رنگ ہے دُنیا مری ⁂ جیسے میکش کی سحر، زاہد کی شام
اُمید و بیم کا اِک حشر برپا دیکھ لیتے ہیں ⁂ وہ جب ہم کو بہ اندازِ گوارا دیکھ لیتے ہیں
کبھی تیرے بھی زانو پر یونہی اِک دل دھڑکتا تھا ⁂ کلی کی گود میں شبنم کو لرزاں دیکھنے والے

"نبضِ حیات" شفا کی شاعری کا وہ دلکش سنگم ہے جہاں قدیم و جدید خیالات کی لہریں یکجا ہوتی ہیں ان لہروں کے "پُرپیچ گیسوؤں میں ناز بھی ہے، آنسو بھی بھرے پیمانوں میں"۔ نبضِ حیات کی اشاعت ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ پانچ سو سے زائد اشعار ہوتے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ان اشعار کی تخلیق ان حالات میں ہوئی ہوگی جبکہ ۱۹۴۷ء کے دوش پہ آرزوؤں اور امنگوں کے چراغ جل رہے تھے اور شفاؔ اِس مبارک عہد کے استقبال میں پیش پیش تھے۔

شفاؔ بڑھو کہ اُفق در نظر، رجز بر لب ⁂ شفق کی آڑ میں کچھ کارواں سے گذرے ہیں

اِس عہد میں بدیسی سامراج اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ آرزوؤں کے چراغوں کی رَو میں قومی ترقی، انسانی آزادی، معاشی خوشحالی کی قندیل فروزاں ہو رہی تھی۔ شفا کے ہموطن شہیدوں کے خون سے نگارِ آزادی کے ماتھے میں سُرخی بھری جا رہی تھی۔ لیکن بنگال اور پنجاب کی سرحدوں پر خون کی لکیریں پھیل رہی تھیں، مبارکباد اے چشمِ تماشا! شفا نے اِن ہنگاموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ انسانیت سوز ڈراموں کا سین شروع ہو رہا تھا۔ قوم پرستوں نے قوم دشمنی کا بیوپار شروع کر دیا تھا۔ وہ دھندا جو کل تک سامراجیوں کے ہاتھ تھا، شفا کے ہموطنوں کے ہاتھ آگیا۔ انسان، انسان میں نفرت کے جذبات پھیلے۔ چند تجوریوں کے پیٹ بھرے تو عوام کی بھوک جاگی۔ شفا نے اِس تلخی کو محسوس کیا اور یہ زہر اُنہیں نگلنا پڑا۔ وہ خاموش نہ رہ سکے اور رہ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ گوشہ نشین فلسفی نہ تھے جو دریا کی تہوں میں موتی دیکھ رہے تھے۔ اُن کی نظریں اُس "موجِ بیباک" کی طرف بھی تھیں جو ساحل کے لئے "خار و خس و خاک" لا رہی تھی اور اِسی لئے ......

کلیاں سسک کے رہ گئیں، گُل کسمسا گئے ⁂ تم نے بھی آکے روکی ہے اپنی ہنسی کہاں

جب تڑپ میں کمی ہو گئی ہے ؞ مضمحل زندگی ہو گئی ہے

کے سے اشعار اُن کے اُس عوامی جذبہ کی پیداوار ہیں جس نے اُن کے اخلاص کی تانت کو چھیڑ کر یہ دلسوز راگ پیدا کیا ہوگا - دِلسوزی اور رُوحانی سوگواری کا یہ عالم لازمی طور پر ایک انقلابی لب و لہجہ کا خالق بنا - اِس انقلاب کی فضاؤں میں نامرادیوں اور بے اطمینانیوں کی بھُوکی رُوحیں تیر رہی ہیں - اُن کے یہاں یہ اِنقلاب کوئی ہاتھی کی چنگھاڑ نہیں اور نہ کوئی رسمی جوش و خروش ہے بلکہ مدھم آنچ سے کشید ہونے والا وُہ تیز سیّال مادہ ہے جسکی تہہ رانی اور زہرناکی دھیرے دھیرے سرایت ضرور کرتی ہے مگر اس کے اثرات بہت دیر تک قائم رہتے ہیں اور یہی وُہ متین لہجہ ہے جس کے بارے میں ، مَیں پہلی چند سطروں میں عرض کر چکا ہوں - یہ متانت اور سنجیدگی اِس قسم کے ترقی پذیر خیالات رکھنے والے کم ہی شعراء کے یہاں ملتی ہے - آپ بھی اِس عزم اور ولولہ کی شدّت محسوس فرمائیے :-

(۱) ہر اِک قدم سے جیا اُبھریگی منزلِ کامیاب لیکر ؞ جہاں پہ اِک کارواں ملے گا وہیں سے سو کارواں بنینگے
(۲) منّتِ صیّاد کی حاجت نہ ہو گی کچھ ہمیں ؞ اب قفس کی تیلیوں میں آشیاں ڈھونڈیں گے ہم
(۳) رُک نہیں سکتے قدم اُٹھے ہوئے ؞ مُسکرائیں لاکھ اب شام و سحر
(۴) حقیقت تو یہ ہے کہ روزِ ازل سے ؞ بغاوت جزوِ آدم ہو گئی ہے !
(۵) ظُلمتیں گھٹنے کا آخر اور کب تک اِنتظار ؞ لاؤ باقی رات کو بڑھ کر سحر میں ضم کریں

اور "باقی رات" کو سحر میں ضم کرنے کا اِرادہ اُن حالات سے بغاوت کا عزم ہے جس کا اِشارہ مندرجہ بالا سطور میں کر چکا ہوں - ہندوستان کو آزادی مل گئی ہے لیکن پھر بھی معاشی نابرابری طبقاتی تفریق - لسانی عصبیت اور غیر جمہوری سیاست کے اثرات باقی ہیں - یہ وُہ باقی سیاہیاں ہیں جن کی نظریں ایک سحر کے اِنتظار میں بچھی ہوئی ہیں -

حق تو یہ ہے کہ نبضِ حیات میں موجزن خُون کا ہر قطرہ شفا کی اخلاص مند اور سوز مند شاعری کی قسمیں کھا رہا ہے - اُنہوں نے اِنسانی نسل کی عظمت اور اِنسانی زندگی کی جدوجہد ، حرب و پیکار ،

سعی و عمل کے تقدس کے آستانوں پر عقیدت کے سجدے نظر کئے ہیں۔

ادب سے عرشِ اعظم بھی جھکا دیتا ہے سر اپنا ÷ حریمِ قدس میں انساں کا جب بھی نام آتا ہے
زندگی اب وہ زندگی نہ رہی ÷ موت آئے تو سوچ کر آئے
عروج کی حد کو چوم لیں گے تڑپ کے اب پستیوں کی تہہ پر ÷ زمین کے یہ حقیر ذرے جلالتِ آسماں بنیں گے
اور تو ہر طرح تکمیلِ پرستش ہو چکی ÷ صرف اپنے سامنے کرنا ہے اک سجدا مجھے

نبضِ حیات کی غزلوں سے نئے پیرہن کی خوشبو آتی ہے۔ ان غزلوں میں نیا نکھار اور سکھرا پن ہے ان میں ابہام کی چادروں سے ڈھکی، استعاروں، تلمیحوں اور باریک بینیوں کے وہ گورکھ دھندے نہیں ملتے جن کو سلجھا کر ہمارے فارغ البال بزرگوں نے وقت گذاری کی ہے۔ بلکہ حقیقت اور صداقت سے بھرپور نئے طرز کی توانا غزل ملے گی جس کے شوخ چہرے پر شفا کے فن کی لکیریں آراستہ ہیں۔ یہ سب اِس بناء پر ہے کہ شفا نے متقدمین کے کلام کا مطالعہ کر کے اُن کے صحت مند عناصر کو نئے حالات اور ماحول کے مطابق اپنے اشعار میں سمونے کی کوشش کی ہے اور یہ اُردو زبان اور شعر کی ترقی اور کامیابی کا اصل راز ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس پر میں اکثر بحث کرتا ہوں اور بالخصوص فراق گورکھپوری اِس امر سے واقف ہیں۔ غزل کو نئی وسعتوں اور نئی سمتوں کی طرف لیجانے میں متقدمین کے گُل و بلبل کی اشاریت (SYMBOLISM) کافی مؤثر اور جامع صورت ہے۔ مجنوں نے اپنی "ادب اور زندگی" میں اِس پر کافی زور دیا ہے اور وہ تمام نقاد جو زندگی کی بڑھتی ہوئی قدروں اور ادب، سماج اور سیاست کے اضافی رشتوں کو سمجھتے ہیں۔ اِس مسئلہ پر متفق ہیں کیونکہ دراصل قدیم توانا تہذیبی اور ثقافتی روایتوں کے ہم بہترین وارث ہیں۔ بہر کیف میں یہ عرض کر رہا تھا کہ شفا کے تغزل کی کامیابی کا اصل راز یہی ہے۔ اُن کے یہاں فکر کی شوخی کے ساتھ فن کی خوبی بھی ملتی ہے۔

ساری خود داریاں دل کی رکھی ہیں ÷ اُن کے جلوؤں میں جا کر نظر مل گئی
شبِ فراق کچھ ایسے بھی حادثے گذرے ÷ چراغ جلتے رہے اور روشنی نہ رہی

بہار آتے ہی دامان و گریباں جاگ اُٹھتے ہیں ⁂ گلستاں کروٹیں لیتے ہیں زنداں جاگ اُٹھتے ہیں
مہکتے ہوئے بتوں پر بہ سایہ تبسم ⁂ پھولوں سے ڈھل رہا ہے جیسے شرابِ خانہ
وفا کی راہ میں ایسی بھی ایک منزل ہے ⁂ جہاں سے رُک کے ذرا دو جہاں گذرتے ہیں

نبضِ حیات کے اشعار کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ شفاؔ کے یہاں ندامت سے ترقی کی طرف مائل شاعری کا جو سلسلہ ملتا ہے وہ ہنگامی نہیں ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ اُسمیں موضوعات اور خیالات مستعار لئے گئے ہوں اور دُوسرے چیخ و پکار کرنے والے نعرہ بازوں کی طرف چلتی شاعری کی رَو میں نظم کر لئے گئے ہوں۔ بلکہ اُن کے یہاں یہ تبدیلی ایک ارتقائی سلسلہ کی مختلف سیڑھیوں سے چل کر آئی ہے۔ میرا اشارہ اُس تقلید، روائت، حرمان، بے اطمینانی۔ انتشار، انقلاب، عوامی احساس اجتماعی شعور اور طبقاتی تقسیم کی طرف ہے جو مختلف ساعتوں میں شفاؔ کے شعور میں شور مچاتی رہیں اور جن کے عناصر سے شفاؔ کی اِس حیات افروز شاعری کی لَو بڑھتی رہی ہے۔ یہ ضرور ہے اور مجھے اُمید ہے کہ خود شفاؔ کو اِس کا اعتراف بھی ہوگا کہ اگر وہ اپنی اعلیٰ شعری قوتوں اور صلاحیتوں کو صرف غزل کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن کی طرف صرف کرتے تو ممکن تھا اُن کی صلاحیتیں زیادہ متنوع طور پر ہم سے خراجِ تحسین حاصل کر سکتیں اور ساتھ ہی ساتھ اُن کی شاعرانہ خوبیوں کو مختلف زاویوں سے دیکھ کر اُن کی شاعری کے مقام کا تعین زیادہ بہتر طور پر کیا جا سکتا۔ اِسی طرح اگر اُن کے وہ سارے اشعار مل سکتے جو اُردو کے درجنوں رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں اور جو خود اُن کی نظرِ انتخاب سے بچ کر نکل گئے ہیں اور اُن کے مجموعوں میں شامل نہ ہو سکے تو ممکن تھا کہ آج اُن کے مطالعہ میں ہمیں کافی آسانی ہوتی۔ انتخاب جگر سوزی کا کام ہے۔ بہت سے اچھے انتخابات بھی بعض اوقات بے مصرف ہوتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کا وُہ کلام جو آبِ حیات کے تذکرہ میں ذوق کی نسبت سے درج ہے اور وُہ چند اشعار جو آزاد کی نظرِ انتخاب کے مستحق نہ بن سکے وہ دراصل ظفر کا عین سرمایۂ شاعری ہیں۔ بہر کیف یہ بحث بے محل ہے۔ یہی دُوسری اصنافِ سخن کا

نام لیکر ارباب نقد کو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہیئے۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ غزل کا اختصار کسی شاعر کے ذہن و مزاج کی وسعتوں کا بار نہیں اُٹھا سکتا۔ میں غزل کی ہمہ گیری، تیزی، تاثر اور کیفیت کا معترف ہوں اور اس کے افادی پہلوؤں پر بھی نگاہ ہے۔

شفا کی "شاخ زیتون" امن سے متعلقہ رُباعیات کا مجموعہ ہے۔ ان میں بقائے امن کی باہمی کوششوں کے فروغ اور اشاعت کی سعی کی گئی ہے۔ امن آج کی دُنیا کا اہم تہذیبی اور ادبی پہلو ہے کیونکہ ہماری موجودہ نسل دو بڑی جنگوں کے دھماکے سُن چکی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے انسانی، تمدّنی اور معاشی تباہیوں اور ہلاکتوں کے خوفناک مناظر بھی دیکھے ہیں۔ امن ہماری زبردست خواہش ہے۔ ہم امن کے خواہاں ہیں۔ کیونکہ ہم اپنی آئندہ نسل کو معاشی تباہی اور انسانی ہلاکت سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ ذواتی قوتوں کے وہ مہلک اثرات ہماری آئندہ نسل کی ریڑھ میں نہ پہنچ سکیں۔ جن کے زہر سے انسانی حیات کی طبعی منزلیں کم ہوتی ہیں۔ امراض، دُکھ، درد اور تکلیف میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے ایک ایسے امن کی آرزو مذہبی، اخلاقی، عمرانی، تاریخی اور سیاسی اعتبار سے بیحد ضروری ہے۔ شفا نے اس اہم انسانی خدمت کی سعادت حاصل کر کے انسانیت دوستی اور بین الاقوامی اخوت کی شمع روشن کی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان رُباعیات کو قلب گیتی کی دھڑکنوں اور شفا کے جذبات کی موجوں نے مل کر ترتیب دیا ہے۔

سینے میں فروزاں ہیں نئے میخانے ✤ خورشید کی کرنوں نے بھرے پیمانے
اک روز بدل کر ہی رہیں گے شمعیں ✤ یہ امن و محبت کے حسیں پروانے

فنکاروں کے افکار چمک اُٹھے ہیں ✤ جذبات کے شہکار چمک اُٹھے ہیں
ہو سب کو مُبارک یہ بہارِ تازہ ✤ اب امن کے گلزار چمک اُٹھے ہیں

مندرجہ بالا سطور میں میں نے شفا کی شاعری کا جو جائزہ لیا ہے وہ مختصر ہے۔ لیکن میری یہ کوشش رہی ہے کہ اپنے مطالعہ اور فکر کی بنیاد پر اُن کی شاعری کے مزاج اور روح

کی گہرائیوں تک پہنچ سکوں۔ اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف اُردو کے دانشوروں اور نقادوں کو بھی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ علامہ نیاز فتحپوری، علامہ محوی صدیقی، ضیا احمد بدایونی، رشید احمد صدیقی، اثر لکھنوی، مولوی عبدالحق، فراق گورکھپوری، حامد حسین قادری عبدالشکور، کوثر چاندپوری اور تہذیب سہسوانی وغیرہ نے اکثر و بیشتر اُن کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ ان تبصروں میں بحث طلب امور بھی ہیں اور بصیرت افروز ارشادات بھی۔ جن پر تفصیلی گفتگو بے محل ہے۔ بہر حال مجھے یقین ہے کہ شفا کی شاعری کا متین لب و لہجہ۔ رنگ اور روپ۔ تاثر و کیفیت زیادہ دیر تک محسوس ہوتے رہیں گے۔ اُنہوں نے جس محنت اور خلوص سے ایک پاکیزہ تغزل اور انسان دوست شاعری کی سعی کی اور جس طرح اپنے مذاق کو مرثیہ، ہجو اور زیادہ گوئی کی آلودگی سے بچایا ہمارے نزدیک اس لئے اور زیادہ اہم ہے کہ آج شعرا کی ایک بڑی تعداد رسالوں میں چھپنا اور مشاعروں میں سُنا جانا ہی اصل مقصودِ شاعری سمجھ بیٹھی ہے اور اس طرح ہماری شاعری کے معیار کی آزمائش کا وہ منحوس دن قریب آرہا ہے جبکہ مشاعروں کی اسٹیج پرستی، عامیانہ غزلوں کو فلمی طرز میں گانے والے ہی شاعر کہلائیں گے اور شفا کے اس شعر کی گونج سُنائی دیگی ؎

سمو دیں حال کے دل میں جو مستقبل کی دھڑکن کو
تو بڑھ کر اس صدی سے اُس صدی تک بات کیوں پہنچے

صابر شاہ آبادی

نئی پود اور اردو غزل

جہاں تک میری رائے ہے، افادی اعتبار سے نہ قدیم شاعری (خاص طور پر غزل) سراسر ایسی ہے کہ آنکھ بند کر کے اس کے قطعی مفید اور اور حرفِ آخر ہونے پر ایمان لایا جائے۔ نہ ہی ترقی پسند شاعری ایسی ہے کہ جسے بلا تامل اپنا لیں، کیونکہ معائب و محاسن ہر دو شعری سرمایوں میں موجود ہیں۔ لیکن قدیم شاعری (دورِ متقدمین کی) سراسر نہ سہی نسبتاً ہی سہی صوری و معنوی ہر دو حیثیت سے مفید اور پاکیزہ ہونے کے ساتھ ساتھ فطری بھی ہے اور زیادہ ترقی پسند شاعری مہیب اور مبہم ہونے کے ساتھ ساتھ غیر فطری بھی ہے۔ قدیم شاعری میں صوری و فنّی اعتبار سے تقابلِ ردیفین، شکستِ ناروا، ایطائے جلی، مضافِ علیہ کا زن اعلان اور بعض متروک الفاظ کا خیال غیر ضروری پابندیاں ہیں اور معنوی اعتبار سے مبالغہ بحد غلو، جنسی شہوانی تخیلات، استفادۂ ناروا۔ محبوب کی آرائشی اشیاء کا تفصیلی بیان، غیر مہذّب حد تک بڑھی ہوئی تمنازدگی اور عجز و فتادگی رقیب کو گالی گلوچ، شیخ و زاہد پر بیجا پھبتیاں اور تعلّی وغیرہ بھی کہیں کہیں ہی سہی لیکن قابلِ ترک باتیں ہیں۔ اسی طرح ترقی پسند شاعری میں اس فنی و معنوی کجروی کے باوجود فیض، معین احسن جذبی اور مجاز کی بعض غزلیں لائق داد ہیں اور کسی طرح بھی ان کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قدیم شاعری (خصوصاً غزل) کے مفید ہونے کا سب سے بڑا اور پہلا ثبوت یہ ہے کہ وُہ آج بھی یعنی وقتی، معاشی، سیاسی، سماجی اور تمدنی تغیرات کے ساتھ ساتھ موجودہ اعتراضات و اختلافات کے باوجود ہر ذی علم و سنجیدہ طبقہ میں رائج ہے اور نہائت احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ بایں انقلابات جو رنگ شاعری آج کے انسانی جذبات کی بھی آسودگی کا باعث ہو تو اس سے ظاہر ہے کہ یہ انسان کے مستقل جذبات و مطالبات کا مداوا ہے۔ لہذا جو چیز انسان کے مستقل جذبات کے لئے فائدہ بخش ہو وُہ کسی بھی نظریہ کے تحت دور از کار اور فضول نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ شعری سرمایہ جمالیاتی رنگینیوں، نفسیاتی کیفیتوں، عشقیہ تمناؤں، دنیوی آفتوں رُوحانی حادثوں اور فطری تقاضوں کی ایسی مکمل اور پاکیزہ تصویر ہے جس سے ذی علم اور متمدن افراد کا وُہ احساس کماحقہٗ آسودہ ہو سکتا ہے جسے ذوق و وجدان کہتے ہیں جس کی آسودگی کے لزوم سے محض اس لئے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ساری دُنیا کا احساس نہیں ہے۔

جذبات میں بہہ کر قدیم شاعری کو "دل کے محور پر گھومنے والی بکواس" کہنے والوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ "دل" سے بے تعلقی آدمی کو رفتہ رفتہ انسان کی بجائے مشین بنا دیتی ہے۔ جس سے احساساتِ لطیفہ کے ساتھ ساتھ خلوص و رحم اور انصاف و حق شناسی کی توقع قطعاً بیسُود ہے۔ کیونکہ دل انسانی جسم کا وُہ جزوِ اہم و لطیف ہے جو محیط ہے۔ اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعض مطالبات کی تکمیل ہمیں قطعاً ناممکن معلوم ہوتی ہے اور عقل و فہم کی روشنی میں اس منزل تک پہنچنے میں سینکڑوں ناقابلِ عبور کوہ و دریا نظر آتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ہم اپنی اندرونی سیماب وشی سے تنگ آکر اُسی طرف کو مُڑ جاتے ہیں۔ مگر جب اوقات "دل" پر "دماغ" کا قبضہ ہو جاتا ہے تو آدمی تفریح کو "افادیت" پر ترجیح دینے لگتا ہے اور یہ ذہنیت شدید ہو کر اُسے ناآسودگی اور بیزاری کا گھن لگا دیتی ہے اور نتیجتاً دل و دماغ معطل اور رُوح بجھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ایسی صورت میں حیاتِ انسانی جیسی کچھ بے آب و رنگ بلکہ خطرناک راہوں سے گذرتی ہو اس کے متعلق مغرب کے

نفسیاتی ماہروں نے جا بجا سمجھایا ہے جو اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ لہذا جب تک ترکیبِ انسانی میں "دِل" شامل رہے گا اُس وقت تک "ترکاری" کے ساتھ ساتھ "پھول" کی اہمیت بھی برابر باقی رہے گی۔

اور پھر کم از کم میر و نظیر کے ہوتے ہوئے قدیم شاعری کو اِس شدید داخلیت کا اسیر بتانا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اُنہوں نے حُسن و عشق کے علاوہ خودی بے خودی، عِلم و جہالت، رحم و انصاف، صبر و تحمّل، ظُلم و انتقام، کینہ پروری، ریاکاری، افلاس، مجبوری، عالی حوصلگی، اِنسانی عظمت، وجودِ باری، حق شناسی، قناعت پسندی اور اخلاق و کردار جیسے ہمہ گیر و آفاقی حقائقِ خارجہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مگر چُونکہ اِن حقائقِ خارجہ کا ذِکر بھی اُنہوں نے اپنے مخصوص لب و لہجہ (عشقیہ) میں کیا ہو اس لئے بعض اوقات اِن کی تہہ تک پہنچنے میں دِقّت پیش آتی ہے۔ آخر میر کی "دنیا سے محروم چلے جانے والی" بات کو سراسر غمِ جاناں ہی کا نتیجہ کِس طرح کہا جا سکتا ہے جبکہ اُنہوں نے "درد عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ کیا کیا کچھ" کہہ کر اپنے حلقۂ تمنّا کی رنگا رنگی اور وسعت پُوری طرح ظاہر کر دی ہے۔ بغیر کسی قطعی تاریخی انکشاف کے اِس وسیع حلقۂ آرزو سے نکلنے والی ہر دردانگیز و کربناک آہ کو "بیدادِ دوست" ہی سے تعبیر کرنا کہاں تک درُست ہو سکتا ہے۔ اِتنا تو ہر شخص کو کہنا پڑے گا کہ اُنکی داخلی پریشانی کو کرب میں بدلنے والی تکلیف باہر سے آئی ہوئی ہے۔ پھر کیا اِس کا مطلب یہی نہیں ہُوا کہ وُہ تیغِ دو آتشہ کے کُشتہ تھے۔

ہاں تو آسُودگیٔ ذوق و وجدان سے قطع نظر وُہ شاعری جو حقائق کے لحاظ سے "اپنے پُورے عوامل و روابط کے ساتھ متحرک صُورت میں نظر نہ آنے" کے باوجُود اپنے پسِ منظر کا پتہ دیتی ہو، مُفید نہیں کہلائیگی؟ اگر واقعتاً کِسی دور کے سماجی حالات سے باخبر ہونا بھی افادیت میں ہی داخل ہے اور جس شعر سے (خواہ وُہ کِسی دورِ شاعری کا ہو) ہماری سوئی ہوئی جبلّات کو پیامِ بیداری اور عملی قوتوں کو جھرجُھری محسوس ہوتی ہے اور جس کے ذریعہ لُطفِ اِنسانی جذبات و

احساسات کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہو کیا اس کو مفید نہیں کہیں گے؟ کیا اُن کے غموں کا مطالعہ ہمارے اندر لاشعوری طور پر حوصلہ افزا و ولولہ انگیز کیفیت نہیں پیدا کرتا؟ کیا ان شعروں میں چھپی ہوئی غمگین داستانِ حیات ہم میں ہمدردی۔ رحم اور خلوص کا جذبہ نہیں پیدا کرتی؟ اور کیا اس جذبے کی تدریجی شدّت سے ساری دُنیا کو غم و آلام سے محفوظ دامون دیکھنے کی بلند تمنّا نہیں پیدا ہوتی؟ اور کیا اس نوع کے مطالعے سے اِن معصوموں کو اس حد تک بے بس و مجبور بنا دینے والے سماج کی جلات متحد ہو کر بغاوت کرنے کی آمادگی نہیں ہوتی؟ کیا اُن کے قلبی حادثات کے مطالعہ سے اپنی حسی مماثلت دیکھ کر ہر شخص فطری و نفسیاتی حقائق پر عبور نہیں حاصل کر سکتا؟ اور کیا ان ساری باتوں کا تعلق افادیت سے نہیں ہے؟ اگر ہے تو پھر کیوں اُس دور کی شاعری کو بُری نگاہ سے دیکھیں اور اس کی افادیت سے انکار کرنے کے لئے خواہ مخواہ کی دور از کار تاویلیں تراشیں

یُوں تو اچھے شعر کی تعریفیں لاتعداد ہیں اور مختلف بھی لیکن عملی طور پر ممکن نہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھی اپنے کسی ایک ہی شعر میں یہ ساری اچھائیاں بھر سکے۔ بایں ہمہ شعر کی دو بنیادی۔ خصوصیتیں ایسی اہم ہیں کہ جن کے بغیر شعر مکمّل نہیں ہو سکتا۔ یعنی "خیال" اور "بیان" اگر کوئی شاعر اپنے شعر میں کسی مناسب خیال کو دلکش وضاحت کے ساتھ بیان کر دے تو ہم کہیں گے کہ یہ شعر ہے اور اچھا شعر۔ دُنیائے شاعری میں آج تک کسی نے بھی شعری تاثیر کے لئے خیال کی صحت اور بیان کی پاکیزگی سے انکار نہیں کیا ہر دو خصوصیتیں اپنی اپنی جگہ تقریباً یکساں افادیت و اہمیّت کے حامل ہیں لیکن ناقدینِ عالم کا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات خیال کی ژولیدگی و ناہمواری کے باوجود طرزِ ادا کی دلکشی سے شعر اچھا ہو سکا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے:-

سب کہاں کچھ لالہ وگُل میں نمایاں ہوگئیں	خاک میں کیا صُورتیں ہونگی جو پنہاں ہوگئیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو	یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
ہستی کا فرطِ حجاب سے پیوندِ خاک ہو جانا خلافِ فطرت بات ہے	زخمِ جگر کو سامنے کی چیز کی طرح دیکھ سکنا غلط بات ہے

لیکن ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا کہ بیانیہ پیچیدگی کے باوجود خیال کی رنگینی نے شعر کو کامیاب کر

دیا ہو، کیونکہ رنگینیٔ خیال کے ظاہر ہونے کا سارا دارومدار بیانیہ وضاحت پر ہے۔ لہٰذا جب تک شعر میں کہی ہوئی بات ہی سمجھ میں نہ آئیگی تو اس بات کے متعلق کیونکر کہا جا سکیگا کہ وہ رنگین ہو یا بے رنگ۔ اسی لئے شعر میں معمولی بات بھی بیانیہ دلکشی کی وجہ سے نہائت اہم ہو جاتی ہے لیکن نہائت اہم ترین خیال بھی بیانیہ الجھاؤ کے باوجود نہائت اہم تو کیا معمولی اہمیت کا بھی حامل نہیں رہتا کیونکہ اسکی اہمیت شاعری کے پیٹ میں بسی ہوئی ہوتی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ خیال و بیان تقریباً یکساں افادیت و اہمیت کے حامل ہونے کے باوصف بیان قابلِ ترجیح خصوصیت شعر ہی ہے۔

غور کریں تو معلوم ہوگا کہ دہلویت کو لکھنویت پر ترجیح دلانے والی خصوصیت ہی بیانیہ پاکیزگی اور دلکشی ہے۔ حالانکہ لکھنؤ کے دورِ ناسخی نے زبان کی نوک پلک سنوارنے میں بڑی موشگافات محنت کی۔ لیکن شعر و غزل کے مزاج سے ناواقفیت نے ان کی ساری دیدہ ریزیوں کو "کوہ کاہ برآوردن" ثابت کر دیا۔ ظاہر ہے کہ شعر کی جس خصوصیت نے تاریخی حیثیت سے ایک اسکول کو بدنام اور ناسخی اور ایک اسکول کو نیک نام اور کلاسیکل کر دیا ہو وہ کوئی ایسی معمولی خصوصیت نہیں ہو سکتی کہ جس سے جذباتی طور پر فرار کی باتیں گوارا ہو سکیں۔ اس سے قطعاً مجالِ انکار نہیں کہ دورِ متقدمین کے بھی بعض اشعار میں ژولیدہ بیانی پائی جاتی ہے مگر ایسے اشعار کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

ظاہر ہے کہ کلام دردؔ و میرؔ کے ساتھ سنجیدہ ناقدوں کے سلاست و روانی، سادگی و پرکاری سوز و گداز اور عجز و فتادگی کے اور کلام نظیرؔ کے ساتھ "ایک مستقل ادارہ" آزاد منش اور جمہوریت پسند کے جو گہرے تصورات وابستہ ہو چکے ہیں اور ضیاء الدین ضیاءؔ بر متغزلانہ بلندیوں اور سوداؔ کے کلام پر معنی آفرینی، ندرتِ بیاں اور نزاکتِ تخیل پر جوہرِ تصدیق ثبت ہے اور پھر قاسمؔ، یقینؔ، احسن اللہ خاں بیاںؔ اور میر حسنؔ کے کلام کے ساتھ بھی ہم اور وقیع تاثرات قائم ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ ان کے طرزِ ادا کی پاکیزگی اور روانی ہے۔ تو پھر

کیا اس دور کی شاعری کو بیانیہ اعتبار سے پاکیزہ نہیں کہیں گے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ بعض ترقی پسند حضرات اِن غیر جانبدارانہ تاثرات کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور گریز کی سینکڑوں راہیں نکال کر ان باتوں کو قدیم ادب کی طرف سے غیر تنقیدی رویّہ پیدا کرنے کا طریقہ کہتے ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شہیر ناقد جناب مجنوں گورکھپوری کی تصنیف "نکاتِ مجنوں" کے مطالعہ کی دعوت دیجائے جسمیں انہوں نے متذکرہ بالا اساتذہ کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

کلاسیکل دورِ شاعری چونکہ واقعی جذبات واحساسات کا ذریعہ تھی اور بالخصوص غزل میں کوائف نفسی و شدید قلبی احساسات ہی کی ترجمانی کو ترجیح دیجاتی تھی۔ (اس لئے غزلگوی کی جرأت اکثر و بیشتر انہیں کو ہوتی تھی جو دل گزیدہ ہوتے تھے) خواہ یہ احساسات کسی داخلی تکلیف و آزار کا نتیجہ ہو کہ خارجی حالات کا لیکن احساسات واقعی ہوتے تھے۔ اُن کی غزلوں میں یہی وجہ ہے کہ آپ بیتی کا رنگ زیادہ اور مضمون آفرینی کا کم نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو احساس حقیقی و واقعی ہوتا ہے وُہ بجائے خود اپنے اندر ایک لطیف تاثیر رکھتا ہے اور جب یہ احساس شدید اور پختہ ہوکر شاعر کی زندگی کا ایک جزو ہوجاتا ہے تو اس کی صداقت اور تاثیر اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ پھر یہ احساسِ شدید اگر اصلاحی ہوتا ہے تو شاعر کو مصلح و باغی بنا دیتا ہے۔ نشاطیہ ہوتا ہے تو کبھی سنجیدہ مذاق اور کبھی عیش پسند بنا دیتا ہے اور حزنیہ ہوتا ہے تو الم پسند۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ احساس کی اس منصب نوازی میں صرف احساس کی شدّت ہی سب کچھ نہیں ہوتی بلکہ شاعر کی بیانیہ قوّت کو بھی اسمیں بہت بڑا دخل ہوتا ہے کیونکہ اِن مختلف احساسات کی ہُوبہو تصویر کھینچنے والا ذریعہ بیانیہ ہی ہوتا ہے۔ پھر یہ تو ظاہر ہی ہے کہ کلاسیکل دور کا اندازِ بیاں کس درجہ صحت مند، پاکیزہ اور متغزلانہ تھا۔

ہر چند اس دور کے بعض شعراء کے تفصیلاتِ زندگی کا قطعی طور پر کسی کو علم نہیں۔ لیکن بایں ہمہ ان کے کلام کے بغور مطالعہ سے قاری کے ذہن میں لاشعوری طور پر ایک متعلقہ

پسِ منظر اُبھرتا ہو جس کی روشنی میں قاری شاعر کی زندگی کے بالکل نہ سہی کچھ کچھ قریب ضرور پہنچ جاتا ہے اور یہ سب کچھ اِس یقین کی بناء پر ہوتا ہے کہ اِس کی دانست میں یہ شاعری شاعر کے حقیقی واقعی احساسات وجذبات کا عکس ہوتی ہے۔

غزل کے تمام اصناف سخن پر مرجح ہونے اور نسبتاً زیادہ مقبول ہونے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اِسمیں تمام اصناف کی بعض اہم اہم خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ (اِسی لئے کہا جاتا ہے کہ غزل کہنے والا سب کچھ کہہ سکتا ہے) کیونکہ اِس کا زیادہ تر تعلق قلب وروح سے ہے اور کون ہے جو قلب وروح کا حامل نہیں یا اس کے تقاضوں سے واقف نہیں۔ غزل کا جو مرکزی عنصر بلا امتیاز فکر ومزاج ہر انسانی قلب کی آسودگی کا باعث ہے وہ تغزل ہے جسمیں ڈھل کر سیاسی، سماجی، اقتصادی، داخلی، خارجی، ربنیہ اور نشاطیہ غرض ہر طرح کے مسائل وحقائق (بشرطِ مناسبت ولطافت) گھلا ئے شاداب وشگفتہ بن جاتے ہیں۔ یُوں سمجھئے کہ تغزل پارس پتھر کی طرح ہے یہ جس کسی دھات (خیالی وحقیقت) کو چھُو لیتا ہے اُسے سونا بنا دیتا ہے۔ غزل کے مزاج میں کچھ ایسی لچک ہے کہ وُہ بیک وقت "ادب برائے ادب" کے خانے میں بھی آسکتی ہے اور "ادب برائے زندگی" کے ذیل میں بھی اور پھر ہر جگہ یکساں افادیت کے ساتھ۔ یعنی اگر غزل تفریحی بھی ہے تو دلگی جیسی سطحی وقت گذاریوں سے بہت بلند ہے کہ اِس کی تفریحی کیفیت بھی وجدانی آسودگی کے علاوہ علاج دل کا بھی باعث ہے اور اگر تعمیری ہو تو ایسی بھرپُور کہ جسے صحیح معنوں میں ادائے زیست کہہ سکیں۔ اگر کارِ آگہانہ طریق پر غزل کو سمجھا جائے اور اپنایا جائے تو یہ ہر مذاق کے شاعر کو اپنے انداز کا منفرد شاعر بنا سکتی ہے چنانچہ اس نے مغموم کو میر۔ غم پسند کو غالب بنا دیا ہے عیش پسند کو داغ اور تصوّف پسند کو اصغر بنا دیا ہے۔ غرض تغزل کی فطری لچک نے دُنیائے شاعری میں بڑے بڑے معجزے دکھائے ہیں لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تغزل کی تعمیر میں علم اور کارِ آگہی کے ساتھ ساتھ فطرت اور گداختہ قلبی کو بھی اہمیت کے اعتبار سے اوّلیت حاصل ہے۔ کوئی شاعر ممکن ہے کہ دیگر اصنافِ سخن میں دماغی وشعوری کوششوں سے

اپنے آپکو بعینہ اُس رُوپ میں پیش کرسکے جو اُسکی حقیقی زندگی کے برعکس ہو، لیکن غزل اِس بھرم کو فوراً گھول دیتی ہے۔ خاص کر اس کے مرکزی حقائق عشق و غم عشق کے باب میں یہ نہائت لطیف اشاروں میں بڑی وضاحت کے ساتھ بتلادیتی ہے کہ کون اصلی مغموم و اصلی عاشق ہے اور کون نقلی۔ جس کی ایک روشن دلیل میر و غالب کی غزلیات ہیں۔ میر کی غزلیں باوجودیکہ سیدھی سادی ہیں لیکن ان کا ہر ہر لفظ میر کے عاشق صادق ہونے کا شاہد ہے اور غالب کی تمام تر عاشق نمائیوں اور الم طرازیوں کے اِن کی غزلیں ان کے نیم عاشق یا غیر عاشق ہونے کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے۔ اِن کے غزلیہ کلام کے بغور مطالعہ سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وُہ "ساز" کے ذریعہ "شکستِ ساز" کی آواز پیدا کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہیں لیکن وُہ آواز ہے کہ کسی طرح پیدا نہیں ہوتی۔ جس سے بیزار ہو کر وہ ساز کو پھینک پھانک ادھر اُدھر نکل پڑتے ہیں لیکن اِس طرح کہ ہر قدم پر ان کا عنوانِ فکر بدلتا رہتا ہے، شاید اِسی عدم سکون و اطمینان نے انہیں غزل کو "تنگ دامن" کہنے پر مجبور کردیا ورنہ اگر یہ "شنید" کی بجائے "دید" پر اپنی غزلوں کی بُنیاد رکھتے تو غزل کی عدم وُسعت سے انہیں سات جنم کے بعد بھی بیزاری نہ ہوتی۔

واضح رہے کہ یہ بات میں نے اِس لئے نہیں کہی کہ نئی پود سارے اہم اور دقیق کام چھوڑ کر تیس و فرہاد بننے کو بیٹھ جائے بلکہ اِس سے میرا مقصود یہ ہے کہ وُہ نازک صنف سخن جو غالب ایسے اہر بیانات کی چُغلی کھا سکتی ہو وہ بھلا ایسے دلیسوں کا کیا بھرم رکھ سکیگی۔ لہٰذا نئی پود کے وُہ ترقی پسند نوجوان جو اِس "کارِ شیشہ و آہن" کو اپنانا چاہتے ہوں اِس باب میں بڑی احتیاط سے قدم اُٹھائیں کیونکہ آپ لوگ ہر صنف سخن میں انکشافِ حقیقت پر مردانگی کے اظہار کو ترجیح دیتے ہوئے غم کو خوشی ظاہر کرتے ہیں۔ آپ ہی غور فرمائیے کہ غزل یہ غیر فطری بیانات کہاں برداشت کرسکتی ہے جبکہ وُہ عاشقوں کی بھرپور نقالی کرنے والوں کو بھی ایک ہی نگاہ میں تاڑ لیتی ہے۔ یعنی میں صاف طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غزل میں آپ وُہی بات ظاہر کریں جو آپ کے دل میں شدت سے متلاطم ہو اور جس رنگ میں محسوس ہوتی ہو اسکو کوی اور مختلف

رنگ دیکر ظاہر کرنا نظریاتی پابندی کے لحاظ سے کیسا ہی مستحسن اقدام سہی لیکن غزل گوئی کے لحاظ سے سخت مہمل اور لغو ترین ہے۔

غزل کی اِس شاندار وسعت کے باوجود یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ غزل کو کسی خاص سیاسی نظریہ سے منسلک کر دینا اس کی رنگا رنگ اور لطیف روح کو مجروح کرتا ہے۔ کیونکہ غزل کے تخلیقی اسباب میں وجدانی آسودگی کو بھی مرکزیت حاصل ہو اور اِس طرح کی غزلگوئی سے اسکی قطعاً توقع نہیں ہو سکتی اور پھر بر خلاف نظم کے غزل کے اشعار کا معنوی اعتبار سے غیر مربوط ہونا اِس لئے ہے کہ اِسمیں بیک وقت شاعر کے کئی اہم اور مختلف احساسات نظم ہو سکیں۔

تغزل کے پارس پن کا یہ مطلب ہرگز نہ لینا چاہیئے کہ وہ "دندان تو جملہ دادیا نند" جیسی سپاٹ اور بے رنگ حقیقتوں کو بھی خوشگوار بنا سکتی ہے۔ خیال و مضمون کا حقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ لطیف ہونا بھی نہائت ضروری ہے۔

جہاں تک ہو سکے غزل کے لئے ضروری ہے۔ انداز بیاں نہائت قریب الفہم ہو لیکن ساتھ ہی سریع الاثر بھی کیونکہ صرف قریب الفہم انداز بیاں خشک اور بے مزہ بھی ہوتا ہے۔ غزل میں انداز بیاں کی اہمیت اِس وقت اور بھی احتیاط طلب ہو جاتی ہے۔ جب شاعر کوئی ایسی بات کہنا چاہتا ہو جو عام باتوں اور عامۃ الورود جذبات سے مختلف و ممتاز ہو ایسے موقعوں پر اکثر استعارات و تشبیہات کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ رجن کی افادیت سے محض اِس لئے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا استعمال ہر شاعر کے بس کی بات نہیں، ان کارواں دواں استعمال بڑی احتیاط طلب کاوش چاہتا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات شاعر کی نا اہلی کی وجہ سے کسی عمیق و دقیق خیال کی مکمل وضاحت میں ان کا غیر ماہرانہ و غیر صحت مندانہ استعمال وضاحتِ مفہوم میں سنگِ گراں ثابت ہوتا ہے، جو شاعر اِس نازک مقام سے کامیاب گذرے اس کے قدم بھی مشکل ہی سے کسی بیانیہ اُلجھن میں لڑکھڑا سکیں گے۔

خاص طور پر غزل کے باب میں اِس کے قدیم ہیئتی نظام کی انادیت نے انکار یا تو شعر و غزل کی لطیف موسیقیت سے لاعلمی کا ثبوت ہے یا پھر نظریاتی تعصب کا۔ اِس سلسلہ میں مَیں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ اِس انکار کا ایک مطلب اِن قیود کے ساتھ ساتھ چل کر غزل کا حق ادا نہ کر سکنے کا عجز بھی ہو سکتا ہے۔ ہاں مَیں اتنا ضرور کہوں گا کہ اِن قیود کے التزام کا مقصد وضاحتِ بیانیہ کے ساتھ ساتھ شعر کی تاثیری وُسعت و شدت سے متعلق ہے۔

بسوز غالب آزردہ را و باک مدار — بشرطِ آنکہ تواں گفت نا مسلمانش

ڈاکٹر منوہر سہائے انور

روا یا ناروا ہوتا ہی کیا ہے
وہ جو چاہیں کریں بے جا ہی کیا ہے

بُتوں نے لوٹ لی ساری خُدائی
خُدا کے پاس اب رکھا ہی کیا ہے

ہمارا ماجرا سُنتے چلے جاؤ
ابھی کہنا ہی ہے اتنا ہی کیا ہے

جن آنکھوں نے ترا رُوئے دل افروز
نہیں دیکھا ہے تو دیکھا ہی کیا ہے

جھگڑنے میں بھی ہے اک لُطف ورنہ
ہمارا آپ کا جھگڑا ہی کیا ہے

قسم جھُوٹی نہ کھایا کر خُدا کی
خُدا میرا بھی ہے تیرا ہی کیا ہے

دُو عالم کے مزے ہیں میکدے میں
یہاں جنّت بھی ہے دُنیا ہی کیا ہے

غمِ امروز ہی میں عمر گزُری
مرے اِمروز کا فردا ہی کیا ہے

وہ ہنس دیتے ہیں میری بات سُنکر
نہ ہو یہ بات تو رونا ہی کیا ہے

"بہت" ہے سرسری سی اک نظر بھی
یہ تھوڑا سا کرم "تھوڑا" ہی کیا ہے

نہیں ہیں وہ یہاں پھر بھی یہاں ہیں
نہ ہونے سے یہاں ہوتا ہی کیا ہے

رہا دِل میں اندھیرا ہی اندھیرا!
چراغِ آرزُو جلتا ہی کیا ہے

اگر بیداد کو اچھا نہ سمجھو
تو اس سے بڑھ کے اور اچھا ہی کیا ہے

نہیں کہنے میں آتی بات اس کی
تمہاری بات کا کہنا ہی کیا ہے

مرا حال تردُّد خیز انور
وہ کیوں پوچھیں انہیں پروا ہی کیا ہے

جگن ناتھ آزاد

ارتقاء

آج آزاد بہاریں یہ خبر لائی ہیں — کہ بہاروں میں پھر اک برق شرربار ہوئی

جسکی خوشبو سے مری روح کا عالم مہکا! — وہ کلی پھول ہوئی پھول سے گلزار ہوئی

جسطرح آپ ہی مینا سے چھلک جائے شراب — اسطرح خواب کے عالم سے وہ بیدار ہوئی

جسقدر بے خبر آنکھوں نے اسے دیکھا تھا — اب یہ سنتا ہوں کہ اتنا ہی وہ ہشیار ہوئی

زندگی عشق کی پہلے ہی کچھ آسان نہ تھی — اب یہ عالم ہے تو کچھ اور بھی دشوار ہوئی

مائل صلح جو تھی نرگس بیمار کبھی — اب یہ سنتے ہیں کہ آمادۂ پیکار ہوئی

وہ تجلی کہ جسے ایک کرن میں سمجھا — اس طرح پھیل گئی مطلع انوار ہوئی

ایک میخانۂ شیراز بدن کی خوشبو — اک چمک آپ ہی جو مصر کا بازار ہوئی

چال ایسی کہ نشاں کبک دری پا نہ سکے — کچھ اس انداز کی حاصل اسے رفتار ہوئی

وہ جھجکتی ہوئی گفتار سنی تھی جو کبھی — آج وہ نغمۂ خیام کی جھنکار ہوئی

ہر نفس کیف لٹاتا ہوا میخانہ بنا
ہر ادا جھوم کے پیمانۂ سرشار ہوئی

اک نشہ ٹوٹ گیا ایک نشہ اور آیا — جا چکا دور لڑکپن کا جوانی آئی

پھر نئے رنگ سے پیدا ہے ہواؤں میں نکھار — موج دریا میں نئے سر سے روانی آئی

جسکو آزاد نہ آئی کبھی نادانی بھی — آج اس کیف سخن کو ہمہ دانی آئی

فقط اسرار سے تھی جکو نہ آگاہی تک — وہ نظر لے کے اب اسرارِ نہانی آئی
وہ تکلّم کہ پہنچتا تھا خموشی کے قریب — اِس تکلّم کو عجب لغز بیانی آئی

اِس کہانی کو اب آزاد بہت طول نہ دے
کہ بڑی سخت منازل میں کہانی آئی

جلیل حشمی

چاند کی کونپلیں

آج پھر اُس میٹھ کا آیا ہے دھیان
پہلو بہ پہلو سیب کے نازک شگوفوں کی سمان
پھیلتے کوہوں میں وہ ترچھی لکیروں کی گران
اُف وہ بیچوں بیچ اِک سیدھی کمان
جیسے استھائی پہ گرتی بھیروں کی امرتی
جیسے مچھلی سر کے بل ساگر میں کھائے ڈبکنی
یا ہرے شیشے پہ ہیرے کی کنی
چھوڑتی جائے بڑی تیزی سے پیچھے کرن ان
پھیلتے کوہوں پہ وہ ترچھی لکیروں کی گران

اِن لکیروں میں ہے سرسرگم کا گیان
کونپلیں پھوٹ آئی ہوں جیسے چمکتے چاند کی
اور اِن میں بنتی ہو انگڑائیاں اِک راگنی
آچلی ہو رس پہ انگوں کی کلی
چاند کی اِن کونپلوں میں آتی حرکت آتی جان
کیا کہوں بنتی نہیں یہ بات، ہتھرے زبان
آج پھر اُس میٹھ کا آیا تھا دھیان

○

احسان احمد

کچھ اس طرح بھی جنوں میں نظر اُٹھا کے چلے
تمام عرصۂ عالم پہ جیسے چھا کے چلے

رہِ طلب میں گریں گرچہ بجلیاں اکثر
کنارِ شوق میں سب کو مگر دبا کے چلے

وہ اہلِ درد ہمیں تھے کہ اِس رگِ جاں پر
ہزار زخم لگے، پھر بھی مُسکرا کے چلے

اٹھی ہے جب یہ نظر، کائنات عالم کیا
حریمِ قدس کے پردوں کو بھی ہلا کے چلے

کسی کو امن و سکون کی تلاش ہوگی، مگر
یہاں تو دہر کے فتنوں کو خود جگا کے چلے

رہ طلب میں نہ تھا کوئی ہمسفر اپنا
کہ ہر مقام سے آگے قدم بڑھا کے چلے

ہزار بار ملے تو گنوا دیں ہم اس کو
دیارِ حسن میں جو زندگی گنوا کے چلے

وہ تشنگی کہ تھی سیراب زندگی جس سے
یہ بادہ خوار کہاں اسکو اب بجھا کے چلے

گذر گئے وہی اِس خارزارِ ہستی سے
جو سر اُٹھا کے چلے کچھ قدم جما کے چلے

لیا ہے ہوش و خرد سے بھی ہم نے کام بہت
جب اِن کو شیوۂ دیوانگی سکھا کے چلے

اخترؔ انصاری اکبر آبادی

کیا جانے کس اُمیّد میں بیٹھے کیا سمجھ کے ہم
نادم ہیں رسم و راہِ تمنّا سمجھ کے ہم

تُو بھی تو ہے عزیز ہمیں اے غمِ حبیب!
چُپ ہیں پیامِ ساغر و مینا سمجھ کے ہم

احباب کا خلوص معمّہ نہ تھا کوئی!
کھاتے رہے فریب تمنّا سمجھ کے ہم

رازِ بہار آ ہی گیا تھا زبان پر!
چپ ہو گئے کلی کا اشارہ سمجھ کے ہم

بے احتیاطیوں کے زمانے گُذر گئے
اب چھو رہے ہیں پھولوں کو کانٹا سمجھ کے ہم

دُنیا میں کیا کریں گے تمنّائے باغِ خلد
بھیجے گئے ہیں قابلِ دُنیا سمجھ کے ہم

گرداب تو ملے ہمیں اخترؔ اُسی طرف
جس سمت بھی گئے ہیں کنارا سمجھ کے ہم

شفاؔ گوالیاری

بڑی جانسوزیوں سے درد کے آئینے ڈھلتے ہیں
پگھل کر سینکڑوں آنکھوں میں وہ آنسو نکلتے ہیں

سحر ہو کر چمکتے ہیں، شفق بن کر نکلتے ہیں
وہ جب غرقِ تبسّم ہو کر انگڑائی میں ڈھلتے ہیں

رہِ اُلفت میں ایسے راہرو بھی ہم نے دیکھے ہیں
جو رہبر کو بھی اپنی رہبری میں لیکے چلتے ہیں

وُہ اپنی لغزشوں ہی کو مکمّل کیوں نہیں کرتے
جو دب دب کر اُبھرتے ہیں جو رہ رہ کر سنبھلتے ہیں

مسلسل کتنے ہی آتشکدوں میں تپنا پڑتا ہے
محبّت کے بڑی مشکل سے غمخانے اُجلتے ہیں

نظامِ عالمِ امکاں کی ہِل جاتی ہیں بُنیادیں
تڑپ کر غم کے مارے جب کبھی کروٹ بدلتے ہیں

کسی کی یاد میں دل پر عجب عالم گزُرتا ہے
کئی طوفاں سمٹتے ہیں، کئی طوفاں اُبلتے ہیں

اسیری ہم کو راس آئی، نہ آزادی ہی راس آئی
قفس میں دِل مسلتے تھے چمن میں ہاتھ ملتے ہیں

اندھیرے مُسکراتے ہیں شفاؔ جن کے اُجالوں پر
جہاں میں کچھ چراغِ زندگی ایسے بھی جلتے ہیں

راجہ مہدی علی خاں

”ابنِ مریم ہوا کرے کوئی“

”ایک گال پہ تھپڑ کھا کے آگے کر دے دوجا گال
دشمن کچھ بھی کرے برائی بدلا مت لے ہنس کر ٹال“

تو نے کبھی یہ بات کہی تھی سچ ہوا کیا تیرا حال
ہم نے تجھ کو پھانسی دے دی بیتے آج ہزاروں سال

تیرے ساتھ ہی کر دیئے رخصت ہم نے تیرے نیک خیال
ہاں تجھے اپنا رہبر ہم نے مان لیا بن قیل و قال

آج فلک سے تو نے زمیں پر رنج بھری نظریں مت ڈال
ہم میں کوئی کمزور نہیں ہے کوئی ہے رستم کوئی زال

اس میں برائی کیا گر لوٹا بھائی نے بھائی کا مال
آپس ہی میں تو لڑتے ہیں بھائی کا تھپڑ بھائی کے گال

ملک میں ہیں شطرنج کے مہرے دیکھ ہماری کراق حال
آنکھوں میں جیت کی خوشیاں لب پہ ہنسی ہے چہرے لال

دیکھ خدا کے پیارے بیٹے دل سے غم کا بوجھ نکال
ہم سے ہو گر کوئی برائی غور نہیں کر ہنس کر ٹال

اوپر بیٹھ کے گن ایٹم بم ہم نے بنائے جو ہر سال
گر اوپر سے نیچے آیا پھر وہی ہوگا تیرا حال

راجہ مہدی علی خاں

حسابِ دُشمناں در دِل

(۱)

"سلاماں لیکم" قسم خُدا کی بہت ہی عُمر آپکی بڑی ہے
(صُبح صُبح تو یہ تو یہ پھر یہ ادائیں دِکھلانے آگئی ہے)
کھڑی ہیں کیوں آپ؟ بیٹھئے نا، گئے ہیں شائد "وہ" ڈاکٹی نے
(نہیں "وہ" گھر میں تو اب کریگی تو جلد جانے کے سو بہانے)
غضب کا حُسن آج آپ پر ہے! ابھروں میں کیا چند آہیں ٹھنڈی
(لگا کے دُنبالہ دار کاجل تُو ہُو بہو لگ رہی ہے رنڈی)
پئیں گی کیا آپ کوئی شربت؟ نہیں؟ تو پھر کیا منگاؤں چائے؟
(ترے خصم کا یہ گھر ہے شاید کہ جب بھی جی چاہا کھٹ سے آئے)
زبیدہ جلدی سے چائے لاؤ کہ گھر میں تشریف لائیں آپا
(تمہاری باجی کی سوت آئی ہے اس کا آکر کرو "سیاپا")

"مشین" کیا چیز ہے؟ میں حاضر کر دوں اگر آپ جاں بھی مانگیں
(مشین کیا تیرے باپ کی ہے؟ میں چیر دوں تیری دونوں ٹانگیں)

(۲)

"وہ" چھ بجے شام کل ملیں گے! جی چھ بجے آپ آ سکیں گی؟
(دوپٹہ سرکا کے کل ہی اب آپ "ان" کو نخرے دکھا سکیں گی)

"سُور کی بچّی! حرامزادی! خبیث!" "جی کون؟" "جی رضیہ"
قسم خدا کی میں ایک دن تنگ آ کے نبٹوں گی سب قضیہ

"مگر رضیہ تو نام میرا...." "نہیں جی وہ ایک دوسری ہے
بہت دنوں سے چھنال میرے میاں کے پیچھے پڑی ہوئی ہے"

اور آپ تو خیر "ان" کو اپنے ہی بھائی کیطرح چاہتی ہیں
بہن ہیں آپ "ان" کی. خواہرانہ محبت "ان" سے نباہتی ہیں

زبیدہ! تو یہ کہاں گئی پھر؟ ذرا مری جاں ادھر تو آنا
رضیہ آپا کو اپنے پیانو پہ وہ غزل آن کر سنانا

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
"کنواریوں" کا بیاہتا مردوؤں سے چھپ چھپ کے پیار ہوگا

راجہ مہدی علی خاں

مثنوی تاج دین معراج دین

(۱)

میں لکھنے سے پہلے یہ کرتا ہوں طے — یہ انیس سو تیس کا ذکر ہے
یہاں سے میں پہنچا ہوں لاہور میں — سمجھ لیجے انگریز کے دور میں
میں ہوں اور پنجاب کے زندہ دل — درخشندہ چہرے وہ تابندہ دل
میں گھر سے نکل آیا بازار میں — سمجھ لیجے کوٹ اور شلوار میں
کروں اُن نظاروں کو اب میں بیاں — جو اُس دور میں میں نے دیکھے وہاں

(۲)

خوشی ہی خوشی ہے جدھر دیکھئے — ذرا مسکرا کر ادھر دیکھئے
وہ سڑکوں پہ پنجابی "منڈے" چلے — کسی نے کہا دیکھو "غنڈے" چلے
جھکی ایسی پگڑی ہے اک آنکھ پر — پڑے گر کسی پر تو ترچھی نظر
یہ تہمد پہ بوسکی کی "قمیض" — جو دیکھے تو غش کھائے دل کا مریض

یہ دیں اس طرح اپنی مونچھوں پہ تاؤ — کہ رستم بھی اُلجھے تو بولیں کہ "آؤ!"

اکڑ کر چلے کیوں نہ ہر نوجواں — ہے قینچی کا سگرٹ بنوکِ زباں

بڑے فخر سے کش لگاتے چلے — دھوئیں پر دھواں یہ اُڑاتے چلے

ادا کہہ رہی ہے کہ ہم شیر ہیں — ہر اک سامنے اپنے بکری کی "میں"

طبیعت کے فطرت کے رنگین ہیں — یہ چاقو چلانے کے شوقین ہیں

نہیں کوئی غم، خوش رہیں یہ مدام — فساد اور دنگے کریں صبح و شام

جسے چاہیں رستے میں کندھا لگائیں — وہ چُوں بھی کرے تو اُلجھ اُس سے جائیں

کہیں کیوں بے گالی کسے تُو نے دی؟ — نکالوں ابھی تیری "فوں" ادھا "آتی؟"

یہ منٹوں میں بس دُھن کے رکھ دیں اُسے — ہزاروں میں یہ چُن کے رکھ دیں اُسے

یہ سمجھو نہیں پھر بچارے کی خیر — قیامت تلک اُس سے رکھیں گے بیر

ہیں مشہور ان کے لبِ خوش کلام — کریں لوگ ڈر ڈر کے ان کو سلام

ادب سے کہے جو انہیں پہلواں — ہے عزت اسکی بچے اسکی جاں

یہ بھرپور سینہ یہ اُٹھتا شباب — کہیں کھائیں گے جا کے نان اور کباب

"کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے — کہا خیر بہتر ہے منگوائیے"

نہیں چومتے اِن کے لب جام کو — یہ پیتے ہیں فالودہ ہر شام کو
کھدے بازوؤں پر ہیں یاروں کے نام — ہر اک ان میں ہے عاشقی کا امام
بہت اونچا عورت کا سمجھیں مقام — یہ کرتے ہیں اس صنف کا احترام
یہ ہیں تاج و معراج و مہتاب علی — اکھاڑوں میں ان کی جوانی پلی
پیا ان کے جسموں نے سرسوں کا تیل — چڑھی ان کے قد پر جوانی کی بیل
بنے جسم فولاد ڈنڑ پیل کر — گذاریں یہ ہر شام ہنس کھیل کر
نہ دِل میں یہ لائیں غم خوب و زِشت — یہ دُنیا ہی ان کے لئے ہے بہشت

بظاہر تو برطانیہ کا ہے راج
مگر اصل میں ان کے سر پر ہے تاج

فیض احمد فیض

آ گئی فصلِ سکوں چاک گریباں والو
سِل گئے ہونٹ کوئی زخم سِلے یا نہ سِلے
دوستو بزم سجاؤ کی بہار آئی ہے
کِھل گئے زخم کوئی پھول کِھلے یا نہ کِھلے

راجہ مہدی علی خاں

ادیب کی محبوبہ

تمہاری اُلفت میں ہارمونیم پہ میرؔ کی غزلیں گا رہا ہوں
بہتّر اُن میں چھپے ہیں نشتر جو سب کے سب آزما رہا ہوں

بہت دِنوں سے تمہارے جلوے خدیجہ مستور ہو گئے تھے
ہے شکرِ باری کہ سامنے اپنے آج پھر تم کو پا رہا ہوں

"لحاف" عصمت کا اوڑھ کر تم فسانے منٹو کے پڑھ رہی ہو
پہن کر بیدی کا گرم کوٹ "آج" تم سے آنکھیں لڑا رہا ہوں

تمہارے گھر ن۔م۔ راشد کا لے کے آیا سفارشی خط
مگر تعجب ہے پھر بھی تم سے نہیں میں کچھ فیض پا رہا ہوں

بہت ہے سیدھی سی بات میری نجانے تم کیوں نہیں سمجھتی
قسم خدا کی کلامِ غالب نہیں میں تم کو سنا رہا ہوں

تمہارے حسن پہ یہ تنقید کس سے لکھواؤں جلد بولو
شری عبادت بریلوی کو میں تار دے کے بُلا رہا ہوں

میں تم پہ ہوں جاں نثار اختر۔ قسم ہے مُنشی فدا علی کی
میں بمبئی جا کے تم پہ ساحر سے جادو ٹونے کرا رہا ہوں

اگر ہو تم ہاجرہ تو پھر مجھ سے مل کے مسرور کیوں نہیں ہو
تمہارے آگے اوپندر ناتھ اشک بن کے آنسو بہا رہا ہوں

حسیں ہو زہرہ جمال ہو تم۔ مجھے سنا کر نہال ہو تم
تمہارے یہ ظلم قرۃ العین کو بتانے میں جا رہا ہوں

میری محبت کی داستاں سُن کے رو پڑے عرش ملسیانی
سُکھا کے پنکھے سے اُن کے آنسو ابھی وہاں سے میں آ رہا ہوں

پلا دو آنکھوں سے تا کہ مجھ کو کچھ آلِ احمد سرورؔ آئے
بہت ہیں غم مجھ کو۔ عاشقی کے پئے پنا تھ گنگنا رہا ہوں

جو حکم دو واجدہ تبسم کا سب تبسم میں تم کو لا دوں
تمہارے ہونٹوں پہ غم کی موجوں کو دیکھ کر تلملا رہا ہوں

فراق گورکھپوری کی غزلوں کی طرح ہے رات کتنی لمبی

قسم ہے مجھ کو تمہارے قد کی۔ اسے میں رو رو بتا رہا ہوں

میری محبت کی داستاں کو گدھے کی مت سرگذشت سمجھو

میں کرشن چندر نہیں ہوں۔ ظالم الیقین تم کو دلا رہا ہوں

ملیح آباد آج جا رہا ہوں۔ میں جوش لاؤں کہ آم لاؤں؟

ہیں دونوں چیزیں وہاں کی اچھی میں لاؤں کیا تلملا رہا ہوں

میری تباہی پہ چھاپ دیں گے "نقوش" کا ایک خاص نمبر

طفیل صاحب کے پاس سارے مسودے لیکے جا رہا ہوں

حکیم یوسف حسن نے جب میری نبض دیکھی تو رو کے بولے

"جگر ہے زخمی تباہ گردے۔ یہ بات تم سے چھپا رہا ہوں

اب کی دنیا میں لاؤں گا انقلاب میں اپنی شاعری سے

صلاح دیں سے میں کچھ صلاحیں ادھار لینے کو جا رہا ہوں

وزیر آغا پٹھان ہیں ساتھ ساتھ یاروں کے یار بھی ہیں

پکڑ کر وہ تم کو پیٹ دیں گے۔ میں کل انہیں ساتھ لا رہا ہوں

شادؔ امرتسری

جب نہ کچھ بندوبستِ مے ہوگا
راستہ کس طرح سے طے ہوگا!

کیا خبر تھی کہ دِل کی بستی پر
غم کا شب خون پے بہ پے ہوگا

تیری آواز سُننے والوں کو!
کیا دِماغِ سرودِ نے ہوگا!

تُو ہی اے آرزُوئے وصل بتا
ہجر کا زور تا بہ کے ہوگا!

مجھ سے مِل کر تو دیکھ وصل کے بعد
حُسن تیرا عجیب شے ہوگا

شادؔ امرتسری کو دیکھئے گا!
اِک نہ اِک دن شہیدِ مے ہوگا

مشفق خواجہ

تری نگاہ کے احسان کم تھے پہلے بھی — ستم کشِ غمِ دوراں تو ہم تھے پہلے بھی

تری جُدائی کے صدمے نئے سہی، لیکن — خیال ہے کہ کچھ ایسے ہی غم تھے پہلے بھی

حسین گلیوں میں آوارگی نے کچھ نہ دیا — کہ میرے ذہن میں ایسے صنم تھے پہلے بھی

ترے ستم کی فراوانیوں سے راس آئے — ہمارے حال پہ یوں تو کرم تھے پہلے بھی

نہ جانے تیرے تغافل سے ان پہ کیا گزری — وہ بدنصیب جو مایوسِ غم تھے پہلے بھی

شکستہ پائی نے موقع دیا تو سوچیں گے — کہ رہگذار کے یہ پیچ و خم تھے پہلے بھی

ہم آج ہی تو نہیں شکوہ سنجِ تشنہ لبی — معاملات یہی بیش و کم تھے پہلے بھی

ترے خیال سے جو کچھ ملا، ملا لیکن
ہم اہلِ درد شناسائے غم تھے پہلے بھی

حافظ لدھیانوی

اب کہاں لذّتِ آغوشِ تمنّا باقی   دِل جو بجھ جائے تو کچھ بھی نہیں رہتا باقی

شامِ غم ایسی بلاخیز نہ دیکھی تھی کبھی   آسماں پر نہ رہا کوئی بھی تارا باقی

اب کہیں جمتی نہیں محفلِ اربابِ کہن   مَیں ہی مَیں رہ گیا اس بزم میں تنہا باقی

چیخ کر کہتا ہے ہر ایک نیا ویرانہ   اور کچھ روز ہے دُنیا کا یہ نقشا باقی

میرے لب پر تھے ابھی گیت بہاروں کے مگر   مُڑ کے دیکھا تو وہ موسم ہی نہیں تھا باقی

ہُو کا عالم ہے جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھو   اب وہ گلشن نہ وُہ دریا، نہ وہ صحرا باقی

ایک لمحے نے اُٹھائی وُہ قیامت حافظؔ
آنکھ جھپکی تو مکیں تھے نہ مکاں تھا باقی

سعید اختر نعمانی

پھول کھلتے ہیں جن مہینوں میں
مسکراتے ہیں زخم سینوں میں

ذکرِ طوفاں تھا ہم نشینوں میں
ناخدا چھپ گئے سفینوں میں

ہم نہیں آستاں نشینوں میں
داغ رکھتے ہیں پر جبینوں میں

اب تو رُسوائے جام و مینا ہوں
کبھی بدنام تھا حسینوں میں

ترکِ اُلفت کے بعد جانیے کیوں
میرا چرچا ہے نازنینوں میں

غمِ جاناں، غمِ جہاں، غمِ زیست
کیفِ ہستی ہے ان ہی تینوں میں

اپنا سب کچھ اجل لُٹا بیٹھی
آئی جب زندگی کے زینوں میں

ہم سے پوچھو کہ انقلاب ہے کیا
ہم نے دیکھے ہیں بل جبینوں میں

کل جو کرتے تھے دردِ دل کو عیاں
اب چھپاتے ہیں داغ سینوں میں

عقل کی بات پر نہ جا اختر!
عشق خود بھی ہے نکتہ چینوں میں

طاہرہ سلطانہ مخفی

انتظارِ نیم شبی

موجِ ہوا اُداس ہے چاند بھی زرد زرد ہے
دل میں ہے دردِ آرزو ہونٹوں پہ آہِ سرد ہے

بزمِ جہانِ عاشقی جیسے کوئی حسین باغ
نور فشاں روش روش، میری اُمید کے چراغ

چھُپ کے عروسِ زندگی دیکھ رہی ہے پیار سے
چشم بہ نم کھڑی ہوں میں ہو کے خفا بہار سے

سرد چنار دم بخود، چشمِ ستارہ سوگوار
صحنِ چمن میں پھول پھول آج ہے محوِ انتظار

میرے خیال صف بہ صف جیسے ہوں کھوئے قافلے
ایسے یہ رہ نورد ہیں جنکو نہ کوئی رہ ملے

سو گئیں دل کی دھڑکنیں ہائے نگاہ تھک گئی
اُن کے لئے میں بار بار باغ میں دور تک گئی

آہ وہ شوخ بلبلیں پھول سے جنکے لب ملے
عہد شکن وہ سنگدل، مجھ سے نہ جانے کب ملے

کاش کہ سُن سکوں میں پھر اُنکے قدم کی آہٹیں
دیکھ کے اُنکو جاگ اُٹھیں، ہونٹوں پہ مسکراہٹیں

اے میرے بیقرار دل، وہ نہیں آج آئینگے
کل نہیں مجھ کو آئیگی، لب نہیں مسکرائیں گے

شمعِ حزیں کی طرح پھر، آج جلوں گی رات بھر
دے گی مجھے تسلیاں آ کے حسینۂ سحر

ادیب سہیل

ایک شہزادۂ گُل آتا ہے

اپنی خوشبو میں مگن رات کی شہزادی سے
اِک تجسّس بھرے انداز میں زُہرہ نے کہا
"خیر مقدم کے لئے کسی کے، سرِ صحنِ چمن
بربطِ ماہ پہ ہے نغمہ سرا لیلائے شب
شاخ در شاخ فروزاں ہیں شگفتہ رُخسار
زیرِ ہر شاخِ شجر نُور کی گُل کاری ہے
جشن ہے، رقص ہے، ترنّم ہے، سرشاری ہے"
اپنے ہونٹوں پہ لئے خندۂ گُل کی رونق
وقت کی شاخ پہ کھِلتے ہوئے لمحے بولے
"اِک طرحدار کی قُربت کو مسخّر کرنے
اِک دِل آرام کا احساس معطّر کرنے
اِک طلبگار کو سرمایۂ عشرت دینے
حُسن کو پیار کے اقرار کی لذّت دینے
اِک شہزادۂ گُل آتا ہے
ساتھ پیمانِ وفا لاتا ہے"

پرکاش ناتھ پرویزؔ

کیا تیری محبت میں عالم نظر آتا ہے
کونین کا ہر ذرّہ برہم نظر آتا ہے

مشتاق نگاہی کا کچھ جرم تو سمجھاؤ
کیوں چشمِ تماشا کو تو کم نظر آتا ہے

عالم ہی بدل ڈالا ہستی کے تقاضوں نے
ہر دستِ حنائی میں پرچم نظر آتا ہے

اے عشق! تیری غیرت مجروح نہ ہو جائے
اب شعلۂ بیتابی مدّھم نظر آتا ہے

افسانۂ اُلفت کا ابہام نہ کچھ پوچھو
عنوان سے آخر تک مُبہم نظر آتا ہے

ظاہر میں نہیں اُس کو گو میری خبر لیکن
در پردہ غمِ دل کا محرم نظر آتا ہے

پہلے تو نہ تھی ایسی تاثیر محبت میں
کیوں دیدۂ محبوبی پُرنم نظر آتا ہے

دیکھے تھے ترے جلوے اک بار نگاہوں نے
اب عالمِ دل میں تو پیہم نظر آتا ہے

یہ اشک جو پلکوں سے ڈھلکا ہے شبِ فرقت
پرویزؔ محبّت کا ماتم نظر آتا ہے

حمید الماس

دردِ نارسا کا گلہ

تیرے گلرنگ شبستاں کو سجانے کیلئے
مَیں نے آنکھوں سے چُنے تھے کبھی تاروں کے کنول
مَیں نے چھوڑا نہ کبھی مہر و وفا کا آنچل

تُو نے یہ بھی تو نہ دیکھا کہ ترا دیوانہ
تیری اِک چشمِ عنایت کا طلبگار بھی ہے
محوِ نالہ بھی ہے لذّت کشِ آزار بھی ہے

تیرے ہی قصرِ بہاراں کے ہر اک گوشہ میں
آرزؤں کے حسیں پھُول چڑھائے مَیں نے
کتنے کعبے تری راہوں میں بنائے مَیں نے

تو کہاں ہے کہ تری یاد بھی اب ساتھ نہیں
کون کاٹے گا یہ شب کون سحر دیکھے گا
اب یہاں کون مرا چاکِ جگر دیکھے گا

صفحۂ گل پہ ترے عارضِ سیمیں کے نقوش
اسطرح کھینچ دیئے ہوگئی شرمندہ بہار
مَیں سمجھتا تھا تجھے اپنی نظر کا شہکار

رات گلرنگ سہی، چارہ گرِ غم تو نہیں
جیب و دامانِ دریدہ کا رفو کون کرے
تشنہ کاموں کیلئے فکرِ سبو کون کرے

کوثر لدھیانوی

جائزے

بھٹک رہے ہیں یہ گمراہ کن خیالوں میں
کسے نہیں ہے یہاں منصب و مقام کی چاہ
کسے نہیں ہے یہاں شہرتِ دوام کی چاہ
الجھ گئے ہیں یہ خود آگہی کے جالوں میں
ہماری کشتیِ امید کے یہ رہنما

ہیں بے قرار مگر ہے ابھی قرار کی چاہ
جو باعمل ہیں وہ حسنِ خرام کھو بیٹھے
جو باہنر ہیں وہ اپنا مقام کھو بیٹھے
غمِ حیات سے ہیں ڈھونڈتے فرار کی راہ
یہ رند ہاتھ سے مینا و جام کھو بیٹھے

ادب کے نام پہ بے ادبیاں بھی کرتے ہیں
طبیعتوں میں ہیں کچھ اور دھن سمائے ہوئے
محبتوں میں ہیں خود آگ سی لگائے ہوئے
وفا کے پردے میں آہیں بھی سرد بھرتے ہیں
دلوں میں گرمیِ جذبات کو دبائے ہوئے

یہ بھول کر بھی کوئی کام کر نہیں سکتے
ہے اک ارادہ مگر کامگار وہ بھی نہیں
ہے شوقِ جادہ، مگر استوار وہ بھی نہیں
رہِ حیات سے تن کر گزر نہیں سکتے
ہیں ایستادہ جہاں رہگذار وہ بھی نہیں

مشال رضوی

گھور اندھیرا

گھور اندھیرے اور تنہائی

نیلا ہے آکاش

جانے کہاں چھپا ہے جا کر چندرما کا سُندر مکھڑا

ویاکُل ہے ہر تارا

ہر تارے میں جوت ہے ایسی

جیسے دِل کی آشا

آشائیں ہیں یا تارے ہیں

کیسے پیارے پیارے ہیں

چمک رہے ہیں جھلمل جھلمل جیسے آشائیں ہوں دل کی

نیند کی ماتی پاگل دُنیا

سوتی ہے

آنکھیں ہیں نہ جیتی ہے

سمے کا اجگر کھسک رہا ہے

لمحہ لمحہ

گھور اندھیرے

آکاش کا پردہ، گہرا نیلا

چمک رہے ہیں تارے

چندرما کا سُندر مکھڑا کہاں چھپا ہے جا کر

گزر رہا ہے سمے کا اجگر

اب پو پھٹنے والی ہے

اِک تارے نے اِک تارے کو کھینچ لیا، شاید

یا پھر اِک تارا ٹوٹا

کلپ رہی ہے آشا

گھور اندھیرا!

گھور اندھیرا!!

چھایا ہے آکاش پر جیسے گھور اندھیرا... گھور اندھیرا

اور تنہائی

نیلا ہے آکاش

عرش صہبائی

کچھ نشترِ غم کی خلش بھی ہے کچھ لطفِ مئے گلفام بھی ہے
اُس ایک نظر کی جنبش میں تکلیف بھی ہے آرام بھی ہے

ہم محفلِ بادہ و ساغر سے اُٹھے تو ہیں پیاسے ہی لیکن
آوازِ شکستِ دل میں نہاں آوازِ شکستِ جام بھی ہے

بربادیٔ دل کا غم تو نہیں لیکن یہ رنج مٹے کیوں کر
کہتے ہیں مری بربادی سے بدنام تمہارا نام بھی ہے

تم حاکمِ وقت ہو قسمت سے تم جو چاہو کر سکتے ہو
تم کہہ دو اگر تو صبح بھی ہے تم کہہ دو اگر تو شام بھی ہے

ہیں ساقیٔ محفل کے صدقے ہیں ساقیٔ محفل کے قرباں
آنکھوں میں لرزتے اشک بھی ہیں ہاتھوں میں شکستہ جام بھی ہے

گو خاک بسر ہوں دنیا میں پھر بھی تابندہ خیالوں سے
نکھری ہوئی ہر اک صبح بھی ہے مہکی ہوئی ہر اک شام بھی ہے

کچھ لوگ سمجھتے عرش اسے کچھ لوگ سمجھتے صہبائی
پر حسن و ادا کا دیوانہ مشہور بھی ہے گمنام بھی ہے

ڈی سی آر طاہر

یہ راز کیا ہے نہیں کوئی آرزو جیسے
دلِ حزیں کو نہیں تیری جستجو جیسے

بہا ہے اشکوں کے ہمراہ کیا لہو دل کا
چمن میں آ گیا سیلاب رنگ و بو جیسے

کبھی جو داغ تھے گلہائے رنگ رنگ اب ہیں
کھلا ہوا ہے چمن زار آرزو جیسے

بہشت حسن تصوّر کی بزم آرائی
مَیں دیکھتا ہوں وہ بیٹھے ہیں روبرو جیسے

شباب حسن کا حسن شباب کیا کہنا
کمر پہ ساقیٔ مہوش کے ہو سبو جیسے

بتوں سے ذکرِ حرم بات کیا ہے اے طاہر
چھڑی ہو ترکِ محبّت کی گفتگو جیسے

خلیل رامپوری

ہم سے مسافروں کا ٹھکانہ کہاں نہیں
یارو گھنے درخت کا سایہ کہاں نہیں

صحرا میں بھی ملیگی ترے رُوپ کی مٹھاس
یہ لازوال دھُوپ کا دریا کہاں نہیں

مانوس کب ہوا نہ گلِ دیدیں سے میں
یہ دِل ترے جمال میں ڈوبا کہاں نہیں

مُرجھا دیئے حیات نے طوفاں بدوش شہر
غم ہائے روزگار کا رونا کہاں نہیں

اک پھُول تم بھی توڑ کر زلفوں میں ٹانک لو
تاریکیوں کے ساتھ اُجالا کہاں نہیں

جب سے ہوا ہے آنکھ سے اوجھل کوئی خلیل
پھیلا ہوا خیال کا صحرا کہاں نہیں

الطاف مشہدی

حسین چہرے سے اُٹھیگا پھر نقاب ابھی
طلوع اور بھی ہوگا اِک آفتاب ابھی

تو بدنصیب ستاروں پہ ہو گیا قانع
گھٹا کی اوٹ سے نکلیگا مہتاب ابھی

ابھی نہ جام کو محفل میں زحمتِ رم دے
لہو کی باس سے خالی نہیں شراب ابھی

ہوا کے دوش پہ بکھری ہوئی ہیں فریادیں
نہ چھیڑ مطرب رنگیں نوا رباب ابھی

جواں خیال و جواں سال آپ کا الطاف
بقیدِ زیست ہے وہ شاعرِ شباب ابھی

ندیم جعفری

اُن کی طرف سے پُرسشِ حالات کم رہی
نہیں کہ رسم و راہ مُلاقات کم رہی

شاید خزاں سے ایسے بھی کچھ سلسلے ملے
رونقِ چمن کی حسبِ روایات کم رہی

کیا کیا ہوئیں نہ غیر پہ پیہم نوازشیں
ہم پر تمہاری چشمِ عنایات کم رہی

کچھ ہم نے بھی فراخدلی کا دیا ثبوت
کچھ اُن سے بھی تلافیٔ مُلاقات کم رہی

پھر بھی خطوطِ شیشہ و ساغر تک آ گئی
مے گرچہ بالحاظِ مُدارات کم رہی

سرشار سیلانی

ہزاروں بار ہم تقدیر کی افتاد پر روئے
ہزاروں بار ہمکو اپنے رونے پر ہنسی آئی

جو شے دُنیا میں تھی درکار عقبیٰ نے عطا کی
ترے انصاف پر اے داورِ محشر ہنسی آئی

خلوصِ چارہ گر میں تو نہیں جائے سخن لیکن
مآلِ چارہ فرمائی پہ رہ رہ کر ہنسی آئی

یہ نیرنگِ محبت تھا اسی جانِ محبت تک
نہ پھر آنکھوں میں اشک آئے نہ پھر لب پہ ہنسی آئی

وہ عالم کر دیا سرشار وارفتہ مزاجی نے
کہ خود ہمکو بھی اپنے حال پر اکثر ہنسی آئی

موجِ عملیگ

سفر کے سارے مراحل عجیب سے گزرے
وہ جب بھی راہِ دلِ بدنصیب سے گزرے

اک انتظارِ مسلسل کے ماسوا شبِ ہجر
کچھ اور حادثے دل پر عجیب سے گزرے

خود اپنے ظرفِ تمنّا پہ شرمسار تھے ہم
نظر جھکائے دیارِ حبیب سے گزرے

خرد نصیب زمانے کی گرد بنتے گئے
بس ایک اہلِ جنوں ہی قریب سے گزرے

چھپایا تھا جنہیں اپنے دوستوں سے بھی
وہی فسانے نگاہِ رقیب سے گزرے

اے موج کوئی تصور خزاں نصیبوں کا
بہار بن کے دلِ عندلیب سے گزرے

قطعات

وقار خلیل

غم کے اندازِ مدارات سے جی ڈرتا ہے
فصلِ گل میں بھی ملاقات سے جی ڈرتا ہے
ہم تو واقف ہیں تری چال سے اے مستِ خرام
آج دزدیدہ اشارات سے جی ڈرتا ہے

تم رخِ زیست بہر طور نکھارو یارو
کوہکن کی طرح سر تیشے پہ مارو یارو
غمِ ایام کا شکوہ تو کوئی بات نہیں
کاکلِ وقت بہر رنگ سنوارو یارو

حیاتِ مصحفِ جاناں کی طرح روشن تھی
یہ کیا ہوا کہ تری انجمن ہے زیر و زبر
تقاضۂ غمِ دوراں بھی آج مبہم ہے
نہ جانے کونسی راہوں میں کھو گیا ہے بشر

حامد ناروی

ہوا کے گرم جھونکے چل رہے ہیں
تپش سے غنچہ و گل جل رہے ہیں
چمن میں گرمیِ دورِ خزاں ہے
کفِ افسوس پتے مل رہے ہیں

زینتِ صحنِ چمن تم ہو کوئی اور نہیں
مجھ سے سرگرمِ سخن تم ہو کوئی اور نہیں
کیوں نہ ہو مجھ کو تحیر کہ ہو تم پیشِ نظر
میرے خوابوں کی دلہن تم ہو کوئی اور نہیں

یہ مبتلا ہوں کس نئی مشکل میں آج کل
رہنے لگا ہے درد مرے دل میں آج کل
غم ہائے بیشمار کی ہوتی ہیں بارشیں
آتا ہوں میں جو آپ کی محفل میں آج کل

فضا کوثری

کل میرا تیرے ساتھ جو گزرا تھا وقت کچھ

کتنے طرب نواز تھے نغمے وہ رات کے
مسحور کن تھے ساز طربِ کائنات کے

کتنی مہک رہی تھی ہواؤں میں تیری بو
کتنی مچل رہی تھی مرے دل کی آرزو

محوِ نشاط تھی ترے پہلو میں زندگی
کتنی لطیف تھی ترے جلووں کی چاندنی

کتنا نفیس تھا مرے احساس کا چمن
کتنی قریب تھی مری چاہت تری لگن

کتنی سرور بخش تھیں باہوں کی گرمیاں
کتنی مشارکت تھی ترے میرے درمیاں

کتنی طرب فروز تھیں سانسوں کی آہٹیں
کتنی فراق سوز تھیں وہ گنگناہٹیں!

کتنا گداز تھا ترا وہ پھول سا بدن
کتنے شگفتہ تھے ترے رخسارہ و دہن

کتنی جمیل تھی تری رنگت شراب سی
رنگین کس قدر تھیں وہ آنکھیں گلاب سی

کتنی کشش فزا تھیں وہ انگڑائیاں تری
کتنی نظر فریب تھیں رعنائیاں تری

چھلکی تری نظر تو چھلک اٹھا میکدہ
لچکی تری کمر تو بکھرنے لگی فضا

لہرائی تیری زلف تو لہرا گئی بہار
ذوقِ نظر تھا سنبل و ریحاں سے ہمکنار

چھایا ہوا تھا پیار کا رنگین سلسلہ
جیسے سمٹ گیا تھا من و تو کا فاصلہ

مدہوش ہو رہے تھے مرا دل ترا جمال
حالات کا وہ موڑ بھلاؤں، بہت محال

عطاءالرحمٰن ارشاد

آدمِ نو

پیار کرتے تو ہو گلوں سے مگر
جانتے ہو مآلِ ذوقِ نظر
مہ و مریخ ہم رکاب ہوئے
جب کیا آدمی نے عزمِ سفر
کوئی صاحب نظر نہیں ملتا
ہیں اِسی خاک میں گُل و گوہر
آرہی ہے براتِ آدمِ نو!
سج سجا لے ذرا نگارِ قمر
سایۂ زُلفِ عنبریں ہوتا!
تیز ہے دھوپ داورِ محشر
خواہشِ زیست ہے اگر تجھ کو
موت سے کھیل موت سے مت ڈر
میں کہ تقدیرِ دہر ہوں ارشاد
کون ہوگا بھلا مرا ہمسر!

عادل منصوری

ساگر منتھن

مَیں نے اِس جیون ساگر میں
پریم کے امرت رس کے کارن
کیا تھا اِک دن ساگر منتھن!

لیکن اِس جیون ساگر سے
پریم کے امرت رس کے بدلے
دُکھ کے وِش کا دھارا نکلا

آج تلک اِس دُکھ کے وِش کو
مَیں ہنستے ہنستے پیتا ہُوں!
کبھی تو اِس جیون ساگر سے
پریم کا امرت رس نکلے گا
مَیں اِس آشا میں جیتا ہُوں

عبدالحمید بھٹی

○

کوئی منزل مقام ہو کیسے؟
موت کا احترام ہو کیسے؟

ہے نشاطِ نظر کو اک لمحہ
صبح کیسے ہو، شام ہو کیسے؟

خندۂ گل تو ہے بہائے قلب
دید کو اذن عام ہو کیسے؟

آبروئے حیات ہے غم سے
قصۂ غم تمام ہو کیسے؟

اپنی دھڑکن پہ بھی دھڑکتا ہے
دِل رَم خُوردہ رام ہو کیسے؟

طرب جُو دُنیا سے دُور ہو بیٹھے
کوئی دُنیا سے کام ہو کیسے؟

پھر کسی سے رہے سلام و پیام
پھر یہ اہتمام ہو کیسے؟

رہبر قادری

○

بڑی پُر درد میری داستاں ہے
سخن کی ہر کڑی سے جو عیاں ہے

مجھے جانے دے ساقی میکدے سے
میرے گلشن کا گلچیں نوجواں ہے

خلوص و دوستی کی قدر اب کیا
فریب و مکر کا سارا جہاں ہے

عنادل سر کہاں جا کر چھپائیں
کہ زیرِ دام سارا گلستاں ہے

نہ کر تو فکر میری کچھ بھی ناصح
میری قسمت میں نالہ ہے فغاں ہے

کسی سے بدگمانی کیوں ہو رہبرؔ
کہ جب قسمت ہی تجھ سے بدگماں ہے

حبیب بارہ بنکوی

○

ہے پسِ آئینہ اسطرح نمایاں کوئی!
محوِ حیرت ہے کوئی سر بہ گریباں کوئی

ذرہ ذرہ میں ترا عکس نظر ہے ساقی
تو نے چھوڑا ہی نہیں ہوش کا امکاں کوئی

راس آئے بھی تو کیا آئے یہ آئینِ چمن
کوئی گریاں نظر آتا ہے تو خنداں کوئی

آبلہ پائی نے مجبور بنا رکھا ہے
مجھے پُوچھے خلشِ خارِ مغیلاں کوئی

نغمۂ زیست گوارا نہیں فرقت میں تری
کاش اب توڑ ہی دے تارِ رگِ جاں کوئی

عمر جلتے ہی تو گزری ہے محبت میں حبیبؔ
"کیوں میری خاک پہ کرتا ہے چراغاں کوئی"

نیاز بدایونی

○

سب مری تباہی میں ترا نام لیتے ہیں
بوالہوس محبت سے انتقام لیتے ہیں

کون طعنہ زن ہوتا تیری کج کلاہی پر
اپنے سر یہ تہمت بھی ہم غلام لیتے ہیں

ترکِ آرزو کرنا دشمنی نہیں ہوتی
میں سلام کرتا ہوں وہ سلام لیتے ہیں

مست ہو کے چلتی ہیں موجِ گنگ و لیے اُٹھی
یہ سبق تجھی سے سب خوش خرام لیتے ہیں

یہ بھی ایک پہلو ہے میری تشنہ کامی کا
نشہ مجھ کو چڑھتا ہے لوگ جام لیتے ہیں

جانِ شوق کہنے پر ہو گیا کوئی برہم
پیار میں تکلف سے کس کا نام لیتے ہیں

عابد مناوری

○

جو بشر خود کو بھی نہ پہچانے
وہ رموزِ حیات کیا جانے

دل کو خدشوں نے آ کے گھیر لیا
لی جو چٹکی کسی تمنّا نے

اُف! فریبِ جمالِ ذوقِ نظر
ہم اُنہیں آج بھی نہ پہچانے

صاف گوئی کا یہ نتیجہ ہے
اپنے بھی ہو گئے ہیں بیگانے

مہر و ماہ و نجوم کچھ بھی نہیں
تو جو اپنی خودی کو پہچانے

معجزہ ہے کہ بزمِ عابد میں
رقص فرما رہے ہیں پیمانے

وزیری پانی پتی

نظر فریب سہی موسمِ بہار کے پھول
عزیز دیدہ و دل ہیں خیالِ یار کے پھول

انہیں بھی میری طرح انتظار ہے تیرا
بچھے بچھے ہیں کئی دن سے رہ گذار کے پھول

مرے چمن میں ہوائے خزاں نہیں چلتی
مری وفا نے تراشے ہیں اعتبار کے پھول

سحر کی جلوہ گری شام تک فسانہ تھی
چمن سے روٹھ گئے دوپہر گذار کے پھول

کسی کی کمسنی پر بھی حرف آ جاتا
نشہ کی چھاؤں میں کھلتے اگر خمار کے پھول

یہ دور ایک شکستہ مزار ہے گویا
ہم اہلِ فکر وزیری ہیں اس مزار کے پھول

شاہد دہلوی

حسنِ عالم ہے زندگی میری
آپ کا غم ہے زندگی میری

گیسوئے دوست کا تصور ہے
راہ پُرخم ہے زندگی میری

حوصلے تھک گئے سرِ منزل
حرفِ ماتم ہے زندگی میری

کیا محبت اسی کو کہتے ہیں
دردِ مبہم ہے زندگی میری

جی رہا ہوں تیری عنایت تک
مثلِ شبنم ہے زندگی میری

کیا تعلق خوشی سے اے شاہد
مستقل غم ہے زندگی میری

رئیس فروغ

دشتِ شب میں جو تگ و تاز نہیں کر سکتے
شہرِ خورشید کا در باز نہیں کر سکتے

عشق وہ کارِ مسلسل ہے کہ ہم اپنے لئے
ایک لمحہ بھی پس انداز نہیں کر سکتے

حسن کو حسن بنانے میں مرا ہاتھ بھی ہے
آپ مجھ کو نظر انداز نہیں کر سکتے

ہم گلستاں سے گذرتے ہوئے پھولوں کی طرح
اِک نگاہِ غلط انداز نہیں کر سکتے

گفتگو اُن سے جو کرنی ہے سب ازبر ہے ہمیں
غم فقط یہ ہے کہ آغاز نہیں کر سکتے

بات نظروں کے تعاون سے ہی بنتی ہے فروغ
صرف جلوے کوئی اعجاز نہیں کر سکتے

واحد پریمی

چمن میں، چاند میں، تاروں میں دلکشی آئی
یہ کون آیا کہ ہر شے میں زندگی آئی

تلاشِ دوست میں یوں کھو گیا ہوں اکثر
مری حیات مجھے ڈھونڈتی ہوئی آئی

بقدرِ ذوقِ تجسس، بفیضِ جذبِ جنوں
بتانے راہ مجھے بڑھ کے گمرہی آئی

شبِ فراق ستم پر ستم ہُوا دل پر
تمہاری یاد تمہارا ہی پوچھتی آئی

ستارے جھوم گئے پھول جگمگا اُٹھے
ترے لبوں پہ جو بے ساختہ ہنسی آئی

خدا کا فضل، بزرگوں کا فیض ہے واحد
مرے کلام میں جو اتنی پختگی آئی

جمیل کلیمی

خود اپنے ہی غمِ دل سے اگر چھوٹتے ہم لوگ
نرگس کے کبھی احوال کبھی پوچھتے ہم لوگ

آپ آتے تو اس تاروں بھری رات میں کچھ دیر
غم بھولتے دو چار قدم گھومتے ہم لوگ

اچھا ہوا یوں راہ میں تم مل گئے ورنہ
اس شہر میں کس طرح تمہیں ڈھونڈتے ہم لوگ

کچھ آپ کی چاہت میں اثر ہوتا تو ایسے!
طوفانوں میں کس طرح بھلا ڈوبتے ہم لوگ

ہوتی جو جمیل آپ کے نغموں میں تڑپ تو؟
رہ جاتے نہ ہر رات یونہی اونگھتے ہم لوگ

قمر بڈودوی

یہ کس منزل پہ ٹھہرا ہے نہ جانے کارواں میرا
کہ ہر ذرّہ جہاں کا لے رہا ہے امتحاں میرا

وہیں لیکر چلا ہے آج پھر ذوقِ جنوں مجھکو
کہ جس منزل پہ اکثر لٹ چکا ہے کارواں میرا

یہ آہِ سرد لب پر اور یہ بھیگی ہوئی آنکھیں
میں ڈرتا ہوں کہیں افسانہ ہو رازِ نہاں میرا

ہوا کیا برق نے جو بے رخی سے آج پھونکا ہے
بنے گا کل نئے انداز سے پھر آشیاں میرا

یقیں ہے پا ہی جاؤں گا مقامِ زندگی اک دن
خدا رکھے سلامت اے قمر عزمِ جواں میرا

کرشن مِتل معراج

تاروں بھری سہانی پُر کیف رات ہے
ایسے میں ہوں وُہ ساتھ تو کچھ اور بات ہے

تیرے بغیر رُخِ ہستی تھا دِل شِکن
تُو ہے تو دلفریب مری کائنات ہے

کہنے کے واسطے کوئی خود کو بڑا کہے
لیکن بُلند اگر ہے تو خالق کی ذات ہے

اِک تیر چُبھ رہا ہے کلیجے میں بار بار
کیا یہ بھی آپ کی ہی نگاہِ التفات ہے

زخمِ جگر ہزار ہیں معراج خندہ زن
کتنی حسین دیکھ تیری کائنات ہے

بِمل کرشن اشک

حیات، موت، شبِ وصل، شامِ غم کیا ہے؟
شعور بانٹنے والے کہیں تو دھوکا ہے

سُنا ہے ہم سے بہت دُور اپنی مجبُوری
سوائے اپنے کوئی اور بھی سمجھتا ہے

تجھے یہ علم بھی ہوگا کہ عکس نے تیرے
کبھی کبھی تو تجھے آئینے میں دیکھا ہے

تمام رُوح تصوّر تمام جِسم فریب!
کِسے خبر کہ حقیقت حقیقتاً کیا ہے

کہو، اشک تمہیں درد چاہیئے کہ دوا
یہ شہر وُہ ہے جہاں اُس پری کا سایا ہے

ذکی بدایونی

ایک کتاب کے سرورق سے متاثر ہو کر

ماڈرن آرٹ - ماڈرن پوئم

پھلجھڑی ہے چاند ہے یا آفتاب
یوں یہ تو کر نہیں سکتا کوئی کاغذ خراب
اُڑ رہی ہیں تیلیاں ماچس کی سوئے آسماں
یا کہ ٹڈے ہیں یہ سرگرمِ سفر
حضرتِ غالب کا فرمانہ بجا
"کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"

ایک گنبد پر سرِ بلڈنگ نظر آیا مجھے
غور سے دیکھا تو نکلی چشمِ ہرپل
آدمی جس میں سما جائیں ہزار
گھاس چرنے کے لئے
بیٹھے پلکوں پہ بھوکے جانور
بھیڑ بکری گائے بیل

آنکھ اِک ایسی کہ جسمیں روشنی باقی نہیں
اشتراکی بھی نہ تھی مجرم نہ تھی پتلی ہی تھی
جانے کیوں انڈر گراؤنڈ ہو گئی
طب، سیاست، فلسفہ اور شاعری
فیصلہ سب کا یہی
اِس جگہ حضرت اندھیرا چاہیئے
اور وہیں لکھا ہُوا تنویر ہے

اِک عمارت پر نظر آیا ہلال
جو کسی راکٹ نے اُلٹا کر دیا
آہ بیچارہ حوادث کا شکار

کھڑکیاں خود جھانکنے کے موڈ میں

اور دروازے ضعیفہ کی کمر
بعض دیواریں نمازی کی طرح
کچھ کھڑی ہیں کچھ جھکی ہیں پڑھ رہی ہیں فاتحہ
نوبتِ سجدہ نہیں آئی ابھی
کیا بنائے ہیں مکاں کھنڈر نما

دُور سے آواز آئی برملا
یہ تو آثارِ قدیمہ ہیں حضور
ان کے باشندے گئے ہیں سیر کو
مر مرا کر بھی نہ پہنچے جس جگہ ذوق و جگر
یہ وہاں زندہ ہی رُخصت ہو گئے

رہبری کے واسطے کتبا ملی

کس سے پُوچھیں کون بتلائے جناب
نا کوئی زندہ ہی پلٹا جس سے کرتے یہ سوال
اور مردے وہ تو مُردہ ہی رہے
کل تلک مرحوم تھے اور آج وہ محروم ہیں
اِک قیافے کا سہارا رہ گیا

شوق سے قصہ سُنا دو من گھڑت
آپ بھی آزاد ہیں جیسے یہ آرٹ

علیم جہانگیر

ترغیبِ مے گساری اب عام ہو رہی ہے
تلقینِ دین و دُنیا ناکام ہو رہی ہے

احسان ہیں کسی کا کیونکر اُٹھاؤں ساقی
اب تشنگی ہی ڈھل کر خوُد جام ہو رہی ہے

پھر انتظارِ خط پر مجبوُر ہے تمنّا
پھر آرزو اجل کا پیغام ہو رہی ہے

جلووں کا سحر سا ہے چلمن کی تیلیوں میں
جو نوُر کی کرن ہے اب دام ہو رہی ہے

بسمل ہی کر گئی ہے تیری غزل جہانگیر
ظالم ادا کسی کو صمصام ہو رہی ہے

ندا فاضلی

نیم کی شاخوں میں اُلجھا ہُوا پیلا سورج

سامنے چھجّے پہ بیٹھی ہوئی ننھی چڑیا
چونچ میں تنکا دبائے ہوئے کھوئی کھوئی
اپنے پر تول رہی ہے کہیں اُڑ جانے کو!!

کسی بچہ کی پرانی سی ربڑ کی گڑیا
جس کے چہرہ پہ کئی زخم نظر آتے ہیں
صحن کی نالی میں بکھری ہوئی ٹوٹی پھوٹی
اندھی آنکھوں سے مری سمت تکے جاتی ہے
چپکے چپکے کوئی افسانہ کہے جاتی ہے!!!

میں یونہی بیٹھے ہوئے سوچے چلا جاتا ہوں
تیرے آنے میں مگر چند منٹ اور بھی ہیں

جی میں آتا ہے کہ یہ میز پہ رکھا ہُوا کپ
جتنی جلدی ذرا بڑھ کے اُلٹ کر رکھ دوں
یا قلمدان پہ رکھا ہُوا بے نب کا قلم
یونہی بیٹھا ہُوا ہاتھوں میں گھماتا ہی رہوں
وقت کے پہیے کی رفتار بڑھاتا ہی رہوں

نیم کی شاخوں ......
سامنے چھجّے پہ ......

محمدؐ علوی

پربت

اُجلی اُجلی جھیل کو پہلو میں رکھ کر
اپنا چہرہ دیکھ رہا ہے اِک پربت
اپنے آپ میں گم سم کھویا کھویا سا
جانے کب سے بیٹھا ہے آئینہ لئے
جانے کب سے جھیل بنی ہے آئینہ
جانے کتنے موسم آئے اور گئے
جھیل نہ جانے کب کب اُبھری اور جھکی
کب کب سمٹی سکڑی تہہ میں بیٹھ گئی
کتنے پودے نکلے چھوٹے سوکھ گئے
کتنے پھول کھلے مرجھائے ٹوٹ گئے
کتنے پنچھی آئے ٹھہرے لوٹ گئے
پربت سب سے بے پرواہ کھویا کھویا
اُجلی اُجلی جھیل کو پہلو میں رکھ کر
اپنا چہرہ دیکھ رہا ہے کیوں اب تک؟

پھمنداس شائق

طرحی غزل

اب نگاہیں مبتلائے عشقِ جاناں ہو گئیں
لے سنبھل اے دل! تیرے غم کا ساماں ہو گئیں

خون کی بوندیں شبِ فرقت جو ٹپکیں آنکھ سے
مایہ دارِ نور تھیں شمعِ شبستاں ہو گئیں

جا بجا دیوانگانِ عشق کے تھے نقشِ پا
جا بجا پیدا بیاباں میں بھی کلیاں ہو گئیں

بادۂ گلگوں کی موجیں بھی شبِ مہتاب میں
جذبۂ الفت سے مد و جزر ساماں ہو گئیں

خونِ دل پی پی کے بھی آئی نہ راس زندگی
دل ہی دل میں آرزوئیں گھٹ کے بے جاں ہو گئیں

جوشِ وحشت میں بھی تھا یہ پاسِ خودداری مجھے
چند کلیاں بھی چمن میں سنگِ طفلاں ہو گئیں

حسن کی نیرنگیاں تھیں عمر بھر رو در حجاب
پڑ گئے آنکھوں پہ جب پردے تو عریاں ہو گئیں

زخمِ دل پر کر گئیں اے دوست مرہم کا اثر
تیر سی تیری نگاہیں دل کا درماں ہو گئیں

ہے بڑا احسان شائق ان کی مشقِ ناز کا
"مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں"

عشرت قادری

شعلۂ احساس

ایک مدت سے ہے احساس و تخیل پہ جمود
سالہا سال سے ویران ہے آغوشِ خیال
ایک عرصہ ہوا خاموش ہے دل کی دھڑکن
کوئی آہٹ، کوئی دستک، کوئی جھنکار نہیں

اک تجسس ہے کہ آوارہ بھٹکتی ہے نظر
کوئی فردوسِ شمائل، کوئی شہناز، ملے
کوئی نغمہ، کوئی جھنکار، کوئی ساز ملے

شرمگیں نظروں سے، لے کوئی محبت کا سلام
کاش! پھر کوئی لکھے دستِ حنائی سے خطوط
دل کی تاریکی میں پھر درد کی کرنیں پھوٹیں
پھر دریچے سے کوئی جھانکے، سرِ شامِ فراق
کسی پازیب سے پھر گونج اٹھے، تنہائی
چوڑیاں کھنکیں، شبستاں کی خموشی ٹوٹے
جل اٹھیں پھر سے جواں سال امنگوں کے چراغ

پھر سے ہو نیند کی وادی میں کوئی محوِ خرام
پھر سے ہوں اجڑے ہوئے خوابوں کے جزیرے آباد
پھر ملے چاندنی میں کوئی شہر سے دور
آرزوؤں کے گلے میں کوئی، بانہیں ڈالے
نرم سانسوں سے مہک اٹھے شبستانِ وجود
لیکے انگڑائیاں، پہلو سے پھر اٹھے کوئی
بامِ امید پہ لہرائے مسرت کی بہار

آنکھیں ملتی ہوئی، خوابیدہ تمنا، جاگے
فکر و تخیل کو پھر سے پرِ پرواز ملے
شعلۂ عشق کو پھر منزلِ آغاز ملے

سالہا سال سے ویران ہے آغوشِ خیال
ایک عرصہ ہوا خاموش ہیں دل کی دھڑکن
کوئی آہٹ، کوئی دستک، کوئی جھنکار نہیں
طائرِ فکر کو موضوعِ سخن کی ہے تلاش

سحر جلگانوی

تجھے اے دل کسی کے عشق کے قابل بناتا ہے
تری خاطر مجھے دانستہ کوئی چوٹ کھاتا ہے

ہماری مسکراہٹ میں ہزاروں غم ہیں پوشیدہ
ہزاروں غم چھپانے کیلئے ہی مسکراتا ہے

چراغوں کی ضرورت کیا غنیمت ہے دل سوزاں
شب غم دل جلا کر اپنی محفل جگمگاتا ہے

پہنچ ہی جائیں گے منزل پہ لیکن اس سے کیا حاصل
کہ منزل پر پہنچ کر بھی تو آخر لوٹ آتا ہے

عطا کی حادثات عشق نے سوغات بس اتنی
کبھی تو مسکراتا ہے کبھی آنسو بہاتا ہے

خدا جانے سحر کتنے واسطے ہیں امتحاں کتنے
اے زندگی کیا اور اسکو آزمانا ہے

شباب للت ایم اے۔ بی۔ ٹی

قطعات

پھر وہی شام جدائی وہی سناٹا ہے
آج دینے لگے لو دل کے سلگتے ہوئے داغ
وہ جو دیتا تھا کبھی پیار کے شعلوں کو ہوا
بجھ گئے ہیں اسی آنچل سے وفاؤں کے چراغ

سو گیا وقت کے زانو پہ مقدر اپنا
غم کا مارا ہوا دل زیست سے بیزار ہے آج
بہہ چکا آج جوانی کی امنگوں کا لہو
پیار اک ہچکیاں لیتا ہوا بیمار ہے آج

زخم رستے ہیں مری روح کے ہر گوشے میں
غم کے آغوش میں ہر سانس مری پلتی ہے
دل سے اٹھتے ہیں کچھ اسطرح مسلسل شعلے
کسی شمشان میں جسطرح چتا جلتی ہے

آج پھر زیست کی راہوں میں اکیلا ہوں شباب
نہ کوئی ساتھی ہے نہ مشعل ہے نہ منزل کا سراغ
جس سے ملتی تھی کبھی پیار کے شعلوں کو ہوا
بجھ گئے ہیں اسی آنچل کے وفاؤں کے چراغ

حمید نظر

فردوسی کا خواب

گنگناتی ہوئی رنگین فضائیں، جن میں
آج بھی رقص کیا کرتے ہیں خیام کے جام
آج بھی حافظِ شیراز کے نغموں کی کھنک باقی ہے
ایک اور شاعرِ اعظم کی بھی مرہون ہیں وہ
جس کے تخیل سے فردوس بھی شرمائی تھی!

اِک رات ایسی بھی آئی کہ شہنشاہ کا فرمان ہوا
جاؤ — پیغام دو فردوسی کو
کہ میری شان میں اِک ایسا قصیدہ لکھے!
جس کی دُنیا میں نہ ہو کوئی نظیر
مایۂ دولت کو ہوا اس کا قصیدہ جو پسندِ خاطر
ایک اِک شعر کے بدلے میں دیا جائے گا.
ایک اِک سونے کا دینار اسے!

زندگی کانٹوں کے بستر پہ بسر کی لیکن
مُدّتوں شاعرِ اعظم نے تخیل کے سمن زاروں سے
ایک گلدستۂ رنگیں کے لئے پھول چُنے
اور وہ گلدستۂ شاداب ہوا پیش اِک دن
"شاہنامے" کے حسین روپ میں شاہنشہِ دوراں کے حضور!

اور شاہنشہِ دوراں نے نوازا اسکو
اپنی بے پایاں مسّرت سے، پسندیدگی سے!
جب سوال آیا مگر اُجرت کا
آگیا شاہ کی نیّت میں فتُور
کچھ مشیروں نے، کہ جو جلتے تھے فردوسی سے
شاہ سے کی یہ گذارش، کہ حضُور!
ایک شاعر کے لئے اپنا خزانہ نہ کہیں فرمائیں
"شاہ نامے" کے لئے کم تو نہیں،
مرحمت آپ اگر فرمائیں
ایک ایک شعر پہ دینار — مگر چاندی کا!

شاہ کی لالچی نیّت میں تھا پہلے سے فتُور

اس لئے کر لی مشیروں کی گذارش منظور
اور جس وقت دیا جانے لگا
"شاہ نامے" کا صلہ چاندی کے دیناروں میں
اسکو ٹھکرا دیا فردوسی نے

چند ہی ہفتوں کے بعد
شاہ کو خود بخود احساس ہوا
اپنی کم ظرفی و وعدہ شکنی کا
"ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"

اس نے فردوسیٔ اعظم کے یہاں بھجوایا
"شاہ نامے" کا صلہ سونے کے دیناروں میں
جبکہ فردوسیٔ اعظم نہ تھا اس دنیا میں!
غم و اندوہ کی شدت نے بجھا ڈالا تھا

اسکی ہستی کا چراغ !!

اسکی تخلیق مگر آج بھی پائندہ ہے
جذب ہے جسکے ہر اک شعر میں شاعر کا لہو!

کل بھی محنت کی ہوا کرتی تھی توہین اے دوست
وہی محنت کہ جو تخلیق کا سرچشمہ ہے
آج بھی اسکی اسی طرح سے توہین ہو کرتی!
آج وہ جابر و سفاک شہنشاہ نہیں ہیں لیکن
آج سرمایہ و جاگیر کے فرزندوں سے لڑنا ہے ہمیں
ان کو دینا ہے شکست
تاکہ تذلیل نہ ہو محنت کی
اور تخلیق کے سینہ سے ہر اک سنگِ گراں اٹھ جائے

○

انور معنوی

عشق میں ہوتی ہے ذلت مری ہر گام کیساتھ
خوبصورت ہے طریقہ مری مے نوشی کا
رہِ الفت میں تری یاد ہے خضرِ منزل
زندگانی کا تھا کس درجہ حسیں افسانہ
غمِ محبوب ہو یا ہو غمِ دوراں انورؔ!

لوگ لیتے ہیں مرا نام ترے نام کیساتھ
تیری آنکھوں کا تصور ہے مے و جام کیساتھ
آتشِ شوق فروزاں ہوتی ہے ہر گام کیساتھ
ہو گیا ختم مری موت کے انجام کیساتھ
یاد بار آتے ہیں یہ لوگ گردشِ ایام کیساتھ

بقیہ تیوری۔ صفحہ ۴۸۴ سے آگے

"اچھا تمہاری مرضی —"

میرے بازو تمہارے کندھوں پر سے اس طرح پھسل پڑے جیسے دو شاخیں درخت سے ٹوٹ کر گر جاتی ہیں۔ میں تمہارے ساتھ ساتھ دروازے تک آیا اور پھر تم چلی گئیں اور شیر پھر پھر کر مجھ سے جھپٹ پڑا۔ نڈھال ہو کر میں صوفے پر گر پڑا۔

لیکن یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ بجلی کی ایک چمک ہے جو میرے ذہن میں کوند جاتی ہے یہ سب کچھ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں۔ جب میں نئی دلی کے ایک پُرہنگام شاپنگ سنٹر میں تمہیں ایک جنرل سٹور میں سے جاتے ہوئے دیکھتا ہوں —— یہ میں ہوں — یہ تم ہو— لیکن جو اپنے وجود کو کھو چکا ہے لیکن جو ہمارے وجود کی چوتھی وسعت بن کر ہمارے وجود کی تمام ترتیبی وسعتوں کو یکجا کرتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو مجھے کھینچ کر تمہارے قریب لے آتی ہے اور میں سائیکل پر تمہارے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہوں۔ یہ وہ چیز ہے جو اس سارے واقعے کے وجود کا باعث بنتی ہے اور مجھے دیکھتے ہی یہ تمہارے اندر بھی اسی طرح ایک کوندے کی طرح روشن ہو جاتی ہے جو تمہارے چہرے کا رنگ اُڑا دیتی ہے۔ تمہارے چہرے پر ایک تیوری بن کر نمودار ہوتی ہے جو اصل میں میرے چہرے کی تیوری ہے۔ جو پتہ نہیں کیوں تمہیں دیکھ کر میرے چہرے پر سے غائب ہو جاتی ہے اور تمہارے چہرے پر سے بھی۔ لیکن یہ تیوری جو ہر وقت مجھے جکڑے رہتی ہے جیسے کوئی بہت بڑا اژدہا اپنی زوردار جکڑنوں سے میری ہڈیوں کو کڑ کڑا تا رہتا ہے۔ جب میں اپنے اسٹوڈیو میں ہوتا ہوں۔ جب میں سڑکوں پر مارا مارا پھرا کرتا ہوں۔

ابھی کل ہی میں اسی کی جکڑبندیوں سے گھبرایا بھاگا جا رہا تھا۔ کناٹ پلیس کے قریب سائیکلوں کے ہجوم میں اچانک اپنے برابر میری نگاہ تم پر پڑی — تم میری طرف دیکھ رہی تھیں لیکن نگاہیں ملتے ہی اس تمام کچھ نے ہماری نظروں کو ایک دوسرے سے دور پھینک دیا تھا۔ لیکن آج ایسا نہیں ہوا۔ آج میں تمہارے قریب آ گیا تھا۔ یہ سب کچھ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔

کیوں ؟ اپنے زخموں کا کرب، بانگیز   لہو نچوڑنا چاہتا ہوں۔ کیوں ؟ کیونکہ میں اور کسی کو یہ بتا بھی تو نہیں سکتا۔ یہ خون بین کسی دوسرے کے سامنے نچوڑ بھی تو نہیں سکتا۔

لیکن تمہارے قریب پہنچ کر جب میں غور سے تمہیں دیکھتا ہوں، تمہارے سائیکل کے آگے بید کے ٹوکری نما پنگھوڑے میں ٹمّو کو دیکھتا ہوں، جس کی نکر کے صلیب نما فیتوں میں سے اُس کی ننھی منھی سیپ کے اندر کی سطح کے رنگ کی میٹھی عُریاں نظر آ رہی ہے۔ تو یہ سب کچھ ـــ یہ تیوریاں پھر میرے سینے میں اُتر جاتی ہیں۔

اور کچھ بھی کہے بغیر صرف ٹمّو کے سر پر ہاتھ پھیر کر جب میں واپس مُڑ رہا ہوں تو دلی کی اس حبس کر دینے والی شام میں سڑک پر وقوع پذیر ہونے والا یہ واقعہ بھی اس چوتھی وسعت میں شامل ہو کر اسی کا حصّہ بن چکا ہے۔ جو نہ جانے مستقبل میں کسی چیز کی تخلیق کرنے والا ہے ـــ اور کرنے والا ہے بھی یا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کون جانے!

بقیہ رتھ کے گھوڑے۔ صفحہ ۱۶ سے آگے

رکشا والا اور میرا ملازم دونوں کھڑے تھے۔

"تمہارے یہ کپڑے پھٹ رہے ہیں، انہیں تبدیل کیوں نہیں کرتی ؟"

"کیسے کروں، پیسے کہاں ہیں نئے کپڑے خریدنے کو ؟"

"اچھا سنو، تم پچاس گھوڑے بنا کر دے سکتی ہو ؟ مجھے چاہئیں۔ ایک روپیہ فی گھوڑا ملیگا۔

کتنے دنوں میں بنا سکتی ہو ؟"

"دس دن میں۔"

"کیا وعدہ ہے نا ؟"

"جی، مزدوروں کے وعدے کچے نہیں ہوتے۔"

"لیکن گھوڑے خوبصورت ہوں ؟"

"جی اچھا۔"

میرا ملازم اور رکشا والے دونوں حیران ہو رہے تھے میرے پاگل پن پر۔ اِس دور میں جذبات کی بات ماننا عقلمندی میں شمار ہی کہاں ہوتا ہے۔

"تو یہ تو پیشگی!" میں نے دس کا ایک نوٹ حسینہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اپنی دادی کی خدمت کرو۔ ہاں یہ دس روپے اِن دس دنوں کی اُجرت ہے جن میں تم اڈے پر آکر گھونگھٹے نہیں بیچو گی اور میرے لئے گھونگھٹے بناتی رہو گی۔" دس کا ایک نوٹ اور میں نے اس کی طرف بڑھایا۔ حسینہ حیرت زدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میری جیب میں صرف رکشا والے کو دینے کے پیسے ہی رہ گئے تھے اب۔

"کب آئیں گے آپ گھونگھٹے لینے؟"

"پورے دس دن کے بعد۔ اپنی دادی کو بھی ساتھ لے کر آنا۔ میں اِس آخری بس سے آؤں گا۔ اچھا اب جاؤ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔"

"جی، سلام بابو جی۔"

وہ سامنے کھڑی تھی، جھولی میں پڑے پھلوں کو سنبھالتے ہوئے۔

"جاؤ اب، بھاگ جاؤ۔"

حسینہ دھول سے اٹے ننگے پاؤں سے گرد اُڑاتی بس اسٹینڈ کے احاطہ سے باہر نکل گئی۔

میں اور میرا ملازم رکشا میں بیٹھ کر ریسٹ ہاؤس کی طرف چل دیئے۔

رات جب میں اپنے بستر پر لیٹا تو آنکھیں بند کرتے ہی کوئی میرے سامنے آکھڑا ہوا وہ حسینہ تھی۔ اس کے بال اب گندے اور بکھرے ہوئے نہیں تھے، صاف اور دُھلے ہوئے تھے۔ اُس کا لباس پھٹا پرانا نہیں تھا۔ سُرخ رنگ کا بڑا پیارا سا لباس تھا۔ اس کے پاؤں چاندنی سے دُھلی ہوئی کلیوں کی طرح صاف تھے اور اس کی سُرخ سُرخ ایڑیاں بڑی خوبصورت لگ رہی تھیں۔ اُس کے ساتھ اس کی بوڑھی دادی تھی۔ جس کی کمر ضرور جھکی ہوئی تھی لیکن اُس کے قدموں

میں عزم کی طاقت تھی اور آنکھوں میں محبت کی روشنی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے باہر سُرخ بجری والی سڑک پہ گھوڑوں سے جُتا ہُوا ایک سجا سجایا رتھ کھڑا تھا۔ گھوڑے ہنہنا رہے تھے اور حسینہ اور اُس کی دادی کا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے جب آنکھ کھولی تو کمرے کے روشندان سے آکاش پر جھکتا ہُوا چاند بڑی خوبصورتی سے مُسکرا رہا تھا۔

بقیہ منظر و پس منظر۔ صفحہ ۷۶ سے آگے

کر چل رہی ہے —— دبے دبے قدموں سے قیمتی قالینوں پر جن پر زری کا بہت باریک کام کیا ہُوا ہے، چلتا ہُوا قریب پہنچ کر میں نے کہا۔ "عالم پناہ!"

"کون ہے؟" بڑی آہستگی سے جواب ملا۔

"ظلِ الٰہی میں ہُوں۔ ایک کہانی کار۔!"

"کہانی کار کیا مطلب —؟" جہاں پناہ کی پیشانی پُر شکن ہو گئی۔ قریب ہی کھڑے معاف نے کہا۔ "داستان گو عالم پناہ!"

داستان گو —، یوں کہو۔ اہو داستان گو بڑے موقعے پر تم آئے۔ ہمیرا دل بہت اُداس ہے..... اِسے بہلاؤ..... کوئی قصّہ....."

"نہیں ظلِ سبحانی — میں محلوں کا نہیں جھونپڑوں کا قصّہ گو ہوں۔ گستاخی معاف.. عالم پناہ میرے قصّے آپکو بہلانے کی جگہ اور بے چین کر دیں گے،

تو پھر یوں آیا ہے گستاخ۔ دور؟.....

"میں صرف تاج محل کے اخراجات کا گوشوارہ جاننے کے لئے حاضر ہُوا ہوں۔ ظلِ سبحانی۔"

"تاج — !میری اُمیدوں کا سہارا۔ میری لازوال محبّت کی یادگار۔ مگر تم اِس کا گوشوارہ کیوں جاننا چاہتے ہو داستان گو؟"

"وہ صرف اس لئے کہ ایک بیوقوف رنبیُوجی اسے ساڑھے چھ آنے میں بیچ رہا ہے
سارے محل میں ایک شور سا گونج اُٹھا —— کوئی ہے؟ اس گستاخ کو [illegible]
سے باہر نکال پھینکو۔

میں جلدی سے بھاگ آیا...... بُڈھے رنبیُوجی بدستور چلا رہا تھا۔ "ساڑھے چھ آنے
میں...... لے جایئے ساڑھے چھ آنے میں —— آگرہ کا تاج محل۔ آگرہ کا تاج محل ساڑھے چھ
آنے میں......"

رنبیُوجی کے قریب کھڑا ایک دُبلا پتلا یرقان زدہ آدمی چلا رہا ہے...."بیلے کا ہار......
ناری کا سنگار ہے لو..... بیلے۔" اس کے ہاتھ میں لکڑی کا ایک تراشیدہ ٹکڑا ہے۔ اسمیں
بیلے کے ہار جھول رہے ہیں۔ سفید سفید پھول تاروں کی طرح دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کی
نرم پنکھڑیاں بارش کے قطروں سے نم ہو گئی ہیں۔ بھینی بھینی خوشبو، ایک کیف، ایک نشہ، ایک
سحر بن کر آس پاس پھیل رہی ہے —— "بیلے کا ہار، ناری کا سنگھار، بیلے کا ہار۔"

کیچڑ اڑاتی ہوئی ایک جیپ سامنے آکھڑی ہوئی۔ اسمیں سے ایک بنگالی حسینہ اُتری۔
اس کے لانبے بال، ایک بڑے سے جُوڑے کی شکل میں پھول سے دکھائی دے رہے تھے۔ بیلے
کے ہار والا زور سے چلایا "ناری کا سنگھار، ناری کا سنگھار۔" بنگالی حسینہ ہاروں کی طرف
متوجہ ہوئی۔ ہار والا قریب آ گیا۔ پُر امید لہجے میں پُوچھا۔ "کتنے دوں حضور۔؟" عورت کے
پیچھے اس کا شوہر بھی آن کھڑا ہوا۔ عورت نے شوہر کو دیکھا۔ گویا پُوچھ رہی ہو کتنے؟ شوہر نے مسکراتے
ہوئے جواب میں کہا۔ "مگر تمہاری بینی تو ہے۔!"

عورت نے بالوں کے جُوڑے پر ہاتھ پھیرا —— "ہاں ہاں! ہار نہیں چاہیئے۔ میرے
پاس پلاسٹک کی بینی ہے۔" اور آگے بڑھ گئی۔

ہاروں والا پھر منہ دُوسری طرف پھیر کر چلا رہا ہے —— "بیلے کا ہار —— بیلے کا ہار..
ناری کا سنگھار......"

"مگر ناری تو اس دور میں پلاسٹک کی ہو گئی ہے ۔ تو کیا گلا پھاڑ رہا ہے ، بے حیا۔؟"

بے حیا نے جواب میں کہا ۔ "میں رات سے بھوکا ہوں ۔ میری بیوی نے چوتھے بچے کو جنم دیا ہے۔ بچے کی ماں کو بھی کچھ کھانے کو نہیں ملا ۔ میں دن بھر ایک آٹے کی مل میں کام کرتا ہوں اور رات گئے تک کمیشن پر یہ ہار بیچتا ہوں ۔ پھر بھی میری بیوی کو پاؤ بھر دودھ نہیں ملتا ۔ آج تین دنوں سے میرا بچہ ننگا پھر رہا ہے ۔ آٹھ برس کا بچہ کل تک اس کے جسم پر کچھ چیتھڑے تھے ۔ پرسوں وہ چیتھڑے بچہ پیدا کرنے والی بے شرم بیوی کی ضرورت میں آ گئے ۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا ـــ بیلے کا ہار ـــ ناری کا سنگھ ـــ مگر ناری تو .....

دھوپ کی کومل لجیلی کرنیں اپنے آنچل سمیٹ کر سہاگ رات منانے چلی گئی ہیں ۔ سینما بلڈنگ کی دودھیا روشنی آس پاس پھیل گئی ہے ۔ جیسے تاروں کی نیلاہٹیں بکھر گئی ہوں ۔ چہل پہل میں اضافہ ہو رہا ہے ..... سینما کے آمنے سامنے لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں ۔ ایک طرف "گپ چپ" دہی بڑے ، پکوڑیاں ، بیچنے والے اپنے خونچے لئے بیٹھے ہیں ۔ ان کے ہاتھ اور زبان بیک وقت تیزی سے چل رہے ہیں ـــ شاید بکنگ شروع ہو چکی ہے کیونکہ سینما کے لاؤڈ اسپیکر سے مخصوص ہلکی موسیقی کی آواز آنے لگی ہے ۔ فلم کے شوقین تیزی سے بکنگ آفس کی طرف آ جا رہے ہیں ۔ کچھ لوگ سینما گیٹ کے عین پیشانی پر لگے ہوئے رنگین پوسٹر کو بڑے اشتیاق اور تجسس سے تک رہے ہیں جس میں ایک جوان عورت اپنے سینوں اور رانوں کی نمائش کر رہی ہے ۔

کہیں سے بھٹکتا ہوا ایک نو عمر لڑکا بغل میں بوٹ پالش کا سامان لئے آ گیا ہے ۔ لڑکا بہت کمسن ہے ۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عورت ہے ۔ اس کے دیکھنے سے ایسا معلوم پڑتا ہے گویا وہ شہر کی کسی مل میں ملازم ہے ۔ وہ عورت لڑکے کے ساتھ ساتھ کچھ فاصلے پر چل رہی ہے ۔ لڑکا سفید پوش آدمیوں کے قریب جا کر بڑے پیارے انداز میں کہتا ہے "پالش کر دوں صاحب؟ ـــــــ آپ کے جوتوں پر پالش کر دوں ۔ ایک دم سے چمکا دوں گا ۔۔"

یہ سن کر سینما گیٹ کے پہلو والی بڑے بڑے آئینوں سے سجی ہوئی پان کی دکان کے قریب کھڑے

ہوئے گجراتی سیٹھ کی نگاہ اپنے جوتے کی طرف جاتی ہے ۔۔۔ دوسری بار اس میلے کچیلے بچے کیطرف بچے کی آنکھوں میں نہ جانے کہاں سے امید کی ایک چنگاری چمک اٹھتی ہے ۔ اس نے بڑی توقع سے ہاتھ بڑھایا ۔

"حضور کردوں پالش ۔۔۔ ؟"

سیٹھ نے پیر یوں پیچھے کھینچا گویا کوئی سانپ بڑھ رہا ہے ۔

"اے ہٹ ہٹ ۔ سالا دیکھتا نہیں ہے میرا جوتا میلا ہو جائے گا ۔ ہم روز موبہے آپ پالش کرتا ہے ۔ بھاگ بھاگ سالا ۔۔۔ بھاگ سالا ۔ دیکھتا نہیں ۔ آج کل کوٹلے کے بیوپار میں ہر مہینہ گھاٹا ہو رہا ہے ۔ کلکتہ کی تین پارٹیوں کو مجبوراً چھوڑ دینا پڑا ہے ۔ سالی ہیں کار کے صرف تین ہی ماڈل بنے جاتے ہیں ۔ اپنے ہاتھوں سے پالش کرنا پڑتا ہے اور تو چاہتا ہے گجراتی سیٹھ ایکدم سے کنگال ہو جائے ۔ ؟"

لڑکا ہٹ گیا اور گاڑی میں اونگھتے ہوئے شوفر کی طرف پُر امید نظروں سے دیکھتا ہے جس کے جوتے چھونے سے شائد میلے نہ ہو جائیں گے ۔ مگر اسے اونگھتا ہوا دیکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے ۔

بوٹ پالش ، بوٹ پالش ..... جیسے بلبل چہک رہی ہو ۔

"بچے تم نے اتنی چھوٹی عمر میں ہی کیوں زندگی کے جھمیلے کو اپنا لیا ہے ؟ نو عمر بچے تم اسکول کیوں نہیں جاتے ۔"

"آپ کے بھیجے پر پالش کردوں صاحب ؟"

"ارے لڑکا ! تو بڑا گستاخ معلوم پڑتا ہے ۔"

سائے کی طرح ساتھ رہنے والی ادھیڑ عورت قدرے مایوسی سے لڑکے کی طرف دیکھ رہی ہے

"یہ عورت کون ہے بچے ؟ یہ تمہارے ساتھ سائے کی طرح کیوں لگی ہوئی ہے ؟؟"

"یہ میری ماں ہے ۔ یہ میرے باپ کی کھوج میں ہر روز میرے ساتھ شہر آتی ہے ۔ یہ "پگلی" ہے ۔ میرا ننھا بھائی بیمار پڑا ہے یہ اس کا بھی خیال نہیں کرتی ۔"

جب گاؤں میں کال سا پڑنے لگا اور کئی کئی دنوں تک چاول کی شکل تک دیکھنا نصیب نہ ہونے لگی۔ چاول جسے اس نے اور اس کے شوہر کے ہاتھوں نے بویا تھا، سینچا تھا، کاٹا تھا۔ چاول جواب اس کے قبضے میں نہیں تھا۔ گاؤں کے صدیوں پرانے لیڈروں کے تصرّف میں تھا۔ چاول جو صرف ایک یاد، ایک خواب بن کر رہ گیا تھا اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی رائیں رائیں مسلسل بھوک سے سائیں سائیں کرتے ہوئے کانوں میں شیشہ پگھلا کر ڈالنے لگی۔ اس وقت سُنی سنائی باتوں میں آکر اس کے شوہر نے ایک دن بیوی سے کہا۔ "کیوں نہ شہر چلا جائے۔ جہاں کے کارخانوں میں اتنی مزدوری مل جاتی ہے کہ ایک آدمی کمائے اور تین کھائیں۔" یہ سُنکر اس کی بیوی کی آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں۔ پہلے تو اسے یقین نہ آیا کہ دُنیا میں کوئی ایسی جگہ ہو سکتی ہے کہ جہاں ایک آدمی کی کمائی میں تین آدمی کو کھانے کو مل جائے۔ مگر جب اس کے شوہر نے اچھی طرح یقین دلایا اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کے قصّے سُنائے جو شہر میں موج اُڑا رہے ہیں۔ تو وہ خوشی سے جھوم اُٹھی اور اپنے تیسرے یعنی سب سے چھوٹے بچے یعنی جو زندگی کے میدان میں کڑی دھوپ بن کر آیا تھا، کو چوم لیا اور اس روز مکئی کا ڈھیر سا ڈنٹھل لے کر شوہر کے ساتھ چل پڑی۔

لیکن شہر پہنچ کر وہ بہت مایوس ہوئی۔ یعنی چالیس برس تک جس اُمید کو وہ سنبھالے چلی آئی تھی۔ وہ مایوسیوں کی آگ میں جل گئی ـــــ پھر انتھک دوڑ دھوپ کے بعد بالآخر ایک کارخانے میں میاں بیوی کو کام مل گیا۔ مگر دن بھر کی کڑی محنت کے بعد بھی بھر پیٹ کھانا میسّر نہ آیا۔ پھر بھی وہ خوش تھی۔ پھر بھی اس کے ہونٹوں پر حرفِ شکایت نہ آیا۔ پھر بھی اس کی آنکھیں نم نہ ہوئیں۔

پھر اب ہوا کہ گاؤں کے لوگ بھاری تعداد میں شہر آنے لگے اور کارخانے کے گیٹ پر ایک جمِ غفیر رہنے لگا اور یوں مقرّرہ مزدوری میں کمی ہونے لگی اور ہوتے ہوتے اتنی رہ گئی کہ تین کمائیں تو ایک کا بھی پیٹ نہ بھرے تو اچانک کارخانوں میں ہڑتال ہو گئی۔

اور چاول کے دانے یکدم سے چھن گئے اور جہنم کی آگ تیز سے تیز ہوتی گئی۔

بھوکے بچوں کی سسکیاں بڑھتی گئیں۔ ہڑتال کی مدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے قدموں میں

لڑکھڑاہٹ آتی گئی اور جب ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی نہ رہا تو ایک رات جب اسکی بیوی سو رہی تھی اور بچے چیخ چیخ کر تھک کے اپنی ماں کے جسم سے چپٹے ہوئے تھے اور آئندہ صبح کو ہڑتال کرنے والوں کی طرف سے ایک جلوس نکلنے والا تھا - اس کے سائیں سائیں کرتے ہوئے دماغ میں نہ جانے کیا سمایا - نہ جانے کیا سوچ کر وہ بہت پریشان ہو اٹھا - اسی رات کو اس کے لرزتے ہوئے قدموں نے شہر کو چھوڑ دیا -

پھر کلکتہ جاکر اس نے ایک جوٹ مل میں ملازمت کرلی - مگر ابھی ملازمت کے دس ہی دن گزرنے تھے کہ چھٹائی ہوئی اور پھر بیکار ہوگیا - کئی ہفتوں تک آوارہ پھرتے کے بعد ایک روز سونا گاچی میں اس نے اپنے ضمیر کو موت کی نیند سلادیا اور اب رات رات بھر رنڈیوں کی دلالی کرتا ہے اور دن بھر شراب کے نشے میں غرق ہوکر رہیں پڑا رہتا ہے اور فحش فلمی گیت گاتا رہتا ہے اور اس کی بیوی کارخانے سے فرصت پاکر ہر شام اپنے لڑکے کو پانس کا بس دیکر اس کے ساتھ ساتھ شوہر کی کھوج میں سڑکوں پر انتظار کرتی ہے -

"اور چائے لاؤں حضور - ؟" بیرہ پھر مجھے بینے دیو کے ماحول میں کھینچ لایا ہے -

"ہاں لے آؤ — !"

بینے دیو میں شور بدستور جاری ہے ، پلاسٹک کی خوبصورت عورتیں اپنے سعادت مند جھوٹے چاہنے والوں کے ساتھ جھوٹی محبت کا ؟ ڈرامہ رچتے پاگل ہوتی جارہی ہیں -

"ڈارلنگ میں نے تمہاری جدائی میں آنسوؤں کے سمندر بہائے ہیں - دیکھو دیکھو ابھی تک میری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں - "

"میں نے ایک ایک دن ایک ایک صدی کر کے گذارا ہے - میں نے کئی بار خودکشی کا بھی فیصلہ کرلیا تھا ، ڈیئر - "

"اوہو - ہوہو .... ڈارلنگ یوں نہ کہو ، مجھے غش آجائے گا - میں نے خود تڑپ تڑپ کر تین مہینے ہجر کی جلن میں کاٹے ہیں"

کوئی نہیں، کوئی نہیں۔ بے جان کھوکھلے، جھوٹے، جھوٹے آنسو۔ جھوٹی مسکراہٹیں —— سارے سینے دیو میں گھٹن سی چھا رہی ہے۔ آرکسٹرا پر ایک نئی دُھن شروع ہو گئی ہے۔ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کے پیر پھڑک رہے ہیں۔ کوئی دیر میں رقص شروع ہو جائے گا۔ جسم سے جسم ملیں گے اور سارے ہنگامے شراب اور رقص کے نشے میں مست ہو کر بار کے تاریک کمروں میں سو جائینگے اور جھوٹی زِندگی کے جھوٹے آثار کھوئے ہوئے نگروں کی طرح تلاش کرنے پر بھی نہیں ملیں گے۔ شراب کے نشے میں دھت جوڑے جب رات گئے جاگیں گے اور رات دِن نئی مِل۔ نئی دُکان۔ نئی بلڈنگ اور بلیک مارکیٹ کی نئی اسکیم بنانے والے والدین کا جب انہیں خیال آئے گا اور خالی جیبوں کی طرف ہاتھ جائے گا تو وہ بگٹٹ بھاگیں گے۔ پاؤڈر کریم کی تہوں کے نیچے چھپے ہوئے چہروں پر موت کی سی اُداسی چھا جائیگی اور اس وقت جھوٹی محبت کی ساری دِلنواز باتیں، فراق کے شکوے، جُدائی میں بہائے گئے آنسوؤں کے سیلاب سب کچھ ایک بھولا ہوا خواب بن چکے ہوں گے اور پلاسٹک کی عورتیں رس گُلوں اور شراب کے ذائقوں سے محروم لبوں پر زبان پھیر پھیر کر اپنے چاہنے والوں کے اکتائے بازوؤں کا سہارا لئے خوبصورت کاروں میں بیٹھ کر اپنے اپنے ڈربوں کو چل پڑیں گی۔

دِل واقعی اُداس ہوتا جا رہا ہے۔ دل ناداں کو کیا سمجھاؤں۔ اِس کمبخت کو سینے دیو میں بھی زِندگی کی تلاش رہتی ہے۔

میں نے بھی پھر باہر دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ جہاں ادھیڑ عورت اپنے دُکھوں کا بوجھ لئے اپنے مفرور شوہر کی تلاش میں ایک نالی کے قریب بیٹھی ہوئی ہے۔

زِندگی سے بھاگے ہوئے سدھارتھ! گھر لوٹ آؤ۔ یشودھرا زندگی کے رُوپ میں اب بھی تیرا انتظار کر رہی ہے۔

تلخ، ترش و شیریں

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے)

★ **سحر غزل** جناب سحر ہوشیار پوری کی وجد آفریں غزلیات کا مجموعہ ہے۔ جو اُردو شاعری میں ایک قابلِ قدر اور حسین ترین اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ ساحر ایک شگفتہ مزاج شاعر ہے جس کی بے ساختگی اور جذباتی مٹھاس رُوح کی عمیق ترین گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے۔ ان کے ہلکے پھلکے اشعار گلاب کی بار یاب پنکھڑیوں کی طرح آپ کے ذہن میں رقص کرنے لگتے ہیں۔ زبان کی شیرینی، طبیعت کی رنگینی، خیالات کی بلند پروازی اور شعور کی پختگی نے ان کی شاعری میں ایک نشہ سا بھر دیا ہے، جو آہستہ آہستہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔

ساحر نے حسن و عشق کی روایاتی باتیں نہیں کیں بلکہ زندگی کے گہرے تجربات کو اپنے منفرد اور بڑے ہی لطیف انداز میں غزل کی ریشمی ڈوری میں پرو دیا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

آج کس طائرِ بے پر نے قفس توڑ دیا　　　کس کی پرواز کا چرچا ہے گلستانوں میں

طوفان نے دیا جو پیامِ بقا مجھے　　　دریا کی موج موج کو ساحل بنا دیا

زیست کی گتھی، دل کی گرہ!　　　اور اُلجھی سلجھاتے سے

منجدھار میں کشتی چھوڑ چکے، ساحل سے تعلق توڑ چکے　　　اندازۂ طوفاں کیا معنی، ہم شورشِ طوفاں دیکھیں گے

مائلِ شوق لاکھ طوفاں ہوں　　جو اُترتے ہیں پار اُترتے ہیں
آرزوئے قیام کیا معنی　　قافلے بھی کہیں ٹھہرتے ہیں
کلیجے سے لگائیں ہم شبوں داغِ محبت کو　　یہی تو زندگی بھر کی تمناؤں کا حاصل ہے

گٹ اپ کے لحاظ سے کتاب بڑی دلکش مرتب ہے۔ دو رنگی چھپائی ہیں چند اشعار کو اسمٰعیل آرٹسٹ نے مصوّرانہ پیش کیا ہے۔ مصنّف کی اپنی تصویر بھی شامل ہے۔ سفید بڑھیا کاغذ اور آرٹ پیپر پر تصاویر ہیں۔ سہ رنگی جلد سادگی اور دلکشی کا نمونہ ہے جس پر اسمٰعیل آرٹسٹ کا برش فن کی پابندیوں پر ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف ۳ روپے ہے۔

ناشر :- حلقہ ارباب ادب ۸۸۲۸ نیا محلہ۔ پُل بنگش۔ دھلی۔

★ **شکستِ جام** وادیٔ کشمیر کے مقبول ترین نوجوان شاعر عرش صہبائی کی بڑی پیاری اور دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں اُتر جانے والی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جس کا دُوسرا ایڈیشن ہمارے پیشِ نظر ہے۔ آج کل کسی اُردو کتاب کا ایک ایڈیشن ہی ختم ہو جائے تو غنیمت ہوتا ہے اور شکستِ جام کا دُوسرا ایڈیشن دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ آج کے اقتصادی اور سیاسی ٹکراؤ میں بھی دل والوں کی کمی نہیں۔

عرش کی شاعری میں آپ کو بڑے بڑے وزنی اور ثقیل الفاظ کا پتھراؤ نہیں ملے گا بلکہ چھوٹی چھوٹی مترنم بحروں میں ننھی ننھی کلیوں کی چٹک اور شگفتہ پھولوں کی مہک محسوس ہوگی عرش کی شاعری میں اس کا گہرا سماجی شعور، خیالات کی بلند پردازی۔ شاعرانہ صلاحیت اور پختہ کلامی جا بجا نمایاں ہے چند اشعار ملاحظہ فرمادیں ؎

کہاں دیر و کعبہ کہاں بزمِ ساقی　　نکل آئے ہم یہ کدھر جاتے جاتے
بااوقات میرِ کارواں بھی　　بھٹک جاتے ہیں راہِ زندگی سے
دریائے زندگی میں تلاطم کے باوجود　　کشتی گئی ہے جانبِ ساحل کبھی کبھی

بحرِ حیات میں اُسے ساحل ہُوا نصیب — کشتی جو بے نیازِ تلاطم گذر گئی!

وقت کی سب ستم ظریفی ہے — ورنہ انسان بُرا نہیں ہوتا!

لکھائی چھپائی اچھی۔ رنگین جاذبِ نظر سرورق۔ صفحات ۱۲۸ اور قیمت صرف ۲/- روپے ہے

مکتبہ اُردو ادب جموّں!

اِنسان جیت گیا

رام کمار ابرول کا اسٹیج ڈرامہ ہے جس میں نئی اور پرانی قدروں کا تصادم ہے اور اس تصادم میں آپ پرانی دم توڑتی جاگیرداری کی آخری ہچکی۔ اور نئی اُبھرتی ہوئی عوامی طاقت کے [illegible] اور تیز بہاؤ کی گونج سُن سکتے ہیں۔

موضوع کے لحاظ سے یہ ڈرامہ وقت کی بہت بڑی ضرورت کہا جاسکتا ہے۔ ڈرامہ کے تمام کردار چلتی جاگتی زندگی کے نمائندہ کردار ہیں اور ان کی بول چال اور ایکٹنگ میں ایک جوش قوت اور ولولہ رواں دواں ہے۔ جن لوگوں نے یہ کھیل اسٹیج پر دیکھا ہوگا یقیناً وہ ڈرامہ کے شدتِ تاثر سے چونک اُٹھے ہوں گے مگر پڑھنے والا بھی بُری طرح متاثر ہوتا ہے اور اپنے اندر جوش اور ولولہ کی چھوٹی بڑی بہت سی لہریں اُٹھتی اور مچلتی محسوس کرتا ہے۔

لکھائی چھپائی اچھی۔ سفید کاغذ۔ مجلد۔ سادہ اور پُر معنی سرورق۔ ایک سو سے کم صفحات پر دو روپے قیمت کچھ زیادہ محسوس ہوتی ہے :: ناشر۔ لکشمی سٹیشنری مارٹ جموں

فریبِ سحر

ہلال سیوہاروی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔

ہلال ایک مزدور شاعر ہے۔ جسے شاعری ورثے میں ملی مگر ان کی شاعری میں جو انسانی قوت۔ بیباکی۔ سیاسی شعور اور طنز نمایاں ہے وہ اس کا اپنا ہے۔ جو براہِ راست اس نے زندگی سے نچوڑا ہے۔

ہلال کی شاعری میں کتابی مطالعہ کی کمی ہو تو ہو مگر زندگی، حالات اور ماحول کا مطالعہ اور

مشاہدہ بڑا گہرا ہے۔ "شوگر" فیکٹری کی سخت مزدوری نے ان کی شاعری میں ایک جواں ہمتی، زندگی پر اعتقاد اور حالات اور ماحول سے لڑنے کی قوت پیدا کردی ہے۔ ان کی نظمیں آج کی لوٹ کھسوٹ اور بے انصافیوں پر بڑا بھرپور طنز ہے جو آنیوالے روشن مستقبل کیطرف اشارہ کرتا ہے۔ زندگی اور ادب کی صحت مند اور ترقی پسند قدروں کے علمبردار ہلال کی غزلیں بھی بڑی جاندار اور جدید تقاضوں سے بھرپور ہیں۔ یہاں بھی آپ ان کی شاعرانہ عظمت اور شدتِ تاثر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

پہلے قدم تو سب نے مجھے پرند کہہ دیا — مجھ پر تری نگاہ سے الزام آگیا
تم پر جفا کے بعد بھی معصوم ہی رہے — آنا تھا میری ذات پہ الزام آگیا
جب کبھی گھیرا ہے مجھ کو گردشِ ایام نے — آپ ہی کا نام کیوں بے ساختہ یاد آگیا
ہر کلی دیدہ نم نظر آئی! — جب کوئی پھول مسکرایا ہے
ہمیں سے لوگ چلا ئینگے منزلوں کا پتہ — مسافرو ہمیں تم گردِ کارواں نہ کہو

لکھائی چھپائی نفیس۔ بڑھیا سفید کاغذ۔ صفحات ۱۲۸، سادہ اور پُر معنی سرورق۔ مجتبیٰ شاعر کی تصویر بھی شامل ہے۔ قیمت صرف ۱/۸ روپیہ۔

پبلشرز:- یو۔ جی۔ ایس۔ ایم لمیٹڈ سیرہاوہ۔ یو۔ پی

پرچمِ اُردو۔ یہ چھوٹا سا منظوم کتابچہ "جشنِ شاعر" بمبئی کے موقعہ پر جناب شفا گوالیاری صاحب نے پیش کیا ہے۔ جسمیں اُردو زبان کی افادیت اور مقبولیت کے تذکرے کے ساتھ ساتھ معمارانِ اُردو کے مہند (موجودہ) کی ایک فہرست بھی پیش کیگئی ہے۔

شفا صاحب ہندوستان کے چوٹی کے شعراء میں سے ہیں۔ اور اتنی ہی بات ہوتی تو دو مردوں کی سی بات ہوتی۔ مگر آپ بہت بڑے اُردو نواز اور اُردو پرست ہیں۔ جو ہر وقت اُردو زبان و ادب کی ترقی اور بہتری کے خواہشمند رہتے ہیں اور اس لگن میں بڑی خلوص دلی سے

کام کر رہے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتابچہ ان کی اِس اُردو پرستی کی نمایاں مثال ہے۔ آپ بھی ذرا ان کے جوشِ جنوں سے فیض یاب ہوں۔

برہم تری محفل کو نہ کرنے دیں گے — پتھر تری چھاتی پہ نہ دھرنے دیں گے
اے جانِ وطن چاہنے والے تیرے — مر جائیں گے خود تجھ کو نہ مرنے دیں گے

شفا صاحب جہاں اُردو کی بہتری اور ترقی کے خواہاں ہیں وہاں وہ اپنی قومی زبان ہندی سے بھی دلی لگاؤ اور محبت رکھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

ہندی کو بھی کر نہیں سکتے تحقیر — تہذیب و تمدن کی ہے یہ بھی تصویر
یہ کس طرح چاہیں گے کہ ہندی مٹ جائے — لاریب کہ ہم اتنے نہیں کور ضمیر!

بہترین کتابت و طباعت۔ سفید بڑھیا کاغذ۔ صفحات ۲۰۰۔ اُردو سے پیار کرنے والوں کے لئے بڑی نفیس اور بہتر اپنے پاس رکھنے والی چیز ہے۔ حیرت ہے کہ نہ قیمت اور نہ ملنے کا پتہ درج ہے۔ خواہش مند اصحاب جناب شفا گوالیاری صاحب بھوپال سے رجوع کریں۔
